www.pdfbooksfree.pk

www.pdfbooksfree.pk

سرگزشت — 15 — **خودساز** — ادارہ
ایک صفحہ میں مکمل، مختصر مختصر ایک نادر روزگار کا تعارف

گفت وشنید — 16 — **شہر خیال** — مدیر اعلیٰ
آپ کی باتیں، آپ کے خیال، آپ کے مشورے اور آپ کے سوال

شخصیت — 24 — **بابِ درخشاں** — ڈاکٹر ساجد امجد
زندگی کو برتنے والی ایک اہم شخصیت کا زندگی نامہ

عکس زندگی — 47 — **کالی قسمت** — ابنِ کبیر
اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل کی لستانی نے ایدھی سینٹر میں زندگی گزاردی

حالات وواقعات — 67 — **نصیبِ خفتہ** — شکیل صدیقی
وہ ادب پتی مصنف تھا لیکن مرا تو ہاتھ خالی تھا

فلم وصحافت — 75 — **فلمی الف لیلہ** — علی سفیان آفاقی
فلم وصحافت کی کہی ان کہی کہانیاں، فلم نگری کی باتیں، یادیں

خراجِ تحسین — 99 — **سپر اسٹار** — شاہد جہانگیر شاہد
خاموش فلموں کا سپر اسٹار جس نے پشاور میں جنم لیا یہیں سپردِ خاک ہے

تحقیق — 113 — **تلاشِ مرقد** — مختار آزاد
ملکہ قلوپطرہ کی قبر آخر ہے کہاں ایک محقق کی روداد

داستان عشق — 129 — **لازوال محبتیں** — منزہ قادری عطاری
محبت کے بحرِ بے کراں میں ڈوب کر نام پیدا کرنے والوں کا تذکرہ

سفر کہانی — 137 — **افریقا او افریقا** — الطاف شیخ
افریقا کا وہ رخ جسے عام طور پر دکھایا نہیں جاتا

معلومات — 157 — **سحر ساحری** — امجد اوسلو
جادو منتر کی اصل حقیقت کیا ہے، کیا اس علم میں قوت ہے؟

مہم جوئی — 163 — **تلاش** — طارق عزیز
اس دور کا قصہ جب لوگوں کو دنیا کی وسعت کا اندازہ نہ تھا

معاشرت — 172 — **سراب** — کاشف زبیر
بلند حوصلوں اور بے مثل ولولوں سے گندھی تہلکہ خیز داستان

شعر وادب — 211 — **بیت بازی** — قارئین
شعر وادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک دلچسپ سلسلہ

انعامی مقابلہ — 214 — **علمی آزمائش** — ادارہ
ذہین قارئین کے ذوق جستجو کی تسکین کے لیے منفرد انعامی سلسلہ

پہلی سچ بیانی — 216 — **تلافی** — امجد
وہ اپنے جرم کی تلافی کے لیے مجبور تھا اور اس نے ایسا کر دکھایا

دوسری سچ بیانی — 231 — **ڈیوٹی** — عدنان
ایک دلچسپ الگ انداز کی سچ بیانی ہر شخص اپنی ڈیوٹی نبھانے کے لیے پیدا ہوا ہے

تیسری سچ بیانی — 239 — **چور** — آصفہ ضیا احمد
ایک انوکھے چور کا قصہ عجیب وہ انسان نہیں تھا

چوتھی سچ بیانی — 245 — **ڈراما** — ابرار
ایک ڈرامے نے اس کی زندگی بدل دی اور وہ برگزیدہ بن گیا

پانچویں سچ بیانی — 253 — **قصور** — زلیخا
اس کا قصور کیا تھا کوئی بتائے گا؟ کیونکہ زندگی تلخ ہوگئی تھی

چھٹی سچ بیانی — 261 — **نہ جائے رفتن** — فریدی
وہ باپ بیٹے عجیب مخمصے میں پھنس گئے تھے کیونکہ محلے والوں نے زندگی اجیرن کردی تھی

ساتویں سچ بیانی — 267 — **بیٹی** — امجد
بیٹی خدا کی منفرد نعمت ہے جسے سمجھنے کے لیے وقت چاہیے

آٹھویں سچ بیانی — 273 — **جرم** — خورشید عالم
کس نوعیت کے تھے یہ جرم؟ ایسے انوکھے قصے سرگزشت کا خاصہ ہے

نویں سچ بیانی — 287 — **قسمت** — ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری
ایک ایمبولنس ڈرائیور کی داستان وہ موت کو شکست دے کر آیا تو...

ماہ نامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوقِ طبع ونقل بحق ادارہ محفوظ ہیں، کسی بھی فرد یا ادارے کے لئے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورتِ دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔
● تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

www.pdfbooksfree.pk

جلد 23 ❖ شمارہ 04 ❖ مارچ 2013ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرہ اعلیٰ: عذرا رسول

مصور: شاہد حسین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

میرے سامنے ایک معروف روزنامے میں شائع شدہ مولانا محمد خان شیرانی کا تحریر کردہ کالم ہے۔ وہ اسلامی نظریاتی کونسل کے چیرمین ہیں، لکھتے ہیں کہ "1992ء میں جب مجاہدین نے افغانستان میں ایک سپر پاور کو دوسری سپر طاقت میں بدلنے سے انکار کیا تو مغربی ممالک نے جہاد کا غلط استعمال کروایا اور بہت سے گروپ بنا دیے۔ میں اس دہشت گردی کو خانہ جنگی کا نام دیتا ہوں۔" یہ مولانا کا اپنا نظریہ، اپنی معلومات ہو سکتی ہے لیکن ہم یہ ضرور کہیں گے کہ مغرب نے ایک بار پھر وہی چال چلی ہے جو کبھی ہسپانیہ میں اور کبھی بغداد کا عروج ختم کرنے کے لیے چلی گئی تھی یعنی جب جب مسلمان علم و فن میں عروج حاصل کر کے ترقی کے راستے پر چل پڑتے ہیں، دشمن نفاق کا سہارا لے کر انتشار پھیلا دیتا ہے اور مسلمان آپس میں دست و گریباں ہو کر اپنی تباہی کو آواز دینے لگتے ہیں۔ تقریباً 200 سال کی غلامی کے بعد نہ جانے کن کن برگزیدہ بندوں کی دعاؤں کے طفیل ہمیں ایک آزاد وطن نصیب ہوا مگر یہاں بھی آستین کے سانپ در آئے اور کلمہ گو کو کلمہ گو کے خون کا پیاسا... بنانے لگے ہیں جس کا نتیجہ کوئٹہ اور کراچی سمیت پورے پاکستان میں نظر آ رہا ہے۔ ایسا کوئی دن نہیں گزرتا جب کسی کلمہ گو کے سینے میں کسی کلمہ گو کی گولی نہیں اترتی۔ ایسے وقت میں حبیب جالب کا یہ شعر بہت یاد آتا ہے:

محبت گولیوں سے بو رہے ہو
وطن کا چہرہ خوں سے دھو رہے ہو
گماں تم کو کہ رستہ کٹ رہا ہے
یقیں مجھ کو کہ منزل کھو رہے ہو

معراج رسول

شعبہ اشتہارات

منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789

نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391

رانا محمد حمید 0323-2895528

نمائندہ لاہور افراز علی تابش 0300-4214400

◆◆◆

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زرِ سالانہ 700 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقامِ اشاعت: C-63، فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ، کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200 Fax :35802551

E-mail: jdpgroup@hotmail.com

MEMBER APNS CPNE

خود ساز

سرگزشت

21 فروری 1865ء کو گوجرانوالہ کے ایک انتہائی غریب گھر میں اس نے جنم لیا۔ گھرانا اتنا غریب تھا کہ اس گھر کو روشن کرنے کے لیے چراغ کا تیل خریدنا بھی مشکل تھا اس لیے اس نے اندھیرے کمرے میں آنکھ کھولی تھی، غربت کی گود میں پل کر وہ ہوش مندی کی منزل تک پہنچا۔ غریبی کے بوجھ تلے دبے، کراہتے سسکتے اس خاندان کے کسی بچے کا تعلیم حاصل کرنا ایک ناممکن سی بات تھی۔ یوں بھی اس دور میں تعلیمی رجحان کا فقدان تھا۔ اچھے اچھے گھروں کے بچے جہالت میں گھرے خوش ہوتے۔ الف بت کو بزدلی کی علامت قرار دیتے۔ خواہ مخواہ کی کہاوت گھڑی تھی کہ علم حاصل کرنے سے انسان بزدل بن جاتا ہے۔ اس دور میں کسی بچے کا، وہ بھی ایک ایسے گھرانے کے بچے کا جسے دو وقت بھر پیٹ کھانا بھی نصیب نہ ہوتا ہو تعلیم کی طرف رجحان ایک حیرت انگیز بات تھی۔ وہ اپنے طور پر، کسی کی مدد لیے بغیر خود ہی پڑھتا رہا، کبھی اس کے پاس تو کبھی اس کے پاس جا کر ابجد سیکھتا تھا پھر 12 سال کی عمر میں وہ اپنے چچا احمد دین کے ساتھ گوجرانوالہ سے لاہور چلا آیا۔ اس دور میں لاہور مغربی ہند کا شہر العروس تھا۔ اس سے بڑا کوئی شہر نہ تھا، ترقی کے وہاں مواقع بھی تھے۔ لاہور آ کر اس نے تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دی .... چچا اسے اپنے کام میں مدد لینے کے لیے لے کر آئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ایک مفت کا نوکر ہاتھ آ گیا ہے۔ اس نے بھی کبھی خدمت میں کوتاہی نہیں کی۔ کسی کام سے جی نہ چرایا مگر پڑھائی کی طرف سے بھی غافل نہ رہا، خود ہی محنت کرتا رہا اور منشی فاضل کا امتحان دیا۔ اس نے یہ امتحان اپنی محنت اور قابلیت سے دیا تھا۔ کسی استاد سے مدد نہیں لی تھی صرف کبھی کبھی چچا سے تھوڑی بہت مدد لے لیتا تھا۔ پھر بھی اس نے اس امتحان میں امتیازی حیثیت حاصل کر لی۔ بہت زیادہ نمبر حاصل کیے۔ اس کامیابی پر اسے یونیورسٹی سے نقد انعام ملا۔ نہ صرف نقد رقم بلکہ قیمتی کتابیں بھی یونیورسٹی نے فراہم کیں۔ یہ ایک بہت بڑی اور تاریخی بات تھی کہ کسی ہندی مسلمان کو یہ اعزاز ملا۔ مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن گھریلو ذمہ داریاں بھی سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ ان کا مقابلہ بھی کرنا تھا۔ چچا مولوی احمد دین نسبتاً خوشحال تھے تو انہوں نے استطاعت بھر مدد کر دی تھی۔ اب تمام تر ذمے داری اسے ہی اٹھانا تھی اور وہ ذمے داری اٹھانے پر مجبور بھی تھا کہ یہ اس کا فرض بھی تھا۔ چچا کے پریس میں کام کرنے پر مزدوری بھی ملتی تھی جسے وہ پورا کا پورا گھر بھیج دیتا تھا۔ پریس میں کام کرتے کرتے اس کام میں دسترس حاصل کر چکا تھا۔ یوں بھی اب عمر کی اس منزل پر پہنچ چکے تھے جہاں پہنچ کر آرام کی طلب زیادہ ہو جاتی ہے۔ قویٰ جواب دینے لگتے ہیں، سمجھتا اب اس قابل ہو چکا ہے کہ وہ پریس سنبھال لے، اس بات کا ادراک انہیں ہو چکا تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد انہوں نے پریس پر سے ہاتھ اٹھا لیا اور کلی طور پر اسے بھتیجے کے حوالے کر دیا۔ بھتیجا عقل میں چچا سے سوا تھا اس نے پریس کا صحیح استعمال کیا۔ اس پریس کو دوسرے لوگوں کی چیزیں چھاپنے کے لیے وقف نہ رکھا۔ اس نے اپنا کام شروع کرنے پر غور کیا۔ ہر کام کے لیے سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے جس کی اس کے پاس بہت زیادہ کمی تھی مگر اس کے پاس دماغ تھا۔ وہ غور و فکر کرتا رہا بالآخر اس نے اخبار نکالنا شروع کر دیا۔ اخبار کے کام میں بہت زیادہ جدت تھی۔ اخبار کا نام علم یا علم سے جڑی چیزوں پر نہیں رکھا۔ نہ اس کا نام فکر و فن سے جوڑا بلکہ اخبار کا نام "پیسا" رکھا جو صرف ایک پیسے میں بکتا تھا۔ اخبار کو کچھ ایسا انداز دیا کہ وہ دیکھتے ہی دیکھتے ہندوستان بھر کے معاصر اخبارات سے آگے نکلنے لگا۔ گوجرانوالہ میں رہ کر "پیسا" وہ کامیابی حاصل نہیں کر پا رہا تھا جو اسے مطلوب تھی۔ کافی غور و خوض کے بعد اس نے اپنا پریس گوجرانوالہ سے لاہور منتقل کرنے کی ٹھانی اور لاہور چلا آیا۔ ایک معقول جگہ بھی نظر آ گئی۔ وہ جگہ حاصل کی پھر پریس کو لاہور منتقل کر دیا۔ یہ فیصلہ بروقت اور دانشمندانہ تھا۔ لاہور سے شائع ہوتے ہی "پیسا اخبار" نے مقبولیت کی معراج حاصل کر لی۔ ہر کوئی اسے پسند کرنے لگا تھا۔ دہلی، امرتسر کے اخبارات جو اس وقت لاہور میں خاصے مقبول تھے ان کی مقبولیت کم ہوتی چلی گئی۔ اخبار کی مقبولیت بڑھی تو آمدنی کا راستہ بھی کھلا۔ اب اس نے طباعت کے دوسرے شعبوں پر بھی توجہ دینا ضروری سمجھا اور کتابیں بھی شائع کرنے لگا۔ اس کے مکتبہ سے شائع ہونے والی کتابیں بھی پسند کی جانے لگیں کیونکہ طباعت کا معیار بہت اعلیٰ تھا پھر طباعتی مواد بھی کافی دماغ سوزی کے بعد وہ آگے بھیجتا تھا۔ پھر اس نے ماہنامہ پرچوں کی جانب توجہ دی "بچوں کا اخبار" "انتخاب لاجواب" اور "شریف بی بی" کے نام سے رسائل شائع کرنے لگا۔ یہ رسائل بھی کامیابی کی ضمانت بن گئے۔ گھر گھر میں پسند کیے جانے لگے لیکن پیسا اخبار کی تو اب بھی بات الگ تھی، لوگ اس کے عادی بن گئے تھے۔ خود بھی انشائیہ لکھتا اور بہت اچھا لکھتا پھر تقریر بھی بہت اچھی کرتا تھا جس کی وجہ سے ہر بڑے جلسے میں جو مسلمانانِ ہند کے مسائل پر .... منعقد ہوتے وہاں سے خصوصی طور پر دعوت نامے آتے۔ یورپ سے بھی دعوت نامہ آتا۔ یورپ کی سیاحت کا احوال "سفر نامہ یورپ" میں بڑے دلچسپ انداز میں لکھا جو عرصہ تک قسط وار شائع ہوتا رہا۔ 1912ء میں حج بیت اللہ پر بھی گیا۔ برصغیر میں پہلا اسلامی انسائیکلو پیڈیا بھی شائع کیا۔ بطور سماجی کارکن اور قلم کار شہرت کی بلندی حاصل کرنے والے اس خود ساز کے پیکر کا نام مولوی محبوب عالم تھا جس نے 23 مئی 1933ء کو اس دنیا سے رشتہ توڑا۔

☆☆☆

www.pdfbooksfree.pk

شہرِ خیال

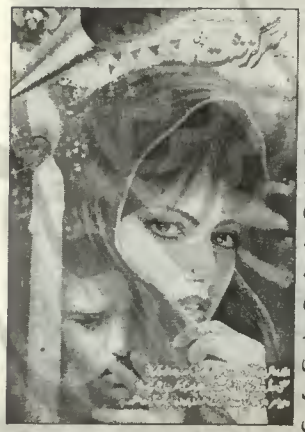

☆اعجاز حسین لدھیانہ کی کچی کھوہ خانیوال سے شرکت آوری ”فروری کا سرگزشت اپنی تمامتر رعنائیوں سمیت ہاتھوں میں ہے۔ پچھلے کچھ عرصہ سے اپنی تمام تر خواہش کے باوجود شہرِ خیال کی محفل میں حاضری نہیں دے سکا ہوں جس کا افسوس ہے۔ معراج رسول صاحب کی باتیں سیدھی دل پر اثر کرنے والی ہیں۔ ملک کو نہ جانے کس کی نظر لگ گئی ہے۔ ایک بحران سے نکلتے ہیں تو دوسرا سامنے منہ کھولے کھڑا ہوتا ہے۔ اس مشکل کی گھڑی میں بجائے اس کے کہ ہم ایک متحد قوم کا مظاہرہ کریں ہم ایک دوسرے کے گریبانوں میں ہاتھ ڈالے ہوئے ہیں خدارا یہ روش ترک کرکے وطن دوستی کا ثبوت دیں۔ خاص کر حکمران طبقہ، خدا کے لیے ہوش کے ناخن لے اور ہر قسم کے جھوٹے پراپیگنڈا کا ڈٹ کر مقابلہ کرے۔ پاکستان قائم رہنے کے لیے بنا ہے اور انشااللہ قیامت تک قائم رہے گا۔ یک صفحی سرگزشت میں جو بھی شائع ہوتا ہے نابغہ روزگار ہوتا ہے۔ ماشااللہ، زبردست مواد ہوتا۔ شہرِ خیال میں اعجاز حسین سٹھار صاحب آن دی ٹاپ نظر آئے۔ باقی دوستوں کے تبصرے بھی اچھے ہیں خاص طور پر عزیز میرٹھی، ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی، رانا محمد شاہد نے بہت عمدہ لکھا۔ ایم اے خالق صاحب سدرہ بانو ناگوری صاحبہ کو محبتوں بھرا اسلام۔ وحیدِ عصر، تحریر نے وحید الہ آبادی کے بارے میں گرانقدر معلومات فراہم کی ہیں۔ ویلڈن ڈاکٹر ساجد امجد صاحب، محمد ہاشم آملہ کے بارے میں معلومات ملیں واقعی ایک باریش کھلاڑی اور نماز روزے کا پابند سبحان اللہ! سونے پہ سہاگا یہ کہ ایک غیر مسلم ملک کی ٹیم میں۔ چمکتا چہرہ اور شاندار کھلاڑی' اللہ ہاشم آملہ کو اور زیادہ عزت ' شہرت اور وقار دے آمین! کے ایف سی ہوٹل کے مالک کے بارے میں عمدہ معلومات ملیں واقعی ہمیشہ ترقی وہی کرتا ہے جو سخت محنت لگن اور ایمانداری کو زندگی میں شامل رکھتا ہو۔ بلے بوائے کے بارے میں صرف سنا تھا سرگزشت نے سارا کچا چٹھا کھول کے سامنے رکھ دیا۔ الطاف شیخ کا سفرنامہ افریقا افریقا اچھا ہے۔ سمندر کے مکین ابھی پڑھ نہیں سکا۔ یورپین نے ہند کا سمندری راستہ تو ضرور تلاش کیا لیکن جو لوٹ کھسوٹ کا بازار ایشیائی ممالک میں گرم کیا وہ بھی کم نہیں ہے۔ قلمی الف لیلہ ہمیشہ کی طرح زبردست۔ اللہ آفاقی صاحب کو لمبی زندگی اور صحت عطا فرمائے (آمین) پوپ میوزک کی روح بیٹلز کو کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا۔ واقعی انہوں نے پوپ سنگنگ کو لافانی شہرت دی۔ یوسف خان شہر بانو کے بارے میں پڑھا اچھا لگا۔ عشق رسول ﷺ میں ڈوبی تحریر نے روح و جسم دونوں کو بالیدگی بخشی۔ عشق رسول ﷺ میں ہی ہماری بقا اور آخرت کی کامیابی ہے۔ سراب ہمارے لیے بھی اب سراب ہی ہوتی جارہی ہے۔ بہرحال سراب اپنی مخصوص اسپیڈ اور ٹیمپو سے رواں دواں ہے۔ انگارا نے بہت زیادہ متاثر کیا' یہ سچ ہے کہ اگر کوئی ایک اچھا کام کرنے لگتا ہے تو ہم اس پر سو طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ عمران نے سادگی سے شادی کرکے ہمیں آئینہ دکھا دیا ہے کہ جہیز جیسی لعنت اور فرسودہ رسوم سے بچیں جو غریب لوگوں کے لیے بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کرنے میں حائل ہیں۔ اگر ہم شادی کے معاملے میں سنتِ نبوی ﷺ پر عمل کریں تو کوئی بھی بیٹی جہیز نہ ہونے کی وجہ سے بوڑھی ہوکر والدین کی دہلیز پر بیٹھی نہیں رہے گی۔ حربہ عبرت انگیز تحریر اور نروان اچھوتی تحریر ہے۔ مماثلت بھی عمدہ تحریر تھی۔ ہوس ہمارے معاشرے میں بسنے والے مختلف کرداروں کی آئینہ دار تحریر ہے۔ ماں باپ کو کچھ نہ کچھ تو سوچنا چاہیے تھا۔ آنکھیں بند کرکے ایک شخص پہ اعتبار کرکے بیٹی کی زندگی تباہ کردی۔ چارا اچھی تحریر ہے۔ دماغ پھر جائے گا، اچھی تھی۔ مذاق کرنے اور لطیفے سنانے کی عادت نے زندگی کے قیمتی سال قید کی نذر کردیے۔ دوہرا معیار بھی بہترین تحریر تھی۔ بھی مائیں اپنے لاڈلوں کے لیے چاند سی بہو چاہتی ہیں، کیسا اپنا پن بس ٹھیک ہے۔ کبھی کبھی ایسے غیر متوقع حالات سے پالا پڑ سکتا ہے۔ سرگزشت کی انتظامیہ کو اتنا اچھا شمارہ شائع کرنے پر مبارکباد اور معراج رسول صاحب کی لمبی زندگی کے لیے ڈھیروں دعائیں، خدا حافظ!“

☆ایم اے خالق بھٹی، رحیم یار خان سے لکھتے ہیں۔ ”تازہ شمارہ ملا۔ جس ملک کے حکمرانوں میں احترام قانون نہ ہو اس ملک کا اللہ ہی مالک ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے ووٹ کا حق ان لوگوں کو بھی حاصل ہے جو ووٹ کی اہمیت سے نابلد ہیں، نشہ بازوں کو بھی ووٹ کا حق حاصل ہے بھلا وہ کیا جانیں ووٹ سے کیا تبدیلی رونما ہوسکتی ہے۔ موبائل ہمارے سادہ لوح لوگوں کے لیے فائدہ مند کم اور نقصان زیادہ کررہا ہے۔ ہمارے یہ بھائی اپنا قیمتی سرمایہ موبائل بیلنس کے نام سے غیر ممالک میں بھجوا رہے ہیں جس سے ہماری پس ماندگی میں اضافہ ہورہا ہے۔ مختصر بیتی میں ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ کا ذکر تھا۔ قلمی الف لیلہ میں پشاور کی معروف قلمی شخصیات کا ذکر پڑھنے سے معلومات میں اضافہ ہوا ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی وحیدِ عصر، ابن کبیر کی قابلِ فخر کھلاڑی، عائشہ جونیجو کی محنتی، شکیل ادریس کی پلے بوائے اور کافی ماہ بعد الطاف شیخ صاحب نے افریقا او افریقا کے نام سے سفر کہانی لکھ کر اپنے سابقہ ریکارڈ کو برقرار رکھا ہے۔ مختار آزاد کی سمندر کے مکین، طارق عزیز کی تلاشِ ہند، شکیل صدیقی کی چار گو یے محمد ایاز راہی کی مختصر تحریر جلالِ عشق پڑھی ہے۔ سچ بیتیوں کے مطالعے سے قبل لیٹر لکھ رہا ہوں کہیں میرے اس اکلوتے کی ٹرین نہ چھوٹ جائے اور بادولت لیٹ کمرز میں نہ آجائے۔ اس مرتبہ شہرِ خیال کی کرسی صدارت پر اچھے تبصرے کے ساتھ اعجاز حسین سٹھار براجمان تھے۔ عزیز میرٹھی صاحب نے بھی مہینوں بعد درشن کرائے ہیں۔ سدرہ بانو، ناگوری کے ساتھ ساتھ احمد خان توحیدی بھی کرسی صدارت کی سالانہ تفصیل کے ساتھ موجود تھے۔ سہیل احمد عباسی، رانا فیصل جاوید، رانا محمد شاہد، طاہر الدین بیگ، امجد ایاز راہی، ڈاکٹر ایم اے ملک گلن، اور نامعلوم شخص نے خوب محنت سے شمارے پر تبصرہ کیا ہے تمام کے تمام مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اس مرتبہ لیٹ کمرز کی طویل لسٹ بھی سرگزشت کی مقبولیت کا ثبوت پیش کررہی تھی۔“

☆نینا قیصرانی، کوٹ نقیران سے لکھتی ہیں ”کسی بھی رسالے میں یہ میرا پہلا خط ہے۔ سرگزشت میرا فیورٹ رسالہ ہے، میرے گھر میں سب شوق سے پڑھتے ہیں۔ میں اپنی فیورٹ بلکہ موسٹ فیورٹ کہانی سراب پڑھتی ہوں۔ دسمبر 2012ء میں تعبیر خواب، پڑھ کر بہت اچھا لگا، شاہد جیسے باہمت لوگ ہی زندگی کا چراغ ہوتے ہیں جو اوروں کو بھی جینا سکھاتے ہیں۔ میں زخم زخم ہوں، پڑھ کر اچھا بھی لگا اور بشریٰ کی خودکشی پر افسوس بھی ہوا۔ بشریٰ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا، بشریٰ بے شک جذباتی تھی کیونکہ یہ عمر جذباتی ہی ہوتی ہے لیکن اس میں ظفر کا کوئی قصور نہیں ہے وہ تو خود اتنی مشکلات سے گزرا ہے۔“

☆اعجاز حسین سٹھار کا اظہار یہ، نور پور تھل سے۔ ”کچھ پرانی روایات بدل رہی ہیں۔ دوست اپنی ذمہ داریوں سے پہلو بچا رہے ہیں۔ کتنا تجسس ہوتا تھا کہ سال بھر کا تجزیہ پیش کیا جائے گا تو کہیں اپنا نام بھی نظر آئے لیکن اب کی بار ایسا کوئی اہتمام دیکھنے کو نہ ملا تو مایوسی ہوئی لیکن ایک دوسری فکر نے گھیر لیا ہے کہ شاید وہ دوست خود کسی پریشانی یا تکلیف میں ہوں۔ ہم کہاں کے سچے اور غم گسار ہیں کہ خبر تک نہیں لی۔ ایسا کریں' آپ ہی کارِ خیر انجام دے ڈالیں۔ احمد خان توحیدی نے معمولی ہی سہی، لیکن تجزیہ کیا ہے، شکریہ قبول کریں۔ ”قابلِ فخر کھلاڑی“ میں ہاشم آملہ کی روداد دل کی آنکھوں سے پڑھی ہے اور واقعی ہمیں بھی فخر ہوا ہے۔ وہ ہنرمند ہیں ساتھ اللہ کی ذات پر کامل یقین رکھتے ہیں ان کی ترقی و کامرانی کے لیے دعا کررہے ہیں کہ مستقبل میں بھی وہ اپنی موجود پرفارمنس برقرار رکھ سکیں۔ ”قلمی الف لیلہ“ سدابہار سلسلہ ہے جس سے ہمیں ہر طرح کی معلومات حاصل ہورہی ہیں۔ ”سراب“ کے ہنگامے ایک جگہ ٹھہر گئے ہیں، جوش و جذبہ قید ہوکر رہ گیا ہے۔ ایک ہی چھت تلے اڑتیس صفحات کے واقعات پھیلا دیے گئے ہیں۔ سچی بات ہے ہم بھی ہلا گلا کے عادی ہوگئے ہیں۔ سچ بیانیوں میں ”انگارا“ ایک دھماکا خیز کہانی ہے جس میں زندگی کی راہیں متعین کرنے کے کئی راستے ہیں لیکن ہم لوگ لکیر کے فقیر ٹھہرے۔ اچھا کام کرنے اور سیدھی راہ اپناتے ہوئے بھی ہچکچاتے اور چور نظروں سے دوسروں کے تاثرات دیکھتے ہیں اصل بات یہ ہے کہ کسی کو کہنے سننے کی بجائے خود کو باعمل بنایا جائے اور شرمندہ کرنے کی بجائے احساسِ ذمہ داری پیدا کیا جائے۔ تبلیغ کے نام پر یرغمال بنانے کی بجائے سوچنے کا موقع دیا جائے۔ جب دل سے احساس جاگے گا تو وہ عمران کی طرح پوری برادری کے سامنے ڈٹ جائے گا۔ یہ الگ موضوع کی کہانی ہے جسے مناسب الفاظ سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس وجہ سے دل میں اتر گئی ہے۔ لکھاری کے علاوہ نوک پلک درست کرنے والے مبارکباد قبول کریں۔ ”حربہ“ میں عذرا کا کردار قابلِ تقلید ہے۔ لڑکیاں عزت گنوا کر خودکشی کرلیتی ہیں یا جلتی کڑھتی رہتی ہیں اور عزت کے لٹیرے آزادی سے پھرتے ہیں۔ جب مرنے کا فیصلہ کرہی لیا ہے تو اس حال تک پہنچانے والے کو تباہ کردو تاکہ یہ زہر بھی ان کے ساتھ ختم ہوجائے یا وہ عبرت کا نشان بن کر جئیں اور دیکھنے والے عبرت پکڑیں۔ ”نروان“ کے واقعات تبصرے اور قیاس آرائی سے بالاتر ہیں۔ راحیلہ کی زندگی سنور گئی۔ آنے والے دنوں میں اسے بھٹک جانا تھا۔ وہ کوئی ایسا نیک کام کربیٹھی تھی کہ نوازدی گئی بس اتنی سی بات تھی۔ ”مماثلت“ کے واقعات میں تسلسل ضرور ہے لیکن جان نہیں ہے۔ ”ہوس“ میں روزی کو جیسے حالات پیش آئے امارات کی ساری ریاستوں میں ایسے واقعات سماعت سے ٹکراتے رہتے ہیں اور اکثر لڑکیاں ہتھیار ڈال دیتی ہیں اور زمانے کا رنگ چڑھ جاتا ہے۔ لیکن شاباش ہے اس پر کہ حیا کو زندہ رکھے ہوئے تھی یہی وجہ ہے کہ رمیز کو انتہائی سزا دی لیکن اب کوئی رکاوٹ راستے میں نہیں ہے تو وہاں سے اڑان بھرنے میں دیر

قارئین کے لیے اہم اعلان

ملک بھر میں ادارے کے ماہنامے مندرجہ ذیل تاریخوں میں دستیاب ہوں گے

* سسپنس ڈائجسٹ: 17 تاریخ
* ماہنامہ پاکیزہ: 24 تاریخ
* ماہنامہ سرگزشت: 28 تاریخ
* جاسوسی ڈائجسٹ: 03 تاریخ

مذکورہ بالا تاریخوں پر پرچے دستیاب نہ ہونے کی صورت میں رابطہ کریں

ثمر عباس: 0301-2454188

www.pdfbooksfree.pk

نہیں لگانی چاہیے تبھی پارسائی کا یقین کیا جاسکتا ہے۔ ''چارا'' جیسے واقعات عام ضرور ہیں لیکن ہتھکنڈے بدلتے رہتے ہیں یہی وجہ ہے سادہ لوح کے علاوہ اچھے بھلے سمجھ دار بابو بھی بے بس ہوجاتے ہیں۔ لوگ تھانے کچہری کے چکروں سے وقت برباد کرنے کی بجائے چپ کرکے گھر بیٹھ جاتے ہیں۔ یوں ایسے لوگوں کا حوصلہ بڑھ جاتا ہے اور وہ دیدہ دلیری سے وارداتیں کرتے ہیں۔ ہمیں خود ہشیار رہنے کے ساتھ ایسے لوگوں کی اصلاح پر توجہ دینا چاہیے تبھی مثبت نتائج حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ ''دماغ پھر جائے گا'' دلچسپ واقعہ ہے جس نے مسکرانے پر مجبور کردیا۔ ''دوہرا معیار'' میں زاہدہ کے بدلتے خیالات سے حیران رہ گیا یہ خودغرضی کی انتہا ہے یوں بھلا برائی، ناپسند رواج اور خود ساختہ رسوم سے کیسے بچا جاسکے گا۔ یہ مجبوریوں کی زنجیر سے بنائے گئے پنجرے کیسے ٹوٹیں گے۔ یہاں انفرادی سوچوں میں تبدیلی کی ضرورت ہے جو پہلا عملی قدم اٹھائے گا وہ غازی کہلائے گا۔ ''کیسا اپنا پن'' میں میڈم ساجدہ اپنی حسرتوں اور محرومیوں کا انتقام اولاد سے لینا چاہتی تھی۔ وہ خاوند، اولاد اور دنیاوی سہولت کے باوجود ناشکرے پن کا مظاہرہ کرتی رہیں اور ذہن کو گندے خیالات کی آماجگاہ بنائے رکھا اسی وجہ سے ادھورے پن کا شکار رہی۔ اس محفل کے تمام دوستوں کو میرا خلوص بھرا اسلام، زندگی ہے تو یہ رونقیں آباد رہیں گی۔''

☆ طاہرہ گلزار کی آمد پشاور سے ''اعجاز حسین سٹھار، ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی، عزیز میرٹھی، رانا محمد شاہد، ایم اے خالق بھٹی، سہیل احمد عباسی، سدرہ بانو ناگوری، احمد خان توحیدی اور کراچی سے نامعلوم قاری نے بڑا اکنامیکل تبصرہ کیا ہے۔ سب سے زیادہ اچھا تبصرہ رانا شاہد اور جاوید سرکانی کا لگا۔ جاوید سرکانی آپ کا لفظ مصالحہ سے کوئی ذاتی لگاؤ لگتا ہے چلو آپ نے بات مان لی کہ میں اور جناب طارق عزیز خان دونوں درست ہیں۔ جاوید نے جیمز بانڈ کے بارے میں خوب لکھا۔ یہ سیریز میں نے دیکھی ہے بلکہ راجر مور تو میرے پسندیدہ اداکار ہیں۔ رانا شاہد صاحب اول تو میرا نام زہرہ گلزار نہیں طاہرہ گلزار ہے۔ دوسری بات آپ کی سچ ہے کہ میں کسی ظالم مرد کا شکار ہوئی ہوں۔ میری زندگی شادی کے نام پر تباہ کردی گئی۔ یہ تو میرے والد کی مہربانی ہے کہ مجھے پڑھایا پھر 19 سال کی عمر میں میرا فیصلہ جاب کرنے کا بالکل صحیح نکلا۔ شکر ہے میں کسی کی محتاج نہیں ہوں لیکن یہ دکھ ساری عمر رہے گا کہ آدم کی حوا کو مانگنے کی سزا ہم عورتیں کب تک بھگتیں گی۔ مجھے تو جو بھی مرد ملا دھوکے باز ہی ملا۔ آپ نے صحیح فرمایا کہ مرد تو باپ، بھائی اور بیٹا بھی ہوتا ہے۔ باپ اور بھائی میرے ساتھ اچھے ہیں۔ کیونکہ میں ان کی بیٹی اور بہن ہوں لیکن وہ اپنی بیوی کے لیے تو باپ اور بھائی نہیں۔ آدم نے تو زندگی کا ساتھی مانگا۔ نہ ماں، نہ باپ نہ بہن اور نہ بیٹی مانگی۔ اس لیے بیوی کی زندگی عذاب ہے۔ کبھی یہ کہہ کر لوٹا جاتا ہے کہ مردوں کو تو اسلام نے چار شادیوں کی اجازت دی ہے۔ جبکہ یہ اجازت صرف اس وقت کے لیے تھی کیونکہ اس وقت مسلمان کم تھے۔ اگر اسلام نے اجازت دی بھی ہے تو اسلام نے بیوہ، طلاق شدہ اور زیادہ عمر والی سے شادی کا کہا ہے۔ مرد ہر لڑکی سے جھوٹ پہ جھوٹ بولتا ہے، خود کو مظلوم ظاہر کرتا ہے اور عورت اپنی ازلی رحم دلی اور محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کے مرد کا یقین کرلیتی ہے اور بعد میں ساری عمر کے لیے روتی ہے۔ پہلے شوہر کے نام پہ میری زندگی جہنم بنی اور پھر محبت کے نام پر جو جھوٹ کا سہارا لیا تھا اس بدذات مرد نے لیکن شکر ہے کہ اللہ نے وقت سے پہلے اس کو میرے سامنے بے نقاب کیا۔ پورے 7 سال اپنی شادی چھپائی مجھ سے۔ رانا صاحب آئندہ مجھ سے مرد اور عورت کا بے جا ذکر مت کرنا میں اور طرح کی عورت ہوں۔ میں انسانیت کی تذلیل کسی طور برداشت نہیں کرتی لیکن مردوں سے سخت نفرت ہے کیونکہ ان سے بڑھ کے کوئی منافق نہیں۔ 100 میں صرف 50 مرد سچے دل سے اپنی بیوی سے محبت کرتے ہیں لیکن افسوس کہ باقی 50 فیصد مرد ایسے بے حس عورتوں کو ملتے ہیں کہ ان بے چاریوں کی زندگی تباہ کردیتے ہیں۔

☆ ابن مقبول جاوید احمد صدیقی کا خلوص نامہ راولپنڈی سے ''ایڈیٹوریل پڑھ کر کئی سنجیدہ باتیں ذہن میں آگئیں۔ یک صفحی پڑھ کر ملک غلام مرتضیٰ کا اور بھی احترام کرنے کو جی چاہا۔ وہ ایک ولی بندے تھے۔ چلیے جی شہر خیال میں اپنے ساتھیوں سے ملتے ہیں۔ اعجاز حسین، سٹھار مسندِ صدارت پر براجمان ہیں ۔ سنجیدہ اور زبردست تبصرے کے ساتھ اتنا اچھا لکھ کر بھی جٹ اور سادہ آدمی ہیں تو بھئی یہ بہترین صفات ہیں ان پر قائم رہیں۔ ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی، شکر ہے میرے نام سے دوگنا لمبا نام بھی پڑھنے کو مل گیا۔ جی آپ نے جیمز بانڈ وغیرہ کے متعلق زبردست معلومات ارسال کی ہیں۔ بہت شکریہ۔ عدنان ذاکر کی معلومات اچھی تھیں مگر ایڈیٹر کا نوٹ بھی ان کو صحیح کرنے میں زبردست تھا۔ رانا محمد شاہد کا خلوص بھرا اور بھرپور طویل تبصرہ سب سے بہترین تھا۔ جی ہاں روبینہ نفیس انصاری صاحبہ آپ کی آمد کا قارئین کو انتظار ہے۔ ضرور آئیں۔ ایڈیٹر کے نوٹ سے خوش خبری مل گئی اب اگلے شمارے کا انتظار رہے گا۔ سہیل احمد عباسی کی خواہش بھی پوری ہوئی۔ سدرہ بانو ناگوری کا بھی تبصرہ خوب تھا اور احمد خان توحیدی سلیس اردو پر توجہ دیں۔ محمد ایاز راہی صاحب کی کتاب کا ذکر خوب تھا۔ ڈاکٹر ایم اے ملک مختصر تبصرہ کے ساتھ آئے مگر خوب آئے۔ اور یہ نامعلوم شخص کراچی کا کون ہے؟ اتنا گرما گرم، غصے سے بھرپور انتہائی بلندی کا تبصرہ پڑھ کر کون کیا کرے گا؟ محض آہ بھر کر رہ جائے گا۔ یہ باتیں سب جانتے ہیں۔ دل کے پھپھولے پھوڑنے کے لیے روزناموں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد کا وحیدِ عصر بے مثال انسان کی بے مثال داستان ہے۔ انتہائی گہرائی لیے شعروں کا خالق ہمارے سامنے پوری زندگی کے لمحے لمحے کی کہانی سناتے ہوئے ہمارے دلوں میں اتر گیا۔ اور پھر طرزِ تحریر بھی اپنی مثال آپ ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ پورا دیوان نہ شائع ہوسکا نہ حفاظت کی گئی، افسوس ہے! قابلِ فخر کھلاڑی، ہاشم آملہ کی داستان اسلام سے پہلے کے معاشرے سے جڑی ہے کہ انتہائی سفاک، ظالم اور تعصب پسند معاشرہ میں جس طریقے سے ہاشم زندہ رہا زندگی گزار رہا ہے اور پھر اسلام کی رسی کو ایمانِ مکمل کے ساتھ تھام کر اس سفید و کالے تفریق کے پل صراط سے کامیابی سے گزرتا رہا۔ لگن، ان تھک محنت اور سب سے بڑی بات ایمان کامل، اللہ پر غیر متزلزل بھروسا ہو تو دنیا کی کوئی طاقت اپنے مقصد و مقصود کو پانے سے نہیں روک سکتی۔ والد کی بہترین نصیحت کو مضبوطی سے پکڑ کر ہاشم آج نیک نامی و شہرت کی بلندی پر پہنچا ہوا ہے۔ کئی عالمی ریکارڈ کا حامل ہے۔ ایک زمانے کا ٹھکرایا ہوا لڑکا محنت اور لگن سے کہ اس کے لیے ایمان کا درجہ رکھتے تھے شہرت کی بلندی پر ہے۔ سمندر کے مکیں تو حیرت انگیز رہی۔ میں تو تمام معلومات کو ایک ہی سانس میں پڑھ گیا۔

تجسس اور تحیر سے بھرپور اس سمندر کے باسیوں کی عادات بھی عجیب و غریب ہیں کہ بچہ پیدا ہوا اور پھر سمندر کے حوالے کردیا۔ اس ماڈرن دنیا میں اپنے بڑوں کے اصولوں اور رواجوں سے جڑے ہوئے یہ لوگ ماورائی دنیا میں رہ رہے ہیں۔ بڑی تفصیلاً معلوماتی کاوش دل میں اتر گئی۔ اس طرح تلاشِ ہند بھی بڑی نئی چیزوں سے بھرپور کہانی تھی۔ سات ملکوں کی معلومات دے کر تو جیسے دنیا کو کوزے میں بند کردیا ہے۔ زبردست معلوماتی کہانی تھی۔ چار گوتیوں نے عالمی شہرت حاصل کی اور ہر ایک کیسے کیسے نامساعد حالات سے لڑتا ہوا ہیرا بنتا چلا گیا۔ یہ گروپ بیٹلز تو گلوبل اہمیت اختیار کرگیا ہے۔ پیار کی آگ تو جہاں بے تحاشا قسم کی معلومات بھی دے گئی وہاں میں بھی تیس سال پیچھے یادوں کے ماضی میں آگیا کہ جب یوسف اور شربانو کی لازوال داستان کے حامل علاقے میں تھا تو اپنے پشتون بھائیوں سے یہ داستان بڑی تفصیل سے سنتا تھا۔ اس کے باوجود بہت سی باتوں کی معلومات اس کہانی سے حاصل ہوئی۔ جلالِ عشق تو جناب ایسی داستان ہے کہ حیاتِ جاوید پاکر یہ لوگ رہتی دنیا تک زندہ رہیں گے۔ عشقِ رسول ﷺ میں کئی ایسے واقعات آئے اور پھر یہ چند ایک لوگ تو امر ہوگئے ۔ عبدالرحمان شہید کی داستان بھی انمٹ رہنے والی ہے۔ سبحان اللہ، ایمان کو تازہ کرگئی، یہ لازوال داستان۔ اب کچھ حالات و واقعات کہ کراچی تو صحیح معنوں میں ختم ہو رہا ہے اور خاک و خون کا گڑھ بن گیا ہے۔ روزانہ 10، 15 افراد ٹارگٹ کلنگ کے نام پر موت کے گھاٹ اتار دیے جاتے ہیں۔ بھتا خوری پر آئے دن تاجر و صنعت کار مظاہرے کررہے ہیں۔ اغوا برائے تاوان کی وارداتیں بڑھ رہی ہیں۔ کارخانے کراچی سے دوسرے شہر میں ہی نہیں دوسرے ممالک میں منتقل بھی ہو رہے ہیں۔ عام آدمی خاص کر خواتین بھی اسی تذبذب کا شکار رہتی ہیں کہ ان کے بچے کل اسکول جاسکیں گے یا نہیں۔ مرد خواتین بخیریت گھر واپس آجائیں یہی شکر ہے۔ ٹرانسپورٹرز کا خوف کہ کہیں اچانک فائرنگ نہ شروع ہوجائے، اصل مسئلہ کراچی کی اونر شپ ہے اسے کوئی اون نہیں کرتا اور لگتا ہے یہ شہر لاوارث ہوچلا ہے۔ روشنیوں کا شہر اندھیروں میں ڈوب رہا ہے۔ مگر یاد رکھو مسلمانو! تم میں سے جو بھی ان تمام وارداتوں اور قتل و غارت میں ملوث ہے اللہ کی لاٹھی بے آواز، کسی لمحے، کسی وقت بھی تم پر قہرِ الٰہی بن کر ٹوٹ پڑے گی۔ سدھر جاؤ!''

☆ ڈاکٹر ایم اے ملک کا گلین وڈ میری لینڈ یو ایس اے کا اظہارِ خیال ''آپ میرے خطوط کو سرگزشت کے قیمتی صفحات میں جگہ دیتے ہیں، جو میرے لیے باعثِ عزت ہے۔ اور اس پر طرہ یہ کہ میری ہی تنقید پر میری ہی رائے مانگ کر مجھے اس افتخار اور فخر کے پہاڑ پر بٹھا دیا ہے۔ جس کا میں غالباً اہل نہیں ہوں۔ بہرحال آپ نے مجھ سے ڈاکٹر ساجد امجد کے مضامین کے فارمیٹ کے بارے میں مشورہ مانگا ہے۔ عرض ہے کہ من آنم کہ من دانم، لیکن آپ کے حکم کی تعمیل سے گریز کرنے کی بھی مجھ میں ہمت نہیں۔ عرض ہے اگر ڈاکٹر صاحب وہی انداز اختیار فرمالیں، جو محترم الیاس سیتاپوری، علی سفیان آفاقی، ابن کبیر، محی الدین نواب، مغل صاحب کا تھا اور ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کے مضامین یکسانیت کا شکار ہوکر اپنی دلچسپی اور افادیت کھو بیٹھیں۔ اگر وہ اپنی تحریری روش مندرجہ بالا مصنفین کی طرز پر اپنالیں تو کوئی وجہ نہیں کہ لوگ پھر سے ان کے مضامین ذوق و شوق سے نہ پڑھیں۔ (آپ کا مشورہ بجا ہے لیکن ہر صاحب تحریر کا اپنا انداز ہوتا ہے اور ڈاکٹر صاحب کا شروع سے ایک جیسا انداز ہے) ابن کبیر کے مضمون سنڈی پر غور فرمائیں۔ انہوں نے ایک عظیم المیہ کو اس طور سے تحریر کیا کہ شروع سے آخر تک اس کی سحر کاری میں گرفتار رہے اور انہوں نے اس المیہ میں ایسی ایسی باتیں اس لطیف پیرائے میں تحریر کیں۔ تو ایسے لوگوں کو بھی ان باتوں کا پتا چل گیا جو خود امریکا کے رہنے والے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریروں میں بوریت اور عدم دلچسپی اس وقت در آتی ہے جب ڈاکٹر صاحب ایک ہی صنف اور سمت اور ایک ہی طرز میں اپنے مضامین تحریر فراتے ہیں، جس سے کہانی کے تسلسل اور روانی میں خلل آجاتا ہے۔ ان سے گزارش کریں کہ ایک تو وہ موضوع عنوانات اور نئے دلچسپ مضامین کو لکھیں، جس میں کہانی کا عنصر زیادہ ہو، تاریخ، پیدائش، وقت، والدین نہ ہو۔ مضمون ہلکا پھلکا اور باربط ہو، تاکہ قاری شروع سے آخر تک اس کے سحر میں گرفتار رہے۔ آپ کی تحریر الفاظ کی الجھاؤ سے بھری ہوتی ہے۔ ایک آدھ صفحہ کے بعد اپنی دلچسپی اور قاری کی توجہ کھودیتی ہے۔ (نسیم حجازی اور دیگر تاریخی کہانیاں، ناولیں لکھنے والے اس طرح لکھتے تھے لیکن سرگزشت نے ابتدا سے ہی سن و دیگر حقائق کو ضروری سمجھا اور اپنی ڈگر الگ بنائی) محترم مدیر صاحب امید ہے کہ آپ میری حقیر رائے پر اگر مناسب سمجھیں تو توجہ دیں۔ ابن کبیر کا ہاشم آملہ کے بارے میں کہانی حسبِ معمول ایک دل افروز تحریر تھی اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ کے ایف سی کے بانی کے بارے میں عائشہ کی ایک بے حد معلوماتی اور گرما گرم تحریر تھی۔ پلے بوائے کے بارے میں کچھ لکھنا گو ضروری نہیں لیکن یہ ایک اچھی کاوش ہے۔ یہ انگریزی جریدہ مغربی ماحول میں ایک خاص طبقہ میں پاپولر ہے۔ حسبِ سابق محترم الطاف شیخ کا سفرنامہ دلچسپی اور نئی معلومات سے مزین کینیا کے بارے میں انکشاف بھی نئی بات تھی۔ فلمی الف لیلہ پر اس مرتبہ پشاور ہی چھایا رہا۔ پڑھ کر بے حد لطف اندوز ہوئے۔

☆ سدرہ بانو ناگوری کا خلوص نامہ ''خوبصورت اور دلکش رنگوں سے سجا سرورق بے حد پسند آیا اعجاز حسین سٹھار ایک مرتبہ پھر صدارت کی کرسی پر فائز نظر آئے۔ مبارک ہو آپ کو اتنا اچھا تبصرہ کرنے پر۔ کراچی کے نامعلوم قاری کا اظہار یہ بھی پسند آیا۔ محترم اپنا نام تو لکھ دیتے۔ مختنی، عائشہ صاحبہ چکن روسٹ کے بانی کا احوال کیا خوب بیان کرتی نظر آئیں کہ دو ہی صفحات میں پوری زندگی کی روداد بیان کرڈالی۔ سراب اس دفعہ جانی پہچانی قسط رہی یوں لگا کہ واقعات دہرائے جارہے ہوں غالباً زرین والی قسط تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ دہرائی گئی سو اس دفعہ قسط سو سو رہی فاضلی نے خوب دھوکا دیا، گویا شوبی کا دار شوبی پر پلٹ دیا۔ مرشد کا کردار اس بار ڈھیلا ڈھالا رہا۔ سیکریٹری اور فاضلی کی نوک جھونک کے دوران مرشد ایک احمق اور بیوقوف سا جاگیردار نظر آیا جو فیصلہ کی قوت سے عاری تھا۔ براہِ کرم ذرا اس کے کردار پر بھی دھیان دیجیے'' ''فلمی الف لیلہ میں آفاقی انکل نے پاکستانی فلمی صنعت اور بھارتی فلمی صنعت کو آسمان پر پہنچا دینے والے فنکاروں پر تبصرہ کیا مگر انکل یہ کیا بات لکھی ہے آپ نے کہ شاہ رخ خان نے قیام پاکستان کے بعد پشاور کا دورہ کیا! کیا شاہ رخ خان قیام پاکستان سے پہلے کے ہیں جبکہ ان کی اتنی عمر تو نہیں ہے (وہ دہلی میں پیدا ہوا۔ اس کے والد پشاور کے تھے) ایک تصویر کے نیچے لکھا ہے پشاور کے 3 خان ایک ہندو 2 مسلمان، راج کپور نے اپنے آپ کو خان نہیں کہا (پرتھوی راج خود کو خان لکھواتا تھا) آپ نے لکھا ہے کہ سیف علی خان کی شادی کم

www.pdfbooksfree.pk

دسمبر کو ہوئی لیکن دعوت نامے کے عکس میں 18 اکتوبر لکھا ہے (دعوت نامہ ویسے کا ہے) شوکت رحمن خٹک بھی تشریف لائے اور انتہائی عرق ریزی سے حاصل کی گئی معلومات ہم تک پہنچائی۔ انہوں نے اپنی طبیعت کے بارے میں نہیں لکھا (بڑھاپا سب سے موذی مرض ہے) سادہ اور آسان لفظوں میں لکھی گئی پہلی سچ بیانی نے بہت متاثر کیا اور پڑھ کر حیرت بھی ہوئی کہ کیا واقعی ایسا دور آ گیا ہے کہ سنتوں پر عمل کرنے والوں کو زندگی انگارا لگنے لگے۔ لوگوں کے طعنے اور طنزیہ نگاہیں صرف اس وجہ سے جینا دشوار کر دیں کہ ہم اپنے رسم و رواج کو توڑ کر خدا کا حکم مان رہے ہیں، ہم نسلی مسلمان تو ہیں مگر اصلی مسلمان شاید ہم میں سے کوئی نہیں ہے۔

☆ رانا فیصل جاوید کی علی پور سے شرکت ”حیرت کی بات ہے کہ بدترین لوڈشیڈنگ اور امن و امان کی دگرگوں کنڈیشنز کے باوجود رسالہ ہمیں بروقت مل رہا ہے۔ یہ ادارے کے تمام ارکان کی مخلصانہ کاوشوں کا ثمر ہے۔ اداریہ میں وطن فروشوں کے سیاہ چہروں سے پردہ اٹھایا گیا۔ میسج کے ذریعے ہونے والے منفی پروپیگنڈے نے نوجوان نسل کو گمراہ کر رکھا ہے۔ نمایاں مدرس میں ڈاکٹر غلام مرتضیٰ کی کامیابیوں کا احاطہ کیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے خوب محنت کی اور عروج حاصل کیا۔ شہرِ خیال میں اعجاز حسین، رانا شاہد، عزیز میرٹھی اور ملک جاوید نے خوب لکھا، باقی خطوط بھی اچھے تھے، کراچی سے نامعلوم قاری کی باتیں درست تھیں لیکن ادارہ تو ان خرافات کے لیے ذمہ دار نہیں۔ وحیدِ عصر میں انتخابِ کلام لاجواب تھا۔ ہاشم آملہ قابلِ فخر کھلاڑی ہیں۔ جو چار سو برائیوں کی دلدل ہونے کے باوجود تقویٰ کا دامن نہیں چھوڑتے۔ چکن روسٹ کے بانی کا احوال پڑھا۔ ویسے ہمارے دیہی علاقوں میں ہری مرچ کی چٹنی اور ساتھ میں پودینے کا تڑکا لگا ہو تو وہی روسٹ چکن ہے بلکہ اس سے بڑھ کے ہے۔ عبدالرحمان شہید جیسے محبانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہر خطے میں موجود ہیں جو عشقِ رسولؐ میں کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کرتے۔ دو صفحات پر مشتمل اس اثر انگیز تحریر نے ایمان تازہ کر دیا۔ سراب پڑھتے ہوئے تو ایسا لگا جیسے وقت ضائع کر رہا ہوں اس کا اختتام ہونا چاہیے۔“

☆ عدنان ذاکر کا ای میل کراچی سے ”فروری کے شمارے کی خاص چیز ڈاکٹر ساجد امجد کا ”وحیدِ عصر“ تھی۔ ڈاکٹر صاحب کا اندازِ تحریری اتنا دلچسپ ہے کہ پڑھنے کا لطف آ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ طارق عزیز کی تلاشِ ہند بھی اچھی تھی مبارک باد (طارق عزیز اردو میں سمندری سفر پر لکھنے والے اکلوتے لکھاری ہیں۔ مبارک باد ان سطور سے پہنچ گئی) افریقا او افریقا کا دوسرا حصہ لاجواب تھا۔ الطاف شیخ صاحب سے میری ملاقات اسلام آباد میں ہوئی تھی۔ بہت محبت سے باتیں کرتے ہیں۔ نوجوانوں کی حوصلہ افزائی بھی بہت کرتے ہیں۔ ہو سکے تو ابن عنقا یعنی افتخار خان کے سفر ناموں کو پھر سے شمارے کی زینت بنائیں۔“

☆ فہیم صدیقی کا ای میل ”ہماری فلمیں صرف رومانس پیش کر رہی ہیں جبکہ باقی لوگوں نے آرٹ ڈرامے، فلمیں بنا کر اپنا اور اپنے ملک کا نام روشن کیا ہے۔ جیسے بھارت کی دو بیگھا زمین، مدر انڈیا، ایسی فلمیں انٹرٹیننگ تو نہیں ہوتیں لیکن معاشرے کی اصلاح میں مددگار ہوتی ہیں۔ آفاقی صاحب کی خدمت کو میں بیان نہیں کر سکتا بس ان سے میری گزارش ہے کہ وہ پاکستانی فلمیں جنہیں ناقدین نے پسند کیا چاہے عوام نے ناپسند کیا ہو ان کی لسٹ تیار کر دیں، ان کی محنت اور قابلیت کو سامنے لائیں۔“

☆ طاہر الدین بیگ میرپور خاص سے رقمطراز ہیں ”فلمی الف لیلہ سے شروع کرتے ہیں، آفاقی صاحب نے سرحدوں کے خانوں کے لیے خوب لکھا پھر بھولے بسرے فنکاروں کا ذکر بھی کافی شاندار رہا۔ شاعر غزنوی صاحب کے بارے میں پڑھا ہندوستان میں ان جیسے بہت سے لوگوں نے بڑا خوبصورت کام کیا غزنوی صاحب پاکستان آ کر عطاء اللہ ہاشمی سے وابستہ ہوئے مگر بھارت کی طرح یہاں کوئی کام نہیں کیا۔ ان حضرات نے مسلسل بھارتی کہانیوں کی لفظ بہ لفظ نقالی کی۔ ضیا سرحدی صاحب نے بھی کوئی تیر نہیں مارا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہاں آ کر ان کی فنی صلاحیتیں زنگ آلود ہو چکی تھیں آفاقی صاحب، باغی کی کہانی عرش لکھنوی مرحوم اور انسان کے ہدایت کار قدیر غوری صاحب تھے۔ اس دفعہ سچ بیتیاں معاشرتی اور سبق آموز تھیں۔ پہلی کہانی انگارا، حربہ اور کیسا اپنا پن کافی جاندار کہانی تھی، یوسف خان شیر بانو پر بھی کافی خوبصورت انداز میں لکھا گیا مگر یہ تو اٹل ہے کہ یوسف خان شیر بانو سرحد کے رومانوی کردار تھے ان کی اموات اور کچھ واقعات کا تذکرہ متضاد رہا۔ وحیدِ عصر ڈاکٹر صاحب کی معلوماتی تحریر کافی جانفشانی سے لکھی گئی۔ اس طرح ہاشم آملہ پر بھی بہت پُرکشش انداز میں لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔ بلاشبہ ساؤتھ افریقا کا یہ کرکٹ کا شہسوار مسلمان قوم کے لیے ایک قابلِ فخر اور قابلِ ستائش ہے، محنتی کو ہی دیکھ لیں ایک ہمت والے نوجوان کی داستان ہے بالینڈ جس کا نام مختصر مگر عائشہ صاحبہ نے سمندر کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ شہرِ خیال میں ستار صاحب اپنے خوبصورت تبصرہ کے ساتھ پہلے نمبر پر آئے۔ عزیز میرٹھی صاحب (مشہور کہانی نویس) نے کچھ واقعات کی درستگی کی ہے میرٹھی صاحب یہ عرض کر دیں کہ آپ کی لکھی ہوئی کہانی میں نہ یہ چاند ہوگا نہ تارے رہیں گے، یہ گانا بھارتی فلم سے لفظ بہ لفظ نقل کیا گیا ہے۔ آخر اس کی ضرورت کیوں ہوئی؟“

☆ ڈاکٹر ایم آرائی کا خلوص نامہ ریاض، سعودی عربیہ سے ”دسمبر کے شمارے میں اداریتی کالم کا آپ نے اختتام واصف صاحب کے عمدہ اور بامعنی شعر سے کیا۔ دورِ جہالت میں ایسا بہت کم ہوتا تھا لیکن موجودہ دور کا راہی جو رہزن بن گیا ہے وہ شجر کا سایہ بھی لوٹ گیا ہے۔ جنوری کے شمارے میں سرگزشت علمی ذوق کی دلیل ہے لیکن غالباً سہواً، رحمانیت کو شیطانیت کا مجموعۂ تضادات میں ذکر کر دیا گیا۔ رحمانیت اقوام و فعل میں صرف رحمان عظیم کی ذاتِ اعلیٰ سے ہی منسوب و مرجوع ہو سکتی ہے۔ رحمانی جلال و عظمت کے نوری دائرہ (ہالۂ نور) کے ادنیٰ سی جھلک بھی طاغوتی قوتوں کی رسائی تک ممکن نہیں۔ محمد ایاز راہی اور الطاف شیخ نے ”ترک“ اور افریقا او افریقا، میں معلوماتی، ستائشی، مفید اور دلچسپ و علمی عکس بندی کی ہے۔ دونوں حضرات مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب نے ڈپٹی نذیر پر خوب تحقیقاتی مضمون قلمبند فرمایا، جو ان کی علمی جستجو کی بخوبی دلالت کرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا فرمانا کہ جو بھٹکے ہوئے

ذہنوں کو صحیح منزل کا پتا دے اسے بلاشبہ وقت کا معلم کہا جا سکتا ہے لیکن منزل بھی تو بامعنی اور حق کی علمبردار ہو اور معلم بھی متحد ہو جو قول و فعل کی حقیقت کا ترجمان ہو۔ پھر خود ڈپٹی صاحب بذاتِ خود عربی کے عالم اور قرآن کے حافظ ہو کر بھی تصوف کے فلسفہ کی جستجو اور رموز و اسرار میں سرگرداں تھے حالانکہ قرآن کریم اور نہ ہی معلم اعلیٰ نے تصوف کو بامعنی اور بامقصد وقعت قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ نے زمین و افلاک کے سب حقائق و راز بیان کر دیے۔ پھر ایسی جستجو چہ معنی؟ نبی علیہ السلام نے متعدد بار فرمایا کہ میں اپنے پیچھے کتاب اللہ اور اپنی عترت چھوڑے جا رہا ہوں اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رکھنا ورنہ طاغوتی اور شیطانی قوتیں سوکھے پتوں کی طرح بکھیر دیں گی۔ کیا محترم ڈاکٹر صاحب اس مضمون میں ظاہر یا مبہم نقاطِ منطق یا روشن دلائل کی نشاندہی کرنا پسند فرمائیں گے؟“

(ڈاکٹر صاحب صرف احوالِ شخصیت لکھتے ہیں، تبصرہ و تنقید سے گریز کرنا بھی ضروری ہے کہ سرگزشت عوامی پرچہ ہے)۔

☆ محمد عمران جونانی نے کراچی سے لکھا ہے ”سرگزشت کا بہت پرانا قاری نہیں ہوں مگر مختصر وقت میں جس طرح اس شمارے نے دل میں گھر کیا ہے اس کی مثال ذرا مشکل سے ملے گی۔ یہ میرا پہلا خط ہے چنانچہ آپ لوگوں کے لیے میرا نام نیا ہے۔ معراج صاحب نے ٹھیک کہا کہ موبائل فون پر ایس ایم ایس کے ذریعے جس کے دل میں جو آتا ہے لکھ کر بھیج دیتا ہے اور عام طور پر ہم بلا سوچے سمجھے اسے فارورڈ کر دیتے ہیں جس کا خمیازہ پوری قوم بھگتتی ہے۔ یک صفحی سرگزشت میں ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ کا احوال پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ مرحوم و مغفور کے دل کا اخلاص اور نیت کی پاکیزگی نمایاں تھی۔ شہرِ خیال میں اعجاز حسین ستار کرسی صدارت پر جلوہ افروز تھے۔ اپنے جامع تبصرہ کے ساتھ۔ رانا محمد شاہد صاحب آپ کا اندازِ تحریر مجھے بہت پسند ہے اسی طرح تفصیل سے لکھتے رہیں۔ اس کے علاوہ ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی، عزیز میرٹھی اور سدرہ بانو کے تبصرے بھی جاندار تھے۔ ایم اے خالق بھٹی صاحب آپ نے جس برفیلی سردی کا ذکر کیا ہے اس سے ہم کراچی والے ذرا کم ہی واقف ہیں یہاں درجہ حرارت 10 کے قریب بھی ہو تو تھر تھر ہو جاتا ہے۔ وحید الہ آبادی سے ڈاکٹر ساجد امجد نے اپنے خاص انداز میں ملوایا۔ دین و دنیا کا امتزاج تھی جناب کی شخصیت، یہ واقعی بڑی بات ہے کہ استاد اپنے شاگرد کے نام سے جانا جائے، کلام کے انتخاب نے دل چھو لیا۔ ابن کبیر کا خاص شکریہ، ہاشم آملہ سے ملنے کی عرصے سے خواہش تھی سچ ہے لگن سچی ہو تو کامیابی قدم چومتی ہے۔ کے ایف سی بابا جی کا تذکرہ نوجوانوں کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ لگن، مستقل مزاجی اور انتھک محنت نے انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ الطاف صاحب گھر بیٹھے دنیا کی سیر کروا دیتے ہیں، جس طرح ہلکے پھلکے انداز میں معلومات دیتے ہوئے قاری کو ساتھ لے کر چلتے ہیں وہ ان کا خاصہ ہے ویسے سچ ہے اس رات الطاف صاحب کو نئی زندگی ملی ورنہ اس ”گوریلے“ نے تو کسر نہیں اٹھائی تھی۔ میں نے سرگزشت ایک دوست کے کہنے پر فلمی الف لیلہ کی وجہ سے ہی شروع کی تھی اور آج بھی میرا سب سے پسندیدہ سلسلہ ہے۔ آفاقی صاحب نے اس مرتبہ پشاور کے ہنر مندوں سے اپنے رواں انداز میں روشناس کروایا۔ آپ کی تحریر میں جادو ہے۔ روانی سے خط لکھنا، تبصرہ کرنا ہر کسی کا کام نہیں، دوستوں کو شہرِ خیال میں دیکھ کر مجھے بھی محفل میں شریک ہونے کا شوق اٹھا ہے۔ امید ہے لکھتا رہوں گا تو سیکھ جاؤں گا۔“

☆ رانا محمد شاہد بورے والا سے لکھتے ہیں ”فروری کا شمارہ سبز چنری اوڑھے حسین دوشیزہ کے ساتھ ملا۔ اداریہ ایک تلخ حقیقت پر مبنی تھا۔ ہمارے ہاں کسی بھی ایجاد کا مثبت سے زیادہ منفی استعمال ہوتا ہے۔ کمپیوٹر ہو یا موبائل، اس میں کافی حد تک ذمہ دار حکومت بھی ہے جو ایسے اقدامات نہیں کرتی کہ جس سے انفرادی سطح پر اس سلسلے کی حوصلہ شکنی ہو۔ ہم جانتے ہیں کہ ہماری نوجوان نسل کمپیوٹر و انٹرنیٹ اور موبائل کا مثبت سے زیادہ منفی استعمال کرتی ہے۔ اسکول کے طالب علم ہوں یا کالج کے، ان کا زیادہ وقت چیٹنگ پر گزرتا ہے۔ ہمارے وزیر صاحب تو یہ کہہ کر جان چھڑا لیتے ہیں کہ ”آپ کے ہاتھ میں چھری دے دی جائے تو آپ سیب بھی کاٹ سکتے ہیں اور کسی کا گلا بھی“ مگر شاید وہ ایسے اقدامات نہیں کرنا چاہتے کہ جس سے ان سائٹ کا مکمل طور پر خاتمہ ہو اور جس سے ٹیکنالوجی کے منفی استعمال کی حوصلہ شکنی ہو۔ یک صفحی سرگزشت میں معروف علمی و مذہبی شخصیت ڈاکٹر غلام مرتضیٰ ملک کے بارے میں معلومات پڑھنے کو ملیں۔ ڈاکٹر صاحب کا ٹیلی ویژن پر اسلامی پروگرام ”ضابطۂ حیات“ آج بھی ذہنوں میں محفوظ ہے۔ ان کے بات کرنے کا انداز یعنی دھیما پن سننے والے کو فوراً متوجہ کر لیتا تھا۔ اعجاز حسین ستار کی بات بالکل صحیح ہے کہ معاشرے مل جل کر اجتماعی مفادات کو سامنے رکھ کر چلتے اور قائم رہتے ہیں۔ وہ معاشرے جہاں کے لوگ صرف اپنے اپنے مفادات کے لیے زندہ ہوں، وہاں بے حسی ڈیرے جمالیتی ہے اور یہ بات معاشرے و ملک کو تنزلی کی طرف لے جاتی ہے۔ سہیل احمد عباسی! یہ سچ ہے کہ سیاست میں موجود منافقت اور بے ایمانی نے اسے اتنا گندا کر دیا ہے کہ لوگ اب اس پر بات کرنا بھی مناسب نہیں سمجھتے۔ کوشش کیجیے گا کہ اس دفعہ ووٹ کا صحیح استعمال ہو۔ اردو کے ایک بڑے شاعر وحید الہ آبادی پر ڈاکٹر امجد صاحب نے دلچسپ مضمون تحریر کیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب بہت سے گمنام (ہمارے لیے) مشاہیر سے متعارف کروا رہے ہیں۔ ایک شاعر و نثر نگار کے لیے اس کا کلام، اس کی اولاد کی طرح ہوتا ہے۔ یہ پڑھ کر دکھ ہوا کہ اتنے بڑے شاعر کا کلام اور کتب خانہ سب تتر بتر ہو گیا۔ علم سے محبت کرنے والوں کے لیے کتب کی بہت زیادہ اہمیت ہے ورنہ تو کھانا پینا ہی زندگی ہوتا ہے کہ اس پر تو روزانہ 5 ہزار بھی خرچ کر دیے جائیں تو کم ہے ہاں کتاب 300 کی بھی مہنگی لگتی ہے۔ کرکٹ کی تاریخ کے ایک بڑے بلے باز ہاشم محمد آملہ کی زندگی کا احوال ابن کبیر نے بڑے دلچسپ پیرائے میں بیان کیا۔ ہاشم آملہ نے ڈین جونز کے متعصبانہ رویے کے حوالے سے جو واقعہ بیان کیا، اس کے بعد تو ان لوگوں کو اپنے گریبانوں میں بھی جھانکنے کی ضرورت ہوگی جو مسلمانوں کو دہشت گرد سمجھتے ہیں۔ ہاشم آملہ نے شراب تیار کرنے والی کمپنیوں کے لوگو کا استعمال نہ کر کے نہ صرف اپنا بلکہ ساری مسلم دنیا کا سر فخر سے بلند کر دیا۔ ہاشم آملہ تم پر تمہارے بڑے بھائی کو ہی نہیں ہم سب مسلمانوں کو فخر ہے۔ عائشہ جونیجو کی تحریر محنتی، یہ پیغام دیتی نظر آئی کہ محنت اور کوشش سے انسان اپنا نام ضرور پیدا کرتا ہے۔ کے ایف سی کا نام تو اکثر جگہوں پر پڑھا تھا۔ اب اس نام کی حقیقت بھی جان گئے۔“

☆ محمد ارسلان اکبر رند کی خضدار سے تشریف آوری ”سب سے پہلے تمام قارئین کو میری طرف سے سلام۔ معراج صاحب، آپ ایک پاکستانی شہری ہونے کے ناتے اپنا بہترین کردار ادا کر رہے ہیں۔ پاکستان کے مسائل اجاگر کرتے ہیں۔ پاکستان کے سیاستدانوں کو لوٹ کھسوٹ کے علاوہ کوئی کام

www.pdfbooksfree.pk

نہیں ہے۔ان کے پاس عوامی مسائل کا حل نہیں ہے۔اس بار الیکشن میں نئے چہرے آزما کر دیکھنا چاہیے۔سرگزشت ایک سستی تفریح ہے، پڑھائی کے بعد فارغ اوقات میں سرگزشت کا مطالعہ بہترین لگتا ہے۔زیادہ تر کہانیاں سچ پر مبنی ہوتی ہیں۔میری آپ سے گزارش ہے کہ آپ نواب محمد اکبر خان بگٹی کی داستانِ حیات شائع کریں۔جن لوگوں کو نواب بگٹی کے بارے میں نہیں پتا تو ان کو پتا لگ جائے گا کہ پاکستان کے حق میں انہوں نے کتنا کام کیا تھا۔سرگزشت کے ذریعے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔لوگوں کے حالات وواقعات بھی پڑھنے کو ملتے ہیں۔سچ پوچھیں تو سرگزشت کو آل راؤنڈر کی حیثیت حاصل ہے۔اس بار میرا نام شہرِ خیال میں شامل تھا مگر تاخیر سے موصول ہونے والے خطوط میں۔کیا یہ خطوط بعد میں شائع کیے جاتے ہیں یا ردّی کی ٹوکری کا حصہ بن جاتے ہیں؟(تاخیر سے موصول خطوط تلف کر دیے جاتے ہیں)''

☆ شاہد جہانگیر شاہد کا پشاور سے مکتوب ''ماہنامہ سرگزشت اپنی پہلی اشاعت سے لے کر اب تک زیرِ مطالعہ ہے اور آیندہ بھی رہے گا۔ کئی بار شہرِ خیال کے دروازے پر دستک دی لیکن اِذنِ بازیابی نہ پاسکا۔ایک بار پھر کوشش کرتے ہیں امید ہے کہ شہرِ خیال کے مکین اس بار اپنی محفل میں شریک ہونے کا ضرور موقع دیں گے۔اداریہ حسبِ معمول اس بار بھی ایک سلگتے ہوئے موضوع کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔اللہ ہم پر اور ہمارے پیارے پاکستان پر اپنا رحم کرے آمین! ڈاکٹر ساجد امجد صاحب نے ایک بار پھر میدان مار لیا ہے۔وہ حق رکھتے ہیں کہ سرگزشت جیسے معیاری جریدے کے اولین صفحات پر انہی کی تحریر د تحقیق کو جگہ دی جائے۔کرکٹ کے عالمی شہرت یافتہ ساؤتھ افریقین مسلم کھلاڑی ہاشم آملہ کی خوبصورت خودنوشت پڑھ کر ایمان تازہ ہوگیا۔کے ایف سی کے بانی د ما لک کی انتھک محنت اور کامیابی دیکھ کر واقعی یہ کہاوت سچ لگتی ہے کہ محنت میں عظمت ہے۔ اور اب پلے بوائے، اف بس رہنے دیجیے نام بدنام تو ویسے بھی ہے ایسے بھی سہی۔چار گوتیوں بیٹلو، کا شور شرابے سے بھرپور میوزک، سچ تو یہ ہے کہ نہ تو کل ہمیں پسند تھا اور نہ ہی آج، ہمیں تو بس دھیمے اور مدھر سُروں اور شائستہ شاعری سے مزین گیت اور ان کا میوزک ہی پسند ہے۔صوبہ سرحد (خیبر پختون خواہ) کی مشہور لوک پشتو رومانی داستان جو کہ زمانہ قدیم میں گویے اور داستان گو حضرات ہی محفلوں میں سنایا کرتے تھے اس سے پہلے مشہور پشتو شاعر وادیب علی حیدر جوشی صاحب نے اسے تحریری شکل میں اور بعدازاں پشتو کی پہلی فلم یوسف خان شیر بانو، کے لیے لکھا گیا۔خاص بات یہ تھی کہ اس کے پہلے منظر میں خود محترم علی حیدر جوشی صاحب نے پردہ فلم پر نمودار ہو کر اپنا اور پشتو کی پہلی فلم کا تعارف کروایا تھا۔غالباً ایسا پہلی بار ہوا تھا۔پشتو کی پہلی فلم کے ہدایت کار عزیز تبسم تھے جو کہ پاکستان فلم انڈسٹری کے مشہور ڈائریکٹر پرویز ملک کے اسسٹنٹ تھے۔بدر منیر اور فلم کا دیگر تمام تکنیکی عملہ بھی وحید مراد مرحوم کے فلمی ادارے فلمز آرٹس، ہی سے وابستہ تھا۔یہ تمام افراد اپنے اپنے شعبے میں معاونین کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔پشتو کی پہلی فلم کے بنانے میں ان سب نے دن رات محنت کی اور اللہ نے ان کی محنت کو ضائع نہیں کیا۔یوسف خان شیر بانو پشتو کی پہلی فلم کی حیثیت سے سپرہٹ ثابت ہوئی۔اور بدر منیر دیا سمین خان مرحومین دونوں ہی اس فلم کی کامیابی کی وجہ سے پشتو فلموں کے پہلے سپر اسٹارز کی حیثیت سے ایک طویل عرصہ تک پشتو فلم انڈسٹری پر چھائے رہے۔کافی عرصہ بعد تک بھی لوگ انہیں ان کے اصل ناموں کی بجائے یوسف خان' شیر بانو کے ناموں سے ہی پکارتے رہے۔پیار کی آگ کے نام سے ذوالفقار ارشد گیلانی صاحب نے اسے تاریخی سیاق وسباق کے حوالوں اور مقامی کلچر کے لحاظ سے بہترین انداز میں اردو کا جامہ پہنایا ہے۔کاشف زبیر صاحب معلوم ہوتا ہے کہ کچھ تھک سے گئے ہیں سراب کی پوری قسط شہباز ملک نے ایک کھنڈر میں سوتے جاگتے ہی گزار دی۔کوئی ہنگامہ برپا نہ کیا جو کہ خون گرانے کا بہانہ بنتا۔ٹائٹل اسٹوری انگارا واقعی ایک سبق آموز کہانی ہے۔کاش کہ ہمارے ملک کے بھی نوجوان عمران کی طرح ہو جائیں تو غریب گھرانوں کی لاکھوں بیٹیاں...... بڑھاپے کی دہلیز تک پہنچنے سے قبل ہی پیا کے گھروں کو پیاری ہو جائیں، آمین! آخر میں ذکر کرتے ہیں استادِ گرامی محترم علی سفیان آفاقی صاحب کی فلمی الف لیلہ کا، عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ان کی تحریر مزید جوان ہوتی جا رہی ہے (اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ) اس بار تو انہوں نے حد ہی کر دی کہ ایک ہی قسط میں میرے شہر پشاور سے تعلق رکھنے والے بھی بڑے فنکاروں کے بارے میں مفصل مضمون لکھ ڈالا اور ہم جیسے چھوٹے موٹے لکھاریوں کے لیے کچھ بھی باقی نہیں چھوڑا۔رہی سہی کسر برادرم شوکت رحمان خٹک نے پریم ناتھ پشاوری کے بارے میں خط لکھ کر پوری کر دی۔آفاقی صاحب کو اگر فلم انڈسٹری کا آخری مغل کہیں تو بے جانہ ہوگا۔وہ پاکستان فلم انڈسٹری کے عروج وزوال کی داستان تو تفصیل سے لکھ چکے ہیں اب صرف فلم انڈسٹری کا نوحہ لکھنا باقی ہے کیونکہ اب تو صرف لٹی ہوئی محفلوں کی راکھ ہی باقی ہے۔''

☆ مہوش رفیق کا تبصرہ کراچی سے ''پیپرز کی وجہ سے معروف تھی اس لیے غیر حاضر تھی کچھ ملکی حالات پر اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتی ہوں۔ کراچی کے حالات دیکھ کر دل بوجھل ہے، شاید سرگزشت سے شیئر کر کے بوجھ ہلکا ہو جائے۔دسمبر میں میرے بی اے فائنل کے پیپرز تھے تین پیپرز خیر وعافیت کے ساتھ ہو گئے مگر چوتھے پیپر میں جو کہ 15 دسمبر کو تھا' اچانک کراچی کے حالات خراب ہوئے اور پیپر کینسل ہوگیا۔جبکہ صبح کے ٹائم بی ایس سی فائنل کا پیپر ہوگیا تھا۔میرا سارا اشیڈول خراب ہوگیا۔کیونکہ مجھے بہت ضروری کام کے سلسلے میں اسلام آباد جانا تھا۔19 دسمبر کو میں اسلام آباد کے لیے روانہ ہوگئی۔20 دسمبر کو وہاں پہنچ گئی شام میں دوست کا میسج آ گیا کہ 15 دسمبر والا پیپر 23 دسمبر کو ہے۔اف میری جو حالت وہ بیان سے باہر ہے۔میرے لیے واپسی ناممکن تھی۔بات بتانے کا مقصد صرف اتنا سا ہے کہ میرا پورا سال برباد ہو گیا مجھے ایک پیپر کے لیے پورے سال انتظار کرنا پڑے گا۔اس کا ذمے دار کون ہے؟ اور ستم یہ ہوا کہ 23 دسمبر کو اتوار تھا بہت سے طلبہ غیر حاضر تھے کیونکہ کہیں بھی اعلان نہیں کیا گیا کہ 23 کو پیپر ہے۔ ویسے بھی کراچی تو اب اللہ کے آسرے پر ہے حکومت کچھ نہیں کر سکتی۔پولیس بے بس ہے بلکہ عوام تو عوام اب تو پولیس سی آئی، ڈی کوئی بھی محفوظ نہیں ہے۔اللہ تعالیٰ رحم فرمائے کراچی پر۔میں نے دو تین فرمائشیں کی تھیں جو ابھی تک پوری نہیں ہوئیں۔پلیز پوری کر دیں۔احمد یار خان، ملک صفدر حیات، محبوب عالم کی کوئی ایک کہانی (یہ سسپنس کے لیے لکھتے ہیں، زیادہ لکھ نہیں سکتے) جنوری کے پرچے میں اداریہ پڑھا۔واقعی پاکستان کے دہشت گرد آنے والی نسلوں کو پولیو زدہ دیکھنا چاہتے ہیں۔کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں دوسرے ممالک کے سامنے کہ پاکستان کا مطلب صرف اور صرف دہشت گردی، مہنگائی، ٹارگٹ کلنگ ہے۔ہمارے ملک کو اس ٹائم سرسید احمد خان، علامہ اقبال، قائداعظم، لیاقت علی خان جیسے لیڈروں کی ضرورت ہے جنہوں نے سوئی ہوئی قوموں کو بیدار کیا تھا۔اب آتے ہیں فروری کے پرچے کی طرف۔29 جنوری کو ہی پرچہ مل گیا تھا۔اس لیے جلدی جلدی پڑھنا شروع کر دیا کہ کہیں پھر شہرِ خیال سے غیر حاضر نہ ہو جاؤں۔ سب سے پہلے اداریہ پڑھا واقعی وطنِ عزیز پر بہت برا وقت آن پڑا ہے۔ٹی وی کھولو تو دل اداس ہو جاتا ہے ہر جگہ دہشت گردی، بم بلاسٹ، لوٹ مار، خیر یہ تو سچ ہے کہ موبائل اس وقت کی اہم ضرورت ہے۔ مجھے ایک بات بتائیں خاص موقع پر موبائل سروس بند ہوتی ہے کہ دہشت گردی کا خطرہ ہوتا ہے تو کیا عام دنوں میں کم دہشت گردی ہو رہی ہے۔موبائل سروس بند ہونے سے بھی عوام کو پریشانی ہوتی ہے۔کوئی بھی محفوظ نہیں ہے خواتین بچے مرد۔موبائلوں پر دن بھر غلط سلط میسج آتے ہیں لیکن حکومت خاموش ہے کوئی ایکشن نہیں لیتا کیونکہ یہ پاکستان ہے سب خاموش ہیں سب چلتا ہے یہاں۔انڈیا کی مثال کہ لڑکی نے ایک دہشت گرد کو ڈانٹا کہا تو اسے گرفتار کر لیا۔کاش ہماری سوئی ہوئی حکومت بھی بیدار ہو جائے تو دہشت گردوں کو کیفرِ کردار تک پہنچا دے۔اپنے شہرِ خیال کے باسیوں کو السلام وعلیکم، اعجاز حسین سے شار صاحب کو کرسیِ صدارت مبارک، ویسے شاید یہ کرسی ہمیں نصیب نہ ہو کیونکہ ہم تو تبصرہ کے فن سے نا آشنا ہیں۔اعجاز حسین صاحب ہمیں بھی تھوڑا سا تبصرہ کرنا سکھا دیں۔ہم آپ کے خیالات سے سو فیصد متفق ہیں۔اللہ تعالیٰ پاکستان پر اپنا خاص کرم فرمائے آمین! تبصرہ دلچسپ تھا۔سدرہ بانو نا گوری لگتا ہے آپ کو میرا تبصرہ پسند نہیں آتا۔کبھی بھی پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا۔باقی سب کے تبصرے بھی دلچسپ لگے۔ محنت میں عائشہ جو نجو کی معلومات کافی بہترین لگیں واقعی محنت میں عظمت ہے، فلمی الف لیلہ آفاقی انکل آپ کو داد دینی پڑے گی اتنی ہسٹری آپ کو کیسے یاد ہے پاکستانی اداکاروں اور ہندوستانی ستاروں کی مکمل ہسٹری، ہماری معلومات میں اضافہ ہوا۔پشاور تاریخی مقام بلکہ شہر ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے ستاروں کو جنم دینے کا بھی شہر ہے۔

☆ ڈاکٹر روبینہ نفیس ثاقب انصاری کا خلوص نامہ بھکر سے ''فروری کا سرگزشت بہت لیٹ ملا، ہر بار ایسا ہی ہوتا ہے اور پھر لکھنے کی تاریخ نکل جاتی ہے جس کی وجہ سے میں ایک آہ بھر کر رہ جاتی ہوں۔اس بار تو مصمم ارادہ کیا اور لکھنے بیٹھ گئی۔سرورق پر جلتی موم بتی نے کچھ امیدوں کو حقیقت کا تصور دیا ورنہ تو پاکستان کے موجودہ حالات دیکھ کر دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔یہ چند سال پہلے والا پاکستان تو نہیں ہے۔ہر طرف قیامت کا منظر ہے پر کیا کیا جائے کہ قصور تو ہمارا ہے کیونکہ ووٹ دیتے وقت ہم ہوش سے نہیں جوش سے کام لیتے ہیں۔بے نظیر کی وفات پر عوام اتنے جوش میں آ گئی کہ اپنا اچھے برے کا احساس ہی ختم ہوگیا۔جب ہوش آیا تو سر سے پانی گزر چکا تھا۔اب کیا کر سکتے ہیں سوائے صبر اور دعا کے۔اللہ پاک ہر پاکستانی کو حفظ وامان میں رکھے اور ہمیں نیک اور ایماندار حکمراں عطا فرمائے۔تاکہ ہم بھی سر اٹھا کر دنیا کے سامنے کہہ سکیں کہ ہم پاکستانی ہیں۔شہرِ خیال میں کچھ نئے چہرے نظر آئے شہرِ خیال میں پہلے جیسی بات نہیں صرف کہانیوں پر تبصرہ اور بس۔وہ بھی دن تھے کہ جب سب ایک دوسرے کی خبر رکھا کرتے تھے۔اپنی خوشی اور غمی شہرِ خیال کے توسط سے آگاہ کرتے تھے۔اب تو سب اپنی اپنی بولیاں بولتے ہیں اور اللہ اللہ خیر سلا۔سہیل احمد عباسی، کہانی پڑھنے کی اتنی جلدی کیوں میں نے کہانی بھیج دی ہے۔جلد ہی لگ جائے گی۔پڑھ کر بتائیے گا ضرور کہ کہانی کیسی لگی۔حوصلہ افزائی ہوئی تو ان شاء اللہ وقتاً فوقتاً سے کہانیاں لکھتی رہوں گی۔رانا محمد شاہد کوئی بات نہیں چھوٹا موٹا احسان ہم کرتے رہتے ہیں۔ایم اے خالد تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ کراچی کے نامعلوم قاری کی باتیں دل کو لگیں سوائے اس کے کہ انہوں نے اپنا نام نہیں لکھا۔جناب ایسی بھی کیا پردے داری۔اس بار کراچی سے چاند نظر نہیں آیا۔ارے بھائی میں چاند کی بات کر رہی ہوں۔سچ بیانیوں میں انگارا نے بہت متاثر کیا۔حیرت ہوتی ہے کہ شارق اور عمران جیسے نوجوان آج بھی اس خود غرض مطلبی دنیا میں موجود ہیں۔واقعی ہم لوگ شادیوں پر فضول کی رسموں پر بے انتہا پیسا خرچ کرتے ہیں اپنے دل کی تسکین کو مگر لوگوں کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ ہمارے پاس بھی فالتو پیسا بہت ہے۔لوگ وقتی طور پر واہ واہ کر کے چلے جاتے ہیں پھر یہی لوگ پیٹھ پیچھے ان رسومات کی برائیاں کرتے ہیں، عمران شارق نے سنتِ رسول پر عمل کر کے ثابت کر دیا کہ آج اس ماڈرن دور میں مشکلات کا سامنا کرنا کوئی بڑی بات نہیں، اللہ پاک نے انہیں خوشیوں سے نوازا، بے شک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو کبھی تنہا نہیں چھوڑتا۔محمد سلیم اختر کی تحریر کردہ ہوس، پڑھی تو دل دماغ سکتے میں آ گیا اسپتالوں میں یہ سب بھی ہو رہا ہے۔طاقتور لوگ کب تک کمزوروں کی بے بسی کا فائدہ اٹھاتے رہیں گے سونے پر سہاگا کہ روزی کے والدین نے اپنی ہوس کا نشانہ اپنی بیٹی کو بنایا۔کیا ماں باپ بھی ہوس میں اندھے ہو جاتے ہیں کہ حلال حرام کی تمیز کھو بیٹھتے ہیں۔لعنت ہے ایسے والدین پر جن کے لیے اولاد سے بڑھ کر پیسا ہوتا ہے۔رمیز نے روزی کو اپنی محبت کے جال میں اس چالاکی سے پھنسایا کہ وہ بے بس ہو گئی مگر خود کو آزاد نہ کرا سکی نہ جانے مرد ذات اتنی خود غرض کیوں ہوتی ہے۔مجھے ایسے مردوں سے سخت نفرت ہے جو معصوم لڑکیوں سے محبت کر کے اپنی ہوس کا نشانہ بنا کر بے یارو مددگار چھوڑ دیتے ہیں۔مرد ذات پر کبھی اعتبار نہیں کرنا چاہیے، بس اسی پیغام کے ساتھ ان سب لڑکیوں کے لیے دعا گو ہوں جو کسی نہ کسی مرد کی محبت دل میں بسائے انتظار کر رہی ہیں، اللہ پاک سب کو اپنے حفظ وامان میں رکھے۔''

تاخیر سے موصول خطوط:

سہیل احمد عباسی، پنوعاقل۔ڈاکٹر ساجد محمد روشن، برہ زئی چیچہ احمد خان توحیدی، کراچی۔معراج الدین، مردان۔سعید احمد، حیدرآباد۔صلاح الدین، سکھر۔ارشد ریاض، جھنگ۔ریاض سکھیرا، لاہور۔ثمینہ ریاض، راولپنڈی۔ملک غلام رسول، چنیوٹ۔نیاز احمد منشی العین (یو اے ای) صاحب جان، پشاور۔زینب وٹو، ملتان۔ملک ممتاز حسن، شیخوپورہ۔ارتضیٰ حسن کاظمی، سرگودھا، فلک شیر میو، گجرات۔فہیم الحسن، سیالکوٹ۔

***

www.pdfbooksfree.pk

باب درخشاں

ڈاکٹر ساجد امجد

دوستوں کے ہجوم میں بھی وہ تنہا تھا گویا صبح میں بھی شام کی طرح تھا۔ ہاتھوں میں خواہشات کا کاسہ تھا مگر سکون دل سے تہی دست تھا، دل میں ایک آگ سی سلگ رہی تھی۔ وہ انگریزوں کی چالبازیاں بھی دیکھ رہا تھا اور اپنوں کی کج اداییاں بھی سمجھ رہا تھا کہ راستہ کٹھن ہے دھوپ میں شدت ہے مگر سائے کی محبت میں وہ آگے بڑھنے پر تیار ہوگیا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ سیاست کی مکروفریبی اس کی برداشت سے باہر ہے اس لیے بلاواسطہ وہ سیاست میں حصہ لے رہا تھا کیونکہ اسے منزل پر پہنچنے سے مطلب تھا۔ اس لیے اس نے اپنے مکان کو حصولِ پاکستان کی کوشش کرنے والوں کے لیے وقف کردیا تھا، مگر اسے کیا ملا؟

تحریک پاکستان کے ایک سرکردہ شخصیت کا زندگی نامہ

لاہور کے رہنے والے الٰہی بخش نے عمر کی کچھ ہی منزلیں طے کی تھیں کہ اپنے باپ رحیم بخش کے ساتھ مل کر زراعت اور کاشت کاری کا سلسلہ شروع کردیا۔ اسکول کی شکل نہ باپ نے دیکھی تھی نہ بیٹے کو اسکول بھیجا۔ وہ نرا جاہل رہ جاتا اگر اس کی ملاقات حافظ ولی اللہ سے نہ ہوئی ہوتی۔ یہ صاحب لاہور میں عیسائیت کی تبلیغ کا زور توڑنے کے لیے بڑا کام کررہے تھے۔ آئے دن عیسائیوں سے مذاکرے کرتے تھے اور انہیں شکست دیتے تھے۔ جب انہوں نے مشہور پادری فورمین کو شکست دی تو الٰہی بخش کو بڑی خوشی ہوئی۔ وہ حافظ صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ پڑھا لکھا تو تھا نہیں لیکن حافظ صاحب کی باتیں غور سے سنتا تھا۔ زراعت کے کاموں سے جب بھی فرصت ملتی وہ ان کے پاس پہنچ جاتا۔ وہ اسے دین کی باتیں بتاتے۔ وہ نہ صرف انہیں یاد رکھتا بلکہ ان پر عمل کرنے کی بھی کوشش کرتا۔ رفتہ رفتہ دین میں پختہ ہوگیا۔ پڑھنا لکھنا اب بھی نہیں سیکھا تھا لیکن حافظ صاحب کی صحبت میں بولنے کا ڈھنگ خوب آگیا تھا۔

ایک گواہی کے سلسلے میں عدالت میں پیش ہونا پڑا۔ گواہی کے دوران مخالف وکیل نے جرح کے پینترے بدلے الٰہی بخش نے اس جرح کا بڑے تحمل سے مقابلہ کیا۔ کئی مواقع پر تو اس نے وکیل کو لاجواب کردیا۔ جج انگریز تھا۔ الٰہی بخش کے جوابات کو بڑے غور سے سن رہا تھا۔

''کچھ پڑھے لکھے ہو؟'' جج نے پوچھا۔

''تھوڑی بہت حرفوں کی پہچان ہے۔''

''تم مجھے ذہین معلوم ہوتے ہو۔ اگر کچھ پڑھ لکھ لو تو تمہیں بہت فائدہ ہوگا۔'' انگریز جج کی یہ بات اس کے دل کو ایسی لگی کہ حصولِ علم کی طرف متوجہ ہوگیا۔ حافظ صاحب جیّد عالم تھے اور پھر ان کے پاس آنے والے لوگ بھی صاحبِ علم تھے۔

کاشت کاری کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور عربی، فارسی کی تعلیم بھی حاصل کی۔ اردو لکھنے پڑھنے میں بھی مہارت

www.pdfbooksfree.pk

حاصل ہوگئی۔ دینی کتابیں ذوق وشوق سے پڑھنا شروع کردیں۔ جوانی قریب آرہی تھی۔ قد خوب نکالا، بچپن سے محنت کی تھی لہٰذا ہاتھ پاؤں مضبوط تھے، مختصر یہ کہ ظاہری شخصیت بھی پُرکشش ہوگئی۔ کردار بھی ایسا بنایا کہ الٰہی بخش سے مولوی الٰہی بخش بن گیا۔

حافظ ولی اللہ کی تربیت سے وہ نہایت اچھا واعظ اور مقرر بن گیا اور تبلیغِ دین میں مشغول ہوگیا۔ حافظ صاحب کے ساتھ مناظروں میں حصہ لینے لگا۔

قدرت جب کسی کو بنانا چاہتی ہے تو اسباب مہیا کردیتی ہے۔ خلیفہ رجب الدین نے انہیں ایک مناظرے کے دوران سنا اور ان کے عقیدت مند ہوگئے۔ رجب الدین کے بھائی خلیفہ اسمٰعیل تھے جو ایک چھوٹی عدالت میں مختار تھے۔ مختار اس وکیل کو کہا جاتا تھا جو ماتحت عدالتوں میں مقدمہ لڑنے کے اہل ہوا کرتے تھے۔ الٰہی بخش کو انہیں دیکھ دیکھ کر شوق ہوا کہ وہ بھی مختار بن جائیں۔ انہوں نے خلیفہ اسمٰعیل سے مددلی اور مختاری کا امتحان پاس کرلیا۔

تبلیغِ دین بھی جاری رہی اور مختار کاری بھی لیکن تھوڑے ہی دن میں مختاری سے دل بھر گیا۔ دل میں یہ امنگ جاگی کہ بڑی کورٹوں میں وکالت کا کام کریں چنانچہ چیف کورٹ لاہور میں وکالت کا امتحان دیا اور کامیاب بھی ہوگئے۔

وکیل تو سب ہوتے ہیں لیکن انہوں نے اس شان سے وکالت کی کہ لاہور اور اس کے قرب وجوار میں دھوم مچ گئی۔

ضلع ہوشیار پور کے ایک گاؤں ”گھوڑے بابا“ میں عیسائی مشنریوں نے بہت سے مسلمانوں کو روپوں کا لالچ دے کر عیسائی بنالیا تھا۔ یہ بات اردگرد کے پڑھے لکھے مسلمانوں کے علم میں آگئی تو انہوں نے مداخلت کی۔ مسلمانوں اور عیسائیوں میں تصادم ہوگیا۔ معاملہ عدالت تک پہنچ گیا۔ اس وقت ہوشیار پور میں کوئی مسلمان وکیل نہیں تھا۔ تمام وکیل ہندو تھے یا سکھ۔ چند وکیل انگریز بھی تھے۔ مسلمانوں کا مقدمہ لڑنے کو کوئی تیار نہیں تھا۔ اس صورتِ حال سے پریشان ہوکر مسلمانوں کا ایک وفد لاہور آیا اور الٰہی بخش سے ملاقات کی۔ الٰہی بخش کو عیسائیوں سے مناظروں کا وسیع تجربہ تھا۔ ان کے لیے یہ مقدمہ لڑنا مشکل نہیں تھا۔ انہوں نے یہ مقدمہ لے لیا اور ہوشیار پور چلے گئے۔

وہ اس مقدمے کی پیروی کے لیے ہوشیار پور آئے تھے لیکن کیس کا فیصلہ ہوجانے کے بعد بھی وہاں کے مسلمانوں نے انہیں آنے نہیں دیا۔ ہوشیار پور ان کا وطن بن گیا۔ وہ اس ضلعے میں واحد مسلمان وکیل تھے۔ وکالت کے ساتھ ساتھ وہ اسلام کی تبلیغ واشاعت میں بھی سرگرمِ عمل ہوگئے۔

مقبولیت اتنی بڑھی کہ ہندو مسلمان سب ان کے پاس مقدمات لانے لگے۔ ان کی شادی امرتسر میں ہوئی تھی۔ جس وقت وہ ہوشیار پور آئے۔ بیوی کو ان کے میکے امرتسر میں چھوڑ دیا تھا کیونکہ وہ امید سے تھیں۔

ہوشیار پور میں انہیں بیٹے کی پیدائش کی خبر ملی جس کا نام انہوں نے عبدالعزیز رکھا۔ اس بچّے نے بڑے ہوکر جدوجہدِ آزادی میں بڑا نام پیدا کیا۔

☆☆☆

عبدالعزیز اپنی ننھیال میں تھا۔ ذہین تھا لیکن بعض بیماریاں ایسی لاحق ہوگئی تھیں کہ جسمانی اعتبار سے بہت کمزور ہوگیا۔ ذرا ذہن پر زور دیتا تھا تو چکرا کر گر پڑتا تھا۔ بالآخر ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ اسے اسکول سے اٹھالیا جائے۔ تعلیم سے زیادہ اس کی جان عزیز تھی لہٰذا مجبوراً تعلیم چھوڑ دینا پڑی۔

اسکول جانا چھوٹ گیا تو وہ اس دکھ میں بیمار رہنے لگا کہ سب بچے اسکول جاتے ہیں، وہ کیوں نہیں جاتا۔ اتنا کمزور ہوگیا کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ تعویذ گنڈے، ڈاکٹر حکیم سب ایک کردیے گئے۔ کھیل کود میں دل بہل سکتا تھا لیکن جسمانی صحت اس قابل بھی نہیں تھی کہ بچوں کے ساتھ زیادہ دیر کھیل سکتا۔

رفتہ رفتہ جیسے اسے صبر آگیا۔ اسکول کا خیال دل سے نکل گیا۔ بچوں کے ساتھ کھیلنے کی ضد بھی نہیں کرتا تھا۔ بجھے چراغ کی طرح گھر کے کسی کونے میں اکیلے کھیلتا رہتا تھا۔ اس سے بھی تھک جاتا تو ماں کے پاس جاکر بیٹھ جاتا۔ یہی اس کے معمولات تھے۔

وہ اس حالت میں بھی خوش تھا لیکن قدرت نے اسے ایک اور امتحان سے دوچار کردیا۔ اس کی ماں اچھی خاصی تھی کہ اچانک بیمار پڑ گئی اور ایسی بیمار پڑی کہ بستر سے لگ کر رہ گئی۔

ماں کی بیماری نے جیسے عبدالعزیز کے بدن میں جان ڈال دی۔ وہ اپنی کمزوری کو بھول کر ماں کی تیمارداری میں

مشغول ہوگیا۔ ہر وقت ماں کی پٹی سے لگا رہتا۔ نہ تھکن تھی نہ نیند۔ اس سے اس کی ذمّے دار طبیعت کا اندازہ ہوتا تھا۔

عبدالعزیز کی عمر بارہ سال تھی کہ اس کی ماں کا انتقال ہوگیا۔ گھر میں ایک ہی تو کھلونا تھا، وہ بھی ٹوٹ گیا۔ اب اس کی عمر اتنی ہوگئی تھی کہ انتقال کا مطلب سمجھ سکتا تھا۔ مولوی الٰہی بخش ہوشیار پور سے آئے تو وہ ان کے گلے لگ کر خوب رویا۔

الٰہی بخش بھی سوچ میں پڑ گئے کہ اب کیا کیا جائے۔ بیوی کا انتقال ہوگیا، بیٹے کی تعلیم چھوٹ گئی۔ اب اس کی ذمّے داری انہیں اپنے سر لینی تھی۔ وہ اسے اپنے ساتھ ہوشیار پور لے آئے۔ چھوٹے بیٹے عبدالحفیظ کی عمر صرف ڈیڑھ سال تھی۔ بچوں کی دیکھ بھال کے لیے گھر میں عورت کا ہونا ضروری تھا، انہوں نے دوسری شادی کرلی۔

عبدالعزیز کی طرف سے ان کی فکر بڑھتی جارہی تھی۔ انہوں نے ڈاکٹروں سے مشورہ کیا اور اسے اسکول میں داخل کروادیا۔

وہ اب بھی جسمانی اعتبار سے کمزور ہی تھا لیکن اس کی ذہانت اور پڑھنے کے شوق نے اسے سہارا دیا۔ وہ کلاسیں پھلانگتا رہا۔ سترہ سال کی عمر ہوگئی تھی کہ اس نے مڈل پاس کیا۔ اس کے بعد اسے لاہور میں انجمن حمایت اسلام کے ہائی اسکول میں داخل کروادیا گیا۔

میٹرک کرنے کے بعد اس نے میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا۔ ایک مرتبہ وہ پھر خرابیِ صحت کی بنا پر تعلیم ترک کرنے پر مجبور ہوگیا۔

الٰہی بخش اس کی طرف سے بہت پریشان تھے۔ انہوں نے اپنے وکیل دوستوں سے مشورہ کیا۔ بعض کا خیال تھا کہ انہیں وکالت پڑھنے کے لیے انگلستان بھیج دیا جائے۔ اس کی صحت پر وہاں کی آب وہوا کا بہت اچھا اثر پڑے گا۔ یہ مشورہ صائب تھا اور جب سر میاں شفیع بیرسٹر نے بھی یہی مشورہ دیا تو الٰہی بخش نے اسے انگلستان بھیجنے کا بندوبست کردیا۔

وہ بذریعہ بحری جہاز انگلستان روانہ ہوگیا اور قانون کی مشہور درس گاہ ”لنکراِن“ میں داخلہ لے لیا۔

قائداعظم محمد علی جناح بھی وہاں قانون کی تعلیم حاصل کررہے تھے۔ ہر چند کہ یہ ان کا آخری سال تھا لیکن عبدالعزیز سے ان کی اچھی خاصی دوستی ہوگئی۔

انگلستان کا قیام اس کی ذہنی ساخت کو بڑی تیزی سے تبدیل کررہا تھا۔ انگریزوں سے مرعوبیت کی بجائے ان کی طرف سے نفرت دل میں جمع ہورہی تھی جس کا اظہار وہ اپنے خطوں میں اکثر کرتا رہتا تھا۔

”یہ ملک ایسا ہے کہ اگر آپ کے پاس پیسا ہے تو سب کچھ ہے اور اگر نہ ہو تو ایک منٹ میں سب ندارد۔ خاص کر جبکہ ایسے طوطا چشم انگریزوں سے واسطہ ہو۔“

ذمّے داری کا احساس اسے بچپن ہی سے تھا۔ وہ اب بھی گھر کے تمام وسائل کو سامنے رکھے ہوئے تھا۔ ہندوستان کے حالات بھی اس کے سامنے تھے اور انگریزوں کی طوطا چشمی سے بھی واقف تھا۔ انگلستان کی بے راہ رو آزاد فضا میں بھی اس نے کام سے کام رکھا۔ اسے جلد سے جلد پرائے ملک کو چھوڑ کر اپنے دیس میں پہنچنے کی تمنا تھی۔ وہ سخت محنت کررہا تھا لہٰذا تمام امتحانات نہایت تیزی سے صرف نو مہینوں میں پاس کرلیے لیکن وہاں کے قانون کے مطابق تین سال سے پہلے بیرسٹری کی ڈگری نہیں مل سکتی تھی۔ وہاں کے قانون کے مطابق مقررہ ڈنرز میں شامل ہونا ضروری تھا۔

اس خالی وقت میں بھی وہ نچلا نہیں بیٹھا۔ محمد علی جناح (قائداعظم) سے اس کی دوستی تو ہو ہی چکی تھی۔ دونوں نے مل کر مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن قائم کی جس میں ہندوستان اور دوسرے ملکوں کے مسلمان طالب علم شامل تھے۔

ڈنرز کی منزل سے گزرنے کے بعد وہ بیرسٹر بن گیا۔ اس نے وطن واپسی کی تیاری شروع کردی۔

17 جولائی 1898ء کو اس کا جہاز ممبئی کے ساحل پر لنگر انداز ہوا۔ اس وقت کسی مسلمان کا بیرسٹر بننے کے بعد ہندوستان واپس آنا معمولی بات نہیں تھی۔ وہ جب ممبئی سے بذریعہ ٹرین ہوشیار پور کے لیے روانہ ہوا تو جالندھر ریلوے اسٹیشن پر لوگوں کا بہت بڑا ہجوم تھا۔

چند روز ہوشیار پور قیام کرنے کے بعد وہ لاہور چلا گیا۔

اس نے یہاں رہ کر وکالت کا لائسنس حاصل کیا۔ دوستوں اور عزیزوں سے ملاقاتیں کیں اور کچھ دن ٹھہرنے کے بعد ہوشیار پور چلا گیا۔ یہاں الٰہی بخش اقامت گزیں تھے۔ عبدالعزیز کو بھی یہیں رہنا تھا۔

اس نے یہاں والد کی نگرانی میں وکالت شروع کردی۔ اہلِ ہوشیار پور کے لیے یہ بڑی خوشی کا موقع تھا۔ اب انہیں دو مسلمان وکیل میسر آگئے تھے۔

www.pdfbooksfree.pk

الٰہی بخش صرف وکیل نہیں تھے۔ مسلمانوں اور خصوصاً ہوشیار پور کے مسلمانوں کے لیے ان کے دل میں بڑا درد تھا۔ وہ خدمتِ قوم کے بہت سے کام کرتے رہے تھے۔ عبدالعزیز کے آجانے کے بعد ان کاموں میں مزید تیزی آگئی۔

عبدالعزیز مستعد بھی تھا، باہمت بھی اور جذبۂ دینی سے سرشار بھی۔ انگلستان میں رہ کر وہ اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ مسلمانوں کی ترقی تعلیم سے وابستہ ہے۔ اس نے وہاں کے تعلیمی اداروں کا مشاہدہ بھی کیا تھا لہٰذا ہوشیار پور آتے ہی اس نے اس کمی کو محسوس کیا کہ یہاں کوئی بڑا تعلیمی ادارہ موجود نہیں۔ اس نے ہوشیار پور کے اصحابِ ثروت سے رابطے کیے اور ان کی توجہ ایک تعلیمی ادارے کی طرف دلائی۔ اس کی یہ کوششیں رنگ لائیں اور اتنی رقم جمع ہوگئی کہ ایک ہندو سے اس کا پرائیوٹ اسکول خرید لیا اور اس کا نام اسلامیہ مڈل اسکول رکھا۔ یہ مسلمانوں کا پہلا اسکول تھا جو ہوشیار پور میں قائم کیا گیا۔

یہ ابتدا تھی اور مسلمانوں میں حصولِ تعلیم کا جذبہ ابھارنے کی ایک کوشش تھی۔ اس نے والدین سے ملاقاتیں کر کے انہیں راغب کیا کہ وہ اپنے بچوں کو اس اسکول میں داخل کروائیں۔ بہت سے مسلمان لڑکے اسکول میں داخل ہوگئے۔

تین چار سال تک یہ اسکول پرانی عمارت ہی میں رہا لیکن اب طلبہ کی تعداد اتنی بڑھ گئی تھی کہ اسے ہائی اسکول بنانے اور ایک نئی عمارت تعمیر کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

وہ اس وقت وہی کام کر رہا تھا جو کبھی سرسید نے انجام دیا تھا۔ اس نے چندے کے لیے مختلف مقامات کے دورے کیے اور ایک قطعہ زمین خرید لیا۔ ایک شاندار عمارت کا نقشہ تیار کیا گیا جس میں بورڈنگ ہاؤس کے کمرے بھی شامل تھے۔

اسلامیہ ہائی اسکول کا سنگِ بنیاد رکھنے کی تقریب نہایت پُروقار طریقے سے ادا کی گئی۔ سنگِ بنیاد سرسید کے ایک ساتھی وقار الملک نواب مشتاق احمد کے ہاتھوں رکھا گیا۔ اس تقریب میں اور مہمانوں کے علاوہ علامہ اقبال بھی شامل تھے۔

اس زمانے میں ریل ہوشیار پور نہیں جاتی تھی۔ جالندھر اترنا پڑتا تھا اور وہاں سے پچیس میل کا سفر بیل گاڑیوں سے طے کرنے کے بعد ہوشیار پور جایا جاتا تھا۔

ان حالات میں اس درس گاہ کے افتتاح کے لیے بڑی بڑی شخصیتوں کا ہوشیار پور پہنچنا عبدالعزیز کی کاوشوں ہی کا نتیجہ ہوسکتا تھا۔

اسکول کی تعمیر ہی کے زمانے میں یہ خیال آیا کہ بورڈنگ ہاؤس سے متصل جامع مسجد تعمیر کی جائے۔ چنانچہ اسکول سے کچھ فاصلے پر زمین خرید کر جامع مسجد کی تعمیر بھی شروع کر دی گئی۔

ہوشیار پور کے قیام کے دوران ہی میاں عبدالعزیز نے انجمن اسلامیہ کا ادارہ قائم کیا۔ عبدالعزیز کو اس کے سیکریٹری جنرل کے طور پر منتخب کیا گیا۔

اسلامیہ ہائی اسکول، جامع مسجد اور بورڈنگ ہاؤس کی نگرانی اسی انجمن کے سپرد تھی۔ ایک منصوبہ یہ بھی بنایا گیا کہ اس انجمن کے تحت ہر سال سالانہ تبلیغی جلسہ منعقد کیا جائے گا۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے علمائے کرام کو دعوت دی جائے گی اور وہ ان جلسوں میں تقاریر کریں گے۔

مسلمانوں کے سیاسی اغراض و مقاصد کے لیے ضلعی مسلم لیگ بنائی گئی۔ عبدالعزیز نے اس کے اغراض و مقاصد مرتب کیے۔

قومی خدمت کے ان کاموں نے عبدالعزیز کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔ ہندو مسلمان سب اسے عزیز رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر سال میونسپلٹی کمیٹی کا رکن منتخب کیا جاتا رہا اور اسے یہ موقع ملتا رہا کہ ہوشیار پور میں ترقیاتی منصوبوں کے لیے آواز اٹھاتا رہے۔

اسے ہوشیار پور میں رہتے ہوئے تقریباً بیس سال ہوگئے تھے۔ یہ عرصہ بہت ہوتا ہے۔ خصوصاً اس کے لیے جس نے اپنے شب و روز قوم کے لیے وقف کر دیے ہوں۔

جب یہاں کے لوگوں نے یہ سنا کہ عبدالعزیز اور ان کے والد ہوشیار پور سے لاہور منتقل ہو رہے ہیں تو ان کے پاس وفود آنے شروع ہوگئے۔ ان میں مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی سبھی شامل تھے۔ سب کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ وہ ہوشیار پور میں رہیں لاہور نہ جائیں۔

لاہور، عبدالعزیز کا آبائی مسکن تھا۔ رشتے دار، زمین، جائداد سب وہیں تھی۔ ہوشیار پور میں کب تک رہتے جبکہ اب سیاست کا بہاؤ اتنا تیز ہوگیا تھا کہ اس کا مقابلہ لاہور میں رہ کر ہی کیا جاسکتا تھا۔ اب وہ کسی گہرے دریا میں شامل ہونا چاہتا تھا۔

"آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔ میں لاہور میں رہ کر بھی آپ کو یاد رکھوں گا۔ جب آپ آواز دیں گے حاضر ہو جاؤں گا۔" اس نے ہوشیار پور والوں سے کہا اور والد کو ساتھ لے کر مستقل طور پر لاہور آگیا۔

☆☆☆

شاید قدرت اسے کسی خاص مقصد کے لیے لاہور بلا رہی تھی۔

اس نے جس روز لاہور کی زمین پر قدم رکھا اسی روز وہ سانحہ پیش آیا جسے سانحہ "جلیانوالہ باغ" کہتے ہیں۔ گورنر پنجاب سر مائیکل اڈوائر کے حکم پر جلیانوالہ باغ (امرتسر) میں نہتے لوگوں پر گولی چلائی گئی جس میں بے شمار لوگ مارے گئے۔

امرتسر سے لاہور دور ہی کتنا تھا۔ اس واقعے کی گونج لاہور تک پہنچ گئی۔ اہلِ ہند کے دلوں میں انگریزی حکومت کے خلاف شدید نفرت کے جذبات بھڑک اٹھے۔ پورا ہندوستان لاوے کی طرح پھٹ پڑنے کو تیار تھا۔ مظاہروں اور بیانات نے انگریزی حکومت کو دہلا کر رکھ دیا لیکن مائیکل اڈوائر نے شرمندہ ہونے اور معذرت کرنے کے بجائے امرتسر میں کرفیو لگا دیا۔ وہ انگریزی حکومت کے مخالفوں کو ختم کرنے پر تلا ہوا تھا۔ ہندوستان کے سیاسی رہنما اس بربریت کے خلاف آوازیں بلند کر رہے تھے۔

امرتسر میں داخل ہونا مشکل تھا لہٰذا رہنمایانِ ہند لاہور آئے تاکہ اس المیے کے خلاف احتجاج کیا جائے۔ ان رہنماؤں میں مولانا ابوالکلام آزاد، گاندھی جی، حکیم اجمل خان، مولانا شوکت علی جوہر وغیرہ شامل تھے۔

انگریزوں کا خوف اس قدر طاری تھا کہ ان لیڈروں کو کوئی شخص اپنے گھر ٹھہرانے پر تیار نہیں تھا۔ ایک میاں عبدالعزیز تھے جنہوں نے اپنی کوٹھی کے دروازے ان لیڈروں کے لیے کھول دیے اور اس بے خوفی سے کہ ان کی کوٹھی حکومت مخالفوں کے لیے ہیڈ کوارٹر بن گئی۔

ان لیڈروں پر ہی منحصر نہیں جس کا جی چاہے وہ یہاں آسکتا تھا۔ اجلاس ہوتے تھے، تقریریں کی جاتی تھیں۔ دیگیں چڑھی رہتی تھیں ایک لنگر سا جاری تھا۔

انگریزوں سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کا عمل صرف یہیں تک محدود نہیں رہا بلکہ اگلے سال میونسپل کمیٹی کے انتخابات ہوئے تو میاں عبدالعزیز نے بھی اس میں حصہ لیا اور کامیاب ہوئے۔ لاہور میں یہ ان کی پہلی کامیابی تھی۔ ان لوگوں کو بھی انہوں نے کامیاب کروایا جو ان کے ہم خیال تھے۔ انہی کے بل بوتے پر انہیں وائس پریذیڈنٹ منتخب کیا گیا۔ کمیٹی کا صدر انگریز ڈپٹی کمشنر تھا۔ جب میاں صاحب وائس پریذیڈنٹ منتخب کیے گئے تو اس نے کمیٹی کے اجلاسوں میں آنا چھوڑ دیا۔ میاں صاحب ہی صدارت کرتے تھے۔ اپنی صدارت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اور اختیار استعمال کرتے ہوئے لارڈ لارنس کے مجسمے کو اکھڑوانے کی قرارداد منظور کروالی۔ یہ مجسمہ مال روڈ سے ملحق ایک باغ میں نصب تھا۔ اس بت کے ایک ہاتھ میں قلم تھا اور ایک میں تلوار اور نیچے انگریزی زبان میں لکھا تھا۔

"تم تلوار کی حکومت چاہتے ہو یا قلم کی۔"

یہ الفاظ ہندوستانیوں بالخصوص اہلِ پنجاب کی غیرت کے لیے زبردست چیلنج تھے۔

میاں عبدالعزیز نے اس بت کو اکھڑوانے کی قرارداد منظور کروائی تو حکومت نے اس کی مخالفت کی۔ حکومت کا موقف یہ تھا کہ یہ بت گورنمنٹ کی ملکیت ہے اس لیے کمیٹی کو اسے اکھڑوانے کا حق حاصل نہیں۔ کوئی اور ہوتا تو دبک کر بیٹھ جاتا لیکن میاں صاحب نے کمیٹی کے ریکارڈ سے یہ ثابت کر دیا یہ بت جس شخص نے بنایا تھا اس نے کمیٹی کو دے

بادشاہ مہمان

میاں عبدالعزیز کو اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں بڑے احترام سے نوازا تھا۔ بے شمار بڑے لوگ مہمان کے طور پر ان کے مکان پر آئے۔ لاہور میں ان کا واحد مکان تھا جس میں اپنے وقت کی اہم شخصیتوں کے قدم پڑے۔ اس مکان میں یکے بعد دیگرے دو ایسے شخص بھی آئے جو بعد میں تختِ بادشاہت پر متمکن ہوئے۔ ایک والیِ افغانستان امان اللہ خان دوسرا اسی ملک کا حکمران نادر شاہ۔

والیِ چترال بھی اس گھر میں آئے۔ میاں صاحب غالباً اپنے دور کے واحد شخص تھے جو نہ حکومت کے کسی منصب پر فائز تھے، نہ وزیر تھے، نہ بڑے افسر مگر اس درجہ کثیر تعداد میں ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی ان کے گھر آتے تھے کہ ان کا شمار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بہت بڑا اعزاز تھا جو معاشرتی طور پر انہیں حاصل ہوا۔

www.pdfbooksfree.pk

دیا تھا۔ کمیٹی کو یہ حق حاصل ہے کہ اسے رہنے دے یا کسی اور جگہ نصب کروائے یا اکھڑوا دے۔

حکومت نے گھٹنے ٹیک دیے اور مصالحت کی غرض سے اس مجسمے کے نیچے لکھے ہوئے الفاظ کو ہٹانے پر تیار ہوگئی۔ طویل خط و کتابت کے بعد الفاظ ہٹا دیے گئے۔ میاں عبدالعزیز ہی کی نہیں اہلِ پنجاب کی یہ ایک بڑی کامیابی تھی۔

وہ حکومت کے خلاف ایک ایک کر کے قراردادیں پاس کروا رہے تھے اور حکومت کی آنکھ میں کانٹا بن کر کھٹک رہے تھے کہ پرنس آف ویلز ولی عہد برطانیہ کی ہندوستان آمد کا شور بلند ہوا۔ شہزادے کو خوش آمدید کہنے کے لیے بہت سے اداروں اور انجمنوں نے قراردادیں منظور کیں اور جشن منانے کی تیاریاں کی جانے لگیں۔

لاہور میونسپل کمیٹی میں دو دھڑے بن گئے۔ کچھ لوگ خیر مقدم کی قرارداد پاس کروانا چاہتے تھے۔ میاں عبدالعزیز نے اس کی سخت مخالفت کی۔ انہوں نے جلیانوالہ باغ کو بنیاد بنا کر شہزادے کے خلاف ایک محاذ بنا لیا۔ اتنے لوگ ہم خیال بنا لیے کہ پرنس آف ویلز کی آمد پر بائیکاٹ کی قرارداد منظور کروالی۔

یہ بظاہر چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں لیکن اس سے انگریزی دشمنی کی فضا تیار ہو رہی تھی جو بعد میں آزادی پر جا کر ختم ہوئی۔

انگریز ڈپٹی کمشنر نے سخت جدوجہد کی کہ اس قرارداد کو منسوخ کروا دے۔ بہت سے ارکان کو لالچ دے کر توڑنے کی کوشش کی۔ کچھ کو توڑ بھی لیا لیکن وہ صرف اتنا کروا سکا کہ بائیکاٹ کے الفاظ واپس لے لیے گئے۔

اس کے باوجود ولی عہد کے استقبال میں کسی نے کوئی حصہ نہیں لیا۔ عملاً بائیکاٹ ہی رہا۔

یہ مرحلہ گزرا تو ایک اور امتحان سامنے آ گیا۔ شاہ عالم گیٹ کے باہر میونسپل کمیٹی کی تھوڑی سی جگہ تھی۔ وہاں ہندوؤں نے مندر اور مسلمانوں نے مسجد بنانے کی کوشش کی۔ دونوں فرقوں کے درمیان یہ کشمکش اتنی بڑھی کہ تصادم کی نوبت آ گئی۔ مسلمانوں کا ایک ہی سہارا تھا۔ وہ میاں عبدالعزیز سے ملے۔

"میاں صاحب، مسجد تو بن کر رہے گی اور آپ کو بنوانی ہوگی۔"

"میں اس تنازع کو اس طرح بھی ختم کر سکتا ہوں کہ نہ مسجد بنے نہ مندر۔"

"یہ تو ہماری شکست ہوگی پھر آپ کا لاہور میں رہنے کا فائدہ کیا ہوا؟"

"میں ایک صورت میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔"

"فرمائیے۔"

"اگر آپ ایک رات میں مسجد تعمیر کر لیں تو یہ میرا دعویٰ ہے کہ مسجد گرنے نہیں دوں گا۔"

پہلے تو سب ششدر رہ گئے کہ بھلا ایک رات میں مسجد کیسے تعمیر ہوگی لیکن پھر وہ تعمیر پر تیار ہو گئے۔ زمین ہی کتنی ہوگی زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ مرلہ۔ اتنی بڑی تعداد میں عام مسلمان... اور مزدور تعمیر کے کام میں لگ گئے کہ ایک ہی رات میں مسجد تعمیر کر ڈالی۔ صبح کی اذان ہوئی اور باجماعت نماز پڑھی گئی۔

صبح کو جو اس طرف آیا حیران ہوتا تھا کہ خالی زمین پر مسجد کہاں سے ابھر آئی۔ ہندوؤں نے ہنگامہ کروانے کا منصوبہ بنایا لیکن ناکام رہے۔

یہ مسجد ہنگامی بنیاد پر عارضی طور پر بنائی گئی تھی۔ بعد میں وسیع پیمانے پر چندہ جمع کیا گیا اور مسجد کی دوبارہ تعمیر ہوئی۔ یہ مسجد آج تک قائم ہے۔

علامہ اقبال نے اپنا یہ مشہور شعر اسی مسجد کی تعمیر پر کہا تھا۔

مسجد تو بنا لی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی تھا برسوں میں نمازی بن نہ سکا

☆☆☆

میاں صاحب سیاسی و سماجی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ ہر اجتماعی مسئلے میں مسلمانوں کی کھل کر مدد کرتے تھے لیکن اس کے باوجود ہندو، سکھ اور دوسرے غیر مسلم ان پر پورا اعتماد کرتے تھے۔ یہی ان کی کامیابی کا راز تھا۔ وہ ہر سال میونسپل کمیٹی کے انتخابات میں کامیاب ہوتے رہے ماسوا ایک انتخاب کے جس میں وہ علامہ اقبال کے حق میں دست بردار ہو گئے تھے۔

میاں عبدالعزیز جرأت مند بھی تھے اور بے نیاز بھی۔ ان کی کوٹھی انگریز مخالفوں کا مہمان خانہ بنی ہوئی تھی۔ جب بھی کوئی شورش برپا ہوتی اور سیاسی لیڈر لاہور میں جمع ہوتے تو میاں صاحب کی کوٹھی ہی میں ٹھہرتے۔

رولٹ بل ایکٹ کا نفاذ ہوا یا سائمن کمیشن کا

قیام۔ جب بھی کانگریس یا عام مسلمانوں کی جانب سے مخالفت ہوئی۔ ہڑتال یا فساد ہوئے میاں عبدالعزیز نے نہایت جرأت مندی سے مسلمانوں کا ساتھ دیا اور انگریزوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی۔ کسی صلے یا اعزاز سے بے پروا ہو کر۔

1927ء میں لاہور میں ہندو مسلم فساد ہوا۔ شہر میں ہڑتال ہوگئی۔ حکومت کی تمام تر کوششوں کے باوجود ہڑتال ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔

شہر کی صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے گورنر پنجاب باہر نکلا۔ اس نے سکھوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کے سرکردہ لوگوں سے ہڑتال ختم کرنے کی درخواست کی۔ ان سب نے یک زبان ہو کر کہا۔ "اگر میاں عبدالعزیز یہ ذمے داری قبول کر لیں کہ کوئی فریق کسی فریق کے خلاف کوئی مضرت رساں حرکت نہیں کرے گا تو ہڑتال ختم ہو سکتی ہے۔"

گورنر نے شہر کا دورہ منسوخ کیا اور میاں عبدالعزیز سے ملاقات کے لیے ان کی کوٹھی پر پہنچ گیا اور انہیں آمادہ کر لیا کہ وہ ہڑتال ختم کروانے میں حکومت کی مدد کریں گے۔

میاں صاحب نے تینوں فرقوں کے ذمے داروں سے ملاقاتیں کیں۔ تینوں کو آمادہ کیا کہ کوئی کسی کے خلاف قدم نہیں اٹھائے گا۔ جب تینوں کو تحفظ کا احساس ہو گیا تو ہڑتال ختم کر دی گئی۔

ان کی اس کوشش کو حکومت نے تعریفی نظر سے دیکھا۔ انگریز گورنر نے اپنی حکومت سے ان کے لیے "سر" کا خطاب دینے کی سفارش کی۔ میاں صاحب کو جب اطلاع ہوئی تو انہوں نے خطاب لینے سے انکار کر دیا۔

گورنر نے انہیں بلایا اور ان پر زور دیا کہ وہ اس خطاب کو ٹھکرا کر حکومت کی توہین نہ کریں بلکہ اس کے ثمرات سے فائدہ اٹھائیں۔

جب وہ کسی صورت نہ مانے تو اسپیشل اعزازی سند دینی چاہی۔ انہوں نے اس سے بھی انکار کر دیا۔ گورنر بہت برہم ہوا۔

"جب آپ نے ہماری مدد کی تو ہماری سند لینے سے کیوں انکار کرتے ہیں؟"

"میں نے انگریز حکومت کی کوئی مدد نہیں کی۔ میں نے تو اپنے لوگوں کی خدمت کی ہے۔ اس ہڑتال سے میرے لوگوں کا نقصان ہو رہا تھا، آپ کا نہیں۔ میں تو ہندوستان میں رہنے والی تینوں قومیتوں میں اتحاد کا خواہاں ہوں۔ اس کے لیے کام کرتا رہوں گا۔"

اس کے بعد 31ء اور 35ء میں بھی لاہور میں فسادات ہوئے۔ میاں عبدالعزیز نے ان فسادات کو ختم کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔

میاں عبدالعزیز نے ہر اس تحریک میں حصہ لیا جس سے مسلمانوں کا مفاد وابستہ تھا۔ مسلمانوں کے حقوق پر جہاں بھی آنچ آتی وہ مدد کے لیے پہنچ جاتے۔ لاہور تو خیر ان کا ہیڈ کوارٹر تھا ہی لیکن اردگرد کے علاقوں میں مسلمانوں پر کوئی آفت آتی دیکھتے تو مدد کے لیے پہنچ جاتے۔ راولپنڈی میں ہندو مسلم فساد ہوا تو وہ فوراً وہاں پہنچے۔ سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کا وقت آیا تو میاں عبدالعزیز اس کے بائیکاٹ کے لیے پیش پیش تھے کیونکہ اوروں کی طرح ان کا بھی یہی خیال تھا کہ یہ کمیشن ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کے خلاف ہے۔

ان کی کوششوں کا نتیجہ اس وقت سامنے آیا جب سائمن کمیشن کے ارکان لاہور ریلوے اسٹیشن پر اترے تو ایک بڑا جلوس کالی جھنڈیوں کے ساتھ اس کے استقبال کے

نوشت عبدالعزیز

اسلام جبر و تغلب اور استبدادی استحصال کو روا نہیں رکھتا۔ سودی کاروبار ارتکازِ زر کی اساس اول ہے۔ اللہ اسے جنگ کے مترادف قرار دیتا ہے۔ اسلام ملوں، بیمہ کمپنیوں اور بڑی بڑی صنعتوں کو تو میانے سے نہیں روکتا۔ اسلام ضرورت سے فالتو زرعی زمین پر قبضہ رکھنے کو جائز نہیں سمجھتا۔ اسلام روٹی، کپڑا اور مکان سے آگے گزر کر تعلیم و تربیت، علاج، انفرادی آزادی کا تحفظ (جس کا سوشلزم میں نام لینا بھی حرام ہے) اور نہ جانے کیا کیا نعمتیں عطا کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک انسانی بھائی چارے کی لڑی میں پرو دیتا ہے اور ایک خدائی قانون کے تابع کرتا ہے جہاں اس کے سامنے ہر آن اپنے اعمال پر جواب دہ ہونے کا کھٹکا ہوتا ہے اور یہی وہ روحِ لطیف ہے جو تحریص و ترغیب، جبر و تغلب، استحصال و استبداد کے شجرِ خبیث کے لیے بادِ صرصر ہے اور سوشلزم اس روحِ لطیف کی کلی نفی ہے۔

www.pdfbooksfree.pk

لیے دہلی دروازے سے لنڈے بازار میں داخل ہوا اور ریلوے اسٹیشن کی طرف بڑھا۔ پولیس نے لاٹھی چارج کیا جس سے بہت سے لوگ زخمی ہوئے۔

سائمن کمیشن اس وقت کا بہت بڑا سیاسی مسئلہ تھا۔ میاں صاحب کی کوششوں سے لاہور میں اس کا بھرپور بائیکاٹ ہوا۔

اس واقعے کے بعد میاں عبدالعزیز کی شہرت پنجاب سے نکل کر پورے ہندوستان میں پہنچ گئی۔ وہ ایک ماہر وکیل تو تھے ہی اب ان کا شمار سیاست دانوں میں بھی ہونے لگا۔

1937ء میں میاں عبدالعزیز نے اس وقت سیاست میں باقاعدہ قدم رکھ دیا جب وہ مسلم لیگ کی طرف سے پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (عبدالمجید مالک نے راجا غضنفر علی کا نام لکھا ہے)

انتخابات کے بعد یونینسٹ پارٹی (Unionist Party) کی حکومت قائم ہوئی۔ سر سکندر حیات پنجاب کے وزیراعظم بنے۔ میاں صاحب مسلم لیگ ہی میں رہے۔

پنجاب اسمبلی میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ ریونیو پر معمولی سا ٹیکس عائد کر کے اس آمدنی سے بادشاہی مسجد کی مرمت کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ اس کے لیے سات ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔

میاں عبدالعزیز نے اس تجویز کی مکمل حمایت کی لیکن کمیٹی کی مخالفت کی۔ اس لیے اس میں ایک یا دو کے سوا سب غیر مسلم تھے اور وہ بھی سرکاری ملازم۔

اپوزیشن میں ہونے کے باوجود انہوں نے اس شدت سے آواز بلند کی کہ غیر مسلموں کی جگہ مسلمانوں عہدے دار اس کمیٹی کے رکن مقرر کیے گئے اور بادشاہی مسجد کی مرمت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

☆☆☆

قائداعظم نے جب پنجاب میں مسلم لیگ کو مضبوط و منظم کرنے کا ارادہ کیا تو سب سے پہلے ان کی نظر میاں عبدالعزیز پر ہی پڑی۔

میاں صاحب کی صلاحیتوں سے قائداعظم اس وقت کے معترف تھے جب وہ انگلستان میں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کر رہے تھے پھر وہ پنجاب میں ان کی گونا گوں خدمات کو بھی دیکھ رہے تھے۔ قائداعظم نے بمبئی سے انہیں خط لکھا "وہ پنجاب میں مسلم لیگ کی تنظیم نو کرنا چاہتے ہیں اور اس سلسلے میں لاہور کے سرکردہ لوگوں سے ملاقات کے خواہاں ہیں۔ آپ کی مدد سے یہ کام آسان ہو سکتا ہے۔ کیا یہ ملاقاتیں آپ کے گھر پر ہو سکتی ہیں؟"

میاں عبدالعزیز نے اس پر خوشی کا اظہار کیا اور انہیں لاہور آنے کی دعوت دی۔ یہ بڑا اعزاز تھا کہ محمد علی جناح ان کے گھر تشریف لا رہے تھے۔ کوٹھی کو آراستہ کر دیا گیا۔ پلکوں کا شامیانہ، آنکھوں کا فرش بچھ گیا، عقیدت مندوں نے راستوں کو جھنڈیوں سے سجا دیا۔

2 مئی 1936ء کو میاں صاحب کی کوٹھی پر اجلاس ہوا۔

میاں عبدالعزیز کی کوٹھی کا نصیب اس وقت مزید جاگ گیا جب انہی کی کوششوں سے علامہ اقبال، لیاقت علی خان، ملک برکت علی، خلیفہ شجاع الدین، غلام رسول بیرسٹر اور بعض دیگر حضرات نے اس اجلاس میں شرکت کی۔ اس اجلاس میں مسلم لیگ کی تنظیم اور تشکیل نو کا فیصلہ کیا گیا اور پنجاب مسلم لیگ کے نئے عہدے دار منتخب ہوئے۔ اس کے بعد بھی کئی اجلاس ہوئے۔

ان دنوں اس دھان پان سے شخص میاں عبدالعزیز کی سرگرمیاں قابلِ دید تھیں۔ کسی بھی عہدے سے بے نیاز بھاگ دوڑ میں مصروف تھے کہ وہ ہمیشہ مسلم لیگ کا ساتھ دیں گے۔ ایسے بے لوث افراد ہی تھے جن کی قربانیوں نے مسلم لیگ کے سفر کو آسان بنایا۔

اس کے بعد ہی انہوں نے قانونی امداد کا خاص شعبہ مقرر کیا۔ اس شعبے کا کام غریب اور نادار مسلمانوں کو مفت قانونی امداد فراہم کرنا، ان کی ضمانتیں کروانا تھا۔ ہندو مسلم فسادات عام ہو گئے تھے۔ ایسے موقع پر وہ نہ صرف اس آگ کو بجھانے میں آگے آگے ہوتے تھے بلکہ گرفتار مسلمانوں کے مقدمات بلا فیس لڑتے تھے۔

وکالت ان کی آمدنی کا ذریعہ تھی لیکن قومی خدمت میں انہوں نے اس آمدنی کی بھی پروا نہیں کی۔

☆☆☆

لاہور میں اس وقت سخت سراسیمگی پھیل گئی جب ایک غریب نوجوان نے ایک ہندو ناشر راجپال کو قتل کر دیا اور گرفتار ہو کر جیل پہنچ گیا۔

راجپال نے ایک کتاب "رنگیلا رسول" کے نام سے شائع کی تھی۔ کتاب کا نام ہی گستاخانہ تھا۔ کتاب کے مندرجات میں بھی نبی اکرم کی ذاتِ اقدس اور اسلام کے بارے میں رکیک حملے کیے گئے تھے۔ اس کتاب کی اشاعت

نے مسلمانوں کو مشتعل کر دیا۔ جگہ جگہ احتجاجی مظاہرے ہونے لگے۔ جلسے ہوئے، قراردادیں پاس ہوئیں۔

لاہور کی ایک عدالت میں راجپال کے خلاف مقدمہ دائر ہوا۔ عدالت کی طرف سے راجپال کو سزا ہو گئی۔ اس نے سیشن عدالت میں اپیل کی۔ سزا پھر بھی بحال رہی۔ جب اپیل ہائی کورٹ میں گئی جسٹس دلیپ سنگھ نے راجپال کو بری کر دیا۔ اس نے فیصلے میں لکھا کہ انگریزی حکومت کے مروجہ قانون میں مذہبی اکابر کے خلاف لکھنا قابلِ سزا جرم نہیں۔

اس کی رہائی نے لاہور میں آگ لگا دی۔ جلسے جلوس کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایسا ہی ایک جلسہ تھا۔ نوجوان علم الدین بھی اس جلسے میں شریک تھا۔ تقریر جیسے جیسے آگے بڑھ رہی تھی اس کا لہو گرم ہوتا جا رہا تھا۔ جلسہ ختم ہوا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔ علم الدین بھی اپنے گھر آ گیا لیکن رات بھر سو نہ سکا، جاگتا رہا۔ صبح اٹھ کر اس نے ناشتا کیا۔ اپنی بھابی سے کچھ پیسے لیے، ایک بڑی چادر اپنے بدن پر ڈالی اور گھر سے نکل گیا۔ بازار جا کر ان پیسوں سے چاقو خریدا اور راجپال کے اشاعتی دفتر کی طرف چل دیا۔ یہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ راجپال ابھی نہیں آیا۔ وہ وہیں سیڑھیوں کے نیچے چھپ کر بیٹھ گیا۔ راجپال نے جیسے ہی اپنے دفتر کی سیڑھیاں چڑھیں علم الدین بپھرے ہوئے شیر کی طرح اٹھا۔ چادر دور پھینکی اور راجپال پر حملہ کر دیا۔ راجپال مارا گیا لیکن علم الدین پکڑا گیا۔

اس پر مقدمہ چلا، میاں عبدالعزیز نے اپنی خدمات پیش کیں لیکن مقدمہ سر میاں محمد شفیع بیرسٹر نے لڑا۔ وہ مقدمہ ہار گئے۔ علم الدین کو پھانسی کی سزا سنا دی گئی۔

اپیل کے لیے قائداعظم محمد علی جناح سے رابطہ کیا گیا۔ اس اپیل میں بھی پھانسی کی سزا بحال رہی اور اسے پھانسی دے دی گئی۔ اس کی وصیت کے برعکس اسے جیل ہی میں دفن بھی کر دیا گیا۔

مقدمے کے دوران بھی لاہور میں ہنگامے ہوتے رہے تھے لیکن انگریزوں کی اس حرکت نے پورے پنجاب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ایک ہی مطالبہ تھا کہ علم الدین کی میت لاہور لائی جائے اور یہیں انہیں دفن کیا جائے۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے میاں عبدالعزیز نے گورنر سے ملاقات کی۔

"قانون کی رُو سے انگریزی حکومت کسی کو پھانسی تو دے سکتی ہے مگر لاش اپنے قبضے میں نہیں کر سکتی۔ لاش تو آپ کو ہر حال میں وارثوں کے حوالے کرنی پڑے گی۔"

"شہر میں فساد کا خطرہ ہے اس لیے لاش یہاں نہیں لائی جا سکتی۔" گورنر نے دلیل پیش کی۔

"آپ کو یقین ہے کہ آپ لاش نہیں دیں گے تو فساد نہیں ہوگا؟"

"میرا خیال یہی ہے۔"

"آپ کا خیال درست نہیں۔ لاش نہ دینے کی صورت میں فساد کا خطرہ زیادہ ہے۔" یہ ملاقات نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئی۔ میاں عبدالعزیز حالات کی بدتری کا اندیشہ ظاہر کرتے ہوئے لوٹ آئے۔

وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ احتجاج کا سلسلہ ایسا بڑھا کہ حالات قابو سے باہر ہوتے نظر آنے لگے۔ اس مرتبہ گورنر نے خود انہیں بلایا لیکن اس بار وہ اکیلے نہیں گئے بلکہ ایک وفد لے کر پہنچے۔ اس وفد میں علامہ اقبال اور سر میاں

SOLE DISTRIBUTOR of U.A.E
WELCOME BOOK SHOP
JASOOSI SUSPENSE PAKEEZA SARGUZASHT
P.O.Box 27869 Karama,Dubai Tel: 04-3961016
Fax: 04-3961015 Mobile: 050-6245817
E-mail: welbooks@emirates.net.ae
Best Export From, Pakistan
WELCOME BOOK PORT
Publisher , Exporter , Distributor
All kinds of Magazines, General Books and Educational Books
Main Urdu Bazar, Karachi Pakistan
Tel: (92-21) 32633151, 32639581 Fax: (92-21) 32638086
Email: welbooks@hotmail.com
Website: www.welbooks.com

www.pdfbooksfree.pk

محمد شفیع بھی شامل تھے۔

''گورنر صاحب، میں آپ سے پہلے بھی کہہ کر گیا تھا کہ علم الدین کی لاش اگر مسلمانوں کو نہ دی گئی تو حالات مزید خراب ہوں گے۔ اب بھی وقت ہے ورنہ یہ وقت بھی ہاتھ سے نکل جائے گا۔ مسلمان اس خرابی کی ذمے داری حکومت پر عائد کردیں گے۔''

''اگر لاش مسلمانوں کے حوالے کردی گئی اور لاہور میں اس کی نماز جنازہ ہوئی تو امن عامہ کی ذمے داری آپ لوگ قبول کرتے ہیں۔ اگر آپ لوگ گڑبڑ نہ ہونے کی یقین دہانی کروائیں تو میں فیصلہ کروں گا۔''

وفد کے ارکان اس ذمے داری کو قبول کرتے ہوئے ہچکچا رہے تھے لیکن میاں عبدالعزیز نے گورنر کو یقین دلایا کہ کوئی گڑبڑ نہیں ہونے دیں گے۔

''مسلمانوں کا مطالبہ ہے کہ لاش ان کے سپرد کی جائے۔ جب ان کا یہ مطالبہ پورا ہوجائے گا تو وہ کیوں گڑبڑ کریں گے۔''

آدھی رات کو علم الدین کی لاش میاں عبدالعزیز، علامہ اقبال اور سر میاں شفیع کے حوالے کردی گئی۔ دوسرے دن شہر میں جنازے کی نماز کا اعلان کردیا گیا۔

یونیورسٹی گراؤنڈ کے قریب رائفل رینج میں نماز جنازہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ نماز جنازہ سے قبل گورنر جنازہ گاہ میں آیا۔ میاں عبدالعزیز موجود تھے اور انتظامات کی نگرانی کررہے تھے۔

''آپ کے خیال میں کتنے لوگ جنازے میں شامل ہوں گے؟''

''اتنے لوگ شامل ہوں گے کہ زمین نظر نہیں آئے گی۔'' میاں صاحب نے جواب دیا۔

''ایک گھنٹا نماز میں رہ گیا ہے اتنے لوگ کہاں سے لاؤ گے؟''

گورنر کے جاتے ہی ہر طرف سے لوگ ہجوم در ہجوم چلے آرہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کئی لاکھ آدمی جمع ہوگئے۔ یہ جنازہ بغیر کسی تحریک کے تھا۔ بڑی بڑی تحریکوں میں بھی اتنے لوگ مشکل سے جمع ہوتے تھے۔ میاں صاحب کا کہنا درست ثابت ہوا کہ اتنے لوگ ہوں گے زمین نظر نہیں آئے گی۔

شہر میں مکمل ہڑتال تھی۔ غم غصہ بھی تھا لیکن ایک شیشہ بھی کہیں نہیں ٹوٹا۔ علم الدین شہید کو قبرستان میانی صاحب میں دفن کیا گیا۔

☆☆☆

شروع ہی سے میاں عبدالعزیز ایک ایسے ہمدرد وکیل کا روپ دھار چکے تھے جو بعض قومی نوعیت کے مقدمات مفت لڑ رہے تھے۔ خاکساروں کے وہ تمام مقدمات جو پولیس اور خاکساروں کے درمیان جھگڑے سے متعلق قائم کیے گئے تھے' میاں عبدالعزیز نے لڑے حالانکہ اس وقت وہ پنجاب اسمبلی کے رکن تھے اور پنجاب میں سر سکندر حیات کی حکومت تھی لیکن معاملہ مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان تھا اس لیے میاں صاحب پیش پیش رہے۔

اسی طرح سید عطاءاللہ شاہ بخاری کے مقدمے کی پیروی کا سہرا بھی میاں عبدالعزیز کے سر رہا۔

جنگ عظیم شروع ہوئی تو برطانوی حکومت اس جنگ کی ایک بڑی فریق تھی اور اس کی طرف سے ہندوستانیوں کو فوج میں بھرتی کر کے محاذ جنگ پر بھیجا جارہا تھا۔ مجلس احرار کا موقف یہ تھا کہ ہندوستان کے لوگ فوج میں بھرتی ہو کر جنگ میں حصہ نہ لیں۔

سر سکندر حیات ہر صورت میں انگریزوں کی حمایت کرنے پر مصر اور مجلس احرار کی آواز دبانے کے درپے تھے۔

احرار رہنما عطاءاللہ شاہ بخاری فوجی بھرتی کے خلاف تقریریں کرتے ہوئے ضلع مظفر گڑھ پہنچے تھے کہ گرفتار کرلیے گئے۔

مولانا بخاری کی گرفتاری کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ مجلس احرار کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا اور قرارداد پاس کی گئی۔

''مسلمانانِ ہند اس وقت تک اس جنگ میں حکومت برطانیہ کے ساتھ تعاون نہیں کریں گے جب تک کہ برطانیہ اسلامی ملکوں سے اپنی فوجیں واپس نہ بلالے۔ نیز ہندوستان کو مکمل طور پر آزاد نہ کردے۔''

اس قرارداد نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ ابھی تک تو عطاءاللہ شاہ بخاری گرفتار کیے گئے تھے، اب انہیں سیشن جج راولپنڈی کی عدالت میں بھیج دیا گیا۔ کوئی الزام ثابت نہیں ہوا۔ شاہ جی بری ہوگئے۔

چند ماہ بعد انہیں پھر گرفتار کرلیا گیا۔ الزام یہ لگایا گیا کہ لالہ موسیٰ میں تقریر کرتے ہوئے شاہ جی نے لوگوں کو انگریزوں کے قتل پر ابھارا تھا۔ اس تقریر کا رپورٹر لدھارام

ایک ہندو تھا، اس کو گواہ کی حیثیت سے پیش ہونا تھا۔ اس مقدمے کی سماعت ابتدا میں مجسٹریٹ کی عدالت میں ہوئی۔

شاہ جی مقدمے کی پیشی کے لیے کمرہ عدالت میں پیش ہوئے۔ لدھارام ہیڈ کانسٹیبل بھی سرکاری گواہ کی حیثیت سے پیش ہوا جس نے تقریر کے نوٹ لیے تھے اور مبینہ طور پر حکام بالا کی خاص ہدایات کے مطابق اس تقریر میں ردوبدل کردیا تھا۔

گواہ عدالت میں حاضر ہوا اور اپنے سامنے میاں عبدالعزیز کو دیکھا جو فوجداری مقدمات میں مانے ہوئے وکیل تھے۔ میاں صاحب نے کچھ اس انداز سے جرح کی کہ اس کے ضمیر نے سچ بات اگل دی۔

''شاہ صاحب پر وزیراعظم اور ان کے پرسنل اسسٹنٹ کی ہدایات سے جھوٹا مقدمہ بنایا گیا ہے۔''

سرکاری وکیل نے درخواست دی کہ اس مقدمے کو ہائی کورٹ میں منتقل کیا جائے کیونکہ لدھارام گواہ نے وزیراعظم کو اس مقدمے میں پھنسانے کی کوشش کی ہے۔ اب یہ معاملہ کسی عدالت ماتحت کے بس کا نہیں رہا۔

مقدمہ ہائی کورٹ میں منتقل کردیا گیا۔ ہائی کورٹ میں مقدمہ شروع ہوا تو سرکاری وکیل کے دلائل سننے کے بعد چیف جسٹس نے میاں عبدالعزیز سے پوچھا۔

''کیا آپ کو مقدمے کی ازسرنو سماعت پر کوئی اعتراض ہے؟''

میاں عبدالعزیز نے جواب دیا۔ ''مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' مقدمے کی سماعت ازسرنو شروع ہوگئی۔

یہ مقدمہ کئی مہینے چلتا رہا۔ آخر میاں عبدالعزیز سرخرو ہوئے۔ لدھارام گواہ کو عدالت نے ناقابلِ اعتبار قرار دیا اور سید عطاءاللہ شاہ بخاری کو بری کردیا گیا۔

اس مقدمے کی کامیاب پیروی کے بعد تو میاں عبدالعزیز کی شہرت بلندیوں کو چھونے لگی اور یہ معلوم ہونے لگا کہ جب تک میاں عبدالعزیز ہیں انگریز حکومت کسی مسلمان کو بے جا مقدمے میں نہیں پھانس سکے گی چنانچہ میاں عبدالعزیز نے متعدد علمائے دین، زعمائے قوم اور سیاسی و مذہبی قائدین کے مقدمات لڑے اور تمام میں کامیاب ہوئے۔

مولانا ظفر علی خاں ایک نہیں کئی مرتبہ جیل گئے اور مقدمات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے ہر مقدمے کی سماعت میاں صاحب نے ہی کی۔

مردم خیز

سن 32 یا 33 کا ذکر ہے' میں (میاں عبدالعزیز) چند دوستوں کی معیت میں علامہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا' دوستوں نے حسب معمول علامہ صاحب سے شکوہ کیا کہ ''حضور اب مسلمانوں کا کیا ہوگا؟''

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ ''تمہیں کیا فکر ہے۔ اللہ مالک ہے۔'' پھر ایک دم پوری توجہ کے ساتھ بول اٹھے۔ ''آپ نے کبھی یہ نہیں دیکھا کہ زمیندار ایک دفعہ جس زمین میں گندم بوتا ہے اس زمین کے کسی ٹکڑے کو خالی چھوڑ دیتا ہے صرف اس لیے کہ آئندہ سال وہ ٹکڑا زیادہ طاقت سے فصل پیدا کرسکے۔ اسی طرح بعض زمینیں مردم خیز بھی ہوتی ہیں۔ کبھی اس میں بڑے بڑے نامور لوگ پیدا ہوتے ہیں اور پھر خاموشی طاری ہوجاتی ہے۔ بھئی، یہ قانونِ قدرت ہے۔ عربستان، افغانستان اور ایران نے کیسے کیسے شہسوار پیدا کیے مگر اب کیوں پیدا نہیں ہورہے صرف اس لیے کہ منشائے ایزدی کے مطابق یہ زمینیں آرام کررہی ہیں۔ دعا کرو کوئی اللہ کا بندہ پیدا ہو اور ہم لوگوں کی نجات کا موجب بنے۔'' یہ فقرہ کہتے ہوئے علامہ صاحب آبدیدہ ہوگئے۔ اس وقت ان کا چہرہ دیکھنے کے قابل تھا۔ نہایت سرخ، آنسو ضبط کرنے کی لاکھ کوشش کرتے مگر وہ ٹپک ہی جاتے تھے۔

ایک دفعہ جیل سے رہا ہوئے تو انگریزی حکومت کے ڈر سے کوئی انہیں اپنے گھر میں جگہ دینے کو تیار نہیں تھا کہ کہیں ان سے ہمدردی کی وجہ سے وہ بھی حکومت کے عتاب کی زد میں نہ آجائے۔ میاں صاحب نے کسی خوف کی پروا نہیں کی اور رہا کروا کے انہیں اپنے گھر لے آئے جہاں انہوں نے دو مہینے تک قیام کیا۔

یہ تیاریاں اس لیے ہورہی تھیں کہ 1945ء کے انتخابات ہونے والے تھے۔ یہ انتخابات اس لحاظ سے بہت اہم تھے کہ انہی انتخابات پر ملک کی آزادی اور پاکستان کے قیام کا انحصار تھا۔ برصغیر کی تمام سیاسی جماعتیں کامیابی سے ہم کنار ہونے کے لیے جدوجہد کررہی تھیں۔

پنجاب کی سیاست براداریوں کے گرد گھومتی تھی۔

www.pdfbooksfree.pk

آرائیں برادری بہت بڑی تھی۔ میاں عبدالعزیز بھی اسی آرائیں برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ قائداعظم نے انہیں خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ وہ اپنی برادری میں انتخاب کے لیے کام کریں۔ مسلم لیگ کے لیے راہ ہموار کریں۔ ان کے آپس کے اختلافات دور کر کے سیاسی شعور بیدار کریں۔

جنگ ختم ہونے کے ساتھ ہی سلطنت برطانیہ کے ہر حصے میں انتخابات کی گہما گہمی شروع ہوگئی تھی۔ ہندوستان بھی سلطنت برطانیہ کا ایک حصہ تھا۔ مرکزی اسمبلی توڑ دی گئی تھی۔ بعض صوبائی اسمبلیوں میں انتخابات کا اعلان بھی کر دیا گیا تھا۔ جن صوبوں میں اسمبلیاں کام کر رہی تھیں وہ بھی بس ٹوٹنے والی تھیں۔

صوبہ پنجاب میں بھی انتخابات ہونے والے تھے۔ سیاسی امیدوار مختلف برادریوں کو اپنے حق میں کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

خاکساروں کے سوا سب ہی جماعتیں مضبوط تھیں اور تجربہ کار بھی۔ مسلم لیگ مسلمانوں کی نمائندہ بن کر ابھر رہی تھی لیکن حریفوں سے مقابلہ سخت تھا۔

سب سے پہلے یونینسٹ پارٹی کے سحر کو توڑنا تھا کیونکہ حکومت اسی کی تھی۔ میاں عبدالعزیز نے آرائیں برادری کو متحد کرنے کے لیے یونینسٹ پارٹی اور اس کی حکومت کی ناقص کارکردگی کو اپنی برادری کے سامنے بیان کیا۔

''یونینسٹ پارٹی کے خداوندوں نے ہماری برادری کے ساتھ جو کچھ کیا وہ ہم بھلا نہیں سکتے۔ اس پارٹی کے بزرگوں نے نہ تو ہم راعیوں کو زراعت پیشہ سمجھا اور نہ اس نے ہمیں وہ حقوق دیے جس کے ہم ہر طرح سے مستحق تھے۔ ملازمتوں، تقسیم مناصب وغیرہ میں ہمیں ہمیشہ نظر انداز کیا۔ اب بھی اگر کوئی آرائیں بلا سوچے سمجھے کوئی امداد یونینسٹ پارٹی کی کرے تو سخت غلطی کرے گا۔

اسلامی جماعتیں انتخابات کی تیاری کر رہی ہیں تو پھر کیوں ہماری انجمن راعیان ہند ان سے گفت و شنید نہیں کرتی اور کیوں اپنے حقوق ان کے سامنے پیش نہیں کرتی۔

عوام کی اس وقت انتخاب میں حصہ لینے والی جماعتوں میں سے زیادہ ہمدردی لیگ کے ساتھ ہے کیونکہ مسلم لیگ ایک آل انڈیا جماعت ہے۔

میں اپنے بھائیوں سے یہ گزارش کروں گا کہ اس وقت تک کسی فرد واحد یا جماعت سے وعدہ نہ کریں جب تک ان کی انجمن اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہ کرے۔''

انتخابات نزدیک آئے تو میاں عبدالعزیز بھی ووٹروں کے نام ایک گشتی مراسلہ جاری کیا جس میں ووٹروں سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ اپنے ووٹوں کا اندراج ضرور کروائیں۔

''دوسری قومیں تو اپنے آپ کو منظم کر کے جنگِ آزادی میں کود چکی ہیں لیکن ہم ابھی تک اپنے آپ سے بے خبر ہیں۔ ہمارا قومی فرض ہے کہ ہم آئندہ انتخابات سے پورا فائدہ اٹھائیں۔ یہ ہم اسی حالت میں کر سکتے ہیں کہ آئندہ اسمبلی کے لیے زیادہ سے زیادہ ووٹ درج کروائیں۔

قوموں کی زندگی کا انحصار ووٹروں کی کثرت پر ہے۔ وہ قوم جن کے ووٹروں کی تعداد زیادہ ہو حقیقی معنوں میں زندہ قوم ہے۔ آج ہم نے اپنی زندگی کا ثبوت دینا ہے اور دکھانا ہے کہ پنجاب میں مسلمان آبادی کے لحاظ سے ہی اکثریت میں نہیں بلکہ ان میں ووٹروں کی بھی کثرت ہے۔''

☆☆☆

پنجاب میں انتخابات ہو چکے تھے جس میں مسلم لیگ کو کامیابی ہوئی لیکن مسلم لیگ کے بجائے کولیشن وزارت بن گئی۔ میاں عبدالعزیز کے کاغذاتِ نامزدگی ایک سازش کے تحت مسترد کر دیے گئے تھے۔ وہ قائداعظم کی ہدایت کے مطابق آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخاب لڑ رہے تھے۔

برطانیہ کی طرف سے وزارتی مشن تصفیہ کی نئی اسکیم لے کر آیا جو تین وزیروں پر مشتمل تھا۔ اس وزارتی مشن کی تجویز کے دو حصے تھے۔ ایک کا تعلق مرکز میں عبوری حکومت کے قیام سے تھا۔ دوسرے حصے کا تعلق ملک کے مستقل انتظامات سے تھا۔ آخری حصے کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندوستان کے صوبوں اور ریاستوں کی ایک یونین قائم کی جائے جس کے سپرد دفاع، امور خارجہ اور خزانہ ہوں۔ صوبوں کو اندرونی خود مختاری دی جائے اور انہیں تین گروہوں میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ جو صوبے پاکستان کے مطالبے کے پیشِ نظر یکجا ہونا چاہیں وہ اپنا ایک گروپ بنا لیں۔

ان تجاویز میں چونکہ پاکستان کے مطالبے کی تکمیل نہ ہوتی تھی اس لیے مسلمانوں نے اسے مسترد کر دیا۔ ممبئی مسلم لیگ کے اجلاس میں ''راست اقدام'' کا عزم کیا اور پہلے مرحلے میں مسلم لیگیوں نے خطابات ترک کرنے شروع کر دیے۔ راست اقدام کا سنتے ہی ہندوؤں نے مسلمانوں سے لڑنے کی تیاری کر لی۔ کلکتہ میں ہولناک فساد ہوا جس میں ہزاروں ہلاک، ہزاروں مجروح ہوئے پھر ممبئی، الہ آباد،

نواکھلی ہر جگہ خون کی ہولی کھیلی جانے لگی۔

حالات اس نہج پر پہنچ گئے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا یک جا زندگی بسر کرنا غیر ممکن ہوگیا۔ کابینہ مشن مایوس ہو کر واپس چلا گیا اور ہندوستان میں ایک عبوری وزارت قائم کر دی گئی جس میں کانگریس اور لیگ کو نمائندگی دی گئی۔

عبوری حکومت کی یہ نیا زیادہ دن نہ چل سکی۔ پنجاب کے وزیراعظم ملک خضر حیات نے فسادات کا بہانہ بنا کر مسلم لیگیوں کی گرفتاریوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مسلمانوں میں وہ نامقبول ہوتے چلے گئے۔

خضر حیات شاید اب بھی ڈٹے رہتے لیکن وزیراعظم برطانیہ کی جانب سے یہ اعلان آگیا کہ حکومت برطانیہ اختیارات حکومتِ ہندوستانیوں کی طرف منتقل کرنے والی ہے تو خضر حیات کو اپنی کمزور پوزیشن کا احساس ہوا۔ انہوں نے تو عزت اسی میں سمجھی کہ استعفیٰ دے دیں۔ انہوں نے اس بیان کے ساتھ استعفیٰ دے دیا۔

''میں اب تک پنجاب میں کولیشن وزارت کے قیام کا حامی ہوں اور جہاں تک ملت اسلامیہ کا تعلق ہے میں اس کے مطالبات کی پوری پوری تائید کرتا ہوں لیکن چونکہ انتقالِ اختیارات ہونے والا ہے اس لیے میں مسلم لیگ کے لیے میدان خالی کر رہا ہوں تاکہ وہ حتی الامکان وزارت مرتب کرے۔''

ملک خضر حیات کے استعفیٰ کے ساتھ ہی بند ٹوٹ گیا۔ لاہور اور دوسرے مقامات پر ہندوؤں اور سکھوں کے متحدہ جلسے ہونے لگے۔ ان جلسوں نے فرقہ واریت کو ہوا دی۔ صوبے بھر میں فسادات شروع ہوگئے۔ دوسرے مقامات میں ہندوؤں اور سکھوں نے قیامت مچا دی۔

مائونٹ بیٹن ہندوستان کے وائسرائے مقرر ہو کر آئے۔ انہوں نے آتے ہی گاندھی جی اور قائداعظم کے دستخطوں سے ایک اعلان شائع کروایا جس میں اہلِ ملک کو امن و امان سے رہنے کی نصیحت کی گئی تھی۔

یہ اعلانات بے کار گئے۔ فسادات زور پکڑتے گئے۔ امرتسر اور لاہور دونوں شہروں میں امن و امان ختم ہو چکا تھا۔ لاہور سے ہندو آبادی بھاگ رہی تھی۔ امرتسر کے مسلمان لاہور کا رخ کر رہے تھے۔

فسادات کی آندھی ہولناک نشانات چھوڑ کر رخصت ہوئی تو دونوں طرف کی حکومتیں اپنے اپنے زخم بھرنے میں مصروف ہوگئیں۔ سب سے بڑا مسئلہ شرنارتھیوں اور مہاجرین کی آبادکاری کا تھا۔

میاں عبدالعزیز نے یہ دن خاموشی سے گزارے اور تذلیلِ انسانیت کے مظاہرے دیکھتے رہے۔ اس دور میں خاموش ہی رہا جا سکتا تھا۔ کچھ دن پہلے تک ہندو اور سکھ دونوں میاں صاحب کے عقیدت مند تھے لیکن اب سب کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔

فسادات کی آگ سرد ہوئی اور وہ گھر سے نکلے تو شہر کی صورت ہی بدلی ہوئی دیکھی۔ تمام صورتیں اجنبی نظر آ رہی تھیں۔ تمام سڑکوں پر ہزاروں لوگ مختلف چیزوں کے خوانچے لگائے بیٹھے تھے۔ یہ سب مہاجرین تھے۔ جن کا سب کچھ برباد ہو گیا تھا۔

وہ آدھے راستے سے لوٹ آئے۔ اپنی کوٹھی کے دروازے مہاجرین کی شکایات سننے کے لیے کھول دیے۔ مہاجروں کی مالی امداد کے لیے ساتھی وکلا کی ایک کمیٹی بنائی۔

ان کی کوٹھی مہاجرین کا سینٹر بنی ہوئی تھی جہاں ان کو

شکوہ

میں (میاں عبدالعزیز) اور ڈاکٹر اقبال چیف کورٹ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ باتیں کر رہے تھے۔ دو ڈھائی بجے ہوں گے تو وہ مجھے کہنے لگے۔ ''تم نے مقدمہ تیار کر لیا؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں۔''

کہنے لگے۔ ''چلو مکان پر چائے وہیں پیں گے۔'' چنانچہ ہم دونوں اس انارکلی والے مکان میں جو شیخ نصیر الدین کیمسٹ کی دکان کے اوپر تھا گئے۔

اقبال کہنے لگے۔ ''میں نے ایک نظم لکھی ہے جو میں چاہتا ہوں تمہیں سناؤں۔'' جب نظم سنا چکے تو کہنے لگے۔ ''میں سوچ رہا ہوں اس کا نام کیا رکھوں؟''

میں نے کہا۔ ''آپ نے تو اس کا نام خود ہی تجویز کر دیا ہے۔''

کہنے لگے۔ ''کیا؟''

میں نے کہا۔ ''شکوہ۔''

کہنے لگے۔ ''بہت خوب! اس کا نام شکوہ رکھوں گا۔'' یہ تھی اقبال کی مشہور نظم شکوہ جس پر بڑی لے دے ہوئی اور اقبال کو جواب شکوہ بھی لکھنا پڑا۔

www.pdfbooksfree.pk

بسانے کا انتظام بھی کیا جاتا تھا اور ان کی مالی امداد بھی کی جاتی تھی۔ جو مہاجرین اپنی جائدادیں چھوڑ کر آئے تھے انہیں کلیم داخل کروانے میں بھی طرح طرح کی دقتیں پیش آرہی تھیں۔ انہیں صحیح معاوضہ دلانے کے لیے میاں صاحب کی بنائی ہوئی وکلا کی کمیٹی کام آئی۔

یہ وقت ہی ایسا تھا کہ صاحبِ ثروت افراد بھی ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ اس وقت کسی سے چندہ وصول کرنا آسان نہیں تھا لیکن میاں صاحب پر سب ہی بھروسا کرتے تھے۔ میاں صاحب نے اپنے ذاتی تعلقات استعمال کیے اور مہاجرین کی آبادکاری کے لیے رقم اکٹھی کرکے ان پر خرچ کی۔

مہاجروں کے لیے جو سرکاری سینٹر بنائے گئے تھے میاں صاحب ان سینٹروں سے زیادہ کام کررہے تھے۔ جس کو ذرا بھی شکایت ہوتی سرکاری سینٹروں میں جانے کے بجائے میاں صاحب کی کوٹھی کا رخ کرتا تھا۔

ان کی عمر 75 سال ہوگئی تھی لیکن مہاجروں کا دکھ دیکھ کر وہ یوں اٹھ کھڑے ہوتے جیسے پھر سے جوان ہوگئے ہوں۔

☆☆☆

ان کی نظر کئی سال پہلے سے کمزور ہونا شروع ہوگئی تھی۔ اب اس کمزوری میں بڑی تیزی سے اضافہ ہورہا تھا۔ علاج چلتا رہا اور بالآخر یہ طے ہوا کہ آنکھ کا آپریشن کروالیا جائے۔ ڈاکٹروں کا بھی یہی مشورہ تھا کہ آپریشن کے بعد نظر بحال ہوجائے گی۔ ایک ماہر ڈاکٹر سے آپریشن کروایا گیا۔ وائے قسمت کہ آپریشن کامیاب نہ ہوا۔ بینائی جاتی رہی۔

دنیا اندھیر ہوگئی تھی۔ جس پاکستان کا خواب دیکھا تھا وہ پورا ہوگیا تھا۔ اب اسے پھلتے پھولتے دیکھنے کا وقت تھا کہ بینائی چلی گئی۔ نئے پاکستان کی خدمت کے لیے بہت عزائم دل میں تھے جن کی تکمیل اب مشکل نظر آرہی تھی۔

ثابت قدمی اور اللہ کی رضا پر شاکر رہنا ان کی فطرت میں شامل تھا۔ بینائی چلی جانے کے بعد بھی نہ کوئی افسوس تھا نہ حرفِ شکایت زبان پر۔ دوستوں کو البتہ افسوس ہوتا تھا لیکن وہ اسے اللہ کی مرضی کہہ کر سب کو خاموش کردیتے تھے۔

''اللہ کی مرضی یہی تھی۔ اس نے اس جہان میں بڑی عزت دی۔ بہت دنیا دیکھی۔ اب اس کی رضا پر خوش ہوں۔''

ایسے ہی دوستوں میں سے ایک نے یہ تجویز دی کہ ایک ماہر چشم بیرونِ ملک سے آیا ہوا ہے۔ اگر اسے بھی دکھالیا جائے تو کیا حرج ہے۔

''مجھے اپنی بینائی زائل ہونے کا افسوس ضرور ہے لیکن میں اللہ کی ذات سے مایوس نہیں۔ مرض پر رونا دھونا ایک بات ہے اور علاج کے لیے کوشاں رہنا دوسری بات ہے۔ میں اس ڈاکٹر کو ضرور دکھاؤں گا۔''

اسی وقت اپنے بڑے بیٹے عبدالحمید کو بلایا اور ہدایت کی کہ مذکورہ ڈاکٹر سے وقتِ ملاقات لے کر انہیں اس ڈاکٹر کے پاس لے چلیں۔

گھر میں خوشی کا ماحول تھا۔ جس عزم وامید کے ساتھ وہ ڈاکٹر کے پاس جارہے تھے اس سے یہی لگتا تھا کہ خدا ان کی سن لے گا لیکن جب گھر واپس لوٹے تو چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

''بھئی، یہ ڈاکٹر اپنے فن میں ماہر نہیں، کہتا ہے بینائی بحال نہیں ہوسکتی۔ چلو قدرت کوئی اور انتظام کرے گی ورنہ خدا کی مرضی۔''

اس کے بعد جب بھی سنتے کہ کوئی ڈاکٹر یہاں آیا ہے تو اس سے ضرور ملتے اور مشورہ لیتے۔ جب ہر طرف سے انکار کی صدائیں آنے لگیں تو اپنی ہسٹری شیٹ یورپ کے ایک ڈاکٹر کے پاس بھیجی اور لکھا کہ اگر علاج ممکن ہے تو میں وہاں آنے کو تیار ہوں۔ وہاں سے بھی جواب نفی میں آیا۔ اس کے بعد انہوں نے کسی ڈاکٹر کو نہیں دکھایا۔

بینائی چلی گئی تھی۔ معمولاتِ زندگی میں فرق آگیا تھا لیکن کوئی مایوسی نہیں تھی۔ اخبارات کسی سے سن لیا کرتے تھے۔ پاکستان کے سیاسی حالات کی طرف سے سخت فکرمند تھے لیکن مایوس اب بھی نہیں تھے۔ امید کی کرن ہر وقت ساتھ رہتی تھی۔

جدوجہد آزادی کے بہت سے سپاہیوں کی طرح انہیں بھی فراموش کردیا گیا تھا۔ انہیں دکھ تھا تو صرف اس بات کا۔ 1966ء میں عمر عزیز 94 سال کی ہوچکی تھی کہ حج بیت اللہ کا ارادہ باندھا۔ بینائی زائل ہوگئی تھی لیکن قویٰ مضمحل نہیں ہوئے تھے۔

بیٹے، بہو اور دو ملازموں کے ساتھ رختِ سفر باندھا۔ تین چار دن کراچی میں اپنے اعزہ کے ساتھ ٹھہرنے کے بعد بحری سفر کا آغاز کیا۔

جہاز جدہ پہنچا تھا کہ حکومت پاکستان کے حج آفیسر شیخ

اعزاز نیاز جہاز پر آئے اور کسٹم وغیرہ کا مرحلہ آسان کروادیا۔ حاجیوں کے لیے گورنمنٹ نے یہ انتظام کیا تھا کہ تمام حجاج جدہ سے سیدھے مدینہ منورہ جائیں گے لیکن انہیں پہلے عمرہ ادا کرنا تھا لہٰذا شیخ اعزاز نیاز نے اسی وقت اسٹیشن کار کا انتظام کردیا۔ رات کا ڈیڑھ بجا تھا کہ میاں صاحب اپنے ہمسفروں کے ساتھ مکہ معظمہ پہنچے اور عمرے کے ارکان ادا کیے۔ شیخ اعزاز یہاں بھی ساتھ تھے لہٰذا سہولتیں ملتی رہیں۔ دوسرے دن پھر جدہ پہنچ گئے۔ حجاج کرام مدینہ جانے کی تیاری کررہے تھے کہ یہ بھی بذریعہ کار مدینہ منورہ روانہ ہوگئے۔

مدینہ منورہ سے پھر جدہ آگئے۔ یہاں سے مکہ پہنچے۔ رہائش کے لیے مکان پہلے ہی لے لیے گئے تھے۔ حج سے فراغت کے بعد یوم عید کو مزدلفہ منیٰ کے لیے روانگی ہوئی۔ منیٰ پہنچ کر اس مکان میں ٹھہرے جو کرائے پر لے لیا گیا تھا۔ یہاں انہیں اطلاع ملی کہ وائس چانسلر مدینہ یونیورسٹی ان سے ملاقات کے متمنی ہیں۔ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ وائس چانسلر سے ملاقات کے لیے پہنچے۔

وائس چانسلر ایک بڑے خیمے میں اقامت پزیر تھے۔ ان کا نام بھی عبدالعزیز تھا اور پیدائشی نابینا تھے۔ میاں عبدالعزیز بھی اب نابینا ہوچکے تھے۔ لوگ اس منظر کو دیکھ رہے تھے کہ دو نابینا باہم گلے مل رہے ہیں۔

بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ جب خیمے سے باہر نکلے تو کسی نے بتایا کہ اس وقت ہم شاہ فیصل کے محل کے سامنے ہیں۔ سنتے ہی تڑپ گئے۔

''چلئے ان سے ملاقات کریں۔''

''جب تک پہلے سے وقت نہ لیا ہو، ان سے ملاقات نہیں ہوسکتی۔'' ان صاحب نے بتایا۔

''ملاقات نہ ہوئی تو کوئی حرج نہیں کوشش تو کردیکھیں۔ شاید وہ ملاقات کا شرف بخش ہی دیں۔''

یہ صاحب جو اس وقت ان کے ساتھ تھے حافظ احسان الٰہی تھے۔

حافظ صاحب ان کے اصرار پر محل میں داخل ہوگئے۔ محل کے ایک کمرے میں چند اشخاص بیٹھے ہوئے تھے۔ حافظ صاحب عربی جانتے تھے۔ انہوں نے ان لوگوں سے کہا کہ ہم لوگ پاکستان سے آئے ہیں اور شاہ فیصل سے ملاقات چاہتے ہیں۔ ان لوگوں میں سے ایک کسی طرف غائب ہوگیا۔ غالباً وہ اجازت لینے گیا تھا۔ چند منٹ بعد

سوانحی خاکہ

نام.....میاں عبدالعزیز
والد.....مولوی الٰہی بخش
آبائی شہر.....لاہور
روانگی.....انگلستان 1895ء
عارضی قیام.....ہوشیار پور
تکمیل بیرسٹری.....1898ء
عہدے.....صدر لاہور میونسپل کارپوریشن، رکن پنجاب لیجسلو اسمبلی لاہور، صدر پنجاب صوبائی مسلم لیگ، رکن صوبائی اسمبلی (پنجاب)، میئر لاہور کارپوریشن (بعد از قیام پاکستان)
پیدائش.....امرتسر (1872)
تدفین.....مصری شاہ قبرستان (لاہور)

واپس آیا۔ اجازت مل گئی تھی۔ وہ ان دونوں کو ایک طویل و عریض کمرے میں لے گیا جو خوب صورت کرسیوں سے مزین تھا۔

شاہ فیصل اپنی جگہ سے اٹھ کر آگے آئے اور میاں عبدالعزیز کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ میاں صاحب چونکہ عربی نہیں جانتے تھے لہٰذا انگریزی میں گفتگو کا آغاز کیا۔

''میں لاہور سے آیا ہوں اور سلام عرض کرنے کی غرض سے حاضر ہوا ہوں نیز کچھ مفروضات بھی پیش کرنے کا خواہش مند ہوں۔''

حافظ احسان الٰہی کے ذریعے عربی میں گفتگو ہوتی رہی۔ جتنی دیر گفتگو ہوئی شاہ فیصل، میاں صاحب کا ہاتھ مسلسل اپنے ہاتھوں میں لیے رہے۔

حافظ صاحب نے شاہ فیصل کو بتایا۔ ''میاں صاحب کی عمر 94 سال ہوچکی ہے۔ اس کے باوجود آپ جوانوں کی طرح سفر پر نکلے ہیں۔''

شاہ فیصل نے تین مرتبہ ماشاءاللہ کے الفاظ دہرائے۔ ان کی سماجی خدمات کا سن کر بھی بہت خوش ہوئے۔ یہ ملاقات تقریباً دس منٹ جاری رہی۔ اس کے بعد مصافحہ کرنے کے بعد شاہ فیصل نے رخصت کیا۔

ان بیش قیمت یادوں کو لے کر وہ اور ان کے ساتھی جدہ آگئے۔ اب واپسی کا سفر درپیش تھا۔ جدہ سے عدن پہنچے

www.pdfbooksfree.pk

اور پھر کراچی۔

اعزہ کو آمد کی اطلاع ہو چکی تھی لہٰذا بہت سے عزیز ائرپورٹ پر موجود تھے۔ یہ 23 .... اپریل 1966ء تھی جب ان کا جہاز لاہور ائرپورٹ پر اترا۔

1966ء کی ایک چمکیلی صبح تھی جب کچھ لوگوں نے آپ کے دروازے پر دستک دی۔ ملازم نے آکر بتایا کہ ریڈیو پاکستان کی طرف سے کچھ لوگ ملاقات کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔

''شاید انٹرویو وغیرہ کا کوئی سلسلہ ہوگا۔'' آپ نے ملازم سے کہا۔ ''عبدالحمید یا عبدالمجید (بیٹے) میں سے کوئی ساتھ رہے تاکہ انٹرویو کے دوران میری معاونت ہو سکے۔ بہت سی باتیں میں بھول بھی گیا ہوں۔ وہ یاد دلا دیں گے۔

جب آنے والے اندر آئے تو حقیقت حال کچھ اور ہی تھی۔ معلوم ہوا ریڈیو پاکستان کی طرف سے نشر و اشاعت کی اصلاح کے لیے ایک سوال نامہ جاری کیا گیا تھا جو مختلف حضرات کی خدمت میں بھیجا گیا تھا۔ یہ لوگ خود ان کے پاس چل کر آئے تھے تاکہ بالمشافہ ایسی تجاویز حاصل کریں جس سے ریڈیو کا نظام بہتر بنایا جا سکے۔

''میاں صاحب، آپ ریڈیو سنتے ہیں؟''

''اب فرصت کا مشغلہ یہی رہ گیا ہے۔''

''اس ادارے کی کارکردگی اور اس کے نقائص بھی آپ کے سامنے ہوں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ کے مشوروں سے استفادہ کریں اور آپ کے مشوروں پر عمل کرتے ہوئے ریڈیو کا نظام بہتر بنائیں۔''

''بھئی میرا پہلا مشورہ تو یہ ہے کہ صبح کے پروگرام میں راگ رنگ کی بے ہودگی کا کوئی دخل نہیں ہونا چاہیے۔ جناب یہ وقت کھیل کود کا نہیں ہوتا بلکہ کام کاج اور اصلاح کا ہے۔'' ریڈیو کے ارکان نے ان تجاویز کو ایک کاغذ پر لکھنا شروع کر دیا۔

''ایسا انتظام کیا جائے کہ دورانِ تلاوت کلام پاک، درس قرآن یا خبروں کے وقت بجلی کے سوئچ نہ بدلنے پائیں جس سے ریڈیو بند ہو جاتا ہے۔ بجلی اور ریڈیو دونوں سرکاری محکمے ہیں اس لیے ان میں باہمی ربط بہت ضروری ہے۔''

''جناب پچھلے دنوں میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی ماہانہ نشری تقریر سن رہا تھا۔ یہ تقریر عین مغرب کے وقت ہوتی رہی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہر سہ ماہی کے بعد پروگراموں کے اوقات تبدیل ہوتے رہیں کیونکہ نمازوں کے اوقات کار میں تبدیلی آجاتی ہے۔ ایوب خان کی تقریر کے ساتھ یہی ہوا تھا۔''

''ہر مجلس کا آغاز تلاوت کلام پاک اور اس کے ترجمے سے ہونا چاہیے خواہ پانچ منٹ کے لیے ہی کیوں نہ ہو۔''

''تقاریر یا خبروں کا اظہار یک طرفہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ حزب اختلاف کو بھی اپنے خیالات کے اظہار کا موقع ملنا چاہیے۔ اخبارات کے اقتباسات سنائے جاتے ہیں۔ اس میں صرف سرکاری اخبارات کو نہ لیا جائے۔''

''ریڈیو پاکستان پر محرم کے دس روزہ پروگرام میں راگ رنگ کے پروگراموں کی قطعی ممانعت ہوتی ہے۔ ماہ رمضان المبارک بھی چونکہ پوری مسلم قوم کے لیے بابرکت اور عبادتوں کا مہینہ ہے اس مہینے میں بھی طبلہ سارنگی پر پابندی ہونی چاہیے۔''

''بچوں کے لیے کہانیاں تاریخ اسلام سے لی جائیں جو سچی بھی ہوں گی اور سبق آموز بھی۔ من گھڑت کہانیوں سے گریز کیا جائے۔''

''ریڈیو پروگرام رات بارہ بجے تک جاری رہتے ہیں۔ یہ وقت رات دس بجے تک ہونا چاہیے۔ لوگ رات بارہ بجے تک ریڈیو سنتے رہتے ہیں۔ اس سے ان لوگوں کی نیند میں خلل ہوتا ہے جو جلد سونے کے عادی ہیں۔ گھر گھر سے ریڈیو کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔''

''ریڈیو کا ماہوار رسالہ ''آہنگ'' نکلتا ہے۔ اس کی قیمت بہت زیادہ ہے۔ اسے چاہے مختصر کرنا پڑے لیکن قیمت کم کر دی جائے۔''

''خبروں کا شعبہ خاص طور پر درست اردو اور درست انگریزی کا آئینہ دار ہونا چاہیے۔ خبریں پڑھنے والے تلفظ کا خیال رکھیں۔ ایسے حضرات ملازم رکھے جا سکتے ہیں جو خبریں پڑھنے والوں کا تلفظ درست کروائیں۔''

''اسی طرح ایسے تمام پروگراموں کی بیخ کنی کی جائے جو اخلاق سوز ہیں۔ پاکستان اسلامی اصولوں پر قائم کیا گیا ہے۔ ریڈیو کو بھی اسلامی اصولوں کو مدِنظر رکھنا چاہیے۔''

ان تجاویز کے بعد بھی انہوں نے ریڈیو کی اہمیت اور اس کے ذریعے معاشرے پر پڑنے والے اثرات پر طویل تقریر کی۔ ریڈیو کے لوگ سخت متاثر ہوئے۔ ان تجاویز کو

حکام بالا تک پہنچایا بھی گیا، کچھ پر عمل ہوا کچھ پر نہیں ہوا۔

اب میاں صاحب تقریباً گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہے تھے۔ کوئی آجاتا تو اس سے مل لیتے ورنہ عبادت میں وقت گزارتے۔

اسی سال یعنی 1966ء میں قائداعظم کا یوم ولادت آیا تو صحافی ان کے پاس بھی آئے اور ان سے اس موقع پر پیغام کی فرمائش کی۔ وہ بولتے گئے اور ایک صحافی اسے قلم بند کرتا گیا۔ ان کا یہ پیغام ان کے دلی تاثرات بھی تھے اور قیامِ پاکستان کی تاریخ بھی۔

''حضرات! میری عمر اس وقت 95 سال ہے۔ آنکھوں کی بینائی جانے کی وجہ سے گوشہ تنہائی میں پڑا رہتا ہوں۔ نہ معلوم کس دن بلاوا آجائے۔ میری معلومات کے مطابق جب مسلمانوں کو بالکل بے بس کر دیا گیا تو نواب سلیم اللہ آف ڈھاکا نے مسلم لیگ کے قیام کا فیصلہ کیا۔

قائداعظم سے میری ملاقات انگلستان میں ہوئی تھی۔ وہ مجھ سے چار سال چھوٹے تھے۔ جب وہ ہندوستان واپس آئے تو انہوں نے کانگریس سے اپنا سیاسی سفر شروع کیا لیکن جب ان پر ہندو کی عیاریاں ظاہر ہوئیں تو انہوں نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی اور اس جماعت کو فعال کرنے کے لیے دن رات ایک کر دیے۔ متحدہ پنجاب میں سب سے پہلے میرے ہی غریب خانے پر اجلاس ہوا جس کی صدارت قائداعظم نے فرمائی۔ اس اجلاس میں مسلم لیگ کی تنظیم نو کا فیصلہ کیا گیا۔

یہ انہی کی دانش تھی کہ اللہ تعالیٰ نے پاکستان جیسی عظیم الشان مملکت عطا فرمائی۔ افسوس! کہ اس اعلیٰ اقدار کو ہم اپنی بے عملی سے پامال کر رہے ہیں۔ یہ ملک اس لیے بنا تھا کہ یہاں رہ کر مسلمان آزادی سے اپنے مذہبی اصولوں کو عملی جامہ پہنا سکیں گے لیکن سب کچھ اس کے برعکس ہو رہا ہے۔

ہمارے ملک میں اب تک اسلامی آئین نہیں بن سکا۔ رشوت خوری روز بہ روز عام ہوتی جا رہی ہے۔ غنڈوں کو پناہ دی جاتی ہے اور مظلوم بے چارہ در بدر کی ٹھوکریں کھاتا ہے۔

میری جب آنکھیں تھیں تو وہ نظارے دیکھے ہیں کہ ہمارے علما اسٹیج پر تقریریں کیا کرتے تھے کہ ہمارا مذہب اسلام ہے۔ ہماری ثقافت، ہمارے تمام قوانین تمام اقوامِ عالم سے الگ ہیں۔ ہم ایک الگ ملک چاہتے ہیں۔ ہماری کتاب، ہمارا دین، ہمارا قبلہ ایک ہے لہٰذا اس بات پر ہم

سلیقہ

جب علامہ اقبال کا جنازہ اٹھا تو آگے پیچھے بڑا ہجوم تھا۔ جب جنازہ دہلی دروازے میں داخل ہوا۔ تنگ بازار سے گزرا اور پانی والے تالاب کے پاس پہنچا۔ خلقت کبھی ادھر جا رہی تھی کبھی ادھر جا رہی تھی۔ بڑی بدنظمی تھی۔ یہ بدنظمی دیکھ کر کسی نے زور سے پکارا۔

''او اقبال! تو اس قوم کے لیے مر گیا جس قوم کو تیرا جنازہ اٹھانے کا بھی سلیقہ نہیں۔''

سب مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ اسی اتفاق و اتحاد کی بدولت اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ عظیم مملکت عطا فرمائی جس کو آج ہم پارہ پارہ کر رہے ہیں۔

حضرات! یہ تلخ حقائق میں نے ایک فریضہ سمجھتے ہوئے آپ کے گوش گزار کر دیے ہیں۔ اب یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اچھے اصولوں کو اپنائیں اور اپنے اس ملک کو صحیح اسلامی ملک بنائیں جس کا آئین اسلامی اور جمہوری ہو۔''

ان کا یہ پیغام اخبارات میں شائع ہوا۔ سب کی نظروں سے گزرا۔ اس نے سب کے دلوں پر اثر بھی کیا ہوگا لیکن تبدیلی کوئی نہیں آئی۔ ملک اپنی ڈگر پر چلتا رہا۔

انہیں فراموش کر دیا گیا تھا لیکن کبھی کبھی ان کی خدمات لوگوں کو یاد بھی آجاتی تھیں۔ کہیں کہیں ان کو خراجِ تحسین پیش بھی کر دیا جاتا تھا۔

''آرائیں برادری کے بزرگ میاں عبدالعزیز تحریکِ آزادی اور لاہور کی مسلم ثقافت و قیادت کی مایہ ناز یادگار ہیں۔ بزم لاہور کی یہ شمع پیرانہ سالی کے باوجود آج بھی ان روشنیوں کی امین ہے جس نے غلامی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں بھٹکتی ہوئی قوم کو منزلِ آزادی کا راستہ دکھایا۔ ظلمت کدۂ ہند میں جو بھی عوامی اور جمہوری تحریک اٹھی میاں عبدالعزیز کی فہم و فراست اور ولولہ انگیزیوں نے کسی نہ کسی رنگ میں اسے سہارا دیا اور عوامی جذبات کی یہ تند و تیز لہریں پوری توانائی کے ساتھ استبداد کی چٹانوں سے ٹکرائیں اور انہیں پاش پاش کر ڈالا۔

دہلی دروازے کے باہر میاں صاحب کی قدیم طرز کی قلعہ نما قیام گاہ کی بے نور آنکھوں نے زمانے کے لاتعداد نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ کبھی دیس پنجاب کی سیاست نے یہاں جنم لیا تھا۔ اس دیس کی سیاست اس کوٹھی میں پھلی

www.pdfbooksfree.pk

پھولی اور پروان چڑھی۔

یہی وہ مکان ہے جہاں بلبلِ ہندسروجنی نائیڈو کے مترنم قہقہے گونجے تھے۔ اسی کوٹھی نے فاضل مہمان مولانا ابوالکلام آزاد کے سنجیدہ مباحث سنے تھے۔ کبھی مولانا محمد علی جوہر اسی مکان میں ٹھہرتے تھے اور ان فضاؤں نے حکیم اجمل خاں کی حجت کا حظ اٹھایا تھا۔ سیاست کی جادہ پیمائی کے دوران مسلمانوں کے قافلہ سالار قائد اعظم اپنے ساتھیوں کے ساتھ یہیں ٹھہرے تھے۔

یہ مجلسیں تمام ہوئیں البتہ صحبتِ شب کی جلی ہوئی ایک شمع اب بھی موجود ہے اور وہ ہیں اس حویلی کے مکیں میاں عبدالعزیز بارایٹ لا، پچانوے سال کے انسان، جنہوں نے پرنس آف ویلز کے استقبال سے انکار کر کے دنیا میں تہلکہ مچادیا تھا۔

''ذرا اس واقعے پر روشنی تو ڈالیے۔''

''ٹھہریے، ذرا خیالات جمع کرلوں۔'' میاں صاحب نے اپنی بے نور آنکھوں پر پڑی پلکوں کی جھالر جھپکاتے ہوئے کہا۔ ''بس یوں سمجھئے کہ ایک طوفان آگیا تھا۔ پرنس آف ویلز کے استقبال سے کوئی انکار کردے۔ کوئی یقین کرسکتا تھا؟''

''اس انکار کی نوبت کیوں آئی تھی میاں صاحب؟''

''برادر محترم! جلیانوالہ باغ کا حادثہ ہوئے کچھ ہی دن گزرے تھے۔ شہیدوں کی ماؤں اور سوگوار بہنوں کے آنسو ابھی خشک نہیں ہوئے تھے۔ ہمیں اچھا نہیں لگا کہ قاتل قوم کے اس شہزادے کا استقبال کریں۔ ہمارا دل رو رہا تھا اور حکومت کا اصرار تھا کہ شہزادے کی راہوں میں دیدۂ دل نچھاور کیے جائیں۔ میونسپل کمیٹی ولی عہد کا استقبال کرنے کی قرارداد منظور کرے۔ میں ان دنوں میونسپل کمیٹی لاہور کا چیئرمین تھا۔ مجھ سے یہ گوارا نہیں ہوا کہ قومی غیرت کا سودا کروں۔ میں نے بائیکاٹ کی قرارداد منظور کردی۔ مجھے دھمکیاں دی گئیں لیکن میں ٹس سے مس نہیں ہوا پھر معلوم ہے کیا ہوا۔''

میاں صاحب کچھ دیر کے لیے رکے اور قدرے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''انگریز حکمرانوں کو پرنس آف ویلز کی تقریبات منسوخ کرنی پڑیں۔ فتح ان شہیدوں کی ہوئی جنہوں نے جلیانوالہ باغ، امرتسر میں سینوں پر گولیاں کھائی تھیں۔''

جلیانوالہ باغ کا ذکر کرتے کرتے اچانک ان کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ انہیں سر جان لارنس کا مجسمہ یاد آگیا۔ انہوں نے مضمون نگار سے پوچھا۔ ''تمہیں معلوم ہے سر جان لارنس کے مجسمے کی کہانی؟ چلو میں بتاتا ہوں۔ اسے بھی مضمون میں شامل کرنا۔ سر جان لارنس نے 1857ء کی جنگ آزادی میں بڑے مظالم ڈھائے تھے۔ ایسے ظالم کا مجسمہ لاہور میں نصب کردیا گیا تھا اور نیچے لکھ دیا گیا تھا کہ پرقلم سے حکومت کی جائے یا تلوار سے۔ یہ لکھ کر اہلِ لاہور کی غیرت کو للکارا گیا تھا۔

میں نے بہ حیثیت چیئرمین میونسپل کمیٹی اس کو ہٹانے کی قرارداد پیش کردی۔ گوکل چند وزیر بلدیات تھے انہوں نے قرارداد مسترد کروانے کے لیے خوب شور مچایا اور دھمکی بھی دی کہ بلدیہ کا جو اہلکار مجسمے کے احاطے میں داخل ہو گرفتار کرلیا جائے گا۔

مجھے انگریز گورنر نے طلب کیا اور پوچھا یہ مجسمہ تمہارا کیا لیتا ہے جو تم اس کے پیچھے پڑ گئے ہو۔ میں نے کہا یہ مجسمہ عوام کو دکھ دیتا ہے اور حکومت کا کام عوام کو دکھ دینا نہیں۔ اگر آپ کو اتنا ہی عزیز ہے تو اسے گورنمنٹ ہاؤس کی زینت بنالیجیے مگر یہاں سے ہٹا دیجیے ورنہ عوام خود اسے ہٹادیں گے۔

لوگوں کو معلوم ہوگیا تھا کہ مجھے گورنر نے بلایا ہے۔ انہیں ڈر ہوا ہوگا کہ کہیں مجھ پر کوئی دباؤ ڈالا جائے۔ کسی من چلے نے رات کی تاریکی میں مجسمے کا ہاتھ قلم کردیا۔

حکومت کو عوام کے تیور کا علم ہوگیا تھا لہٰذا اس کی عبارت تبدیل کردی گئی۔

''میں قلم اور تلوار سے تمہاری خدمت کروں گا۔''

اب یہ لارنس کا نہیں ایک خادم کا مجسمہ تھا۔

یہ اور اس جیسے دوسرے بہت سے سوالات ہوئے اور مضمون لکھ دیا اور ہفت روزہ نصرت (لاہور) میں شائع ہوا۔

ممتاز حسن مشہور ادیب تھے اور مختلف سرکاری عہدوں پر رہ چکے تھے۔ اس وقت نیشنل بینک کے مینجنگ ڈائریکٹر تھے۔ قائداعظم اور لیاقت علی خان کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے۔ اقبال کے عاشقوں میں تھے۔ فکرِ اقبال پر کئی مضامین تحریر کرچکے تھے۔ انہیں خیال آیا کہ میاں عبدالعزیز کی اقبال سے دوستی تھی۔ انہیں بہت سے واقعات یاد ہوں گے۔ اب وہ چراغ آخر شب ہیں نہ جانے کب رخصت ہوجائیں۔ ان سے اقبال کے بارے میں کچھ باتیں کرلی جائیں۔ انہیں محفوظ کرلیا جائے۔ کچھ دوسری باتیں بھی ہوجائیں گی۔ انہوں نے چند اور علمی شخصیات کو ساتھ لیا اور میاں صاحب کا انٹرویو ریکارڈ کرنے پہنچ گئے۔ ان شخصیات میں پروفیسر حمید احمد خاں، مولوی ظفر اقبال، چوہدری محمد شفیع وغیرہ تھے۔ گفتگو کی ابتدا ممتاز حسن نے کی۔

''قبلہ، میں آپ سے آج استفادہ کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کے اور علامہ اقبال کے تعلقات کیسے تھے اور آپ سے ان کی پہلی ملاقات کب ہوئی۔ اس کے بعد ملنے کے کیا کیا مواقع آتے رہے؟''

میاں صاحب نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا۔ ''مجھے پہلی مرتبہ انجمن حمایت اسلام لاہور کے 1902ء کے اجلاس میں ان کی نظم سن کر خواہش ہوئی کہ ان سے ملاقات کروں لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔ تاہم ان سے بھائی دروازے میں جہاں وہ رہتے تھے ملنے کا اتفاق ہوا۔''

''وہ نظم یاد ہے کون سی تھی؟''

''غالباً نظم یہ تھی

نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

ملاقاتیں تو اور بھی ہوئیں لیکن ان سے بے تکلفی اس وقت ہوئی جب میں نے ہوشیار پور میں اسکول کا سنگِ بنیاد رکھنے کے لیے وقار الملک سے درخواست کی۔ دوسرے زعما بھی میری دعوت پر ہوشیار پور آئے۔ ان میں اقبال بھی تھے۔ یہاں ڈاکٹر صاحب سے میرے تعلقات استوار ہوئے پھر جب بھی میں لاہور آتا تھا ڈاکٹر صاحب سے ملتا تھا پھر کسی مقدمے کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب ہوشیار پور آئے تو ہر وقت کی ملاقاتیں رہنے لگیں۔ ان مجلسوں میں غلام قادر گرامی بھی شریک ہوتے تھے جو فارسی کے استاد شاعر تھے۔ گرامی صاحب کو سن کر ہی اقبال کو شوق ہوا تھا کہ وہ بھی فارسی میں شعر کہیں۔ گرامی صاحب نے کہا اگر اقبال فارسی میں شعر کہہ کر بھیج دیا کریں تو وہ ان کی اصلاح کر کے بھیج دیا کریں گے۔ طے یہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب فارسی میں شعر کہہ کر میرے پاس بھیجا کریں گے اور میں اس کلام کو گرامی صاحب کی اصلاح کے بعد ڈاکٹر صاحب کو بھیج دیا کروں گا کیونکہ اقبال لاہور میں تھے اور گرامی ہوشیار پور میں۔ اس طرح اقبال سے میرے تعلقات زیادہ بڑھ گئے۔ یہ اصلاح صرف تین مرتبہ ہوئی پھر گرامی صاحب نے کہا، اس سے کہنا اب وہ اپنا کلام مجھے نہ بھیجے خود ہی نظر ثانی کرلیا کرے۔''

مارچ 2013ء کا پربہار شمارہ

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

مزید

کاشف زبیر، ایم اے راحت، تنویر ریاض، مختار آزاد کی دلفریب کہانیاں اور نک و یلوٹ کے کارنامے آپ کے منتظر

زندگی نام ہے

آخری صفحات پر **احمد اقبال** کی ایک پرفکر تحریر..... جب زندگی آزمائشوں سے نبرد آزما ہو کر آگے بڑھی تو تمام آسائشیں بے معنی ہو کر رہ گئیں

وارث

تاریخی صفحات پر اہم شخصیات کے وہ یادگار لمحات جب تخت یا تختہ کی رسّاشی میں کسی کو خاک چاٹنی اور کسی کو فلک کی نا بنا کی نصیب ہوتی ہے **ڈاکٹر ساجد امجد** کے قلم کا جادو

نشانہ

چاہتوں کی چھاؤں سے نکل کر نفرتوں کی کڑی دھوپ میں جلتے دو دلوں کا قصہ..... **طاہر جاوید مغل** کا دلفریب شاہکار

اس کے علاوہ

انوار صدیقی کے قلم سے **کشکول** کے سنسنی خیز واقعات اور **ناصر ملک** کے دلوں میں ہلچل مچاتے سلسلے **مسافر** کے رنگین لمحات، **مرزا امجد بیگ** کے سنگین دلائل، **محفل شعر وسخن** اور **آپ کے خط**

www.pdfbooksfree.pk

ممتاز حسن نے پوچھا۔ ''اچھا یہ بتایئے ڈاکٹر اقبال کی کون سی خاص بات آپ کو پسند آئی؟''

''میں ان کی صاف گوئی کو پسند کرتا تھا۔''

''آپ میں اور ان میں کبھی کوئی رنجش ہوئی؟''

''قطعاً نہیں، کبھی نہیں حالانکہ ہمارے تعلقات تقریباً 32 سال یعنی ان کی موت تک رہے۔''

''اقبال سے متعلق کوئی دلچسپ واقعہ سنایئے؟''

''ایک دن مکان کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک ہندو آیا۔ ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور چلا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ساتھیوں سے کہا، جانتے ہو یہ کون تھا پھر خود ہی فرمایا، یہ مالک مکان تھا۔ اس کو اس بات کی کچھ سمجھ نہیں آئی کہ کوئی مسلمان ہوتے ہوئے پیشگی کرایہ دے سکتا ہے۔ میں اسے ہر مہینے پیشگی کرایہ دے دیتا ہوں۔ یہ اپنی بیوی سے کہتا ہے کہ یہ شخص دھرماتما ہے۔ اسی لیے ہر صبح آکر مجھے پرنام کرتا ہے اور چلا جاتا ہے۔''

کچھ سوالات اور ہوئے اور پھر گفتگو کسی اور طرف مڑ گئی کیونکہ پروفیسر حمید احمد خاں نے قائداعظم سے متعلق ایک سوال کر دیا تھا۔

''پاکستان بننے کے بعد جب پہلی دفعہ قائداعظم لاہور تشریف لائے تو اس وقت کیا ہوا؟''

''جب میری ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے مجھے ہیلو عبدالعزیز کہہ کر مخاطب کیا۔ میں نے کہا۔ میں اچھا ہوں لیکن عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ اپنا خیال رکھیے۔ آپ مجھے بہت کمزور نظر آرہے ہیں۔ مہربانی کر کے اپنی صحت کی فکر کیا کریں اور جو آدمی اپنی گورنمنٹ میں لیں وہ بااعتبار، ایمان دار اور لائق آدمی ہوں۔''

''مجھے جو کرنا ہے انہی کھوٹے سکّوں سے کرنا ہے جو میری جیب میں ہیں۔'' قائداعظم نے کہا۔

''پھر بھی اپنی صحت کا خیال رکھیے گا۔''

''شکریہ خیال رکھنے کا۔''

''آپ نے علم دین کے مقدمۂ قتل میں کوئی حصہ لیا تھا؟''

''میں نے کوئی حصہ نہیں لیا البتہ اس کے رشتے دار میرے پاس آئے ضرور تھے۔ وہ اقبالی تھا۔ موقع پر گرفتار ہوا اور چاقو بھی برآمد ہو گیا تھا اُن سے میں نے کہا کہ اس کا یہ بیان اسے بچا سکتا ہے جیسا کہ وہ بیان کرتا ہے کہ اس نے جب راجپال سے جا کر یہ پوچھا کہ اس نے یہ توہین آمیز کتاب کیوں لکھی تو راجپال نے سخت توہین آمیز الفاظ رسول اکرم کی شان میں کہے۔ اگر علم دین اپنے کلام میں سچا ہے تو اسے اس پر پابند رہنا چاہیے۔ یہ اشتعال کا کیس بن جائے گا اور اسے پھانسی نہیں ہوگی۔ زیادہ سے زیادہ سات سال کی سزا ہو جائے گی۔

اس کے رشتے دار اس پر بضد تھے کہ وہ قتل سے انکار کر دے لہٰذا میں نے معذرت کر لی۔ اس نے بہکاوے میں آکر قتل سے انکار کر دیا۔ شواہد اس کے خلاف تھے لہٰذا پھانسی ہو گئی۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ میں نے علم دین کی لاش کی وصولی میں ضرور کردار ادا کیا تھا۔''

''وہ کیا قصہ تھا؟''

''بھائی، بات یہ ہوئی کہ علم دین کو میانوالی لے جا کر پھانسی دی گئی اور وہیں اس کی لاش کو دفن کر دیا گیا۔ میں نے چند لوگوں کو جمع کیا۔ ان میں ڈاکٹر اقبال بھی شامل تھے اور ہم تمام لوگ گورنر سے ملے اور لاش کی واپسی کا تقاضا کیا میں نے عرض کیا کہ مجھے کوئی قانون ایسا معلوم نہیں جس کی رو سے لاش گورنمنٹ اپنے قبضے میں رکھے اور اس کو واپس نہ کرے۔''

انہوں نے کہا۔ ''اندیشہ فساد کا ہے۔''

میں نے اس پر کہا۔ ''ہم اس کی ذمّے داری لیتے ہیں بشرطیکہ لاش ہمارے حوالے کر دی جائے۔ پولیس اس میں مداخلت نہ کرے۔'' گورنر صاحب خاموش ہو گئے پھر سوچنے کے لیے وقت مانگا اور ہمیں دو دن بعد طلب کیا ہم پھر گئے۔ بات نہیں بنی بالآخر تیسری ملاقات میں وہ لاش دینے کو تیار ہوئے۔

لاش کو پونچھ ہاؤس لاہور پہنچا دیا گیا۔ میں نے علم دین کے رشتے داروں کو اطلاع کر دی۔ پونچھ ہاؤس جا کر لاش وصول کی۔ ہم سے دستخط لے لیے کہ ہم فساد ہونے کی ذمّے داری لیتے ہیں۔'' یہ انٹرویو بڑی دیر تک چلتا رہا۔ کئی گھنٹوں بعد ممتاز حسن نے اجازت چاہی۔

''میں اپنے ساتھیوں سمیت آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اس پیرانہ سالی میں اپنے افکارِ عالیہ سے ہمیں مستفید کیا۔''

''شکریہ تو مجھے ادا کرنا چاہیے کہ ڈاکٹر اقبال کی جو باتیں میرے علم میں تھیں آپ کے رُوبرو بیان کر دیں۔''

''اللہ تعالیٰ نے آپ کو 95 سال کی عمر عطا کی ہے۔ اس عمر میں بھی آپ بے شمار نوجوانوں سے زیادہ مستعد ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کا سایہ ہم سب پر رکھے۔

ان لوگوں کے چلے جانے کے بعد بھی وہ بڑی دیر تک ماضی کی یادوں میں گم رہے۔ جانے والے انہیں ماضی میں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ان یادوں سے باہر آئے تو ماضی سے موجودہ دور کا موازنہ کرنے لگے۔ یہ 1967ء تھا۔ ملک میں مارشل لا تھا۔ فوجی حکومت تھی۔ وہ سوچ رہے تھے ہم نے تو اسلام اور جمہوریت کے لیے یہ ملک بنایا تھا۔ دس سال سے ہم آمریت میں زندہ ہیں۔ قائداعظم کی جیب میں کیا واقعی کھوٹے سکّے تھے۔ خود ان کی موت کس حال میں ہوئی۔ لیاقت علی خان کے ساتھ کیا ہوا۔ ان کے بعد وزارتوں کی تبدیلی کتنی جلدی جلدی ہوئی پھر ملک فوج کے حوالے ہو گیا۔ ایک جنگ بھی ہم نے دیکھ لی۔

وقت اور آگے بڑھا 1970ء کی دہائی آگئی۔ میاں صاحب ملک میں ہونے والے تماشوں کو دیکھ تو نہیں سکتے تھے بڑے دکھ سے سن ضرور سکتے تھے۔ نظریاتی سرحد پر حملے ہو رہے تھے۔ کوئی وقت کے تقاضوں کے مطابق دین کو ڈھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کوئی اسلامی تاریخ کو نظر انداز کر کے اپنا رشتہ داہر اور گندھارا سے جوڑتا نظر آرہا تھا۔ روٹی، کپڑا اور مکان کے نعرے بھی ان کے کانوں تک پہنچ رہے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ ہم پیٹ کے بندے ہیں ہماری کوئی نظریاتی سرحد نہیں۔ افسوس کہ ہم اس کا حل سوشلزم میں تلاش کر رہے ہیں۔ پوری قوم طبقات میں بٹی ہوئی ہے۔ کہیں قومیتوں کے جھگڑے ہیں کہیں فرقوں کے۔ کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں۔ جب اسلام ایک ہے تو مسلمان اتنے گروہوں میں کیوں بٹ گئے ہیں۔ اگر اسلام کا نام لیا بھی جا رہا ہے تو محض اقتدار کا زینہ بنانے کے لیے۔ ایسے میں اگر اسلامی ذہن رکھنے والے ایک نہ ہوئے تو ہمارے دن گنے جا چکے۔

ان کا دکھ بڑھتا ہی گیا۔ بے اختیار ہاتھ اس میز کی طرف بڑھا جہاں کاغذ اور قلم رکھا رہتا تھا پھر خود ہی ہاتھ کھینچ لیا۔ انہیں یاد آگیا کہ وہ تو بصارت سے محروم ہو چکے ہیں۔ فریاد کس سے کروں کون سنے گا۔ اگر اپنے خیالات املا کروا دوں تو سب سے پڑھنے والوں کا بھلا ہو جائے گا۔ اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن نظر آئی۔ انہوں نے اپنا مضمون املا کرانا شروع کیا۔

''یہ ملک جو اسلامی نظریۂ حیات کے نشو و ارتقا کے لیے حاصل کیا گیا تھا آج جس بحرانی کیفیت سے دوچار ہے وہ انتہائی تشویش ناک ہے۔ اسلام جس کا سلوگن بلند کر کے اسلامیانِ ہند کو جمع کیا گیا اور جس کے صدقے میں ہمیں اسلامی مملکت ملی اسی مملکت میں اسلام سب سے زیادہ مظلوم ہے۔''

''اس کہانی کا انتہائی الم انگیز حصہ اس دس سالہ دور پر محیط ہے جسے آمریت کا دور کہا جاتا ہے۔ اس عشرے میں انسانوں سے ان کی حریت فکر چھن گئی، ان کی متاعِ ایمان لٹ گئی، ان کی دینی حمیت مرگئی پھر بھی یہ مظلوم دینِ مشکل اوقات میں ہمارے لیے حصار بنا رہا مگر ہم ہمیشہ ایسے معجزوں کی امید پر نہیں جی سکتے۔ قانونِ مکافات کی طرف سے بہت اتمامِ حجت ہو چکی۔ شاید ہمیں اب اور موقع نہ ملے۔''

''کیا ان واقعات سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ہم انسانیت کے اعلیٰ مقام سے بہت نیچے آگئے ہیں اور ہم نہیں چاہتے کہ ایک ملتِ واحدہ کی صورت میں جئیں۔ ہم جس دین کے نام نہاد پیروکار ہیں وہ جغرافیائی یا طبقاتی نہیں آفاقی دین ہے۔ نہیں بلکہ آفاقی سے آگے گزر کے ماورائے ادراک کی ساری کائنات پر محیط ہے۔ اس پر تنہا سندھیوں یا پختونوں کی اجارہ داری نہیں۔ یہ عربوں کی وارثت نہیں۔ یہ ساری کائنات کے لیے آخری پیغام ہے۔''

''اس وقت پاکستان کو روٹی، کپڑا اور مکان کے نام پر ابھارا جا رہا ہے۔ میں انسان کی ان بنیادی ضرورتوں سے پہلوتہی نہیں کرتا لیکن اس کا پائیدار حل سوشلزم میں نہیں۔''

''ہم مسلمان بھی کہلائیں اور نظامِ معیشت کے لیے مارکس سوشلزم سے اپنے گھاٹے پورے کریں۔ امریکا سے جمہوریت درآمد کریں، فرانس سے ثقافت لیں اور دین کو محض مذہب قرار دیتے ہوئے مسجدوں تک محدود کریں۔ یہی کچھ سوشلسٹ ممالک میں ہوا ہے۔''

''اس وقت حصولِ اقتدار کی خاطر ہم کتنے گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں اور تقریباً تمام گروہ اسلام کو سلوگن کے

''ایک قائد اٹھتا ہے گوریلا جنگ کی دھمکی دیتا ہے۔ کیا وہ اپنے بھائیوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر رہا ہے یا موجودہ حکومت کے خلاف؟ دوسرا طبقاتی طبل جنگ بجاتا ہے اور یہ طبقات مزدوروں کے، یہ طبقات کسانوں کے، یہ طبقات دانش وروں کے، یہ طبقات صنعت کاروں کے، یہ طبقات زمینداروں کے۔ اگر یہ ایک دوسرے پر پل پڑیں تو اس ملک میں باقی کیا رہ جائے گا۔'' (تقریر سے اقتباس)

www.pdfbooksfree.pk

طور پر استعمال کررہے ہیں۔ یہاں تک کہ اشتراکی دین بھی اسلام ہی کی آڑ لینے پر مجبور ہیں۔ اس دعوے کے پیچھے کہیں بنگلہ قومیت کارفرما ہے تو کہیں سندھی۔ کہیں پختون ہے تو کہیں پنجابی۔ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ حکم صرف اللہ ہی کا چلے اور ہمیں وہی کرنا ہے جس کا اللہ نے حکم دیا ہے تو پھر ذاتی اقتدار کے لیے یہ رسہ کشی کیوں؟''

اس مضمون کے آخر میں انہوں نے لکھا۔

''میں عمر کے لحاظ سے سو برس کے لگ بھگ ہونے کے علاوہ نابینا بھی ہوں تاہم تیار ہوں کہ پاکستان کو اسلامی تجربہ گاہ بنانے کے لیے ابتدائی گفت وشنید کی خاطر اپنا غریب خانہ پیش کردوں جو پہلے بھی تحریکِ پاکستان کے لیے وقف تھا۔''

اب وہ ایسی عمر کو پہنچ گئے تھے کہ بیمار پڑنا تو لازمی تھا۔ صحت کتنی ہی اچھی ہو، بڑھاپے میں بیماریاں تو لاحق ہو ہی جاتی ہیں۔ وہ بھی بیمار پڑ گئے۔ بیماریاں چلتی ہی رہتی تھیں لیکن اس مرتبہ وہ بستر پر پڑ گئے، کئی مہینے کی علالت کے بعد ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ 28 جولائی 1971ء کو صبح نو بجے دماغ کی شریان پھٹ گئی۔ دنیائے فانی سے منہ موڑا اور عالمِ آخرت کی راہ لی۔ ان کا جنازہ ان کی رہائش گاہ پکی گیٹ سے اٹھایا گیا اور مرحوم کے آبائی قبرستان مصری شاہ میں دفن کیا گیا۔

ان کی نماز جنازہ مولانا عطاءاللہ حنیف نے پڑھائی جس میں وکیلوں، ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے ججوں، سماجی کارکنوں نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

ان کے انتقال کے بعد معلوم ہوا کہ لوگوں نے انہیں فراموش نہیں کیا۔ کوئی اخبار ایسا نہیں تھا جس نے اس وفات حسرت آیات کی خبر نمایاں طور پر شائع نہ کی ہو اور انہیں خراجِ تحسین پیش نہ کیا ہو۔

روزنامہ امروز (لاہور) نے لکھا:

''میاں عبدالعزیز مرحوم لاہور آرائیں برادری کے سرکردہ رکن، تحریکِ آزادیِ وطن کے بے لوث مجاہد اور اپنے زمانے کے نامور فوجداری وکیل تھے۔ وہ تحریکِ خلافت سے لے کر تحریکِ پاکستان تک، مسلم حقوق کی ہر جدوجہد میں شریک رہے۔ بلدیہ لاہور کے متعدد بار صدر اور مشیر بنے۔ دو مرتبہ پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کو قائداعظم کی قیادت نصیب ہوئی تو میاں عبدالعزیز گنتی کے چند رہنماؤں میں شامل تھے جنہیں قائداعظم کی رفاقت کا اعزاز حاصل ہوا۔ میاں صاحب نے زندگی بھر برطانوی حکومت سے اعزاز یا عطیہ قبول نہیں کیا۔''

روزنامہ نوائے وقت نے خراجِ تحسین پیش کیا:

''ان کی پکی دروازے کے باہر والی کوٹھی برسوں سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنی رہی چنانچہ آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا سہ روزہ اجلاس جو قائداعظم کی زیرِ صدارت ہوا تھا اسی کوٹھی میں منعقد ہوا تھا اور یہی وہ کوٹھی تھی جہاں متحدہ ہندوستان کے بڑے بڑے لیڈر آیا کرتے تھے جن میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد قابلِ ذکر ہیں۔ مرحوم نے آج تک اس کمرے کو جوں کا توں رکھا تھا جس میں قائداعظم بیٹھتے تھے۔''

ہفت روزہ ''الاعتصام'' نے لکھا:

''حکومت برطانیہ اور اس کے استبداد ومظالم کے خلاف مولانا ابوالکلام آزاد کی قیادت میں جو تحریکِ آزادی ہند شروع ہوئی میاں عبدالعزیز فوراً اس کے ہراول دستے میں شامل ہوگئے اور اس سلسلے میں کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔ مولانا آزاد نے انگریزوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے اپنے پرچے الہلال کے ذریعے جب ایک جماعت حزب اللہ کے قیام کا اعلان کیا اور نوجوانوں نے اس دعوت پر لبیک کہی تو اس کے لیے مولانا آزاد کے ہاتھ پر جو بیعت عمل میں آئی وہ میاں عبدالعزیز کی اسی تاریخی کوٹھی میں ہوئی جس سے اب میاں صاحب کا جنازہ اٹھا ہے۔ جب تحریکِ آزادیِ ہند نے تحریکِ پاکستان کی صورت اختیار کرلی تو میاں صاحب اسی وراثتی جذبۂ دینی وقومی کے تحت اس میں شامل ہوئے۔''

ایک رسالے میں ''ایشیا کی انقلابی شخصیت'' کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا جس کا ایک اقتباس یہ ہے۔

''میاں عبدالعزیز اور قائداعظم بڑے گہرے اور دیرینہ دوست تھے۔ ان کی دوستی کی ابتدا لندن میں دورانِ تعلیم ہوئی۔ دونوں ہم مکتب، ہم خیال رہنما تھے چنانچہ قائداعظم نے ان سے رابطہ کیا اور مسلم لیگ کا سب سے پہلا اجلاس 1936 میں میاں صاحب کی کوٹھی میں دو دن جاری رہا اور مسلم لیگ کے تنِ مردہ میں نئی روح ڈالی گئی۔''

ماخذات

میاں عبدالعزیز مالوا اڑہ محمد اسحٰق بھٹی، سرگزشت عبدالمجید سالک

کالی قسمت

ابن کبیر

اس نے ایک علم پرور گھرانے میں آنکھ کھولی، تاعمر ترسیلِ علم کی چاکری کی۔ بڑی بڑی نامور شخصیات اس کی شاگرد ہیں۔ یہاں تک کہ اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل نے بھی اس سے تعلیم حاصل کی لیکن اس کے آخری ایام ایدھی ہوم میں لاوارثی کی حالت میں گزرے۔ اتنی اہم شخصیت کا یہ حال کیسے ہوا۔ کیوں وہ بے کسی کی مجسم تصویر بنی۔ کس طرح وہ ایدھی ہوم پہنچی؟

ایک عبرت بھری کتھا اسی شہر کراچی سے

اکتوبر، 2011، کراچی:

شام ہوتے ہی شہر کی فضاؤں میں خنکی اتر آئی۔ دفاتر خالی ہونے لگے۔ اسٹریٹ لائٹس روشن ہوگئیں۔ سڑکوں پر ٹریفک کا دباؤ بڑھنے لگا۔ ہر شخص جلدی میں تھا۔ موسم اچانک سرد ہوگیا تھا۔ کوئٹہ کی ہوائیں گلیوں میں داخل ہوچکی تھیں۔ گرم کپڑے نکالنے کا وقت آن پہنچا تھا۔

شہر میں گردش کرتی ہواؤں نے ایدھی سینٹر کے مشرقی حصے کی کھڑکیوں پر دستک دی تو ضعیف العمر عورتوں نے خود کو

www.pdfbooksfree.pk

چادر میں لپیٹ لیا اور تسبیح ہاتھ میں لیے کونوں میں دبک گئیں۔

یہ حصہ ایک وسیع و عریض کمرے پر مشتمل تھا جو بے گھر خواتین کے لیے مختص تھا۔ وہاں کئی بستر لگے تھے۔ اسی کمرے کے ایک کونے میں دو بوڑھی عورتیں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ اُن کے چہروں پر جھریاں تھیں، جو اُن کے دُکھ بھرے ماضی کی چغلی کھاتی تھیں، پر لمحۂ حال میں وہ مطمئن معلوم ہوتی تھیں۔ اُن کی گفتگو سے جھلکتی بے ساختگی اِس جانب اشارہ تھی کہ اُنہوں نے ایدھی سینٹر کو اپنا گھر مان لیا ہے۔

ایسے میں ایک لڑکی چائے کی ٹرے لیے کمرے میں داخل ہوئی۔ اُس کا نام روشنی تھا۔ وہ سینٹر میں ملازم تھی۔ بوڑھی خواتین کی دیکھ ریکھ اُسی کے ذمے تھی۔

باقی عورتوں کو چائے تقسیم کرنے کے بعد وہ اُس کونے میں آئی جہاں دونوں عورتیں بیٹھی تھیں۔ اُس نے مسکراتے ہوئے ٹرے آگے کی ''کیسی ہیں زلیخا خالہ؟''

''ٹھیک ہوں بیٹا، پروردگار کا احسان ہے۔ تو کیسی ہے؟'' زلیخا نے جھریوں بھرے ہاتھ سے کپ اٹھایا۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' لڑکی نے ٹرے دوسری عورت کی جانب بڑھائی ''اماں جی، یہ آپ کی چائے۔ بغیر چینی والی!''

''جیتی رہ بیٹی! اللہ ڈھیروں خوشیاں دے۔'' اماں جی نے اُسے دعائیں دیں۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔ ''بیٹی، بی بی قریشی دوپہر میں تیرے ساتھ گئی تھی۔ لوٹی نہیں... خیر تو ہے۔ کیا اُس کے گھر والے آئے تھے؟'' نظریں بائیں جانب والے بستر پر ٹکی تھیں جس کے سرہانے چند کتابیں رکھی تھیں۔

روشنی پاس ہی بیٹھ گئی ''اماں جی، بی بی قریشی گورنر سندھ سے ملنے گئی ہیں۔ ابھی آتی ہوں گی۔'' لہجے سے احساسِ تفاخر جھلکتا تھا۔

''گورنر سندھ سے؟'' زلیخا کے چہرے پر حیرت تھی۔ ''خیریت تو ہے بٹیا؟''

''ہاں زلیخا خالہ سب ٹھیک ہے، آپ پریشان نہ ہوں۔'' روشنی نے اُنہیں اطمینان دلایا۔ ''آپ تو جانتی ہیں، حالات کی ستم ظریفی بی بی قریشی کو یہاں لے آئی، ورنہ وہ بہت پڑھی لکھی اور قابل خاتون ہیں۔'' اُس کے چہرے پر تاسف تھا۔ ''پی ایچ ڈی کرنے والی پاکستان کی پہلی خاتون۔ تحریکِ آزادی کی کارکن اور...''

''روشنی... اے روشنی!'' کسی نے اُسے پکارا۔

''ابھی آئی۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھی اور چلی گئی۔ اور مصروفیات میں الجھ کر بھول گئی کہ اُسے دو بوڑھی عورتوں کو ایک کہانی سنانی ہے۔

سرد ہواؤں کی دستک جاری رہی۔ بوڑھی عورتوں نے چائے ختم کی، خود کو چادر میں لپیٹا اور اپنے بستروں پر چلی گئیں۔

کہانی پھر ادھوری رہ گئی... مگر ادھورا پن اس کا مقدر نہیں تھا۔ اُس کی تکمیل کا لمحہ آن پہنچا تھا۔

اگلے چند روز میں اِس اَن کہی کہانی کو کروڑوں سامعین میسر آنے والے تھے!!

☆☆☆

اظفر حسین کا اصل وطن تو ضلع بجنور کا قصبہ نگینہ تھا، پر اولاد کو زیورِ علم سے آراستہ کرنے کی خواہش اُنہیں مرادآباد کھینچ لائی، جہاں اُنہوں نے محلہ ڈیریا میں رہائش اختیار کی۔ مگر نگینہ سے قطع تعلق نہیں کیا۔ زمینیں تو وہیں تھیں۔ نگینہ آنا جانا رہتا تھا۔

سیاسی و سماجی سرگرمیوں نے بھی اظفر حسین کو مصروف رکھا۔ قانون کی خوب سمجھ تھی۔ وکیلوں سے گاڑھی چھنتی تھی۔ مدلل گفتگو کرتے اور سامنے والے کو پلوں میں قائل کر لیتے۔

مرادآباد سیاسی سرگرمیوں کا مرکز تھا اور اظفر حسین سیاست کے دلدادہ۔ پکے کانگریسی۔ گاندھی جی کے پیروکار۔ انگریز سرکار کے خلاف چلنے والی کئی تحریکوں میں وہ پیش پیش رہے۔ تاہم سیاست کے جھمیلوں میں پڑ کر کبھی گھر کو نہیں بھولے۔ انہیں خاندان کی ضروریات کا پورا ادراک تھا۔ بچوں کی تعلیم و تربیت سے بھی غافل نہیں تھے۔

خدا نے اظفر حسین کو دو بیٹوں اور ایک بیٹی سے نوازا تھا... اور اب ایک اور خوشی دروازے پر دستک دینے کو تھی... اُن کی زوجہ امید سے تھیں۔

26 نومبر 1922 کو اظفر حسین کے گھر بچے کے رونے کی آواز گونجی۔ خدا نے انہیں بیٹی سے نوازا تھا۔ اُس زمانے میں لڑکیوں کی پیدائش پر خوشیاں نہیں منائی جاتی تھیں مگر اظفر حسین ایک پڑھے لکھے اور روشن خیال آدمی تھے۔ بیٹے کو خدا کی نعمت اور بیٹی کو خدا کی رحمت تصور کرتے تھے، سو جونہی بیٹی کی پیدائش کی خبر ملی، اُنہوں نے رب کا شکر ادا کیا۔

بیٹی کا نام اصغری بیگم رکھا گیا۔

اُس دھان پان سی بچی کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ جب پڑوسن نے اُسے دیکھا تو بے ساختہ کہا۔ ''یہ تو

بالکل باپ پر گئی ہے۔''

''باپ کی طرح بڑے ہو کر قانون کی گتھیاں سلجھایا کرے گی!'' ساتھ بیٹھی عورت مسکرائی۔

''ارے، لڑکیوں کو کیا پڑھانا لکھانا۔ لڑکیاں تو پرائی ہوتی ہیں۔'' تخت پر بیٹھی بوڑھی خاتون نے چھالیا کترتے ہوئے کہا جنہیں پورا محلہ بی اماں کہہ کر پکارتا تھا۔

اظفر حسین دالان سے گزر رہے تھے۔ یہ الفاظ کان میں پڑے، تو وہ ٹھٹک گئے۔ ''لڑکیاں پرائی ضرور ہوتی ہیں بی اماں مگر انہیں پڑھنے کا پورا حق ہے۔'' آواز میں ٹھہراؤ تھا۔

''مگر بیٹا، لڑکی ذات پڑھ کر بھی کیا تیر مار لے گی۔ اس کا اصل کام تو گھر سنبھالنا ہے۔'' بی اماں کے چہرہ فہمائشی تھا۔

''خالہ جان، ہندوستان بیدار ہو رہا ہے۔ ہمیں انگریزوں سے مقابلہ کرنا ہے۔ ایسے میں مسلمان گھرانوں پر لازم ہے کہ وہ اپنے بچوں کو بلاتفریق تعلیم کے زیور سے آراستہ کریں، ورنہ وہ دیگر قوموں سے پیچھے رہ جائیں گے۔'' اظفر حسین نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

بہن، جو بھائی کے مزاج سے واقف تھی، درمیان میں کود پڑی۔ ''ہاں ہاں، ہماری اصغری پڑھے گی، لکھے گی، یونیورسٹی جائے گی، کیوں!'

''ہاں۔'' اظفر حسین نے دوٹوک جواب دیا۔ ''میں بیٹے اور بیٹی میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ جو سہولیات اور مواقع اِس کے بھائیوں کو میسر ہوں گے، وہ اسے بھی ملیں گے۔''

اِس جملے کے ساتھ ہی وہ تیزی سے باہر نکل گئے۔ دالان میں خاموشی چھا گئی۔

وہ ایک پُراسرار لمحہ تھا۔ اصغری بیگم کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا تھا۔

☆☆☆

گھر بھر کی وہ لاڈلی تھی۔ سب پیار سے اُسے بی بی کہا کرتے۔ یوں تو سب ہی اسے بہت چاہتے مگر باپ کی تو وہ جان تھی جو گھر لوٹتے ہی اُسے گود میں بٹھا لیتا۔ اُس سے باتیں کرتا۔

شعور کی دہلیز عبور کرنے کے بعد جس پہلی شے نے ننھی اصغری کے ذہن پر گہرے نقوش چھوڑے، وہ تھے کاغذ اور قلم۔

اُس نے پہلی بار اپنے باپ کے ہاتھ میں قلم دیکھا تھا اور نہ جانے کیا سوجھ کر ہاتھ پھیلایا اور قلم مانگ لیا۔

پہلے تو اظفر حسین اِس معصوم خواہش پر حیران ہوئے۔ کھلونے سے کھیلنے کی عمر میں قلم کا تقاضا؟ پھر مسکرا دیے اور قلم ننھی اصغری کو تھما دیا۔ اگلا تقاضا ورق کا تھا۔ یہ خواہش بھی پوری ہوئی۔

آنے والے دن قلم سے ورق پر حاشیے کھینچتے گزرے... اور اُن ہی دنوں نے یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ اُس کی زندگی کتابوں کے ساتھ گزرنے والی ہے۔

شوقِ مطالعہ تو گھٹی میں پڑا تھا۔ کتابیں اجداد کا ورثہ تھیں۔ جلد ہی حروف سے دوستی ہوئی۔ بڑی بہن اور اصغری کی عمر میں خاصا فرق تھا۔ وہ چھ برس بڑی تھی۔ مزاج مختلف تھا۔ تربیت الگ ڈھب پر ہوئی تھی۔ چھوٹی بہن سے اُسے پیار تو بہت تھا مگر مصروفیات اُسے باندھے رکھتیں۔ پہلے پڑھائی۔ اُس سے فرصت ملتی تو باورچی خانہ، صفائی ستھرائی۔

اُس دوری نے اصغری کو اپنے بھائیوں اختر اور اصغر کے قریب کر دیا۔ دھیرے دھیرے وہ اُن کے مزاج میں ڈھلنے لگی۔ اُن کی تقلید کرنے لگی۔ اور پھر اُن ہی کی طرح سوچنے لگی۔

عمر تو گڈے گڑیا سے کھیلنے کی تھی، مگر طبیعت اُدھر نہیں جاتی تھی۔ اسے تو بھائیوں کی طرح باسکٹ بال کا کھیل پسند تھا۔ بیڈمنٹن کھیلنے کو جی چاہتا تھا۔ اور اُس نے ایسا کیا بھی کہ والد کی طرف سے آزادی تھی۔ وہ اُس کی جائز خواہشات پوری کرنے میں ایک لمحے کا بھی تامل نہیں کرتے تھے۔

جب ہر طرف کتابیں ہوں، علم دوست باپ کی سرپرستی میسر ہو، بھائیوں کا ساتھ ہو تو تعلیمی سفر کسی درس گاہ کا محتاج نہیں رہتا۔

خاندان کی بڑی بوڑھیاں اکثر سوچتیں۔ ''گھر میں تعلیم تک تو ٹھیک ہے، چلو اسکول بھی چلی جائے گی مگر کالج، یونیورسٹی؟ نہ جی نہ!''

مگر اظفر حسین بھی دُھن کے پکے تھے، وہ اپنی بیٹی کو اعلیٰ تعلیم دلانے کا پختہ فیصلہ کر چکے تھے۔

بالآخر وہ دن آن پہنچا جب اصغری کو جسے سب بی بی کہہ کر مخاطب کرتے تھے، اسکول بھیجا گیا۔

باپ نے پرتاپ سنگھ ہائی اسکول کا چناؤ کیا۔

کیوں؟ کیونکہ... وہ علاقے کا سب سے معیاری اسکول تھا۔ اُس وقت چند رشتے داروں نے یہ مشورہ دیا کہ بیٹی کو کسی مسلم اسکول میں داخل کروا دو۔

www.pdfbooksfree.pk

"ٹھیک ہے میاں اظفر، مسلم اداروں کا معیار پرتاپ سنگھ ہائی اسکول سا نہیں، مگر ہے تو مسلمانوں کا اسکول ناں!"

ناصح اظفر حسین کو قائل نہیں کر سکے۔ وہ تو کانگریسی تھے۔ یقین رکھتے کہ ہندو اور مسلمانوں کو اختلافات بھلا کر انگریز سرکار کے خلاف اجتماعی جدوجہد کرنی ہوگی۔ اِسی بات کا تو وہ درس دیا کرتے تھے۔ ایسے میں اگر بیٹی کو کسی مسلم درس گاہ میں داخل کروا دیتے، تو اُن کے نظریات کی کیا اہمیت رہ جاتی۔

بی بی اسکول جانے لگی۔ نئے ماحول سے ہم آہنگ ہونے میں اُسے کسی قسم کی دقت پیش نہیں آئی۔ والد کا عطا کردہ اعتماد جو ساتھ تھا، وہ ہر محاذ پر معاون ثابت ہوا۔ ہر سرگرمی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ چند ہی دنوں میں اس کا شمار قابل طالبات میں ہونے لگا۔

سچ تو یہ ہے کہ گھر کی طرح بی بی اسکول میں بھی سب کی لاڈلی بن گئی تھی۔

☆☆☆

"کیا کہا، تم برقع نہیں پہنو گی؟" خالہ زاد بہن کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

"ہاں تم نے دُرست سنا، میں برقع نہیں پہنوں گی!" اُس نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

اُس زمانے میں برقع مسلمان عورتوں کی پہچان تھی۔ خاندان کی تمام عورتیں بھی برقع پہنا کرتی تھیں۔ اسکول اور کالجوں کی طالبات برقع ہی میں نظر آتیں۔ ایسے میں برقع نہ پہننے کا فیصلہ معاشرتی قیود کے خلاف اعلانِ بغاوت کے مترادف تھا۔

بڑی بوڑھیوں کو یقین تھا کہ اظفر حسین کی لاڈلی بھی اُوروں کی طرح برقعے میں چھپ کر ہی گھر سے نکلا کرے گی کہ یہی رواج ہے مگر بغاوت کا اعلان کر دیا گیا تھا جس نے ہر ایک کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔

"اے لڑکی، کیا عقل گھاس چرنے گئی ہے؟" پھوپی نے فہمائشی انداز میں کہا۔

"پڑھ لکھ کر دماغ خراب ہوگیا ہے تیرا۔" خالہ بولیں۔

"محترمہ اپنی پرواز محدود رکھیں، آپ کے والد صاحب کبھی اجازت نہیں دیں گے۔" خالہ زاد نے بھی تنبیہ کی۔

"مجھے یقین ہے، ابا اجازت دے دیں گے۔" بی بی کے لہجے میں عزم تھا۔

اور ایسا ہی ہوا۔ اظفر حسین نے نہ تو ماضی میں اپنی بیٹی پر کوئی روک لگائی تھی، نہ ہی مستقبل میں ایسا کوئی ارادہ رکھتے تھے۔ اسے اجازت مل گئی۔

گھر والوں نے اِس فیصلے پر شدید احتجاج کیا۔ اظفر حسین سے درجنوں سوال کیے گئے۔ اندیشوں سے آگاہ کیا گیا مگر اُس شخص نے ایک ہی جواب دیا۔ "مجھے اپنی تربیت پر پورا بھروسا ہے۔"

یہ بھروسا ہی بی بی کی قوت تھی، جو اب اسے ایک اور تبدیلی کے لیے تیار کر رہا تھا۔

اُسے خاندانی نام سے خال خال ہی پکارا جاتا۔ سب بی بی کہا کرتے، مگر اُسے اِس طرز پر مخاطب کیا جانا اچھا نہیں لگتا تھا۔ بڑا بھائی اصغر حسین اپنے نام کے ساتھ قریشی لگایا کرتا تھا۔ بس، اُس نے فیصلہ کر لیا کہ اپنے نام کے ساتھ بھی "قریشی" کا لاحقہ لگا لیا جائے۔

قدرت کے کھیل بھی نرالے ہوتے ہیں، بی بی قریشی ہونے کے بعد وہ یکسر بدل گئی۔ اصغری بیگم کہیں میلوں پیچھے رہ گئی۔

اب اس میں ایک نئی روح تھی۔ ایک باغی روح!!

☆☆☆

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔

ہندوستان میں دو قومی نظریے کی بازگشت سنائی دینے لگی تھی۔ مسلم لیگ تیزی سے قوت حاصل کر رہی تھی۔ مراد آباد کی گلیوں میں بھی یہ خیال پنپنے لگا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں۔ مسلم لیگی طلبا کی سرگرمیاں بھی دھیرے دھیرے ظاہر ہونے لگیں۔

یہ روشن خیالات بالیدگی کی دہلیز پر کھڑی بی بی قریشی کے کانوں میں بھی پڑے اور سیدھے دل میں اتر گئے۔

وہ اردو اور انگریزی ادب کی دلدادہ تھی۔ عبدالحلیم شرر، ڈپٹی نذیر احمد، ڈکنز کی کتابیں مطالعے میں رہتی تھیں۔ مگر اب اس کا وقت سوچ بچار میں گزرنے لگا۔ کتابوں سے وہ عارضی طور پر دور ہوگئی۔

اخبارات تو وہ پہلے بھی باقاعدگی سے پڑھا کرتی تھی لیکن اب خصوصی طور پر ان کا مطالعہ کرتی۔ مسلمانوں کے ترجمان تصور کیے جانے والے اخبارات توجہ کا خصوصی مرکز تھے جن میں پیش کردہ تجزیات اُسے اپنے خیالات کے قریب تر معلوم ہوتے۔ مسلم لیگ کے ہم خیال طلبا و طالبات سے

بھی اُس کی ملاقات رہنے لگی۔

پہلے تو چھپ چھپ کر مسلم لیگ کے اجلاسوں میں شرکت کی، مگر جب نظریہ پختہ ہوگیا تو اپنے خیالات کے اظہار کا فیصلہ کر لیا۔

پہلے بھائیوں سے اِس بابت گفتگو کی۔ اپنی فکر سے آگاہ کیا۔ اُن کا ردِعمل مبہم تھا۔ نئے، توانا خیالات کی بازگشت اُن کی سماعتوں سے بھی ٹکرائی تھی، مگر انہیں یہ احساس بھی تھا کہ باپ کانگریسی ہے، علاقے کی سیاست میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے، اپنی جماعت کے لیے کئی قربانیاں دے چکا ہے۔ ایسے میں گھر پر مسلم لیگ کا جھنڈا لہرانا قبل از وقت ہوگا۔

چند روز تو اِس دلیل نے بی بی کو خاموش رکھا، مگر جلد ہی دل کی پکار اسے میدانِ عمل میں لے آئی۔ وہ مسلم لیگی طلبا و طالبات کی نشستوں میں باقاعدگی سے حصہ لینے لگی۔

جب سہیلیوں نے باز رکھنے کی کوشش کی، سمجھایا کہ یہ لڑکیوں کے کام نہیں تو بی بی قریشی نے دوٹوک لہجے میں جواب دیا۔ "مجھے تو والد نے لڑکوں کی طرح پالا ہے۔ کبھی کوئی پابندی عائد نہیں کی۔ اور یاد رکھو، لڑکے اور لڑکیوں میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں برابر ہیں۔"

"مگر تم سمجھنے کی کوشش کرو، سیاست آگ کا دریا ہے۔" ایک سہیلی نے کہا۔

"کیا ہمارے سامنے محترمہ فاطمہ جناح کی مثال نہیں ہے۔ ان کی جدوجہد ہمیں درس دیتی ہے کہ ہم بھی میدانِ عمل میں قدم رکھیں اور مسلم لیگ کے لیے جدوجہد کریں۔" اس کا لہجہ واضح تھا۔

اظفر حسین کو اس بات کا تو ادراک تھا کہ مسلمان تیزی سے مسلم لیگ کی جانب راغب ہو رہے ہیں۔ وہ کانگریس کے نظریات سے متفق نہیں، مگر انہیں اس بات کا قطعی اندازہ نہیں تھا کہ ان کی اپنی بیٹی بھی اِس ڈگر پر چل پڑی ہے۔

اِس بات کا پتا تو اُس روز چلا، جب انہوں نے مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے ایک جلوس کو ہائی کورٹ کے سامنے سے گزرتے دیکھا، جس میں اُن کی بیٹی بھی شامل تھی۔

شام میں گھر میں عدالت لگی۔ بی بی قریشی کو کٹہرے میں کھڑا کیا گیا۔ باپ نے جراح کی۔ ملزم نے اپنی صفائی دی۔ کافی دیر تک یہ مکالمہ جاری رہا۔ بالآخر اظفر حسین نے فیصلہ سنا دیا۔ "اگر تمہیں مسلم لیگ کے نظریے پر یقین ہے تو میری طرف سے آزادی ہے، تم اُس میں شمولیت اختیار کر سکتی ہو۔"

وہ ایک خوش گوار لمحہ تھا۔ راہِ زیست کا حتمی تعین ہو چکا تھا۔

☆☆☆

سیاسی شعور تو پرتاپ سنگھ ہائی اسکول ہی کے زمانے میں بیدار ہوگیا تھا۔ گوکل داس گرلز کالج میں داخلہ لینے کے بعد اس نے مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں شمولیت اختیار کی۔

گوکل داس کالج لڑکیوں کی تعلیم کے لیے بہترین درس گاہ تصور کیا جاتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ مسلم لیگ کی دلدادہ بی بی قریشی نے اِس کا حصہ بننے میں تامل نہیں کیا۔ اُس ادارے سے اس نے انٹر کا مرحلہ طے کیا۔

بارھویں جماعت پاس کرنا بڑی کامیابی تھی مگر یہ اکلوتا کارنامہ نہیں تھا۔ اِس عرصے میں اُس نے ہم نصابی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ تقریری مقابلوں میں شرکت کی۔ بیڈمنٹن اور ٹیبل ٹینس کے مقابلوں میں خود کو منوایا۔

اب وہ سماجی کاموں میں بھی حصہ لینے لگی تھی۔

جب کبھی کسی لڑکی کے والدین تعلیم چھڑوا کر اُسے گھر بٹھانے کا ارادہ ظاہر کرتے، وہ دوڑی دوڑی بی بی قریشی کے پاس آجاتی۔ اور وہ اپنے دلائل کے ہتھیار لیے اُس لڑکی کے ساتھ چل پڑتی۔

اظفر حسین کو وہ مسلم معاشرے کے لیے رول ماڈل تصور کیا کرتی تھی۔ مباحثے کے دوران وہ اُن کی مثال پیش کرتی۔ دھواں دھار تقریر کرتی، پھر لڑکی کے والدین کو اس بات پر قائل کر کے ہی لوٹتی کہ انہیں اپنی بیٹی کو اعلیٰ تعلیم دلانی چاہیے۔

انٹر کے بعد بی بی قریشی نے کس ادارے کا رخ کیا؟ اس بابت زیادہ سوچ بچار کی ضرورت نہیں۔ یہ تو واضح تھا۔ علی گڑھ یونیورسٹی اس زمانے میں مسلم لیگ کی سرگرمیوں کا مرکز تھی۔ اور یہی ادارہ گریجویشن کے لیے بی بی قریشی کی پہلی اور آخری ترجیح تھی۔

بیٹی کو ہوسٹل میں قیام کی اجازت دینا بہ ظاہر ایک مشکل فیصلہ معلوم ہوتا ہے مگر اظفر حسین نے یہ فیصلہ کرنے میں ایک منٹ بھی ضائع نہیں کیا۔

وہ جانتے تھے کہ اُن کی بیٹی خود کو مسلم لیگ کے لیے تج چکی ہے، سو انہوں نے اس کے فیصلے کی قدر کی۔ پھر ایک سبب اور بھی تھا۔ یونیورسٹی گھر سے دور تھی۔ آنے جانے میں خاصا وقت ضائع ہوتا۔ بہتر یہی تھا کہ وہ ہوسٹل میں قیام کرے۔

گریجویشن کے لیے بی بی قریشی نے آرٹس کے

www.pdfbooksfree.pk

مضمون کا چناؤ کیا۔ گو کہ وہ چاہتی تو بڑے بھائی کی مانند قانون کے شعبے میں بھی جاسکتی تھی۔ سہولیات اور مواقع دونوں ہی میسر تھے۔ گھر سے راہ نمائی مل جاتی لیکن وہ تقلید کی مخالف تھی۔ جب ایک سہیلی نے اِس بابت استفسار کیا، تو اس نے جواب دیا۔ ”میں وکیل بن کر کیا کروں گی۔ لوگ یہی کہیں گے ناں کہ وکیل کی بہن وکیل بن گئی۔ میں یہ نہیں سننا چاہتی۔“

علی گڑھ یونیورسٹی میں قدم رکھتے ہی اُس کی آزاد روح کو اپنی منزل مل گئی۔ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا پلیٹ فارم میسر تھا اور جذبات آسمان کو چھو رہے تھے۔ ایک الگ ریاست کے قیام کا خواب آنکھوں میں بس چکا تھا اور اب اس خواب کا بیج دیگر مسلمانوں کے دلوں میں بونا تھا، تاکہ یہ ایک تن آور درخت بن سکے۔

☆☆☆

”واہ جی واہ، باپ کانگریس کے جلسوں میں شرکت کر رہا ہے اور بیٹی علی گڑھ یونیورسٹی میں ویمن مسلم لیگ کی صدر بننے جا رہی ہے۔“ کہنے والے کے لہجے میں طنز بھی تھا اور استعجاب بھی۔

”یہی تو جمہوریت کا حُسن ہے۔“ بی بی قریشی نے جواب دیا۔

”محترمہ محترمہ یہ بھاری ذمّے داری ہے اور آپ ایک نخنی سی خاتون ہیں۔“ ایک رئیس زادے نے لقمہ دیا۔

”خاطر جمع رکھیے۔ مجھے اپنی ذمّے داریوں کا پوری طرح احساس ہے۔“ جواب میں کاٹ تھی۔

سیاسی میدان میں تو فعال تھی ہی مگر ویمن مسلم لیگ کی صدارت سنبھالنے کے بعد سرگرمیوں میں مزید تیزی آگئی۔ تحریکِ پاکستان اُس کا اوڑھنا بچھونا بن گیا۔ ہر جلسے جلوس میں وہ پیش پیش ہوتی۔

اُس عرصے میں بی بی قریشی کو تمام قدآور سیاسی شخصیات سے نہ صرف ملنے بلکہ ان سے تبادلۂ خیال کرنے کا بھی موقع ملا۔

قائداعظم محمد علی جناح سے ملاقات کا دن تو یادگار تھا۔ اپنے عظیم قائد سے ہونے والے مکالمے کی مہک برسوں اس کے دل و دماغ کو مہکاتی رہی۔ لیاقت علی خان اور محترمہ فاطمہ جناح سے بھی ملاقات ہوئی۔

پھر گھر گھر جا کر تحریکِ پاکستان کے لیے چندہ جمع کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ بہ ظاہر مشکل معلوم ہونے والا یہ کام بی بی نے آسان بنا لیا تھا۔ خطابت پر اسے کمال حاصل تھا، دلائل دینے میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا... بس، جس مسلمان کے گھر پر دستک دی، اس نے اپنی استعداد کے مطابق چندہ مہم میں حصہ ڈالا۔

یہ مہم اسے شہروں سے نکال کر دیہی علاقوں میں لے گئی، جہاں اس نے زندگی کو قریب سے دیکھا۔ سچے، محنتی اور سادہ لوح انسانوں سے ملاقات کی، جن کے دل پاکستان کے لیے دھڑکنے لگے تھے۔

اسی اثنا..... میں 45ء کا سال آگیا۔ بی بی قریشی نے گریجویشن کا زینہ عبور کرلیا۔

گھر سے بلاوا آیا کہ بہت پڑھ لیں... تمہارے ہاتھ پیلے کرنے کا وقت آن پہنچا ہے، اب لوٹ آؤ۔

آزاد پنچھی کو پنجرے میں قید کرنا آسان نہیں۔ اور پھر اُس کی پرواز کا تو ایک واضح مقصد تھا۔ آزادی!

تحریکِ پاکستان سے علیحدگی کا تصور بی بی قریشی کے لیے محالِ تھا۔ اُسے پایۂ تکمیل تک پہنچانا ہی اُس کا مقصدِ زیست تھا اور دنیا کی کوئی قوت اُسے اپنے مقصد سے پیچھے نہیں ہٹا سکتی تھی۔

”میں علی گڑھ یونیورسٹی سے ماسٹرز کرنا چاہتی ہوں۔“ اس نے دوٹوک جواب دیا۔

گھر والے جانتے تھے کہ ماسٹرز کا تقاضا درحقیقت تحریکِ پاکستان سے جڑے رہنے کا بہانہ ہے۔ مگر بحث کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اس کی ضد سے بھلا کون مقابلہ کرسکتا تھا۔ گھر سے اجازت مل گئی۔

اکنامکس کا مضمون شاید اوروں کے لیے مشکل ہو، مگر بی بی قریشی کو یہ خاصا دلچسپ لگا۔

اِس مضمون کے چناؤ کا ایک سبب اور بھی تھا۔ اس زمانے میں کئی ہندو خواتین معاشیات کے میدان میں کام کر رہی تھیں جب کہ مسلم خواتین خال خال ہی اس شعبے میں نظر آتی تھیں۔ بس یہی سوچ کر اُس نے اِس میدان کا انتخاب کیا۔

گھر سے پھر پیغام آیا۔ ”تمہارے لیے رشتوں کا تانتا بندھ گیا ہے۔ اچھے گھرانوں کے کئی لڑکے تم سے شادی کرنے کے خواہش مند ہیں!“

وہ مسکرادی۔ شادی کے خواہش مندوں کی تو یونیورسٹی میں بھی کمی نہیں تھی۔ کئی طلبا، تہذیب اور احترام کے دائرے میں رہتے ہوئے اُسے شادی کے پیغام کر چکے تھے، مگر اُن

سب کو مایوس لوٹنا پڑا۔ اُس کی منزل تو کہیں اور تھی۔ جدوجہد کے اُس زمانے میں وہ اپنے پیروں میں بیڑیاں نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ خود کو قید نہیں کرنا چاہتی تھی۔

☆☆☆

فضا میں یاسیت تیر رہی تھی۔

حبس بڑھتا جا رہا تھا۔ زمین بنجر اور پتھریلی تھی۔ مایوسی کے سائے تعاقب کر رہے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ مسافر منزل پر پہنچنے سے قبل ہی تھکن کے ہاتھوں ہار جائے گا۔

یکبارگی مشرق سے کرنیں پھوٹیں... سورج طلوع ہونے لگا۔ جوں ہی روشنی پھیلی، پرندوں کی چہکار سے آسمان بھر گیا۔ یاسیت نے راہِ فرار اختیار کی۔ راستہ صاف نظر آنے لگا۔ بنجر زمین سے کونپلیں پھوٹ پڑیں۔ سبزہ لہرانے لگا۔

مسافر نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ سورج کی روشنی افق پر پھیلی تھی۔ اور وہاں... ایک پرچم لہرا رہا تھا، سبز ہلالی پرچم... وہ منزل کے قریب پہنچ گیا تھا۔

بی بی قریشی کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے فوراً بستر چھوڑ دیا۔ کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی، جہاں سے افق نظر آتا تھا، جس پر کرنیں بکھری تھیں۔ ٹھیک اُسی لمحے علی گڑھ یونیورسٹی کے کیمپس میں موذن کی آواز گونجی۔

”پاکستان۔“ اس نے دھیرے سے کہا۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔ یکم جنوری 1947 کا سورج طلوع ہو چکا تھا۔

☆☆☆

”لے کے رہیں گے پاکستان، بٹ کے رہے گا ہندوستان!“

نعروں کی گونج میں وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ اہلِ علم پیش گوئی کر چکے تھے کہ ایک اسلامی ریاست کے قیام کا وقت آن پہنچا ہے۔ آزادی کے متوالوں کو بھی اِس کا کامل یقین تھا۔

بالآخر 14 اگست کا دن آن پہنچا۔ پاکستان قائم ہوگیا اور برصغیر کے مسلمان سجدے میں گر گئے۔ تحریکِ آزادی کے ہزاروں کارکنان کی مانند بی بی قریشی بھی اُس دن انوکھی مسرت سے گزری جسے الفاظ میں بیان کرنا سہل نہیں۔ اگر کوئی یہ ارادہ باندھے تو شاید دفتر کے دفتر سیاہ ہو جائیں۔

ایک جانب جہاں مسرت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا، وہیں اندیشے بھی تھے، کیونکہ نفرت نے پھنکارتے سانپ کی شکل اختیار کرلی تھی۔ فسادات کے عفریت نے جنم لے لیا تھا جو انسانی خون کی قربانی چاہتا تھا۔ بنگال اور بہار میں زبردست ہندو مسلم فسادات ہو رہے تھے۔ افسوس ناک خبروں کا تانتا بندھ گیا تھا۔ لوٹ مار، قتل و غارت گری، عصمت دری اور وحشت کا بازار گرم ہوگیا تھا۔

مراد آباد میں بھی حالات گمبھیر تھے۔ گو کہ اظفر حسین کا گھرانا مالی و سماجی طور پر خاصا مستحکم تھا مگر صورتِ حال اتنی بگڑ چکی تھی کہ وہاں مزید قیام کرنا دشوار معلوم ہونے لگا تھا۔ کانگریسی لیڈر امن کے قیام کی کوشش میں ناکام رہے تھے اور ہر نیا دن ہیبت ناک اطلاعات لا رہا تھا۔

یہی سوچ کر بی بی قریشی کے خاندان نے رختِ سفر باندھا اور پاکستان کا رخ کیا۔ لاہور اُن کا مسکن ٹھہرا۔ البتہ بڑے بھائی نے وہیں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا کہ وہ سرکاری ملازم تھے

اُن مشکل حالات میں بی بی قریشی نے ایک عجیب فیصلہ کیا۔ وہ ہندوستان ہی میں ٹھہر گئی۔ گھر والوں کو لکھ بھیجا کہ میں تعلیم مکمل کر کے ہی پاکستان آؤں گی۔

اِس جرأت مندانہ اقدام نے سب کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ ایک نازک سی لڑکی اور اتنا حوصلہ؟ پر وہ کوئی عام لڑکی نہیں تھی۔ وہ ارادوں کی پکی تھی، حالات کا مقابلہ کرنے کا ہنر جانتی تھی۔ یقین کی قوت سے لیس تھی۔

سو وہ ڈٹی رہی۔ فسادات کی کرب ناک کہانیاں اُسے ہلا نہیں سکیں۔ اندیشوں کی آندھی اُس کے پاؤں اکھاڑنے میں ناکام رہی۔ وہ... اُس محاذ پر بھی جیت گئی۔

☆☆☆

مٹی کی خوشبو نے اُس کی روح کو معطر کر دیا۔ آنکھوں میں مسرت کی نمی تیر گئی۔ اور یہ ایک ایسا تجربہ تھا جس کا بیان ممکن نہیں۔ اِسی مٹی کے لیے تو اُس نے جدوجہد کی تھی۔ دشوار گزار گھاٹیاں عبور کیں تھیں۔ اِسی مٹی کا تو اُس نے خواب دیکھا تھا۔

”میں اِسی مٹی میں دفن ہونے کے لیے پیدا ہوئی ہوں۔“ اُس نے خود سے کہا۔

یہ 1950 کا سن تھا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد بی بی قریشی لاہور پہنچ چکی تھی جہاں خاندان اُس کا منتظر تھا۔

اب وہ اپنے ملک میں تھی جہاں امن تھا، سکون تھا، مگر وہ گھر بیٹھنے والوں میں سے نہیں تھی۔ بی بی قریشی جانتی تھی کہ قیامِ پاکستان کا مرحلہ تو طے ہوگیا ہے مگر تعمیرِ پاکستان کا مرحلہ ابھی باقی ہے اور اس کے لیے اسے اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔

شعبۂ تدریس اس کا میدان تھا اور علم کے چراغ روشن کرنے کی خواہش دل میں مچلتی تھی۔

www.pdfbooksfree.pk

ان ہی دنوں حکومتِ پاکستان کی جانب سے شعبۂ تدریس میں ملازمتوں کا اعلان ہوا۔ اُس نے محکمۂ تعلیم، حکومت پنجاب میں درخواست جمع کروادی، اس یقین کے ساتھ کہ بلاوا ضرور آئے گا۔

انتظار کے دنوں میں وہ فارغ نہیں بیٹھی۔ ''کام، کام اور صرف کام!'' وہ قائداعظم کے اس قول کی عملی تصویر تھی۔ اُس نے لاہور کی مختلف بستیوں کا رخ کیا جن کی گلیوں میں پروان چڑھنے والے بچے تعلیم سے محروم تھے۔ مہاجرین کے کیمپوں میں بھی کام کیا۔ فلاحی اداروں کا ساتھ دیا۔ اگر فارغ وقت میسر آتا تو کتابوں میں گم ہوجاتی۔ ان دنوں وہ معروف فلسفی برٹرینڈ رسل کو پڑھ رہی تھی۔

اب وہ اٹھائیس برس کی ہوچکی تھی۔ گھر والوں کی خواہش تھی کہ وہ بیاہ گھر سدھار جائے مگر اُس کے ارادے مختلف تھے۔

''مجھے ملک سنبھالنا ہے۔ معیشت داں کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کرنا ہے۔'' وہ دوٹوک لہجے میں کہا کرتی۔

ملازمت کے لیے اُسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ چند روز بعد ہی محکمۂ تعلیم کی جانب سے لیٹر آگیا۔ اب ٹیسٹ کے مراحل سے گزرنا تھا اور یہ اس جیسی قابل طالبہ کے لیے ایک آسان مرحلہ تھا۔

ٹیسٹ کے نتائج آئے تو بی بی قریشی کی علمی حیثیت و قابلیت واضح ہوگئی۔ وہ اکنامکس پڑھانے کے لیے، ملک بھر سے منتخب ہونے والے دس امیدواروں میں شامل تھی۔ اس فہرست میں شامل اکلوتی خاتون تھی۔

یہ ایک بڑا کارنامہ تھا لیکن بی بی قریشی فقط اس پر اکتفا نہیں کرنے والی تھی۔ اُس کی آنے والی زندگی میں مزید کارنامے رونما ہونے کو تھے۔

☆☆☆

پنڈی گرلز کالج میں گزرے ابتدائی ماہ و سال ایک خوش گوار یاد کی صورت اُس کے ذہن میں ہمیشہ نقش رہے۔

گو کہ وہ ایک سخت گیر اور نظم و ضبط کی پابند استاد کی شہرت رکھتی تھی مگر طالبات اُس کی دلدادہ تھیں۔ انہیں اس بات پر فخر تھا کہ وہ تحریکِ پاکستان کی ایک کارکن سے براہِ راست اکتسابِ فیض کررہی ہیں۔

کالج اسٹاف بھی بہت احترام کرتا تھا۔ ساتھی اساتذہ اُسے قابلِ تقلید گردانتے۔ اپنے مضمون میں تو اسے اتھارٹی تصور کیا جاتا تھا۔ دقیق سے دقیق مسئلہ پلوں میں حل کردیتی۔ جو الجھن سامنے آتی، اگلے ہی لمحے سلجھ جاتی۔

جب کسی موضوع پر بولتی تو یوں لگتا کہ علم کا دریا بہہ رہا ہے۔ بنجر زمین پلوں میں سیراب ہوجاتی۔

معاشیات جیسے خشک مضمون کو وہ اِس خوبی سے پڑھاتی کہ طالبات پر کبھی اکتاہٹ حملہ نہیں کرتی۔ وہ انہیں اس مضمون کی اہمیت سے آگاہ کرتی اور ساتھ ہی نصیحت کرتی کہ وہ مستقبل میں اسی میدان کا چناؤ کریں کیونکہ پاکستان کو معیشت کے شعبے میں خواتین کی سخت ضرورت ہے۔

پنڈی گرلز کالج میں بی بی قریشی آٹھ برس تک قلیل معاوضے کے عوض علم بانٹتی رہی۔ اور اُن ہی برسوں کی یکسانیت نے اسے نئے تجربات کے لیے تیار کیا۔

''میں معاشیات کے میدان میں مزید کام کرنا چاہتی ہوں۔'' ایک روز اس نے اپنی ساتھی سے کہا۔

''مزید کام؟'' سوال کرنے والے کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ہاں، میں پی ایچ ڈی کا ارادہ باندھ رہی ہوں۔'' اُس نے دھیرے سے کہا۔

جلد ہی یہ خبر پورے کالج میں پھیل گئی۔

اُس وقت خواتین خال خال ہی پی ایچ ڈی کے بارے میں سوچا کرتی تھیں۔ خصوصاً معاشیات جیسے خشک مضمون کی جانب تو کسی نے توجہ نہیں دی تھی۔ عام خیال تھا کہ یہ مردوں کا میدان ہے۔ اسی وجہ سے بیش تر افراد نے اُس کے ارادے کو زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا، لیکن جو لوگ بی بی قریشی کو جانتے تھے، انہیں ادراک ہوگیا تھا کہ وہ ایک اور سنگ میل عبور کرنے کو ہے۔

ایک اور کارنامہ رونما ہونے والا ہے۔

☆☆☆

لندن، علم و ادب و تہذیب کا مرکز، جدید و قدیم تعمیرات کا انوکھا امتزاج، روشن خیالی کا مظہر، ترقی کی علامت... کوئی اور ہوتا تو لندن کی چمک دمک سے اس کی آنکھیں خیرہ رہ جاتیں، لیکن یہ بی بی قریشی تھی جسے مرعوب کرنا آسان نہیں تھا۔ لندن کو اُسے متاثر کرنے کے لیے بہت زور مارنا پڑا۔

جس شے نے بی بی قریشی کو حقیقتاً متاثر کیا، وہ تھیں لندن کی درس گاہیں۔ وہاں کے کتب خانے۔ وہاں کی ترقی کرتی معیشت، جسے سمجھنے کی خواہش اسے یہاں لے آئی تھی۔ وہ اپنے ملک کے لیے ایک معاشی ماڈل بنانا چاہتی تھی۔ ایسا ماڈل، جو پاکستان کو ترقی کی راہ پر گامزن کردے۔

ہاں، اُس شہر کی ایک شے نے ضرور اُس کا دل موہ لیا اور یہ تھی برف باری۔

جب پہلی بار اس نے یہ منظر دیکھا، اُس کا دل محبت سے بھر گیا۔ آنکھوں میں خوشی کے آنسو تیر گئے۔

''آہ، کتنا خوب صورت منظر ہے۔'' اس کے منہ سے نکلا۔ اور وہ منظر واقعی خوب صورت تھا۔ خاموش درخت برف سے ڈھکے تھے۔ آسمان پر نیلی روشنی رقصاں تھیں۔ موسم دل پذیر تھا۔

تحقیق، وہ بھی زرعی معاشیات میں کسی طور آسان نہیں۔

لیکن بی بی قریشی کی لگن کسی مشکل کو خاطر میں نہیں لائی۔ اس نے تیزی سے تحقیقی کام مکمل کیا اور سامان باندھ لیا۔ اب اس کی منزل یورپ کا ایک جزیرہ تھا جسے آئرلینڈ کہہ کر پکارا جاتا تھا۔

☆☆☆

وہ اپنے ملک سے میلوں دور ایک اجنبی جزیرے پر تھی، پر چہرے پر کسی قسم کی گھبراہٹ نہیں تھی... وہاں تو تجسّس تھا۔

آئرلینڈ یورپ کا تیسرا بڑا جزیرہ ہے۔ اس کی ایک جانب بحرِ اوقیانوس ہے اور دوسری جانب بحیرہ آئرش، جو اسے گریٹ برٹن سے الگ کرتا ہے۔ بحیرہ آئرش ہی کو عبور کرکے بی بی قریشی نے اِس زمین پر قدم رکھا تھا۔

آئرلینڈ آمد کا سبب ڈبلنگ کا مشہور زمانہ ٹرینٹی کالج تھا، جس کا شمار یورپ کی اہم ترین درس گاہوں میں ہوتا تھا، خصوصاً معیشت داں اُسے خصوصی اہمیت دیتے تھے۔

سمندر کے کنارے آباد ڈبلنگ نے بی بی قریشی کو لندن سے زیادہ متاثر کیا، جس کا کلیدی سبب دریائے لفی ٹھہرا۔

یہ ڈبلنگ سے گزرنے والا اکلوتا دریا ہے جو شہر کو دو حصوں میں تقسیم کرتا۔ دریا پر تعمیر کردہ پُل دونوں حصوں کو جوڑنے کا بنیادی ذریعہ تھے اور اُس پُل سے گزرنا بی بی قریشی کو بہت اچھا لگتا تھا۔ نیچے بہتا دریا اُسے قدرت کا مظہر معلوم ہوتا۔ اپنا اپنا لگتا۔ رواں، مسلسل بہتا ہوا، آگے بڑھتا ہوا۔ ٹھیک اس کی مانند!

34 1 فٹ بلند ''سٹون نیلسن'' کے رُوبرو کھڑے ہونا بھی ایک انوکھا تجربہ رہا۔ اور ٹرینٹی کالج کا تو ذکر ہی کیا۔ 1952 میں قائم ہونے والی اِس قدیم درس گاہ کے تعلیمی اور تحقیقی نظام کو بی بی قریشی نے اپنے مزاج کے انتہائی قریب پایا۔

ابتداً اُسے جن موضوعات پر تحقیق کرنے کی پیشکش ہوئی، وہ تمام روایتی قسم کے تھے۔ ان میں ندرت نہیں تھی۔ بیشتر پر پہلے بھی کام ہوچکا تھا۔ مگر بی بی قریشی کچھ نیا کرنا چاہتی تھی۔ اُس نے دوٹوک الفاظ میں کہہ دیا۔

''میں اپنے ملک، اپنے خاندان سے میلوں دور یورپی معاشی نظام، امریکی معیشت کے اثرات، ایشیائی زرعی نظام کا جائزہ لینے نہیں آئی۔ یہ گھسے پٹے موضوعات ہیں، جن پر میں اپنا وقت نہیں ضائع کرنا چاہتی۔''

اس صاف گوئی نے پہلے تو کالج کے منتظمین کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا، مگر جلد ہی انہیں اندازہ ہوگیا کہ اُن کے سامنے کوئی عام عورت نہیں۔ پاکستان سے آنے والی یہ طالبہ حیرت انگیز صلاحیتوں کی مالک ہے۔ علم کی متلاشی ہے۔ مشکل پسند ہے اور چیلنجز پسند کرتی ہے۔

''تو پھر آپ ہی بتائیں، آپ کس موضوع پر تحقیق کرنا چاہتی ہیں؟'' اُس سے سوال کیا گیا۔

''میں ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کی زرعی اصلاحات کا تقابلی جائزہ لینے کا ارادہ رکھتی ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''یہ بے حد دقیق اور وسیع موضوع ہے۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ اس کا احاطہ کرلیں گی؟'' ڈائریکٹر کے لہجے میں تذبذب تھا۔

''بالکل، مجھے یقین ہے۔'' اُس کی آواز میں عزم تھا، جس کے پیچھے یقین کی قوت تھی۔ یقین، جس سے معجزات جنم لیتے ہیں۔

آنے والے ماہ تحقیق میں صرف ہوئے۔ ترقی یافتہ ممالک کی کیٹیگری میں اس نے برطانیہ اور جاپان کی زرعی اصلاحات کا جائزہ لیا۔ ترقی پزیر ممالک میں انتخاب پاکستان اور انڈیا تھے، جہاں کی ثقافت اور مسائل سے وہ بہ خوبی واقف تھی۔

مقالہ لکھنے کے لیے کئی کتب خانے کھنگالے۔ سیکڑوں ماہرین سے رابطہ کیا۔ ہر پہلو کا احاطہ کیا۔ خوب محنت کی۔ اس دوران اگر کبھی وہ تھک جاتی تو کوئی ناول پڑھنے لگتی۔ طاہرہ سید اور نور جہاں کی آواز اسے بہت پسند تھی۔ فرصت کے لمحات میں اُن کی گانے سنتی۔ لیکن زیادہ وقت ریسرچ ہی

www.pdfbooksfree.pk

میں صرف ہوتا۔

محنت بے ثمر نہیں گئی۔ اُس کے تحریر کردہ مقالے کی خاصی پزیرائی ہوئی۔ برطانیہ اور جاپان کے زرعی ماہرین نے اُس پر حوصلہ افزا تبصرے لکھے۔

ایک روشن صبح کالج میں خصوصی تقریب منعقد ہوئی، جس میں اُسے پی ایچ ڈی کی ڈگری دی گئی۔ انتظامیہ نے اسے قابلِ فخر طالبہ قرار دیا۔

دوسرے دن اخبارات میں خبر شائع ہوئی۔ ''ڈاکٹر بی بی قریشی، زرعی معاشیات میں پی ایچ ڈی کرنے والی پہلی پاکستانی خاتون!''

ایک معروف امریکی زرعی ماہر نے اُس کے مقالے پر خصوصی مضمون بھی لکھا جس میں یہ خیال ظاہر کیا کہ اگر پاکستان اور انڈیا میں اس کے تحقیقی نتائج اور آئیڈیاز کا اطلاق کیا گیا تو زرعی میدان میں انقلاب آجائے گا۔

آنے والے دن خوشیوں سے لبریز تھے۔ وہ لوٹنے کی تیاریوں میں جٹی تھی۔ اس یقین کے ساتھ کہ اب اپنی تحقیق کو پاکستان میں بروئے کار لائے گی۔

جس وقت وہ پاکستان جانے والے ہوائی جہاز میں سوار ہوئی، آنکھوں میں زرعی انقلاب لانے کا سپنا تھا، ایسا انقلاب جو پاکستان کی قسمت ہمیشہ کے لیے بدل دے گا۔ لیکن یہ سپنا جلد ٹوٹنے والا تھا!

☆☆☆

عجیب بے حسی تھی۔ لاتعلقی تھی۔ شاید جذبے ماند پڑ گئے تھے۔ شاید خوشیوں کو زنگ لگ گیا تھا۔

''یہ وہ پاکستان تو نہیں جسے میں چھوڑ کر گئی تھی۔'' اس نے خود سے کہا۔ ''یہ بدل چکا ہے۔ شاید اسے بے حسی کا روگ لگ گیا ہے۔''

کیا ایسا ہی تھا؟ پاکستان بدل چکا تھا؟

زرعی معاشیات میں ملک کی اولین خاتون پی ایچ ڈی کے ساتھ برتا جانے والا ناروا سلوک اِس تلخ سوال کا جواب اثبات میں دیتا ہے۔

اس کی آمد کا کوئی نوٹس نہیں لیا گیا۔ محکمۂ تعلیم کے افسران کو اُس کے کارنامے کا علم ہی نہیں تھا۔ جن کے پاس یہ اطلاع پہنچی بھی، اُنہوں نے اسے درخورِ اعتنا نہیں جانا۔ اخبارات نے بھی اِس جانب توجہ نہیں دی۔

اتنی ناقدری؟ حیرت انگیز!!

بی بی قریشی کو دکھ ضرور تھا مگر وہ مایوس نہیں ہوئی۔ وہ بے لوث خدمت پر یقین رکھتی تھی مگر بد قسمتی سے... یہاں اِس کی بھی گنجائش نہیں تھی۔

کارہائے نمایاں انجام دینے والی اِس خاتون کو دوبارہ پنڈی گرلز کالج ہی میں ذمّے داریاں سنبھالنا پڑیں۔

اِس بات پر تو اسے افسوس نہیں تھا کہ وہ وہاں کے ماحول سے مانوس تھی، کالج کے در و دیوار سے انسیت بھی تھی۔ لیکن اب اسٹاف بدل چکا تھا۔ نئے لوگ آگئے تھے، جنہیں یہ قبول نہیں تھا کہ اتنی پڑھی لکھی اور قابل استاد اُن کے درمیان ہو۔

حاسدین بی بی قریشی کی جانب سے متواتر کی جانے والی اصلاحات کے تقاضوں کو بھی وقت کا ضیاع تصور کرتے تھے۔

اس ماحول میں جلد ہی بی بی قریشی کو گھٹن محسوس ہونے لگی۔ گلے بندھے معمولات کاٹنے کھانے کو دوڑنے لگے۔ اکتاہٹ قوی ہونے لگی۔ اور پھر... ایک سرد شام مایوسی کے سانپ نے اُسے ڈسا۔

اداسی کے زہر سے اُس کا وجود بھر گیا۔ یہ احساس ستانے لگا کہ وہ اجنبی دیس میں ہے۔

''مجھے پرواز کے لیے نئے آسمان تلاش کرنے ہوں گے۔'' اس نے خود سے کہا۔ ''ایسی درس گاہیں تلاش کرنی ہوں گی، جہاں صلاحیتوں کے اظہار کے، تحقیق کے مواقع میسر ہوں۔ مجھے ایسے طلبا ڈھونڈنے ہوں گے جو مستقبل میں اپنا کردار ادا کرسکیں۔''

شاید وہ قبولیت کا لمحہ تھا۔ کیونکہ جس وقت یہ خیالات بی بی قریشی کے ذہن میں پنپ رہے تھے، قدرت مغربی افریقا کی ایک غریب ریاست میں مصروفِ عمل تھی جہاں سے ابھرنے والا ایک بچہ مستقبل میں اقوام متحدہ کا سیکریٹری جنرل بننے والا تھا۔

☆☆☆

گھانا... ایک گرم اور مرطوب ملک، جہاں وسائل کی قلت تھی۔ تعلیمی مواقع کی کمی تھی۔ بڑے حصے پر سبزے اور غربت کا راج تھا، پر ثقافتی اعتبار سے... وہ ایک زرخیز سرزمین تھی۔

نوآبادیاتی نظام سے قبل بھی یہ علاقہ یورش گروں کی توجہ کا مرکز رہا تھا۔ 1874 میں دوسروں کے وسائل پر زندگی گزارنے والا برطانوی سامراج اِس خوبصورت زمین پر قابض ہوگیا تھا۔ 1957 میں حریت پسندوں کی طویل جدوجہد کے بعد اسے غلامی کے شکنجے سے آزادی ملی۔ گھانا افریقا کی اُن ابتدائی ریاستوں میں سے تھا، جس نے طوق

غلامی گلے سے اتار پھینکا۔ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا عزم کیا۔

وہ جانتی تھی کہ نئے اور یکسر مختلف ماحول سے ہم آہنگ ہونا سہل نہیں ہوگا۔ مگر اُسے اِس کی پروا نہیں تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر زندگی میں مشکلات نہ ہوں، یکسانیت ہو، تو وہ اوب جاتی تھی۔ یہی سبب ہے کہ اُس نے خوشی خوشی یونیورسٹی آف کیپ کوسٹ کا حصہ بننے کا فیصلہ کرلیا۔

گھانا کا رخ کرنے کا ایک سبب وہاں کی تحریکِ آزادی کے قائد کوامے انکروما بھی تھے، جن کی وہ مداح تھی۔ 1966 میں گھانا کے لیے رختِ سفر باندھتے ہوئے دل میں یہی خواہش تھی کہ وہاں جا کر اس عظیم لیڈر سے ملاقات کرے۔ مگر یہ خواہش پوری نہیں ہوئی... جس روز وہ گھانا جانے والے ہوائی جہاز میں سوار ہوئی، انکروما کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔

یہ ایک بھاری دُکھ تھا جس کے ساتھ اُس نے گھانا کی زمین پر قدم رکھا جہاں بے یقینی کی فضا تھی۔

آنے والے دنوں میں بھی بے یقینی بے قرار رہی۔ پے در پے ہونے والی بغاوتوں نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ سیاسی نظام عدم استحکام کا شکار ہوگا۔ جمہوری سسٹم کی کمر ٹوٹ گئی۔ مگر بی بی قریشی نے اس جانب توجہ نہیں دی۔ اُس کا مقصد تو فقط علم کا فروغ تھا۔

اُس کے معمولات میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔ وہی ہوسٹل کی زندگی۔ صبح بیدار ہوکر کمرۂ جماعت کا رخ کرنا۔ وہاں سے فراغت کے بعد کچھ وقت کتب خانے میں گزارنا۔ چارلس ڈکنز اور رسل کی کتابیں پڑھنا۔ اگر کوئی تقریب ہو تو اُس میں شرکت۔ ورنہ تحقیق، تحقیق اور تحقیق!

ہاں، ماضی کے برعکس اِس بار گھر سے دوری نے اُسے تھوڑا اداس رکھا۔ علی گڑھ کے زمانے میں تو تحریکِ آزادی کے سحر نے جکڑ رکھا تھا۔ مصروفیات ایسی تھیں کہ گھر والوں سے رابطے کا موقع بھی کم ہی ملتا۔ کچھ ایسا ہی معاملہ لندن اور آئرلینڈ کا بھی تھا جہاں تحقیقی مصروفیات نے سر کھجانے کا موقع نہیں دیا۔ مگر گھانا آنے کے بعد اسے گھر یاد آنے لگا۔

خیر، طلبا و طالبات کی محبتوں نے اِس غم کو بڑی حد تک کم کردیا۔ وہ یونیورسٹی آف کیپ کوسٹ کی اکلوتی خاتون پروفیسر تھی۔ وہ بھی ایسے مضمون کی جس کی جانب اُس کی ہم وطن خواتین کی مانند گھانا کی عورتیں بھی شاذ شاذ ہی آتی تھیں۔

بی بی قریشی کو وہاں مکمل آزادی حاصل تھی۔ یونیورسٹی انتظامیہ کو اس کی صلاحیتوں پر بھروسا تھا۔ تحقیق کے مواقع بھی میسر تھے۔ پھر طلبا و طالبات میں بھی کچھ نئے سیکھنے کا جذبہ تھا۔ وہ تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اور بی بی قریشی کی زندگی کا مقصد ہی تعلیم کا فروغ تھا۔ یوں اُس نے خود کو ایک سانچے میں ڈھال لیا۔ وہ فوجی بغاوتوں سے، آئینی کی معطلی سے بے پروا ہوگئی۔ فکر تو بس یہ تھی کہ تدریسی عمل معطل نہ ہو۔ اس ضمن میں اس نے عملی اقدامات بھی کیے۔

سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے والے طلبا و طالبات کی وہ حوصلہ افزائی ضرور کرتی کہ نوجوانی میں خود بھی فعال سیاسی کارکن رہی تھی مگر ساتھ ہی انہیں یہ نصیحت کرتی کہ وہ تعلیم کی جانب بھی توجہ دیں۔ اِس ضمن میں اپنی مثال پیش کرتی۔

''میں بھی ایک سیاسی کارکن تھی لیکن اس عمل سے میری پڑھائی متاثر نہیں ہوئی۔ میں نے تمام امتحانات اچھے نمبروں سے پاس کیے۔ آپ کو بھی اپنی پڑھائی سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔''

☆☆☆

گھانا میں اُسے کئی قابل طلبا میسر آئے، جنہوں نے آنے والے برسوں میں بین الاقوامی اداروں میں ذمّے داریاں نبھائیں۔

اور اُن ہی میں ایک ایسا نوجوان بھی شامل تھا جو مستقبل میں اُس ترقی پذیر ریاست کی پہچان بننے والا تھا... اُس کا نام کوفی عنان تھا۔

دھان پان سا وہ لڑکا خاصا شرمیلا اور کم گو تھا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کل وہ اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل جیسا اہم عہدہ سنبھالنے والا ہے۔

کوفی عنان بھری پُری کلاسوں میں کبھی نمایاں طور پر سامنے نہیں آیا۔ وہ پیچھے والی نشستوں پر خاموش بیٹھا رہتا۔ بی بی قریشی بی اے آنرز اور ایم اے کے اسٹوڈنٹس کو لیکچر دیا کرتی تھی۔ کوفی بھی وہیں ہوتا، لیکن ایک آدھ بار ہی اُن دونوں کا سامنا ہوا۔

ایک بار کوفی نے کلاس میں مختصر سی تقریر کی تھی جو خاصی بے ربط تھی۔ دوسری بار اسائنمنٹ کے سلسلے میں اُس نوجوان نے بی بی سے مشورہ کیا تھا۔ بس!!

یہی سبب ہے کہ جب برسوں بعد کوفی عنان کے

www.pdfbooksfree.pk

اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل بننے کی اطلاع ملی، وہ خوشگوار حیرت سے گزری۔ ''تم اتنے بھی نالائق نہیں تھے، جتنا میں تمہیں سمجھتی تھی!'' وہ مسکرائی۔

☆☆☆

لاطینی امریکا کے معروف ادیب گبرئیل گارسیا مارکیز نے ایک بار کہا تھا۔ ''نئی زمینوں کا سفر انسان کو نئے امکانات سے رُوبرو ہونے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ خود کو دریافت کرنے کا حوصلہ دیتا ہے۔''

یہ بات بی بی قریشی کی زندگی پر صادق آتی ہے جس کے لیے گھانا نے نئے امکانات کا در وا کر دیا۔ وہیں اُس نے خود میں چھپے مضمون نگار کو پہچانا... ایسا مضمون نگار، جسے کوئی للکار خوف زدہ نہیں کر سکتی تھی۔ جس کا قلم دو دھاری تلوار تھا۔ جو سچ کا داعی تھا۔

معیشت اس کا میدان، مگر جب قلم تھاما تو بی بی قریشی نے بین الاقوامی سیاست کے موضوع کا چناؤ کیا۔

لگی لپٹی رکھنے والوں میں سے وہ تھی نہیں۔ سچ کہنے میں تامل کیسا۔ سو جب لکھنا شروع کیا، تو پہلا حملہ سامراج قوتوں کے سرپرست اعلیٰ اسرائیل پر کیا جس نے فلسطینیوں پر مظالم کے پہاڑ توڑ رکھے تھے۔

پہلی ہی تحریر نے اخبار میں جگہ حاصل کر لی۔ خوب واہ واہ ہوئی۔ اس کی بے باکی کو سراہا گیا۔ مگر چند خیر خواہ نے دبے لفظوں میں یہ مشورہ بھی دیا کہ اِس موضوع پر ذرا احتیاط رویہ اختیار کیا جائے۔

پہاڑوں پر بسیرا کرنے والی شاہین کو قید نہیں کیا جا سکتا۔ اُس کا کام تو پرواز ہے۔ بی بی قریشی نے بھی محدود ہونے سے انکار کر دیا۔ سچ لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔

اُس زمانے میں جنوبی افریقا میں نیلسن منڈیلا حق و صداقت کی جنگ لڑ رہے تھے۔ آزادی کی قدرداں بی بی قریشی کو اِس سیاہ فام لیڈر کی فکر نے بہت متاثر کیا۔ اس نے نیلسن منڈیلا کی تحریک کو موضوع بنایا۔ اِس تعلق سے مضامین لکھے اور پیش گوئی کی کہ اِس جدوجہد کے نتیجے میں جنوبی افریقا میں نیا سورج طلوع ہوگا۔

چند تحریروں کی اشاعت ہی کے بعد پورے گھانا میں اِس پاکستانی خاتون کی جرأت کا چرچا ہونے لگا۔ اسرائیلی مظالم کی نشان دہی نے گھانا میں تعینات مختلف ممالک کے سفیروں کو بھی اُس کی جانب متوجہ کیا جن میں مصر کے سفیر پروفیسر حسنی بھی شامل تھے۔

بی بی قریشی کے مضامین نے انہیں گرویدہ بنا لیا۔ انہوں نے اس زرخیز ماہر سے ملاقات کی۔ کام کو سراہا اور لکھنے کا سلسلہ جاری رکھنے کی درخواست کی۔

''لوگ تو مجھے باز رہنے کی تنبیہ کر رہے ہیں اور آپ حوصلہ افزائی!'' وہ مسکرائی۔

''کیونکہ میں سچ کا قدر داں ہوں۔'' پروفیسر نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ ''میں نے اپنے اسٹاف کو آپ کے مطبوعہ مضامین مصر بھجوانے کی ہدایت کر رکھی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مصری صدر کو یہ پسند آئیں گے۔ اور امید ہے کہ مصری قارئین بھی انہیں پڑھنا چاہیں گے۔''

''یہ تو بہت خوشی کی بات ہوگی۔'' وہ مسکرائی۔

اُس نے سچ لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ طلبا و طالبات کی جانب سے بھی اِس سلسلے کو بہت پسند کیا گیا۔ وہ اپنے رشتے داروں اور دوستوں کو خبر یہ بتاتے کہ وہ بی بی قریشی کے طالب علم ہیں۔ مداحوں کی فہرست میں کوفی عنان بھی شامل تھا۔

پروفیسر حسنی ہر تحریر کی اشاعت کے بعد اُسے فون کرتے۔ کالم پر بات ہوتی۔

پھر ایک شام بی بی قریشی کو حسنی مبارک کی غیر متوقع فون کال موصول ہوئی۔ سلام دعا کے بعد اُس نے پوچھا۔

''پروفیسر صاحب، آج کیسے یاد کر لیا؟ آج تو مضمون کی اشاعت کا دن نہیں۔''

''صحیح فرمایا۔'' پروفیسر نے عادتاً کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ ''لیکن فون کرنے کا سبب آپ کے مضامین ہی ہیں!''

''کہیے میں سن رہی ہوں۔''

''جیسا کہ آپ کے علم میں ہے... گزشتہ چند ماہ سے میں آپ کے مضامین کی کٹنگ صدرِ مصر کو ارسال کر رہا ہوں۔ آپ کے تحریروں نے انہیں بہت متاثر کیا۔ اور اب وہ چاہتے ہیں...'' پروفیسر نے ایک لمحہ کا توقف کیا۔ ''کہ حکومت مصر کی دعوت پر محترمہ ڈاکٹر بی بی قریشی مصر کا دورہ کریں۔''

''ارے...'' لہجے میں استعجاب تھا۔ ''مگر میں تو ایک معمولی انسان ہوں۔''

''ایسا آپ سوچتی ہیں محترمہ۔ مگر مجھے آپ سے اختلاف ہے۔'' پروفیسر نے فوراً کہا۔ ''سچ تو یہ ہے کہ اگر آپ مصر میں ہوتیں، تو اِس وقت وزیر معیشت ہوتیں۔ خیر، یہ تو الگ موضوع ہے۔ میں نے یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا

کہ ہماری قابلِ احترام شاہی مہمان... یعنی آپ کے تمام سفری انتظامات مکمل ہیں۔ آپ تیار رہیں۔ اگلے ہفتے آپ مصر روانہ ہو رہی ہیں۔''

''مگر میرے لیے یہ ممکن نہیں۔ یونیورسٹی میں کلاسیں...''

پروفیسر نے بات کاٹ دی۔ ''میں وائس چانسلر سے بات کر چکا ہوں، اگلے ہفتے!!''

اور فون بند ہو گیا۔

☆☆☆

مصر... اسرار کی سرزمین، جس کی فضاؤں میں جادو تھا۔ جہاں بلند و بالا اہرام ہزاروں راز چھپائے، زمین کے سینے پر خاموش کھڑے تھے۔ اور قاہرہ کے تو کیا ہی کہنے جہاں بازاروں میں قدیم اور جدید ثقافت کا حسین امتزاج دمکتا تھا۔

ان سب کی اہمیت اپنی جگہ، مگر سب سے زیادہ بی بی قریشی کو دریائے نیل نے متاثر کیا جہاں تاریخ سبک روی سے بہتی تھی۔

مصر میں اِس پاکستانی خاتون کا استقبال شاہی مہمان کی حیثیت سے کیا گیا۔ اس نے صدر کے عشائیے میں شرکت کی۔ اعلیٰ حکومتی شخصیات سے ملاقات کی۔ مصری علما سے تبادلہ خیال کرنے کا بھی موقع ہاتھ آیا۔ تاریخی مقامات کی سیر کی۔ جامعہ الازہر بھی جانا ہوا۔

سچ تو یہ ہے کہ ان چند دنوں میں بی بی قریشی کئی پُرتجسّس تجربات سے گزری۔ لوٹتے وقت اُس نے سوچا۔ ''جب فراغت نصیب ہوگی، میں اِس دلچسپ سفر کی تفصیلی رُوداد لکھوں گی!''

مگر قسمت نے یہ موقع نہیں دیا!!

☆☆☆

بی بی قریشی کے گھانا لوٹنے کی خبر ملتے ہی طلبا میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔

تدریسی عمل شروع ہو گیا۔ پھر وہی بھری مچری کلاسیں۔ ایک ایک گھنٹے کے لیکچرز۔ کتب خانے۔

مصروفیات کے اُن دنوں میں ایک خواہش دھیرے دھیرے بی بی قریشی کے دل میں پنپ رہی تھی، خانۂ خدا دیکھنے کی خواہش۔ وہ عمرہ کرنا چاہتی تھی، سعودی عرب کے لیے رختِ سفر باندھنے کا ارادہ تھا۔

اِس ضمن میں سعودی عرب میں تعینات گھانا کے سفیر سے رابطہ کیا گیا۔ وہاں سے جواب تو فوراً ہی آ گیا، مگر وہ خاصا مایوس کن تھا۔

''ہم آپ کی خواہش کا احترام کرتے ہیں، مگر... یہ ممکن نہیں۔''

سبب دریافت کیا گیا، تو پتا چلا کہ سعودی عرب کی حکومت محرم کے بغیر کسی عورت کو ویزا جاری نہیں کرتی۔

یہ ایک گمبھیر مسئلہ تھا۔ کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔

دوسری جانب خانۂ خدا کی زیارت کی آرزو ہر گزرتے دن کے ساتھ قوی ہوتی جا رہی تھی۔

اِس ضمن میں اُس نے پروفیسر حسنی سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

فون پر اپنا مدعا بیان کرنے کے بعد اُس نے گہرا سانس لیا۔

دوسری طرف خاموشی تھی۔ چند ساعتوں بعد پروفیسر کی آواز سنائی دی۔ ''ڈاکٹر صاحبہ، یہ ایک پیچیدہ معاملہ ہے۔''

بی بی قریشی کو امید دم توڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''لیکن میں کوشش کرتا ہوں۔ مجھے تھوڑا وقت دیجیے۔'' یہ کہہ کر پروفیسر نے فون رکھ دیا۔

اب بی بی قریشی کو انتظار کرنا تھا، جو طویل ثابت ہوا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ مایوسی بڑھتی گئی مگر پھر ایک روز فون کی گھنٹی بجی۔

''ڈاکٹر صاحبہ، مبارک ہو۔ ویزے کا انتظام ہو گیا۔'' دوسری طرف پروفیسر حسنی تھے۔

''یہ تو بہت ہی اچھی خبر ہے، مگر پروفیسر صاحب اجازت کیسے ملی۔'' حیرت اور مسرت، دونوں ہی جذبات بی بی قریشی کے دل میں دھڑک رہے تھے۔

''اِس بات کو جانیں دیں۔ آپ تیاری کریں۔'' پروفیسر حسنی نے جواب دیا۔

یہ تو اُسے بعد میں پتا چلا کہ اِس ضمن میں پروفیسر نے کتنی بھاگ دوڑ کی تھی۔ سعودی حکام کو منانے کے لیے اُسے کتنے پاپڑ بیلنے پڑے تھے۔

جس دوپہر وہ گھانا سے سعودی عرب جانے والی فلائٹ میں سوار ہوئی، دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اندرون میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔

چند گھنٹے جذبات میں تلاطم رہا، مگر جونہی جہاز سعودی عرب کی زمین پر اترا، ہلچل تھم گئی۔ طوفان تھم گیا۔ بس اب

www.pdfbooksfree.pk

ایک ہی خواہش تھی، جلد از جلد مکہ پہنچنے کی خواہش۔

مسجد الحرام میں داخلے کے وقت بی بی قریشی کن کیفیات سے گزری، اِس کا بیان ممکن نہیں۔ آنکھوں میں نمی تھی اور دل میں عقیدت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

وہاں نماز ادا کی۔ طواف کیا۔ حجرِ اسود کو بوسہ دیا۔ خانۂ خدا کے غلاف کو چوما۔ سعی کا مرحلہ طے کیا۔ اور پھر گھنٹوں وہاں خاموش بیٹھی رہی۔

مدینے کا سفر تو ایک روحانی تجربہ تھا جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

گھانا لوٹتے وقت وہ انتہائی مغموم تھی۔ اُس نے جہاز کی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ رن وے پر دھوپ پھیلی تھی جس سے پرے مکانات نظر آ رہے تھے۔

''میں پھر آؤں گی!'' اُس نے آہستگی سے کہا۔

☆☆☆

کوئی اُس کا تعاقب کر رہا تھا۔

اُس نے مڑ کر دیکھا۔ کوئی نہیں تھا۔ پارک میں مکمل سناٹا تھا۔

''شاید میرا وہم ہو۔'' وہ سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔

لیکن یہ احساس جلد ہی لوٹ آیا۔ اِس بار بازار سے گزرتے وقت اُسے محسوس ہوتا کہ کسی کی نظریں اُس پر گڑی ہیں۔

چند ہی روز میں اُسے یقین ہو گیا کہ کوئی اُس پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ جب اُس نے اپنے خیر خواہوں سے بات کی تو وہ بھی پریشان ہو گئے۔

بالآخر اُس نے وائس چانسلر سے بات کرنے کا سوچا۔

''موساد کے اہل کار۔'' اُس کی بات سنتے ہی وائس چانسلر کے منہ سے نکلا۔

''موساد؟'' بی بی قریشی کے لہجے میں حیرت تھی۔ ''ناممکن! بھلا انہیں میرا تعاقب کرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''ضرورت تو ہے!'' وائس چانسلر نے سگار جلایا۔ ''آپ مسلسل اسرائیل کے خلاف لکھ رہی ہیں۔ اِن تحریروں نے آپ کو گھانا کی ہر دلعزیز شخصیت بنا دیا ہے۔ مصر کا بھی آپ دورہ کر چکی ہیں۔ وہاں صدر کی مہمان رہیں۔ چین کا سفر کیا۔ چند دن ایران میں بھی قیام کر چکی ہیں۔ کیا آپ کو نہیں لگتا کہ اسرائیل کی خفیہ ایجنسی کو متحرک کرنے کے لیے یہ عوامل کافی ہیں!''

چند ساعت وہ خاموش رہی۔ پھر سر اٹھایا۔ ''آپ درست ہی کہتے ہیں۔ اُن کے لیے میں واقعی ایک دشمن ہوں۔''

''ایک سبب آپ کا پاکستانی ہونا بھی ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں، آپ کے ملک نے اسرائیل کو تسلیم نہیں کیا۔''

''اور کرے گا بھی نہیں۔'' بی بی قریشی نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''مجھے اِس کا یقین ہے ڈاکٹر صاحبہ۔'' وائس چانسلر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میرا مشورہ ہے کہ آپ ذرا احتیاط سے کام لیں۔ چاہیں تو ہم پولیس کو اطلاع دے سکتے ہیں۔''

''فی الحال اس کی ضرورت نہیں۔'' وہ کھڑی ہو گئی۔

مگر جلد ہی پولیس کو اطلاع دینے کی نوبت آ گئی۔ بی بی قریشی کو محسوس ہونے لگا کہ اس کی ٹیلی فون کالز ریکارڈ ہو رہی ہیں، اس کے نام آنے والے خطوط پہلے ہی پڑھ لیے جاتے ہیں۔ ہوسٹل کے باہر بھی چند مشکوک سرگرمیاں اس کی نظر سے گزریں۔ اور پھر ایک روز... ایک مبہم دھمکی آمیز خط موصول ہوا۔

اب اُس کی برداشت سے باہر ہو گیا تھا۔ وہ خط لے کر پولیس اسٹیشن پہنچ گئی۔ پولیس نے شکایت درج کر لی، مگر تفتیش کا کوئی نتیجہ سامنے نہیں آیا۔

یہی پریشانی کیا کم تھی کہ چند روز بعد وہ ایک اور کرب ناک تجربے سے گزری۔

وہ کافی دنوں سے محسوس کر رہی تھی کہ ساتھی اساتذہ اس سے کھنچے کھنچے رہنے لگے ہیں، مگر اُس نے اس جانب کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ مگر ایک دن تو حد ہی ہو گئی۔

اُس شام اُسے ایک پروفیسر کے بیٹے کی سالگرہ میں شرکت کرنا تھی۔ وہ ہوسٹل سے نکلنے کو تھی کہ ایک غیر متوقع کال موصول ہوئی۔

فون کرنے والے نے خود کو پروفیسر کے ملازم کی حیثیت سے متعارف کروایا۔ ''ڈاکٹر صاحبہ، تقریب ملتوی ہو گئی ہے۔ برائے مہربانی آپ گھر میں آرام کریں۔''

دوسرے دن جب وہ یونیورسٹی گئی، تو یہ جان کر حیران رہ گئی کہ تقریب پروگرام کے مطابق منعقد ہوئی تھی۔ اُس نے پروفیسر سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے ڈاکٹر صاحبہ۔ میرے گھر کے کسی ملازم نے ایسی کال نہیں کی۔''

اُس نے صاف محسوس کیا کہ پروفیسر کی آنکھیں اُس کے بیان سے متصادم ہیں، مگر وہ خاموش رہی۔

اِس ضمن میں اس نے دیگر اساتذہ سے بھی بات کی۔ بیشتر نے یہی کہا کہ وہ وہم کا شکار ہو گئی ہے۔

مگر پھر... ایک خیر خواہ نے سچ اگل ہی دیا۔ ''انتظامیہ پر تمہیں الگ کرنے کے لیے دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔''

یہ انکشاف تھا۔ ''کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟''

''ہاں، وائس چانسلر اور انتظامیہ کوشش کر رہی ہے۔ مگر مجھے لگتا ہے وہ دباؤ برداشت نہیں کر پائیں گے!''

چند ساعت خاموشی چھائی رہی۔ پھر اُس نے کہا۔ ''میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے کسی کو اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑے۔ بہتر یہی ہے کہ میں اِس ادارے سے الگ ہو جاؤں۔''

یہ کہنے کے بعد وہ ہوسٹل لوٹ آئی۔ اگلے چند گھنٹے سوچ بچار میں گزرے۔ شام میں جب وہ چہل قدمی کے لیے نکلی، مستقبل کا فیصلہ ہو چکا تھا۔

دراصل چند روز قبل اُس کی نظر سے یونیورسٹی آف نیروبی کا ایک اشتہار گزرا تھا، جنہیں فوری طور پر اکنامکس کے ایک تجربے کار پروفیسر کی ضرورت تھی۔

ہوسٹل میں لوٹنے سے قبل وہ بہ ذریعہ ڈاک ملازمت کے لیے درخواست روانہ کر چکی تھی!

☆☆☆

کینیا، ایک نئی سرزمین... اور یونیورسٹی آف نیروبی، ایک نئی درس گاہ!

گھانا سے رخصتی کا اُسے دُکھ تو بہت تھا لیکن نیروبی کے حسین موسم نے اِس غم کو خاصا کم کر دیا۔ اُس پُر فضا شہر نے بی بی قریشی کی شخصیت پر انتہائی خوش گوار اثرات مرتب کیے۔

روزمرہ معمولات کا سلسلہ جہاں سے ٹوٹا تھا، وہیں سے جُڑ گیا۔ ایک ایک گھنٹے پر طویل لیکچرز۔ سیکڑوں طلبا و طالبات پر مشتمل کلاسیں۔ کتابوں سے بھرے کتب خانے۔ فراغت کے لمحات میں ڈکنز اور رسل کی کتابیں۔ طاہرہ سید اور نور جہاں کی آواز۔ جدوجہد آزادی پر مشتمل فلمیں۔

کینیا میں بھی ہزاروں طلبا نے اس کے علم سے استفادہ کیا۔ ساتھی اساتذہ بھی اس کا بہت احترام کرتے تھے۔

اس عرصے میں پاکستان بھی آنا جانا رہا۔ بنیادی سبب گھر والے ہی تھے، جو خوب آؤ بھگت کرتے۔ خاندان کے بچے اُس کے گرد ڈیرا ڈال لیتے۔ پردیس کی کہانیاں سنانے کی

نسخہ سپر پاور ہیرے والا
مایوس لاعلاج اور خوف زدہ حضرات کیلئے عظیم سرمایہ
جسمانی اعصابی اور خاص کمزوری
شوگر، بلڈ پریشر کی وجہ سے پریشان
مریض زندگی میں ایک بار اسے ضرور
استعمال کریں اور تمام عمر فٹ رہیں
ایسی خواتین کیلئے بھی مفید ہے جو شوگر کی وجہ سے دماغی جسمانی اور اعصابی کمزوری محسوس کرتی ہیں۔
پنڈلیوں جوڑوں اور پٹھوں کے درد سے مکمل نجات دلاتا ہے
کورس 15 دن صرف 2500 روپے
نوٹ نسخہ سپر پاور ہیرے والا
سونے، چاندی یاقوت، زمرد، عقیق، مرجان اور ہیرے جواہرات کا مرکب ہے جو کہ بہت قلیل مقدار میں تیار ہوتا ہے لہٰذا یہ بازار سے نہیں ملتا صرف ہمارے ہاں ہی دستیاب ہے۔ آپ خود لیں یا گھر بیٹھے فون کر کے وی پی پارسل منگوالیں No Side Effect
پتھری گردہ مثانہ یا پتہ میں ہو انشاءاللہ تعالیٰ ریت بن کر نکل جائے۔ کورس 20 دن صرف 1500 روپے
موٹاپا بڑھا ہوا پیٹ ڈھلکا ہوا پیٹ قد سے زائد وزن جسم کی فالتو چربی پسینہ بن کر خارج ہو جائے گی
کورس ایک ماہ صرف 2000 روپے
گیس ٹربل سینے کی جلن تیزابیت، دائمی قبض، پیٹ سخت ہونا معدے کے زخم اور انتڑیوں کے زخم کا کامیاب علاج
کورس ایک ماہ صرف 1200 روپے
طب یونانی کے مایہ ناز
دواخانہ حکیم عالم شیر کھرل
بلھے شاہ روڈ نزد اڈا اللیانی قصور شہر
0345-6397367
0300-4280816

www.pdfbooksfree.pk

فرمائش کرتے۔ اور وہ مسکراتے ہوئے کوئی قصہ چھیڑ دیتی۔

کبھی اہرام مصر سے پیوست اسرار کا ذکر ہوتا۔ کبھی عمرے کے تجربات زیر بحث آتے اور کبھی گھانا اور کینیا کے جنگلات موضوع بن جاتے۔

جب کبھی وہ پاکستان لوٹتی، ایک شے کا احساس بڑی شدت سے ہوتا۔ ”جس ملک کے لیے میں نے جدوجہد کی تھی، یہ پاکستان اس سے کتنا مختلف ہے۔ ہر کوئی مفادات کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ اپنے اثاثے بڑھانے میں لگا ہوا۔ قائداعظم کی تعلیمات کو بالکل بھلا دیا گیا ہے۔“

بے قیمتی کا المیہ بھی اُسے اداس کر دیتا۔ اُس جیسی کار ہائے نمایاں انجام دینے والی عورت کی خدمات کا حکومت نے نوٹس لینے کی کبھی زحمت نہیں کی۔ کبھی اخبارات میں اُس کے کارناموں کا ذکر نہیں ہوا۔ لیکن وہ منفی خیالات ذہن پر سوار نہیں ہونے دیتی۔ سر جھٹک دیتی اور دوبارہ خاندان کے ننھے منے بچوں میں گم ہو جاتی، جنہیں کینیا کے جنگلات کے سب سے خوں خوار چیتے کی کہانی سننے کی خواہش اُس تک کھینچ لاتی۔

☆☆☆

نیروبی کے ابتدائی دنوں میں کئی بار بی بی قریشی کو اُس پُراسرار احساس نے ستایا، جو گھانا چھوڑنے کا سبب بنا تھا۔

چہل قدمی کے دوران کئی بار اُسے محسوس ہوا کہ کوئی اُس کا تعاقب کر رہا ہے مگر اُس نے اِس جانب توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ لکھنا ترک کر چکی تھی اور اب اُس کی کل توجہ تدریس پر مرکوز تھی۔

ایسا نہیں تھا کہ وہ لکھنے کی آرزومند نہیں تھی۔ دراصل اب بیماریاں خصوصاً امراضِ چشم اُسے پریشان رکھنے لگے تھے۔

مطالعے کی راسخ عادت کی وجہ سے نظر پہلے ہی کمزور تھی مگر پھر ایک دن... اچانک آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ معائنہ کروایا تو پتا چلا کہ آنکھوں میں کالا پانی اتر آیا ہے۔

علاج کے لیے اُس نے پاکستان کا رخ کیا۔ معالجین نے آپریشن کروانے کا مشورہ دیا۔

”ایسا ہے، تو ایسا ہی سہی!“ اس نے دھیرے سے کہا۔

آپریشن کامیاب رہا۔ چند روز آرام کرنے کے بعد نیروبی کے لیے رختِ سفر باندھ لیا۔ پھر تدریسی سرگرمیوں میں الجھ گئی لیکن اندھیرا تعاقب میں تھا۔ کچھ عرصے بعد پھر نظر کی کمزوری اُسے معالجین تک لے گئی۔

اس بار موتیے کی تشخیص ہوئی۔ دوبارہ پاکستان کا رخ کیا۔ آپریشن کروانے کے بعد کئی دن آرام کرتے گزرے۔

صحت یاب ہونے کے بعد سیاحت کی اِس شائق کے دل میں نئے تجربات کی خواہش نے انگڑائی لی۔ اُن دنوں 1964 میں آزاد ہونے والی افریقا کی انتہائی جنوبی ریاست زمبیا کی یونیورسٹی آف لوساکا میں ایک اسامی نکلی تھی۔ خاصی سوچ بچار کے بعد بی بی قریشی نے اُس ملازمت کے لیے اپلائی کر دیا۔

یونیورسٹی کے لیے اتنی قابل اور تجربے کار خاتون کی جانب سے درخواست موصول ہونا ایک حیران کن امر تھا۔ فوراً ہی جواب آ گیا۔ ”ہم آپ کے منتظر ہیں!“

چند روز بعد وہ زمبیا کے مرکزی شہر لوساکا میں تھی جو اُس کی توقعات کے بالکل برعکس نکلا۔

وہاں کی زندگی پر جمود طاری تھا۔ سیاسی منظر پر یکسانیت کا غلبہ تھا۔ ایک طرح کی بیزاری تھی۔

لیکچرز، کتب خانے، نور جہاں کی آواز، ڈکنز کے ناول... کوئی بھی اِس بیزاری کو نہیں توڑ سکا۔

اکتاہٹ کے اُن دنوں میں اُسے گھر شدت سے یاد آنے لگا۔ یہ خواہش پنپنے لگی کہ سب چھوڑ چھاڑ کر اب ایک سیدھی سادی زندگی گزاری جائے۔

شادی کی تو عمر نکل گئی لیکن بھانجے بھانجیاں تو ہیں، ان کی شادیاں کروائی جائے۔ بھائی بھاوجوں کے ساتھ وقت بتایا جائے۔ پیشہ ورانہ اوقات کار سے آزاد ہو کر کچھ سیاحت کی جائے۔

اُن دنوں پاکستان کے ساتھ ساتھ ہندوستان بھی اسے یاد آنے لگا تھا۔ مراد آباد کا محلہ ڈیریا، گوکل داس کالج، علی گڑھ یونیورسٹی۔ دل میں خواہش ہوئی کہ ہندوستان کا رخ کیا جائے۔

وہ ماضی کی اِن حسین یادوں میں گم شب و روز گزار رہی تھی کہ ایک ہیبت ناک خبر موصول ہوئی... کراچی میں مقیم چھوٹا بھائی کینسر کے مرض میں مبتلا ہو گیا تھا۔ آہ، وہ ایک دکھ بھرا لمحہ تھا۔

اِس خبر نے سب تلپٹ کر دیا۔ وہ اداس رہنے لگی۔ تنہائی اُسے گھیرنے لگی۔ تنہائی... جو ایک ظالم ساتھی ہے، اپنے ہم سفروں کو نگل لیتی ہے۔

بی بی قریشی کو بھی تنہائی کا روگ لگ گیا تھا۔ ہر رنگ پھیکا پڑ گیا۔ روشنی اپنا اجلا پن کھو بیٹھی۔ بے خواب راتوں کی کثرت نے اکتاہٹ بڑھا دی۔ اِس پر مستزاد، لوکاسا

یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے بھی نہیں نبھی، جو اِس بات پر شاکی تھی کہ ادارے میں کوئی اُس سے قابل خاتون بھی موجود ہے۔ ایسی خاتون، جو بین الاقوامی شہرت کی حامل ہے۔

ابتدا میں تو بی بی قریشی نے اُس کے ناروا سلوک کو اہمیت نہیں دی، مگر جب اُس عورت نے اُس کی قابلیت پر سوال اٹھایا، وہ غصے سے آگ بگولا ہو گئی۔

وہ رات کانٹوں کے بستر پر گزری۔ جب سورج طلوع ہوا، وہ ایک بڑا فیصلہ کر چکی تھی۔

چند روز بعد بی بی قریشی نے خاموشی سے زمبیا چھوڑ دیا۔ یوں اکنامکس کی اُس انتہائی باصلاحیت پروفیسر کا تدریسی کیریئر اختتام کو پہنچا... اور یوں ایک المیے کا آغاز ہوا۔

☆☆☆

اپنا ملک، اپنی زمین... پر اِس کی مٹی کو کیا ہوا۔ اِس کی خوشبو ویسی تو نہیں ہے، جیسی 1950 میں تھی۔

کچھ بدل گیا تھا۔ یا شاید... وہ خود بدل گئی تھی۔

پاکستان آنے کے بعد اُس نے خود کو کئی مصروفیات میں الجھا لیا۔ ایک بھائی کا گھر کراچی میں تھا، ایک کا اسلام آباد میں۔ خاندان کا ایک حصہ ہندوستان میں مقیم تھا۔ خاصی جمع پونجی تھی اور سیاحت کا شوق۔ تو کبھی وہ اسلام آباد میں نظر آتی، کبھی ہندوستان پہنچ جاتی۔ مگر زیادہ وقت کراچی ہی میں گزرتا۔ اِس عرصے میں حج کے ارادے سے سعودی عرب کا بھی رخ کیا۔

بھانجے بھانجیاں، بھتیجے بھتیجیاں، اُن کے بچے۔ محبت کرنے کی سہولت میسر تھی۔ اور بی بی قریشی کے پاس محبت تھی، جو وہ بانٹ رہی تھی۔

بین الاقوامی درس گاہوں میں خدمات انجام دینے والی بی بی قریشی اب ایک گھریلو عورت بن گئی۔

شادی بیاہ کے معاملات میں وہ آگے آگے ہوتی۔ خرچے بھی اٹھاتی۔ تحائف دینے میں پہل کرتی۔ الغرض ہمیشہ ہاتھ کھلا رکھا۔

مگر ایک شے اُسے پریشان کرنے لگی تھی... وقت، ظالم وقت! 85-84 میں پاکستان لوٹنے کے بعد اب اُس کے پاس وقت ہی وقت تھا۔ اُس نے ایک مصروف زندگی گزاری تھی۔ فراغت سے نبھتی نہیں تھی۔

مصروفیات کھوجنے کی اُس نے کوشش کی۔ ابتدا میں اس میدان میں کامیاب رہی، مگر دھیرے دھیرے حالات بدلنے لگے۔ ظالم تنہائی... جس کا آسیب پہلی بار زمبیا میں ظاہر ہوا تھا، اب اپنا وار کرنے کا ارادہ باندھ چکی تھی۔ اور یہ وار مہلک ثابت ہونے والا تھا۔

☆☆☆

بے شک بی بی قریشی نے خاصی بچت کی تھی، مگر خرچ کیا جائے تو قارون کا خزانہ بھی ختم ہو جاتا تھا، سو آہستہ آہستہ جمع پونجی گھٹنے لگی۔ اور جب اُسے ادراک ہوا، اُس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔

اس نے سر پیٹ لیا۔ خود سے کہا۔ ”بی بی قریشی، تو خود ماہرِ معاشیات ہے، مگر تو اِس بات کا احساس ہی نہیں کر سکی کہ جو کچھ تو نے کمایا تھا، وہ تیزی سے گھٹ رہا ہے۔“

اُسی موقع پر یہ منحوس سوال سامنے آیا کہ اب بڑھاپے میں، جب جمع پونجی ختم ہو جائے گی، میرا خیال کون رکھے گا؟

یہ خیال سم قاتل ثابت ہوا۔ اور اُسی نے ایک اور کاٹ دار سوال کو جنم دیا۔ ”کیا میں نے شادی نہ کر کے غلطی کی؟“

اُسے اپنا پھوپی زاد یاد آیا، جس سے کبھی اس کی منگنی طے ہوئی تھی۔ چار برس تک وہ منگنی کے بندھن میں بندھی رہی۔ پھوپی زاد انتظار کرتا رہا، مگر جب دوبارہ شادی کے معاملے نے زور پکڑا، اُس نے آگے پڑھنے کا ارادہ ظاہر کرتے ہوئے یہ قصہ ہی ختم کر دیا۔ پھوپی زاد سے کہہ دیا، ”آپ کسی اور سے شادی کر لیجیے!“

تنہائی کے اُن ہی دنوں میں اُسے لندن یاد آیا، جہاں کئی طلبا نے اُسے رشتے کی پیشکش کی تھی۔ گھانا کے زمانے میں بھی کئی پڑھے لکھے، خاندانی افراد نے اِس خواہش کا اظہار کیا تھا، مگر اُس نے ایک ہی جواب دیا۔ ”اگر کسی انسان کو اپنی آزادی ختم کرنی ہو، تو شادی کر لے!“

ماضی کی یادوں نے امراض میں گھری اس بوڑھی عورت کو اداس کر دیا۔

”کیا شادی نہ کرنے کا فیصلہ دُرست تھا؟“ دل سے سوال کیا۔ جواب ندارد!

☆☆☆

تنہائی کا پہلا وار!

دل میں یہ خیال پنپنے لگا کہ رشتے دار دولت کی وجہ سے اُس کے ناز اٹھاتے ہیں۔ چند ہی روز میں اِس خیال نے جڑ پکڑ لی۔ شک بھی ساتھ ہی چلا آیا، جس کی آمیزش نے تنہائی کو مزید مہلک بنا دیا۔ اب محفل میں ہوتے ہوئے بھی اکیلے پن کا احساس ہوتا۔ محبت کرنے والوں کی موجودگی میں دُکھ ستاتا۔

www.pdfbooksfree.pk

تفکرات نے صحت پر بھی منفی اثرات مرتب کیے۔ نظر تو پہلے ہی کمزور تھی۔ مگر اب سماعت بھی پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ اونچا سنائی دیتا تھا۔ دھان پان تو تھی۔ اب مزید وزن گر گیا۔ ہڈیوں کا ڈھانچا نظر آنے لگی۔

امراض کے حملوں نے اُسے چڑچڑا بنا دیا۔ وہ گھر والوں سے کھنچی کھنچی رہنے لگی۔ ماضی کی یادیں بے رنگ ہوگئیں اور زندگی میں زہر گھلنے لگا۔

☆☆☆

جس نے شہر کا احاطہ کر رکھا تھا۔ سڑکیں دھول سے اٹی تھیں۔ درخت بجھے ہوئے تھے۔ پرندوں کی پرواز تھکن کی عکاس تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے ہر شخص تنہائی کا شکار ہے۔

وہ کمرے کی کھڑکی میں کھڑی تھی جس کے باہر گرم دھوپ پنجے گاڑے بیٹھی تھی۔

تفکرات چہرے سے عیاں تھے۔ یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ آزاد شہری کی حیثیت سے پیدا ہونے والی، بھرپور زندگی گزارنے والی عورت اب ایک کمرے میں قید ہے۔ گھر سے باہر قدم رکھنے کے لیے دوسروں کی محتاج ہے۔

اُس نے گہرا سانس لیا۔ پردہ کھینچ دیا۔ اور پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔ میز پر آج کا اخبار پڑا تھا۔ کچھ دیر پہلے تھیجے نے اخبار کی سرخیاں پڑھ کر سنائی تھیں جو قتل و غارت گری، دھماکوں اور المیوں کی داستان سنا رہی تھیں۔

ملک کے بگڑتے ہوئے حالات نے اسے مغموم کر دیا۔

''اِس ملک کے شہری اپنی آزادی کی قدر کیوں نہیں کرتے؟'' اس نے خود سے سوال کیا۔ ''کیا وہ نہیں جانتے کہ اِس کے لیے کتنی قربانیاں دی گئیں۔ آہ، حب الوطنی کا جذبہ کہاں گیا؟''

ذہن کے پردے پر فلم سی چل رہی تھی۔

تحریکِ پاکستان کا زمانہ۔ حصولِ علم کا جذبہ۔ والد کی حوصلہ افزائی۔ چندہ جمع کرنے کی مہم۔ قائد اعظم سے ملاقات۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے دن۔ پی ایچ ڈی کی ڈگری وصول کرنا۔ تدریس سے جڑے حسین لمحات... اچانک اندھیرا چھا گیا۔

اُس نے آنکھیں ملیں۔ اندھیرا قائم رہا۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ کھڑکی پر پڑے پردے پر روشنی کا عکس تھا۔

''شاید لائٹ چلی گئی۔'' اس نے خود سے کہا۔

اچانک کھٹکا ہوا۔ ملازمہ کمرے میں داخل ہوئی۔

''اف، کتنا اندھیرا ہے۔ کھڑکی سے پردے تو ہٹا دیتیں۔'' یہ کہتے ہوئے اُس نے پردہ ہٹا دیا۔ کمرے میں چمکتی ہوئی دھوپ در آئی۔

''بی بی جی، آپ کیا کھائیں گی، بتا دیں۔'' ملازمہ کے لہجے میں خفیف سی بیزاری تھی۔

''ارے بیٹا مجھ سے کیا پوچھتی ہو۔ زندگی کا بڑا حصہ ہوسٹل میں گزرا، اچھے کھانوں کا ذائقہ ذہن سے اتر گیا۔ بس سادہ کھانا مل جائے، یہی کافی...''

دھڑ سے دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ ملازمہ جا چکی تھی۔

دل میں درد کی لہر اٹھی۔ اس نے ایک سرد آہ بھری اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔

ماضی پھر آنکھوں کے سامنے تھا۔ کچھ عرصے قبل اُس نے کراچی میں ایک فلیٹ خریدا تھا۔ پھر رشتے داروں کے مشورے پر اسے فروخت کر دیا۔ ساری رقم کاروبار میں لگا دی، یہ سوچ کر کہ منافع ہوتا رہے گا، مگر یہ گھاٹے کا سودا ثابت ہوا۔ رقم ڈوب گئی۔

''اب میں دوسروں کے رحم و کرم پر ہوں۔ دینے والا ہاتھ، لینے پر مجبور ہے۔'' یہ احساس رعب اور دبدبے کے ساتھ زندگی گزارنے والی اُس عورت کے لیے اذیت ناک تھا۔

اکتائے ہوئے ماہ و سال گزرتے رہے۔

اب اُسے زندگی بے مصرف معلوم ہونے لگی تھی۔ وہ خود کو رشتے داروں پر بوجھ تصور کرنے لگی تھی۔ دل کا موسم تبدیل ہو گیا تھا۔

تنہائی کا آسیب، بڑھتی عمر کے ساتھ قوی ہوتا جا رہا تھا!

☆☆☆

2008، اسلام آباد:

گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ چہروں پر پریشانی تھی۔ اندیشے فضا میں تیر رہے تھے... بی بی قریشی گزشتہ کئی گھنٹوں سے لاپتا تھی۔

اُس روز بہن بھائی سیاست کے موضوع پر بات کر رہے تھے۔ بات بڑھتے بڑھتے بحث کی شکل اختیار کر گئی۔ بی بی قریشی ناراض ہوگئی اور اٹھ کر کمرے میں چلی گئی۔

سب کا یہی خیال تھا کہ یہ ناراضی عارضی ہے، مگر ایسا نہیں ہوا۔ بحث کے چند گھنٹے بعد 87 سالہ بی بی قریشی نے خاموشی سے گھر چھوڑ دیا۔

اہلِ خانہ کے لیے وہ لمحات عذاب ناک تھے۔ فوراً ہی تلاش شروع ہوگئی۔ دیگر رشتے داروں کو فون کیا گیا۔ کئی

گھنٹوں تک اسلام آباد کی سڑکیں کھنگالی گئیں، ریلوے اسٹیشن کا رخ کیا گیا، لیکن یہ کوششیں ثمر آور ثابت نہیں ہوئیں۔

جب گمشدگی کو خاصا وقت بیت گیا، تو یہ اندیشہ سر اٹھانے لگا کہ کہیں وہ کسی حادثے کا تو شکار نہیں ہوگئی۔

گھر میں رونا پیٹنا مچ گیا۔

چند روز بعد پتا چلا کہ جس دن بی بی قریشی لاپتا ہوئی تھی، اُس روز ایک ضعیف العمر عورت قریبی اسٹیشن سے کراچی جانے والی ٹرین میں سوار ہوئی تھی۔ اِس اطلاع نے مایوس رشتے داروں میں نئی روح پھونک دی۔ پھر تلاش شروع ہوئی۔ اس بار مرکز کراچی تھا، مگر دو کروڑ کی آبادی والے اُس شہر میں کسی کو ڈھونڈنا تقریباً ناممکن تھا۔ یہ بھوسے میں سوئی تلاش کرنے کے مترادف تھا۔

خیر، پولیس سے رجوع کیا گیا۔ فلاحی تنظیموں کے دفاتر کھنگالے گئے۔ اخبار میں اشتہار دیا گیا، مگر ہر کوشش رائگاں گئی۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا، گھر والوں کی مایوسی بڑھتی گئی۔ اب دعا ہی واحد سہارا تھا۔

چار ماہ بعد، جب ہر امید دم توڑ چکی تھی، اچانک اہلِ خانہ کو ایدھی سینٹر سے ایک فون کال موصول ہوئی جس نے انہیں بیک وقت حیرت اور مسرت سے دوچار کر دیا۔

فون کی دوسری طرف بی بی قریشی تھی، جو نام بدل کر ایدھی سینٹر میں رہ رہی تھی۔

کسی ایسے عزیز کی آواز سننا، جس کی زندگی کے تعلق سے آپ مایوس ہو چکے ہوں، ایک عجیب و غریب تجربہ ہوتا ہے۔ گھر والے دوڑے دوڑے گئے اور اُسے لے آئے۔ کسی نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ انہیں ڈر تھا کہ وہ پھر نہ روٹھ جائے۔ کچھ ایسا ویسا نہ کر بیٹھے۔

☆☆☆

ایدھی سینٹر سے واپسی کے بعد وہ چپ چپ رہنے لگی تھی۔ گو کہ اس کا خیال رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی، لیکن وہ تنہائی کے حصار سے باہر نہیں آ سکی۔

ایدھی سینٹر میں گزرے چار ماہ نے اس پر عجیب اثرات مرتب کیے تھے۔ وہاں اس نے بے گھر اور تنہائی کی شکار بوڑھی خواتین کے کرب کا قریب سے مشاہدہ کیا۔ اُن کا غم اُسے اپنے دکھ کے قریب معلوم ہوا۔ یوں لگنے لگا کہ اُس کی اصل جگہ وہیں ہے، اپنی جیسی تنہا اور بے گھر خواتین کے درمیان۔

وہ گھر کے ماحول سے ہم آہنگ نہیں ہو پائی۔ ذہن پر بے رنگ ماضی سوار تھا۔ وہ زود رنج ہوگئی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ناراض ہو جاتی۔ خود کو کمرے تک محدود کر لیتی۔ جہاں تلخ یادیں منتظر ہوتیں، جن کی یلغار اُسے تاریک گھاٹی میں لے جاتی۔

خاموشی کے وقفوں میں جب وہ اپنے فیصلوں کا تنقیدی جائزہ لینا شروع کرتی، تو تنہائی کا عفریت پاس آن بیٹھتا۔ کانوں میں سرگوشیوں کرتا تھا کہ اُس کی زندگی کا ہر فیصلہ غلط تھا کہ وہ ہار چکی ہے۔

آخر کار تنہائی کے عفریت نے اُسے ایک انتہائی اقدام کے لیے تیار کر لیا!

☆☆☆

ایک ضعیف العمر عورت ایدھی سینٹر میں داخل ہوئی۔ استقبالیہ پر پہنچ کر اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔

''میں ایک بے گھر عورت ہوں۔'' اس نے دھیرے سے کہا۔ ''میرے پاس رہنے کے لیے کوئی جگہ نہیں۔''

استقبالیہ پر بیٹھی عورت نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ایک منحنی سی عورت سامنے کھڑی تھی۔ چہرے پر جھریاں، آنکھوں پر موٹے شیشے کا چشمہ۔

''آپ کا نام؟'' اُس نے سوال کیا۔

''ڈاکٹر بی بی قریشی!'' اس نے دھیرے سے کہا۔

وہ ایک بار پھر گھر چھوڑ چکی تھی... ایک بار پھر رشتے داروں کے چہروں پر اندیشے تھے۔ ایک بار پھر اُسے تلاش کیا جا رہا تھا۔

خوش قسمتی سے ماضی کے برعکس اسے جلد ہی کھوج لیا گیا۔ چند ہی روز بعد گھر والے پہنچ گئے۔ منا کر، سمجھا بجھا اسے واپس لے آئے۔

وہ گھر تو آ گئی، لیکن روح کہیں پیچھے رہ گئی۔ وہ اپنوں سے کٹ گئی تھی۔ اکتاہٹ حاوی ہو چکی تھی۔

اسی اکتاہٹ نے 2011 کے وسط میں ایک بار پھر ایدھی سینٹر کا رخ کرنے کی تحریک دی۔ گھر والوں سے ضد کرنے لگی کہ وہ اُسے سینٹر چھوڑ دیں، ورنہ وہ خود چلی جائے گی۔

اہلِ خانہ نے بہت سمجھایا، مگر وہ ایک نہیں مانی۔ بالآخر اِس شرط پر کہ وہ چند روز بعد لوٹ آئے گی، اُسے ایدھی سینٹر چھوڑ دیا گیا، جہاں اُس نے خود کو اپنی جیسی دکھوں کی ماری خواتین کے درمیان پایا۔

www.pdfbooksfree.pk

اُن ہی دنوں ایک صحافی کا ایدھی سینٹر جانا ہوا جہاں ایک بوڑھی عورت فرفرانگریزی بول رہی تھی۔

جب بات چیت شروع کی تو یہ انکشاف ہوا کہ وہ خاتون نہ صرف پی ایچ ڈی ہے، بلکہ کئی بیرونی درس گاہوں میں تدریسی فرائض انجام دے چکی ہے۔

اگلے دن یہ اسٹوری اخبار کی زینت بن گئی اور اہل کراچی کوایک حیرت نے آلیا۔حکومتی شخصیات بھی اِس جانب متوجہ ہوئیں۔کہانی کی مزید پرتیں کھلیں۔پتا چلا، ایدھی سینٹر میں مقیم یہ عورت کوفی عنان کی استاد رہ چکی ہے، تحریکِ پاکستان کی کارکن ہے۔کئی ملکوں کے دورے کرچکی ہے۔

بی بی قریشی کی گورنر سندھ ڈاکٹر عشرت العباد سے ملاقات کا اہتمام کیا گیا۔

اُسے گورنر ہاؤس میں قیام کی پیشکش کی گئی، مگر اُس نے معذرت کرلی۔

''آپ کا شکریہ۔مگر میرے لیے ایدھی سینٹر کا ایک بستر کافی ہے۔'' اُس نے کہا۔''وہاں میرا بہت اچھی طرح خیال رکھا جارہاہے۔''

اگلے چندروز میں بی بی قریشی کی ادھوری کہانی مکمل ہوگئی۔

وہ اخبارات اور ٹی وی چینلو کا مرکز بنی رہی۔میڈیا کی توجہ کے طفیل جہاں برسوں گم نامی کی زندگی گزارنے والی اِس عظیم عورت کو شناخت ملی، شہرت ملی، وہیں اُس کے خاندان پرانگلیاں اٹھنے لگیں۔اُن پرتنقید کی جانے لگی۔

یہ صورتِ حال اہلِ خانہ کے لیے انتہائی پریشان کن تھی۔وہ دوڑے دوڑے گئے اور اُسے گھر لے آئے۔اس بار بھانجے کے گھر قیام کا بندوبست کیا گیا۔

اگلے چند ماہ خاموشی سے گزرے، مگر 2012 کے اوائل میں بی بی قریشی پھر اُوب گئی۔اسے ایدھی سینٹر کی یاد آنے لگی۔بوڑھی، دکھی عورتیں یاد آنے لگیں۔

''میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔'' اُس نے ضد شروع کردی۔''اب میرا تمہارے ساتھ رہنا ممکن نہیں۔''

گھر والوں نے سمجھانے کی کوشش کی، لیکن اُس کی ضد سے جیتنا مشکل تھا۔

''مجھے جانے دو۔میں اکتا چکی ہوں۔''

ایک بار پھر وہ ایدھی سینٹر میں تھی۔اور یہ عزم لے کر آئی تھی کہ اب وہ گھر واپس نہیں جائے گی۔اُس نے سینٹر کی انتظامیہ سے بھی یہ کہہ دیا تھا کہ اب وہ اپنے گھر والوں سے نہیں ملنا چاہتی۔

''مرنے کے بعد انہیں میرا چہرہ نہیں دیکھنے دیا جائے!''

☆☆☆

☆ 14 اگست 2012:

آنکھوں کے سامنے سبز ہلالی پرچم تھا۔سماعتوں میں نعرے گونج رہے تھے۔''لے کررہیں گے پاکستان، بٹ کے رہے گا ہندوستان...قائد اعظم زندہ باد، پاکستان تابندہ باد!''

فرطِ جذبات سے دھڑکن تیز ہوئی۔آنکھوں میں نمی تیرگئی۔

''کیا ہوا بہن، تم ٹھیک تو ہو؟'' ایک عورت نے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ اُس کے چہرے پر اندیشے تھے۔

''ہاں، ٹھیک ہوں۔'' اُس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔''بس، اپنے رب کا شکرادا کررہی ہوں کہ اُس نے ہمیں آزادی جیسی نعمت دی۔ تم جانتی ہو...''اُس نے ہاتھ پکڑ کر عورت کو پہلو میں بٹھالیا۔''14 اگست ہی کے روز ہمیں آزادی ملی تھی۔وہ رمضان المبارک کا مہینا تھا۔ستائیسویں شب تھی...آہ، اُس روز میں کتنی خوش تھی۔''

''سبحان اللہ!'' عورت کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''اِس بار بھی چودہ اگست رمضان ہی میں آئی ہے۔''

''ہاں سچ کہتی ہو۔'' بی بی قریشی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔''کتنا بابرکت دن ہے یہ۔''

عورت اٹھ کر چلی گئی۔بی بی قریشی یونہی بیٹھی رہی۔خیالات میں گم۔خاموش۔اُس کے دل میں ایک دعا تھی۔ایک معصوم دعا۔

اور جونہی دعا لبوں پر آئی، قدرت مسکرائی کہ وہ قبولیت کا لمحہ تھا۔اُس رات کا انتخاب کرلیا گیا تھا۔

بتیاں بجھا دی گئیں۔بی بی قریشی خاموشی سے اپنے بستر پر آگئی۔جہاں پُرسکون نیند منتظر تھی۔

چند پلوں بعد وہ نیند کی آغوش میں تھی۔سبز ہلالی پرچم پہلو میں رکھا تھا۔

وہ رمضان کا مبارک مہینا تھا، 14 اگست کی بابرکت رات تھی اور لوٹنے کا وقت آن پہنچا تھا۔

سحری میں اٹھنے والوں نے محسوس کیا کہ سینٹر میں ایک پاکیزہ خوشبو پھیلی ہے۔

وہ جا چکی تھی!!

نصیبِ خفتہ

شکیل صدیقی

اس کا شمار عالمی پیمانے پر مشہور ناول نگاروں میں ہوتا تھا، اس نے جو کچھ لکھا وہ سونے کے بھاؤ بکا۔ دولت اس کے گھر کی لونڈی بن چکی تھی۔ عالم یہ تھا کہ وہ صبح ایک شہر میں ناشتہ کرتا تو دوپہر کا کھانا کسی دوسرے ملک کے تفریحیمرکز میں۔ عیش وعشرت میں اس کا ثانی نہیں تھا لیکن جب مرا تو سکندر کی طرح اس کے بھی دونوں ہاتھ خالی تھے۔

ایک بدنصیب مصنف کی خوش نصیبی کا قصہ

اس کی زندگی میں کوئی پُراسراریت نہیں تھی، البتہ موت پُراسرار حالت میں ضرور ہوئی۔وہ آزاد زندگی گزارنے کا قائل تھا۔پیٹ بھر کر شراب پینا، کلبوں میں رقص کرنا اور ملکوں ملکوں کی سیر کرنا اس کا شیوہ تھا۔اس کے پاس چونکہ ذاتی جیٹ طیارہ تھا، اس لیے نقل وحرکت کرتے ہوئے اسے کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی تھی۔جب بھی تفریح کرنے اور شامیں رنگین کرنے کو دل مچلتا تو وہ اپنی بیوی سے کہتا کہ آؤ پیرس چلیں۔پیرس اس کے خوابوں کی جنت تھی۔اسی لیے

www.pdfbooksfree.pk

اس نے کئی ناول پیرس کے پس منظر میں لکھے۔ اس کے علاوہ وہ شہروں شہر گھومتا پھرتا تھا۔ اس کے مختلف ریاستوں میں ذاتی مکانات تھے۔ مثال کے طور پر لانگ آئی لینڈ میں اس کا فارم تھا (دو سو برس قدیم) اپنی شاموں میں رنگ آمیزی کرنے اور یار دوستوں کے ساتھ وقت گزارنے کے لیے اس نے ایک کلب بھی بنایا لیا تھا۔ مشہور زمانہ اداکار یال نیومین اس کا پڑوسی تھا، جس سے اس کی اچھی شناسائی تھی۔ اس کے مکان کے دروازے ادیبوں اور فکشن رائٹروں کے لیے ہمہ وقت کھلے رہتے تھے۔ وہ ادب اور فکشن پر بات کرتے تھے تو اس کے ذہن کو زرخیزی حاصل ہوتی تھی۔ پھر جب اس کے ذہن میں بننے والا پلاٹ مکمل تشکیل پا جاتا تو وہ اسے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیتا۔ اس طرح سے ایک نیا ناول وجود میں آجاتا اور کئی ماہ تک بیسٹ سیلر لسٹ پر رہتا۔

فلوریڈا کے علاوہ اس کا ایک مکان نیپلز میں تھا جس کی کھڑکیاں گلف آف میکسیکو کی طرف کھلتی تھیں۔

جب اس نے گریجویشن کر لیا تو میری ریڈ کا سے شادی کر لی جو اداکارہ تھی۔ وہ ایک تعلیم یافتہ، سمجھ دار اور سگھڑ مزاج تھی۔ گفتگو کرنے کا سلیقہ رکھتی تھی اور زندگی کیسے گزاری جاتی ہے، یہ اسے پتا تھا۔ میری نے اس کی زندگی میں حسن، ترتیب اور ہمواریت پیدا کر دی۔ وہ نشست و برخاست کے آداب سے آگاہ تھی۔ یہ سب اوصاف اس نے اپنے شوہر میں بھی رچا بسا دیے۔ اس بے ہنگم اور بدوضع شخص کو اس نے تراش خراش کر ہیرا بنا دیا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ اس کے ناولوں کو ایڈٹ بھی کیا کرتی تھی، انہیں تراش خراش کر کے اشاعت کے قابل بنا دیا کرتی تھی۔ میری سے شادی کرنے کے نتیجے میں اس کے تین بچے ہوئے۔

بھاری چہرے والا ناول نگار ہمہ وقت متحرک اور رواں زندگی گزارنے کا قائل تھا۔ اس وقت وہ گم صم اور ساکت ہو گیا جب اس کی بیوی میری کو سرطان ہو گیا۔ اس نے ہر اچھے اسپتال میں اس کا علاج کرایا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا اور میری 11 نومبر 1996ء کو آنجہانی ہو گئی۔ وہ بے سہارا اور تنہا رہ گیا۔ اس کے دل کو ایک لمحہ بھی قرار نہیں تھا۔ وہ کسی کی بانہوں کا متلاشی تھا۔ کسی شانے کی تلاش میں تھا جس پر وہ سر رکھ کر دنیا کے سارے غموں کو فراموش کر سکے۔ ایسے میں اس کی ملاقات کیرین ڈیون سے ایک کلب میں ہوئی۔ اس عورت کی آنکھوں میں نہ جانے کیا بات تھی

کہ وہ اس کے سحر میں گرفتار ہو گیا۔ کیرین حالانکہ تین بار کی شادی شدہ تھی اور شوہر تبدیل کرنا غالباً اس کا شغف تھا۔ وہ میری کا عشر عشیر بھی نہیں تھی۔ اس کے بہی خواہوں نے اسے کیرین سے شادی کرنے کو منع کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ ایک لالچی عورت ہے۔ وہ اس کا دل تو نہیں بہلا سکے گی، البتہ اسے قلاش ضرور کر دے گی۔

اس کے وکیلوں نے کیرین سے کہا کہ اگر وہ ناول نگار سے شادی کرنا چاہے تو اسے چند شرائط تسلیم کرنا ہوں گی اور ایک فارم پُر کرنا پڑے گا۔ کیرین نے اس سے انکار کیا اور کہا کہ وہ شادی کرنے کے لیے بے قرار و مضطرب نہیں ہے، اس لیے کسی معاہدے کو ماننے سے انکار کرتی ہے۔ جب کہ ناول نگار ایک قد آور شخصیت کا مالک تھا اور شہرت و عزت اس کے قدموں کی باندیاں تھیں۔ اس کے باوجود اس نے 7 مارچ 1997ء کو فلوریڈا کے ایک چرچ میں بغیر کسی معاہدے کے شادی کی رسومات پوری کر دیں اور کیرین کا ہو کر رہنا منظور کر لیا۔ پھر انہوں نے فلوریڈا ہی میں بسنے کو ترجیح دی۔ کلب کو انہوں نے فروخت کر دیا۔

ابھی شادی کے معاہدے (نکاح نامے) کی سیاہی خشک بھی نہیں ہوئی تھی کہ کیرین نے اپنا روپ دکھانا شروع کر دیا۔ شادی سے پیشتر ان کے جذبات کچھ بھی رہے ہوں مگر شادی کے بعد محبت کے شہد کی مٹھاس پھیکی پڑنے لگی۔ کیرین نے علیٰحدہ خواب گاہ میں سونا شروع کر دیا۔ وہ شوہر کو کتنا چاہتی تھی، یہ خود اس کے شوہر کو بھی پتا نہیں تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے اپنے شوہر کو اس کے دوستوں اور عزیز و اقارب سے علیٰحدہ کرنا شروع کر دیا۔ اس کے رویّے سے جھلکتا تھا کہ وہ لالچی اور خودغرض ہے۔ اسی اثنا میں اس نے اپنی شادی کی انگوٹھی کا سودا کر ڈالا، حالانکہ شوہر نے اسے جو انگوٹھی دی تھی وہ کافی قیمتی تھی، لیکن کیرین نے اسے فروخت کر ڈالا اور دوسری انگوٹھی خریدی جس میں بڑا سا ہیرا لگا ہوا تھا۔ شوہر کی بیٹی گلاڈنس سے اس کی نہیں بنتی تھی، اس لیے کہ وہ اسے سرِعام ایک ایسی عورت سے تشبیہ دیتی تھی جو انسان کی آنکھ کا کاجل نکال لیتی ہے اور جیسے کسی کان کن کی طرح صرف سونا کھودنے سے دلچسپی ہوتی ہے۔

وہ ایک بار پھر تنہائی کا شکار ہو گیا۔ اس نے میری کی یادوں کو فراموش کرنے کے لیے ہی کیرین کی زلفوں کا سہارا لیا تھا لیکن زمین ایک بار پھر اس کے قدموں تلے سے نکل گئی اور وہ خود کو خلا میں محسوس کرنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کا سب کچھ لُٹ چکا ہے۔ اس کا دل خالی خالی سا ہو گیا ہے۔ اس کے گرد اجنبی چہرے تھے اور نا آشنا ماحول۔ وہ ہجوم میں رہتے ہوئے بھی تنہا تھا۔

اس اثنا میں کیرین نے واقف کاروں سے شکایت کرنا شروع کر دی کہ اگر اس کا شوہر اچانک کسی دن آنجہانی ہو گیا تو وہ کہیں کی نہ رہے گی۔ اس کے قدموں تلے سے سب کچھ نکل جائے گا۔ اس کا کوئی پُرسانِ حال تک نہ ہوگا۔ غالباً وہ فلوریڈا کے اس قانون سے ناواقف تھی کہ اگر شادی سے پیشتر کوئی معاہدہ نہیں ہوا ہے تب بھی اسے اپنے شوہر کی جائداد سے ایک بڑا حصہ ملے گا۔ اب اس نے اپنی حد سے زیادہ ہڑپ کرنے کے چکر میں شوہر پر زور ڈالنا شروع کر دیا کہ وہ اپنی وصیت میں تبدیلی کرے اور اسے اپنی دولت کا مالک بنا دے۔

مرتے وقت اس نے کیرین کے نام ساڑھے تین کروڑ ڈالر کی جائداد کر دی جو نیپلز کے ایک مکان کی صورت میں تھی۔ اس کے علاوہ مونٹانا کی کچھ جائداد اور مجموعی طور پر دس لاکھ ڈالر۔ اس کے علاوہ اسے فلموں سے ملنے والی رقم تقریباً ایک ارب ڈالر تھی۔ اگر باقاعدہ حساب کیا جائے تو اس کی دولت اس سے زیادہ نکلے گی۔ اس لیے کہ اس کے ناول مسلسل فروخت ہوتے رہے اور فلموں کی ویڈیوز بکتی رہیں۔

اس کی موت پُراسرار حالات میں ہوئی۔ کیرین سے شادی کے چوتھے برس ایک دن جب وہ اپنے فلوریڈا والے مکان میں بیٹھا تھا کہ آگ لگ گئی۔ جب آگ بجھانے والے اس کے مکان پر پہنچے تو انہوں نے اسے ایک کرسی پر نیم دراز حالت میں پایا۔ وہ چیخ رہا تھا، کمرے میں دھواں ہی دھواں بھرا ہوا تھا۔ 1994ء میں اس کا بائی پاس آپریشن ہوا تھا اور اس کی ٹانگوں کے جوڑوں میں درد بھی ہوتا تھا۔ چنانچہ وہ آتش زدہ کمرے سے نکل نہیں سکا۔ اس کی بیوی اور ایک نرس اس مکان کے دوسرے کمرے میں تھیں، مگر وہ اس کی جان بچانے کے لیے نہیں آئیں....

حالانکہ مکان میں آگ بجھانے کے آلات بھی جا بجا لگے ہوئے تھے۔ ان سے آگ بجھائی جا سکتی تھی۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس کمرے میں آگ تھی اور اس کے کپڑے جل رہے تھے۔ آگ بجھانے والا عملہ جب باورچی خانے کی طرف گیا تو اس نے کیرین کو ایک جام تیار کرتے دیکھا۔ اسے آگ کے بارے میں بتایا گیا تو اس نے معصومیت سے کہا کہ اس کے کانوں تک شوہر کی چیخیں نہیں

آکسفورڈ یونیورسٹی

آکسفورڈ دریائے آکس کے کنارے انگلستان کا مشہور شہر ہے۔ اس کے معنی دریائے آکس کا گھاٹ کے ہیں، اس جگہ انگلستان کا مشہور اور قدیم ترین دارالعلوم واقع ہے۔ اس کی بنیاد قدیم زمانے میں رکھی گئی تھی، لیکن منظم تدریس کا آغاز 1133ء سے ہوا جب پیرس کے رابرٹ پولین نے یہاں تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ اس نے یونیورسٹی کی صورت 1163ء میں اختیار کی۔ اس میں پینتیس کالج ہیں جن کی اقامت گاہیں بھی ہیں۔ لیکن تدریس تمام کالجوں کے مشترکہ لیکچروں کی صورت میں ہوتی ہے اور کالجوں کے ٹیوٹر اپنی اپنی اقامت گاہوں پر بھی طلبہ کی تعلیمی رہنمائی کرتے ہیں۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کی شہرۂ آفاق بوڈلین لائبریری 1595ء میں قائم ہوئی جسے دنیا بھر کی سب سے بڑی لائبریری کہا جاتا ہے۔ اس کی مزید توسیع 1946ء میں جدید بوڈلین لائبریری کی شکل میں ہوئی، جس میں پچاس لاکھ کتابوں کی گنجائش رکھی گئی۔ اس کا نام سرتھامس باڈلے 1545-1613ء کے نام پر رکھا گیا۔

مرسلہ: ہدایت علی ملک، نوشہرہ

آکنلیک، فیلڈ مارشل سر کلاڈ

1884ء - 1981ء برطانوی فوجی افسر۔ فوجی زندگی کے طویل تجربے کے بعد 1933ء تا 1936ء ہندوستان کے شمال مغربی سرحدی صوبے میں کمانڈنگ افسر رہا۔ دوسری جنگِ عظیم میں جولائی 1941ء میں جنرل آرچی بالڈ کی جگہ مشرق وسطیٰ کی اتحادی فوجوں کی کمان اس کے سپرد کی گئی۔ نومبر 1941ء میں لیبیا میں جنگ لڑی۔ جنوری 1942ء میں مصر میں اتحادی فوجوں کا کمانڈر مقرر ہوا۔ جون 1943ء میں ہندوستان کا کمانڈر انچیف بنایا گیا اور 1946ء میں فیلڈ مارشل۔

مرسلہ: نعمان اشرف، لاہور

www.pdfbooksfree.pk

پہنچی تھیں، اس لیے وہ آگ سے لاعلم رہی۔ اسے کوئی شعلہ بھڑکتا نظر نہیں آیا۔ سوختہ جاں کی حالت نازک معلوم ہوتی تھی۔ تاہم جب ایمبولینس آئی اور اسے اسپتال لے جایا جانے لگا تو اس کی بیوی نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ قیاس لگانے والوں کا کہنا ہے:

جب آگ لگی (یا لگائی گئی) تو وہ گھر سے نکل گئی۔ پھر جب فائر بریگیڈ کا عملہ آگیا تو وہ بھی کسی خفیہ راستے سے اندر آگئی اور کچن میں چلی گئی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس آگ کے بارے میں پولیس میں کوئی رپورٹ نہیں لکھوائی گئی اور نہ ہی اس کی خبر اخبارات کی زینت بنی۔ یہ بات صرف چند نزدیکی لوگوں کو ہی معلوم ہے۔ اس سے ملتا جلتا کوئی واقعہ آج کے دور میں ہوا ہوتا تو سوئی کا بھالا بنتے دیر نہ لگتی۔

پہلی بیوی میری کا بیٹا جوناتھن ان ٹیڑھے میڑھے اور پُرپیچیدہ واقعات سے مضطرب و بے چین تھا۔ اس نے اپنے والد کی سوانح حیات لکھنے والوں کو بتایا کہ اس کا خیال ہے کہ آگ لگنے کے بعد فوری طور پر نہیں بھڑک سکتی تھی، لہٰذا اس پر کوئی ایسا محلول ڈالا گیا ہے جس سے وہ فوری طور پر بھڑک گئی اور اس نے پورے کمرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ناول نگار کے دوستوں اور رشتے داروں کو کیرین کی وفاداری پر شبہ تھا، اس لیے کہ وہ اسپتال میں اپنے شوہر کو دیکھنے اور اس کی خیریت پوچھنے بھی نہیں گئی تھی۔

سوختہ جاں ناول نگار جب اسپتال سے گھر آگیا تو بھی اس کی اذیت اور کرب کم نہیں ہوا۔ اسے خود کو پُرسکون رکھنے کے لیے مارفین لینا پڑتی تھی۔ پھر جب وہ مکمل طور پر صحت یاب ہوگیا تو اس نے اپنی وصیت تبدیل کر دی اور تقریباً ساری دولت کیرین کے نام کر دی۔ یہ وصیت اس نے اپنی موت سے صرف سولہ روز پیشتر لکھی تھی۔

کیرین کو اس سے کتنی محبت تھی اور اس کے دل کے نہاں خانے میں شوہر کس انداز سے بسا ہوا تھا، یہ تو کسی کو نہیں معلوم، البتہ اتنا سب کو معلوم ہے کہ شوہر کی موت کے ایک ہفتے بعد ہی اس نے وکیل کو فون کیا اور گونج دار آواز میں کہا کہ اس کے شوہر کا ترکہ اسے کب ملے گا؟ اور ہاں وہ 40 لاکھ ڈالر کیا ہوئے جو اسے فوری ملنے والے تھے؟

ایک خیال ہے کہ اس کی موت دل کا دورہ پڑنے سے ہوئی تھی، ایسی صورت میں اس کا پوسٹ مارٹم کرانا ضروری تھا لیکن اس کا پوسٹ مارٹم کرانے کی کسی نے زحمت گوارا نہیں کی۔ اس سے پہلے کہ ڈاکٹر اس کا طبی معائنہ کرتا اسے

دفن کر کے قبر کو سیمنٹ سے پختہ کر دیا گیا۔ اس کی موت کا سبب کیا تھا، فلوریڈا کی حکومتی سطح پر اس کا اعلان نہیں ہوا۔ بہرحال معاملے سے پُراسراریت ظاہر ہوتی ہے، اس لیے کہ اس کے بھتیجے کے کہنے کے مطابق اپنی موت سے سترہ روز پیشتر وہ ہنس بول رہا تھا اور کسی بیماری کی کوئی علامت دور دور تک نہیں تھی۔ وہ آگ لگنے والے واقعہ کے ایک ماہ بعد ہی اس جہانِ فانی سے کوچ کر گیا تھا۔ اگر اس کے خلاف کوئی سازش کی گئی تھی تو اس کا پتا نہیں تھا، لیکن پولیس کے محکمے کے بعض افسران دبی زبان سے اس بارے میں کہتے سنائی دیتے ہیں۔ اس کے بھتیجے نے بتایا کہ چچا نے اپنی موت سے پیشتر اس کا شبہ ظاہر کر دیا تھا کہ ممکن ہے اس کی موت قدرتی طور پر نہ ہو! چنانچہ اس کے بھتیجے نے چچا کی موت کے بعد مونٹانا کے شیرف سے درخواست کی کہ اس کے چچا کی موت کی تحقیق کی جائے۔ سارے حالات بے حد پُراسرار اور تشکیک کی دھند میں لپٹے ہوئے ہیں۔ جب کیرین کے لیے وصیت دوسری بار لکھی گئی تو اس کے اثاثوں کا تخمینہ نہیں لگایا گیا تھا اس کے باوجود کیرین کو تقریباً ایک کروڑ ڈالر کی رقم مل گئی۔ یہ سب کیسے ہوگیا، یہ کوئی نہیں جانتا، اس لیے کہ شوہر کے ناول 'بورن آئی ڈینٹٹی' سے ہونے والی آمدنی میں سے اسے جو حصہ ملا تھا وہ اس کی موت کے بعد وصول ہوا تھا۔ پھر اس میں سے کیرین حصے دار کیسے بن گئی؟

اس کے بھتیجے کا کہنا ہے کہ اس نے وصیت پر کیے گئے اپنے چچا کے دستخط دیکھے ہیں وہ اس کے معلوم ہی نہیں ہوتے۔ وہ پختہ ہاتھ سے پوری طاقت سے دستخط کیا کرتا تھا، لیکن وصیت پر ہونے والے دستخط کمزور، شکستہ اور مردہ سے ہیں۔

ناول نگار نے مرنے سے پیشتر بہت سے لوگوں سے درخواست کی تھی کہ اسے نیویارک میں دفن کیا جائے جہاں وہ پیدا ہوا تھا، لیکن اس کے برعکس اسے مین پٹن کے ایک قبرستان میں دفن کیا گیا۔ ایک مخبر کا کہنا ہے کہ اس کی لاش کو جلا کر راکھ ایک ہانڈی میں رکھی گئی ہے اور وہ ہانڈی کیرین نے اپنے میٹل پیس میں رکھ دی ہے۔ کچھ کا کہنا ہے کہ اس کے دوستوں نے وہ ہانڈی وہاں سے چرا کر کئی شہروں کی سیر... کرائی اور اس کے بعد اسے ایک دریا میں سپردِ آب کر دیا۔

پہلی بیوی میری کے تینوں بچوں کو بھی اس کی جائداد میں سے تھوڑی سی رقم مل گئی ہے جو بعد میں شائع ہونے والے ناولوں کی آمدنی ہے۔ یہ اس کی جائداد کا صرف وہی حصہ ہے جسے کیرین ہڑپ نہیں کر سکی۔ اس کی زندگی کی پُراسراریت سے کیرین پردہ اٹھا سکتی تھی، مگر 10 دسمبر 2008ء کو وہ بھی آنجہانی ہوگئی اور اس سلسلے کے سارے سوالات کے جوابات وہ اپنے ساتھ قبر میں لے گئی۔ یہ وہ نصیب خفتہ ناول نگار تھا جس کو ایک عالم رابرٹ لڈلم کے نام سے جانتا ہے۔ اس کی موت کے بعد فوربس میگزین نے اسے دنیا کے سب زیادہ آمدنی والے مصنفین میں تیرھواں نمبر دیا ہے۔

رابرٹ لڈلم ایک امریکی مصنف تھا جس کے ایکشن سے بھرپور ناول ساری دنیا میں 29 کروڑ کی تعداد میں فروخت ہوئے۔ تبصرہ کرنے والے کہتے ہیں کہ رابرٹ لڈلم نے اپنا تصنیفی کیریئر بہت دیر سے شروع کیا۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ قارئین کی توجہ ناول کے پہلے صفحے سے آخری صفحے تک مبذول رکھے۔ بلاشبہ وہ اس میں کامیاب ہوا۔ اس کی تکنیک یہ تھی کہ وہ بین الاقوامی سیاست اور حالات کو اپنا موضوع بناتا تھا۔ بعض اوقات اس کے ناول حقیقت سے بہت دور ہوتے تھے، انہیں تصوراتی کہا جاسکتا ہے۔ وہ دنیا کا نفسیاتی طور پر جائزہ لیا کرتا تھا جس میں بین الاقوامی کارپوریشنیں، ملٹری کی طرح کے طاقتور ادارے، حکومتی تنظیمیں دنیا کا سکون اور چین برباد کر رہی ہیں۔ ہر معاملے کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اس کے ہیرو سازشوں کے جال میں پھنسے ہوئے ہوتے ہیں اور انہیں اس بات کی تمیز کرنا دشوار ہوتی ہے کہ کون دشمن ہے کون دوست، بہرحال وہ اپنی صلاحیتوں سے ان سازشوں پر قابو پانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں اور اس سرغنہ کا قصہ چکا... دیتے ہیں جو دنیا کو تلپٹ کرنے کی کوششوں میں لگا ہوتا ہے۔

رابرٹ لڈلم 25 مئی 1927ء کو نیویارک سٹی میں پیدا ہوا تھا۔ (کہاں اور کس اسپتال میں، یہ لڈلم کو آخری وقت تک معلوم نہ ہوسکا۔ اپنے ناولوں کے ہیرو جیسن بورن کی طرح وہ بھی اپنی شناخت معلوم کرنے کے لیے سرگرداں رہا۔ اس سے کام لینے والوں نے اس کی یادداشت کی پلیٹ صاف کر دی تھی تو ماضی سے اس کا کوئی رشتہ نہیں رہا تھا، لہٰذا وہ ہلاکت خیز مشین بن گیا) اس کا باپ جارج ہارٹ فورڈ لڈلم ایک بزنس مین تھا۔ اس کی ماں مارگریٹ ورڈ سورتھ لڈلم تھی۔ اس کی پیدائش کے بعد اس کا خاندان نیو جرسی کے مضافاتی علاقے میں جا کر بس گیا۔ اس کے باپ کا انتقال 1934ء میں ہوگیا تو اس کے نانا جو ریشم کا کاروبار کیا کرتے تھے، انہوں نے رابرٹ لڈلم کے لیے ایک بڑی رقم مختص کی کہ اسے اعلیٰ تعلیم دلائی جائے۔ رابرٹ نے ابتدائی تعلیم ریکٹری اسکول پمفرٹ، کنکٹی کٹ اور چیسائر میں حاصل کی۔ اسے بچپن ہی سے اداکاری کا شوق تھا، اس لیے وہ اسکول کے تھیٹر میں کام کیا کرتا تھا۔ تاہم اسے فٹ بال کھیلنے کا بھی شوق تھا اور وہ کوارٹر بیک کی پوزیشن پر کھیلنے کا متمنی تھا۔ فٹ بال میں اسے چانس نہ ملا تو اس نے ڈراموں کی طرف ساری توجہ لگا دی۔

اپنے شوق کو پروان چڑھانے کی خاطر اس نے

قارئین متوجہ ہوں
پرچا نہیں ملتا
کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔
☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل فون نمبر
رابطے اور مزید معلومات کے لیے
ثمر عباس
03012454188
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی
مندرجہ ذیل فون نمبرز پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں
35802552-35386783-35804200
ای میل: jdpgroup@hotmail.com

www.pdfbooksfree.pk

براڈوے کا رخ کیا اور ایک مزاحیہ ڈرامے کے کردار کے لیے منتخب کرلیا گیا۔ اس ڈرامے کا نام 'جونیئر مس' تھا۔ اس وقت اس کی عمر سولہ برس تھی۔ دوسری جنگِ عظیم شروع ہوئی تو وہ رائل کینیڈین ائیر فورس میں بھرتی کے لیے درخواست دی، لیکن اس کی درخواست قبول نہیں کی گئی، کیونکہ وہ ابھی کم عمر تھا۔ بہرحال اس نے 1945ء تا 47ء امریکا کی میرین کور میں انفنٹری مین کی حیثیت سے کام کیا۔ اس کی ڈیوٹی جنوبی بحراوقیانوس پر لگائی گئی۔ وہاں اس نے اپنے تجربات پر مشتمل دوسو صفحات کی رپورٹ لکھی۔ جب سان فرانسسکو میں اس کی ڈیوٹی ختم ہوئی تو بدقسمتی سے اس کی وہ رپورٹ کھوگئی۔ اس نے میرین کور میں ذاتی حیثیت میں کام کیا تھا اور جب وہ ریٹائر ہوا تو پرائیویٹ حیثیت سے ہی ہوا۔ چونکہ اس کی تعلیم ادھوری تھی، لہٰذا اس نے میڈل ٹاؤن کی ویسلیوان یونی ورسٹی میں داخلہ لے لیا اس طرح سے اسے 1951ء میں گریجویشن کی ڈگری ملی۔

1950ء میں اس نے اسٹیج پر بطور اداکار کام کیا لیکن وہاں اس کی قسمت کا تارہ اس انداز سے نہیں چمکا کہ لوگ راستہ روک کر اس سے آٹوگراف لیتے یا انگلی کے اشارے سے کہتے کہ وہ دیکھو لڈلم جا رہا ہے۔ نیو انگلینڈ کے تھیٹر میں اس نے اپنی بیوی کے ساتھ تقریباً دوسو ڈراموں میں کام کیا۔ اسے وکیل کا کردار ملتا تھا یا پھر مجرم اور قاتل کا۔ 1954ء میں اس نے اداکاری ترک کر کے پروڈکشن شروع کردی۔ اس نے شمالی جرسی کے ایک تھیٹر پلے ہاؤس میں اپنے ڈرامے پیش کرنا شروع کردیے۔ پھر 1960ء میں اس نے ایکٹرز ایکویٹی کے تعاون سے پیراماس مال پر ایک پلے ہاؤس (تھیٹر) قائم کیا۔

بیس برس میں اس نے تقریباً 370 اسٹیج ڈرامے پیش کیے۔ پھر ٹیلی وژن کے متعدد ڈراموں میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے، لیکن شہرت کی بلندیوں تک نہ پہنچ سکا۔ جب اس کام سے اکتا گیا تو اس نے 1971ء میں اپنا پہلا ناول 'اسکارلیٹی انہریٹنس' لکھا۔ یہ جرمنوں اور بین الاقوامی صنعت کاروں کے بارے میں تھا۔ اس نے ناول شائع ہونے کے لیے متعدد پبلشروں کو دیا، لیکن کہیں سے کامیابی نہ ہوئی۔ دس پبلشروں نے حوصلہ شکن باتیں کیں۔ تاہم جب ورلڈ پبلشنگ کمپنی نے اسے شائع کیا تو وہ فروخت کے اعتبار سے بیسٹ سیلرز لسٹ میں شامل ہوگیا اور قارئین نے اسے بے حد سراہا۔ اس ناول کی کہانی اس نے السٹریٹڈ لندن نیوز میں شائع ہونے والی دو تصاویر کو دیکھ کر لکھی

تھی۔ یہ بہرحال اس کے تصور کا کمال تھا کہ اس نے محض دو تصاویر کو مرکزی ستون بنا کر ایک قلعہ تعمیر کرڈالا۔ اس ناول میں بتایا گیا تھا کہ کچھ مالدار لوگ نازی پارٹی 'تھرڈ ریخ' کی معاشی طور پر امداد کر رہے ہیں تاکہ وہ دوبارہ برسرِ اقتدار آجائے۔ یہ ناول 75 ہزار کی تعداد میں فروخت ہوا۔

رابرٹ لڈلم کا حوصلہ بڑھ گیا اور اس نے ناول نویس کی حیثیت سے زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا اور 1973ء میں دوسرا ناول 'اوسٹر مین ویک اینڈ' لکھا۔ اس ناول پر بعد میں سام پیکنپاہ نے 1983ء میں فلم بنائی۔ اس ناول کی کہانی کچھ اس طرح سے ہے کہ سی آئی اے ایک نیوز ایگزیکٹو سے مل کر سازش تیار کرتی ہے اور وہ نیوز ایگزیکٹو ٹیلی وژن پر یہ اعلان کرتا ہے کہ اس نے ایک روسی گروہ کا سراغ لگایا ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ سب اس کے دوست ہیں۔ وہ اپنے دوستوں کو گرفتار کرانے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا۔ لڈلم کے کردار کچھ اسی قسم کے ہوتے ہیں کہ ہیرو کے بجائے ولین معلوم ہوتے ہیں۔ بہت سے ناولوں میں اس کے کردار فرد واحد ہیں جو بڑی تنظیموں سے ٹکر لیتے ہیں، جو دنیا کا امن و چین تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ رابرٹ لڈلم کے ناولوں پر مبنی فلموں کا ہیرو میٹ ڈیمون تھا، جس نے اس کے تین ناولوں پر بننے والی فلموں میں کام کر کے اپنا لوہا منوالیا۔ پھر بعد میں بھی اس نے کئی فلموں میں کام کیا اور کافی نام کمایا۔

1970ء سے رابرٹ لڈلم نے فیصلہ کیا کہ اسے دل لگا کر ناول نویسی ہی کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ یہ مالی اعتبار سے ایک نفع بخش پیشہ ہے۔ جب ناول لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہونے لگے تھے تو پھر کسی اور ذریعہ مُعاش کے بارے میں سوچنے کی ضرورت بھی کیا تھی؟ 1978ء میں اس نے ہول کرافٹ کو وینٹ لکھا اور اس کے بعد 'اپوکلاپس واچ'، جن پر فلم بنی اور وہ شہرت کے بامِ عروج پر پہنچ گیا۔

ایک سوال جو ہر کوئی پوچھ بیٹھتا ہے، وہ یہ ہے کہ اداکاری کرتے کرتے لڈلم کو اچانک لکھنے کا رجحان کیسے پیدا ہوگیا۔ اس کے علاوہ جب وہ اس کے لوازمات سے آگاہ ہی نہیں تھا تو اس نے بین الاقوامی سازشوں کے پس منظر میں ایسے معرکہ آرا ناول کیسے لکھ لیے؟ حقیقت یہ ہے کہ اس کے بہت سے دوست فارن آفس میں کام کرنے لگے۔ جن کی صحبت میں رہ کر وہ بہت کچھ جان گیا۔ پھر اس کے کچھ واقف کار برطانوی سیکرٹ سروس میں اچھے عہدوں پر فائز ہوگئے، لڈلم کو ان کی صحبت سے زرخیزی ملی۔ پھر اس کی بیوی

میری نے پینٹاگون میں ملازمت کرلی۔ جس سے وہ ایک بڑی تنظیم کی کارستانیوں سے آگاہ ہوگیا۔

اپنے ناولوں کے پس منظر اور تانا بانا بُننے کے لیے وہ نچلا نہیں بیٹھتا تھا، بلکہ مسلسل سفر میں رہتا تھا۔ ہر ایک چیز کا مشاہدہ جب تک اپنی آنکھوں سے نہ کرلیتا اسے چین ہی نہ آتا۔ پیرس خاص طور پر اس کا پسندیدہ شہر تھا، جس کا تذکرہ اس کے بہت سے ناولوں میں ملتا ہے۔ اس کے ابتدائی تین ناول جرمنی سے متعلق ہیں اور دوسری جنگِ عظیم کے پس منظر میں ان کا تانا بانا بُنا گیا ہے۔ اس نے جب ناول لکھنا شروع کیے تو سرد جنگ جاری تھی، اس لیے اس کے ناولوں کے مجرم زیادہ تر کمیونسٹ تھے۔ پھر جب سرد جنگ ختم ہوگئی تو اس نے دہشت گردی کو اپنا موضوع بنالیا۔ اس کے مشاہدات میں وسعت اور کشادگی اس طرح سے پیدا ہوئی کہ وہ اپنے جیٹ طیارے میں بیٹھ کر اپنی بیوی میری کے ساتھ دنیا کا سفر کرتا رہتا تھا اور ان ملکوں میں قیام کرتا جہاں اسے اپنے تازہ ناول کا پس منظر تیار کرنا ہوتا تھا۔

1980ء میں اس نے 'بورن آئی ڈینٹی' لکھا جس میں ایک امریکی ایجنٹ کا کردار تخلیق کیا جس کے مخالف ایک کردار کارلوس تخلیق کیا گیا تھا، جن کا دنیا کے بہت سے ملکوں میں مقابلہ ہوتا ہے۔ کارلوس کا کردار ایک پیدائشی دہشت گرد میرز سانشیز کو دیکھ کر تخلیق کیا تھا، جو 1994ء میں سوڈان میں گرفتار ہوا تھا اور مقدمہ چلانے کی غرض سے پیرس لایا گیا تھا۔ حقیقت کی دنیا کا زندہ جاوید کردار' کارلوس دی جیکال' کی پشت پناہی ایک زمانے میں صدام حسین بھی کرتے تھے۔ جس نے 1972ء کے اولمپکس میں بہت سے اسرائیلی کھلاڑیوں کو ہلاک کرڈالا تھا۔ اس کے علاوہ دہشت گردی کے بہت سے واقعات کے پیچھے اسی کا ہاتھ تھا۔ اب وہ پیرس کی ایک جیل میں تاحیات قید کی زندگی بسر کر رہا ہے۔

'بورن آئی ڈینٹی' کے پہلے منظر میں اس کا ہیرو بے ہوش ہوتا ہے اور جب اس کی آنکھ کھلتی ہے تو اسے یہ یاد نہیں آتا کہ وہ کون ہے اور کہاں رہتا ہے۔ اس کے والدین کون تھے اور وہ کس کاروبار سے منسلک تھا۔ یادداشت کی گرہیں کھلتی ہیں تو اسے صرف یہ یاد آتا ہے کہ اس کا نام 'ڈیوڈ ویب' ہے اور وہ مشرق وسطیٰ کا اسکالر ہے۔ سی آئی اے نے اسے ایک نئی آئی ڈینٹی (شناخت) دی ہے کہ وہ جیسن بورن ہے اور اسے کارلوس نامی دہشت گرد کو ہلاک کرنا ہے، لیکن

آگ

خیال ہے کہ سب سے پہلے آگ انسان نے کسی درخت پر بجلی گرنے سے حاصل کی یا کسی آتش فشاں کے لاوا اگلنے سے پیدا شدہ آگ سے اپنا کام چلایا۔ اس طرح حاصل کی ہوئی آگ کو بڑی احتیاط سے غاروں اور جھونپڑیوں میں محفوظ رکھنا پڑتا تھا۔ مدت بعد رگڑ سے آگ پیدا کرنے کا طریقہ انسان کو سوجھا اور پھر آہستہ آہستہ دو خشک چیزوں کو آپس میں رگڑنے سے آگ حاصل کی جانے لگی۔ چقماق ایک سخت پتھر ہے جس سے شیشہ کاٹنے کا کام لیا جاتا ہے۔ اتفاقیہ طور پر کہیں شیشہ کاٹنے کے دوران آگ کی چنگاری نظر آگئی۔ تب سے چقماق کے دو ٹکڑوں کو ایک دوسرے کے ساتھ رگڑ کر آگ حاصل کرنے کا طریقہ رواج پا گیا۔ محدب عدسے میں سورج کی شعاعوں کو ایک مرکز پر جمع کرلینے سے بھی آگ حاصل کی جاتی تھی۔ مشہور سائنس دان ارشمیدس (287 ق م۔212 ق م) نے ایک ایسے شیشے ہی کی مدد سے رومن جہاز کو آگ لگادی تھی۔ صنعتی دنیا میں جدید کیمیائی طریقہ سے آکسیجن کو آگ کا ذریعہ سب سے پہلے فرانس کے مشہور کیمیا دان توائرز نے بتایا۔ اس نے 1783ء میں آکسیجن کے خواص دریافت کیے اور معلوم کیا کہ جلنے کے لیے آکسیجن لازمی ہے۔ آگ کی زبردست طاقت اور فائدہ رسانی کو دیکھ کر انسان نے اس کی پرستش بھی کی ہے اور زمین پر اس کو سورج دیوتا کا نائب سمجھا ہے۔ قدیم یونان میں اسے چار بنیادی عناصر (عناصر اربعہ) میں سے ایک عنصر سمجھا جاتا تھا۔

مرسلہ: ملک سرفراز، سرگودھا

www.pdfbooksfree.pk

افسران اسے دھوکا دیتے ہیں اور عین موقع پر اس سے منہ موڑ لیتے ہیں۔اس طرح سے ناول میں حیرت انگیز موڑ اور تحیر خیزی پیدا ہو جاتی ہے۔(وہ ایک طرح سے سی آئی اے کا قاتل تھا)اس ناول کا دوسرا حصہ 'بورن سپر میسی' ہے۔ ہیرو بورن کی شخصیت کے دو حصے ہو چکے ہیں۔ دوسری شخصیت اذیت رساں ہے اور دوسروں کو مصیبت اور آلام میں دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔وہ ہانگ کانگ میں یکے بعد دیگرے کئی لوگوں کو ہلاک کرتا ہے۔ناول کا تیسرا حصہ 'بورن الٹی میٹم' ہے جس میں وہ اور کارلوس روس میں مدِمقابل ہوتے ہیں۔ناول کا دوسرا حصہ بے حد پیچیدہ ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ رابرٹ لڈلم خیر سے شر کی طرف جا رہا ہے یا شر سے خیر کی طرف۔چونکہ ناول میں بے پناہ روانی ہے،اس لیے قاری سوچے سمجھے بغیر اسے پڑھتا چلا جاتا ہے۔اس کے ناولوں میں جو لڑائی' دنگا فساد ہے اسے کیا نام دیا جائے،وہ تشدد ہے یا محض ایکشن؟ تبصرہ نگار جب یہ سوال اٹھاتے ہیں تو ان ناولوں کے قارئین یہ کہتے ہیں کہ وہ پلاٹ کی ضرورت تھی۔ناولوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔رابرٹ لڈلم کی اپنے بارے میں رائے ہے کہ اس نے سسپنس کو مدِنظر رکھتے ہوئے ناول لکھے ہیں اور ان کا انداز ڈرامائی اور تھیٹریکل ہے،اس لیے کہ وہ دنیا کو شیکسپیئر کی طرح سے ایک تھیٹر سمجھتا ہے۔

اس سلسلے کا چوتھا حصہ 'بورن لگیسی' تھا جسے ایرک فان لسٹ بیڈر نے 2004ء میں لکھا تھا۔اس میں نت نئے جہانوں کی سیر کرائی گئی ہے اور حکومت کی بددیانتی سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔

ہر چند کہ قارئین اس کو بے پناہ پسند کرتے تھے اور اس کے نئے ناول کا انتظار کرتے تھے،لیکن تیکنیکی اعتبار سے تبصرہ نگاروں نے اس کے ناولوں کو پسند نہیں کیا۔مثال کے طور پر مشہور مصنف جان لی کار نے ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ اس کا اندازِ تحریر بچکانہ ہے اور وہ بہت چھوٹے چھوٹے جملے لکھتا ہے،ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اسے لکھنا ہی نہیں آتا ہے۔اس کے ناولوں میں نشانِ تحیر (!) کی بھرمار ہوتی ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ قارئین کو حیرت زدہ نہیں کر رہا ہے،بلکہ وہ خود اپنے پلاٹ اور تحریر پر حیرت زدہ ہے اور یہ نشان مسلسل لگاتا چلا جا رہا ہے۔اس کے کردار بہت سادہ ہوتے ہیں اور نفسیاتی اعتبار سے کمزور۔تاہم اس نے اپنے ناولوں میں یہ انکشاف ضرور کیا ہے کہ روس اور امریکا مل کر دنیا کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں اور سی آئی اے ایک ایسا ادارہ ہے جو امریکا میں بیٹھ کر خلافِ قانون منصوبے تیار کرتا رہتا ہے۔اسے قانون کی عملداری کی کوئی پروا نہیں ہے۔

لڈلم کا انتقال 12 مارچ 2001ء میں نیپلز، فلوریڈا میں 73 برس میں ہوا۔مرنے سے پیشتر وہ ہر وقت نشے میں رہنے لگا تھا۔چونکہ اس کے پاس بہت دولت تھی،اس لیے اس کی زندگی ایک بلے بوائے کی طرح سے گزرنے لگی جس میں ساحلِ سمندر کے نزدیک بنے ہوئے مکانات میں رہائش،شرابیں،تیز رفتار اور نئے ماڈل کی کاریں اور ایک عدد پرائیویٹ جیٹ طیارہ شامل تھا،جس پر وہ ملکوں ملکوں سیر کیا کرتا تھا اور اپنے مشاہدات میں اضافہ کرتا رہتا تھا۔اس کے بھتیجے کا بیان ہے کہ جب میں فیملی ڈاکٹر کی حیثیت سے اس کے مکان پر جایا کرتا تھا تو اسے ایک مخصوص وہسکی ڈیوار پیتے دیکھتا تھا۔وہسکی پینے کے لیے اس کے پاس ایک مخصوص گلاس ہوا کرتا تھا (جس کے پیندے میں شیشم کی لکڑی چپکا کر دیدہ زیب نقوش ابھارے گئے تھے)۔اسے سیر سپاٹے کا بہت شوق تھا اور بہاماز کے جزائر اس کی پسندیدہ جگہ تھی۔وہ جب بھی موڈ میں ہوتا،مجھ سے کہتا کہ جیٹ تیار ہے،آؤ بہاماز چلتے ہیں۔

اس نے اپنی زندگی میں کُل 29 ناول لکھے ہیں جو 32 زبانوں میں ترجمہ ہوئے۔یہ ناول مجموعی طور پر کئی کروڑ کی تعداد میں فروخت ہوئے۔لڈلم نے اپنے اس مخصوص نام کے علاوہ دوسرے ادبی نام جوناتھن رائڈر کے تحت بھی لکھے ہیں جن میں 'ٹریویان' اور 'کرائی آف ہیلیڈان' شامل ہیں۔موخرالذکر اس نے مزاحیہ انداز میں لکھا ہے۔مرنے کے بعد اس کا ناول 2000ء میں چھپا جس کا نام 'سگما پروٹوکول' تھا۔مرتے وقت اس نے بہت سے ناولوں کے ادھورے مسودے ، ناولوں کے خاکے چھوڑے ہیں جنہیں دوسرے مصنفین کے ذریعے لکھوانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

کروڑوں کی تعداد میں فروخت ہونے والا مصنف جب اس دنیا سے گیا تو اس کے دونوں ہاتھ سکندرِ اعظم کی طرح سے خالی تھے اور خانۂ دل بھی خالی تھا۔اس نے محبت کے نام پر بھیک مانگی لیکن یہ بھیک بھی نہ ملی اور وہ تہی داماں ہو گیا۔آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے۔

فلمی الف لیلہ

علی سفیان آفاقی کی یادداشتیں

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

ایسے نادرِ روزگار خال خال ہی نظر آتے ہیں جو نصف صدی سے علم و ادب، صحافت و فلم کے میدان میں سرگرم عمل ہوں اور اپنے روزِ اول کی طرح تازہ دم بھی۔ ان کے ذہنِ رسا کی پرواز میں کوئی کمی واقع ہو، نہ ان کا قلم کبھی تھکن کا شکار نظر آئے۔ آفاقی صاحب ہمارے ایسے ہی جواں فکر و بلند حوصلہ بزرگ ہیں۔ وہ جس شعبے سے بھی وابستہ رہے، اپنی نمایاں حیثیت کے نشان اس کی پیشانی پر ثبت کر دیے۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستگی کے دوران میں انہیں اپنے عہد کی ہر قابلِ ذکر شخصیت سے ملنے اور اس کے بارے میں آگاہی کا موقع بھی ملا۔ دید شنید اور میل ملاقات کا یہ سلسلہ خاصا طولانی اور بہت زیادہ قابلِ رشک ہے۔ آئیے ہم بھی ان کے وسیلے سے اپنے زمانے کی نامور شخصیات سے ملاقات کریں اور اس عہد کا نظارہ کریں جو آج خواب معلوم ہوتا ہے۔

ادب و صحافت سے فلمی دنیا تک دراز ایک داستاں در داستاں سرگزشت

قسط: 213

دلیپ کمار کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا رہا ہے، بھارتی صحافیوں، نقادوں اور معروف مبصرین نے ان کے اور ان کے فن کے بارے میں انگریزی زبان میں کتابیں لکھی ہیں اور ابھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ ہر پہلو سے ان کی اداکاری اور شخصیت پر روشنی ڈالی جا رہی ہے۔دلیپ کمار سالہا سال سے اداکاری ترک کر چکے ہیں۔ان کی سوشل لائف بھی ہمیشہ محدود رہی ہے۔وہ بہت کم ہی فلمی تقریبات میں شرکت کرتے ہیں۔اس کے باوجود ان کی شخصیت اور

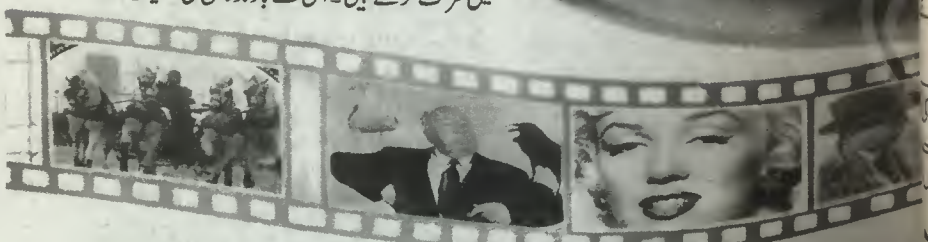

www.pdfbooksfree.pk

اداکاری کا احساس ہردم رہتا ہے۔ بھارت کی فلمی صنعت دلیپ کمار کو کبھی نظر انداز نہیں کرسکتی۔ ان کی نوے سالہ زندگی میں پچاس سے زائد سال تک وہ انڈین فلمی صنعت کے بہت عظیم اداکار رہے ہیں۔ ان کے مقابلے میں بہت سے اداکار آئے لیکن وہ دلیپ کمار کی جگہ نہیں لے سکے۔ ایک زمانے میں بھارتی فلمی صنعت نے تین بڑے اداکاروں کا جو تکون بنایا تھا ان میں دلیپ کمار، راجکپور اور دیوآنند شامل تھے لیکن سچ تو یہ ہے کہ اداکار کی حیثیت سے راج کپور اور دیوآنند دلیپ کمار کے ہم پلہ نہیں تھے۔ راجکپور بہت بڑے فلم ساز اور ہدایت کار تھے لیکن اداکاری میں دلیپ کمار سے ان کا موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح دیوآنند نے چند فلموں میں اداکار کی حیثیت سے بہت داد و تحسین حاصل کی۔ وہ فلم ساز اور ہدایت کار بھی تھے لیکن وہ راج کپور جیسے فلم ساز اور ہدایت کار نہ تھے۔ اداکار کی حیثیت سے بھی انہیں دلیپ کمار جیسی شہرت، مقبولیت اور باکس آفس پر دلیپ کمار جیسی حیثیت حاصل نہ تھی۔ لیکن ان تینوں کو زبردستی ''تین بڑے'' اداکار کہا جاتا تھا' جبکہ حقیقت یہ نہیں تھی۔

دلیپ کمار کے بارے میں ایک مغربی صحافی اور فلمی نقاد نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ ہالی ووڈ کے چند عظیم میتھڈ اداکاروں سے کم نہیں تھے۔ میتھڈ اداکار وہ کہلاتے ہیں جو... اداکاری کا مخصوص انداز رکھتے ہیں اور جو بھی کردار ادا کرتے ہیں اسی میں ڈھل جاتے ہیں، وہ کردار کی ضرورت کے مطابق اداکاری کرتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ ہر کردار ادا کرتے ہوئے وہ اپنی حیثیت اور شخصیت سے علیحدہ نہیں ہوتے، مضمون میں لکھا ہے کہ دلیپ کمار میتھڈ یا حقیقی اداکاری کرتے تھے مثلاً اگر فلم کے کسی منظر میں یہ دکھایا جائے کہ بہت دور سے بھاگے ہوئے آتے ہیں اور ان کی سانس پھولی ہوئی ہے تو وہ دوسرے اداکاروں کی طرح محض سانس پھولنے کی اداکاری نہیں کرتے تھے بلکہ فلور کے باہر دور تک بھاگتے تھے۔ خواہ گرمی ہو یا سردی، وہ بھاگ کر سچ مچ اپنے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ سیٹ پر آتے اور پھر منظر فلم بند کراتے تھے۔ انہوں نے اداکاری کو ایک مقدس پیشے کی طرح اپنایا تھا۔ وہ ایک ساتھ کبھی دو فلموں میں کام نہیں کرتے تھے چاہے کتنا ہی زیادہ معاوضہ پیش کیا جائے۔

فلم ''کوہ نور'' ایک ہلکی پھلکی فلم تھی۔ دراصل جذباتی اور ڈرامائی کردار ادا کرتے ہوئے وہ اس کیفیت کو اپنے اوپر اس طرح طاری کرلیتے تھے کہ سچ مچ اس میں ڈوب جاتے تھے۔ مسلسل جذباتی کردار کرنے کی وجہ سے وہ زمانے میں ذہنی اور نفسیاتی طور پر اتنے تھک گئے تھے ڈاکٹروں نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ کچھ عرصہ تک جذباتی المیہ کرداروں سے پرہیز کریں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک میں انہوں نے ہلکی پھلکی فلموں میں کام کرنے کو ترجیح جیسے رام اور شیام، کوہ نور، لیڈر وغیرہ۔

فلم ''کوہ نور'' کے ایک منظر میں ان پر ایک گانا فلم کرنا تھا۔ یہ ایک کلاسیکی گانا تھا جس میں انہیں ایک ستار نواز کے طور پر ستار بجانا تھا۔ موسیقار نوشاد نے یہ تجویز پیش کی کہ ستار بجاتے ہوئے لانگ شاٹس دلیپ کمار پر بلند کرلیے جائیں لیکن جن شاٹس میں ان کی انگلیوں کو ستار بجاتے ہوئے کلوزاپ میں دکھایا جائے ان میں استاد جمن خان کی انگلیوں کے کلوزاپ لے لیے جائیں۔ فلم بینوں کو شبہ بھی نہیں ہوگا کہ یہ کلوزاپ شاٹس کسی اور ہاتھ اور انگلیوں کے ہیں۔ لیکن دلیپ کمار سمجھوتا کرنے کے قائل نہیں تھے انہوں نے کئی ہفتے ستار بجانے کی مشق کی اور یہ مناظر خود فلم بند کرائے، یہ گانا وہ تھا جس کے بول ہیں۔

جادوگر قاتل

اس گانے کو آج بھی غور سے دیکھ لیں، دیکھنے والوں کو دلیپ کمار خود ستار بجاتے نظر آئیں گے۔ ستار ایک مشکل ساز ہے، اس کو بجانے کے لیے بہت سخت محنت اور مشق کی ضرورت ہوتی ہے۔ دلیپ کمار نے اپنا وقت دینے اور محنت کرنے کو ترجیح دی اور سین کو فلم بند کرانے کے لیے ستار بجانے کی تربیت حاصل کی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کتنے حقیقت پسند اداکار ہیں اور منظر میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے وہ خود زحمت اٹھانا پسند کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ہر فلم اور ہر کردار دیکھنے والوں کے دلوں پر نقش ہوکر رہ جاتا ہے۔ یہی وہ خصوصیت ہے جو دلیپ کمار کو اپنے دوسرے ہم عصر اداکاروں سے ممتاز کرتی ہے۔ ہر اداکار کے لیے دلیپ کمار بننا ممکن نہیں ہے چونکہ وہ اپنے کام اور کردار کے ساتھ انصاف کرنے کے لیے اتنی سخت محنت نہیں کرتے۔ دلیپ کمار نے جب تک کام کیا اسے عبادت سمجھ کر کیا۔ ان کی یہی خصوصیت انہیں دوسرے اداکاروں سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ کیریکٹر ایکٹنگ کرتے ہوئے بھی باکس آفس پر بہت کشش رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جن فلموں میں انہوں نے کیریکٹر ایکٹنگ کی ان میں بھی فلم کے ہیرو سے زیادہ معاوضہ حاصل کیا۔

دلیپ کمار کی شخصیت میں یہ کشش اور جاذبیت اس وقت بھی تھی جب انہوں نے اداکاری کا آغاز کیا تھا۔ بمبئی ٹاکیز کی مالک اداکارہ دیویکا رانی کو اپنی کمپنی کے مقبول اور مشہور ہیرو اشوک کمار کی جگہ لینے کے لیے ایک ایسے اداکار کی ضرورت تھی جو اشوک کمار کی جگہ لے سکے کیونکہ اشوک کمار کمپنی کو چھوڑ کر جارہے تھے۔ اس وقت یوسف خان کو دیکھتے ہی دیویکا رانی نے فلم میں کام کرنے کی پیشکش کردی تھی۔ دیویکا رانی بہ ذات خود ایک بہت اچھی اداکارہ تھیں۔ ان کی جوہر شناسی قابل تعریف ہے کہ انہوں نے ایک شرمیلے اور خاموش طبع لڑکے کو ایک ہی نگاہ میں جانچ لیا اور اشوک کمار جیسے عظیم اداکار کی جگہ اس نوجوان کو ایک انٹرویو کے بعد ہی منتخب کرلیا۔ اشوک کمار نے بھی دلیپ کمار کی اداکاری کو بہت سراہا تھا۔ ان دونوں کو ایک ساتھ کام کرنے کا موقع بھی ملا..... فلم ''دیدار'' میں دونوں آمنے سامنے ہوئے تو فلم دیکھنے والوں کو دلیپ کمار کا پلڑا بھاری دکھا۔ یہ درست ہے کہ ''دیدار'' میں دلیپ کمار کا کردار زیادہ جاندار تھا لیکن جس کسی منظر میں دونوں یکجا ہوئے دیکھنے والوں کو لطف آگیا۔ اشوک کمار بھی اپنے زمانے میں سادہ، بے تکلف انداز میں اداکاری اور مکالموں کی ادائیگی کے قائل تھے۔ دلیپ کمار کا انداز بھی یہی تھا۔ ان دونوں کے مناظر قابل دید اور یادگار ہیں جنہیں دیکھ کر نوواردادا کار بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ دیکھا جائے تو برصغیر کے لوگوں کو دیویکا رانی کا شکرگزار ہونا چاہیے جنہوں نے دلیپ کمار جیسے بے مثال اداکار کو دریافت کیا۔ ورنہ شاید دلیپ کمار اداکار ہی نہ بنتے۔

ہدایت کار لقمان ہمارے بہت مہربان بزرگ دوست تھے، وہ ہمیں ممبئی کے قصے سناتے رہتے تھے۔ وہ بمبئی میں شوکت حسین رضوی کے چیف اسسٹنٹ بھی رہے بلکہ ایک زمانے میں تو وہ شوکت صاحب کے ساتھ ہی رہا کرتے تھے۔ یوسف خان کے خاندان سے ان کا بہت میل جول اور ان کے گھر میں آنا جانا تھا۔ انہوں نے بتایا تھا کہ جب شوکت صاحب نے فلم جگنو بنانے کا فیصلہ کیا تو مرکزی کردار کے لیے نور جہاں کے ساتھ موتی لعل کو ہیرو کے طور پر منتخب کیا لیکن موتی لال جو اس زمانے میں بہت مقبول اداکار تھے ایک تو مصروف بہت تھے دوسرے انہوں نے فلم ''جگنو'' میں کام کرنے کے لیے 80 ہزار روپے معاوضہ

فلم اچھوت کنیا کا ایک منظر

طلب کیا جو شوکت صاحب کے لیے قابل قبول نہ تھا۔ شوکت صاحب نے موتی لال کی جگہ کوئی اور موزوں اداکار تلاش کرنا شروع کردیا۔ ''جگنو'' میں انہیں ایک ایسے اداکار کی ضرورت تھی جو بے تکلف ہو، روزمرہ کے انداز میں سادگی سے مکالمے بولتا ہو۔ ہلکے پھلکے اور ڈرامائی مناظر کے ساتھ بھی انصاف کرسکے۔

لقمان صاحب کو اچانک خیال آیا کہ کیوں نہ یوسف خان (دلیپ کمار) کو بھی موقع دیا جائے۔ دلیپ کمار اس وقت جوار بھاٹا، میں کام کررہے تھے۔ بمبئی ٹاکیز کے ساتھ ان کا معاہدہ تھا اور دیویکا رانی نے ہی انہیں دلیپ کمار کا فلمی نام دیا تھا۔

لقمان صاحب یوسف خان کے گھر گئے تو وہ انہیں گھر پر ہی مل گئے۔ لقمان صاحب نے انہیں مختصراً فلم ''جگنو'' کی کہانی سنائی اور پھر کہا ''اٹھو، تیار ہوجاؤ، میں اسی وقت تمہیں شوکت صاحب سے ملوانا چاہتا ہوں۔''

دلیپ کمار تیار ہوکر جھجکتے ہوئے لقمان صاحب کے ساتھ چل پڑے لیکن اپنی شرمیلی طبیعت کے باعث کچھ سوچ رہے تھے۔ لقمان صاحب شوکت صاحب کے فلیٹ پر پہنچے، اندر گئے تو شوکت صاحب ڈرائنگ روم میں ایک صوفے پر بیٹھے ہوئے اسکرپٹ پڑھ رہے تھے۔

لقمان صاحب نے کہا ''شوکت صاحب، میں ایک لڑکے کو لایا ہوں ''جگنو'' میں کام کرنے کے لیے۔ آپ اجازت دیں تو اندر لے آؤں؟''

''ہاں ہاں کیوں نہیں'' شوکت صاحب نے جواب دیا۔

www.pdfbooksfree.pk

لقمان صاحب کہتے ہیں کہ میں یوسف کو لے کر ڈرائنگ روم میں گیا۔ شوکت صاحب ڈرائنگ کے دوسرے سرے پر صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے جب دلیپ کمار اندر داخل ہوئے، شوکت صاحب اور دروازے کے درمیان میں کافی فاصلہ تھا۔ دلیپ ان کی طرف بڑھا تو شوکت صاحب غور سے جائزہ لیتے رہے۔ دلیپ کمار نے پاس جاکر سلام کیا۔ شوکت صاحب نے جواب دے کر انہیں بیٹھنے کے لیے کہا۔ لقمان صاحب کا کہنا تھا کہ جتنی دیر میں دلیپ کمار شوکت صاحب کے پاس پہنچے اسی وقت شوکت صاحب نے ان کا انتخاب کرلیا تھا۔ اس کا اندازہ لقمان صاحب کو اس طرح ہوا کہ شوکت صاحب نے ملازم کو چائے لانے کو کہا اور دلیپ کمار کو ''جگنو'' میں ان کے کردار کے بارے میں بتانا شروع کردیا۔

دلیپ کمار راتوں رات مقبول اداکار نہیں بن گئے تھے۔ ان کی ابتدا میں ریلیز ہونے والی تین فلموں میں ان کی اداکاری کو سب سے سراہا گیا لیکن وہ باکس آفس پر ہٹ نہیں ہوئی تھیں۔ اسٹار دراصل وہ ''جگنو'' کی نمائش کے بعد بنے تھے، ''جگنو'' میں دلیپ کمار نے بہترین اداکاری کا مظاہرہ کیا۔ ہلکے پھلکے مناظر ہوں۔ طالب علمی کے مناظر اور شوخیاں ہوں یا ڈرامائی مناظر دلیپ کمار نے ہر ایک کے ساتھ مکمل انصاف کیا تھا۔ اس فلم نے دلیپ کمار کو سپر اسٹار اور محمد رفیع کو گلوکار کی حیثیت سے مشہور کردیا تھا۔ اس کے بعد دلیپ کمار نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔

دلیپ کمار نے اداکاری میں جو معیار قائم کیا نقادوں کا کہنا ہے کہ وہ اس دور کے عظیم ہالی وڈ کے اداکاروں مارلن برانڈو، ہنری فونڈا اور سپینسر ٹریسی کے معیار کی تھی۔

ان کا کہنا ہے کہ اگر وہ ہالی وڈ میں ہوتے تو ان کا شمار بھی اسی پائے کے اداکاروں میں ہوتا۔ خاص طور پر مارلن برانڈو کی طرح وہ بھی کم سے کم مکالمے بولتے تھے اور ان ہی کے انداز میں اداکاری کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ اپنے کرداروں کے ساتھ انصاف کرتے تھے اور ان میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے کسی مشکل کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔

دلیپ کمار نے جب اپنی ذاتی فلم ''گنگا جمنا'' بنائی تو موسیقار نوشاد نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ جن علاقوں میں فلم کی شوٹنگ کررہے ہیں ان علاقوں میں عموماً پوربی زبان بولی جاتی ہے۔ انہوں نے پوربی میں چند مکالمے بھی بول کر سنائے۔ دلیپ کمار کو یہ خیال بہت پسند آیا اور انہوں نے اس فلم کو پوربی زبان میں بنانے کا فیصلہ کرلیا۔ انہوں نے صرف خود پوربی لہجہ اور تلفظ سیکھا بلکہ دوسرے تمام اداکاروں کو ہیرو ئن وجنتی مالا، کو بھی پوربی بولنے کی تربیت دی گئی۔ زبان کی اس تبدیلی نے فلم کو حد درجہ موثر بنادیا تھا اس کی کامیابی میں ایک قابل ذکر تبدیلی ثابت ہوئی۔ ''گنگا جمنا'' میں دلیپ کمار اور وجنتی مالا کے پوربی میں بولے ہوئے مکالمے فلم بینوں کو زبانی یاد ہوگئے تھے۔

یوں تو دلیپ کمار نے کئی فلموں میں المیہ کردار کیے تھے لیکن محبوب خان کی فلم ''انداز'' کے کردار سے ان کے المیہ کرداروں کا آغاز ہوا اور پھر یہ سلسلہ کافی عرصے تک جاری رہا۔ دیدار، سنگدل، دیوداس، گنگا جمنا، ہلچل، آرزو اور اسی زمانے کی دوسری المیہ فلموں میں دلیپ کمار ڈوب کر اداکاری کی۔ تعریف بھی خوب سمیٹی مگر کرداروں کا تاثر ان کی ذات پر بھی بہت گہرا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ وہ ذہنی اور نفسیاتی مسائل کا شکار ہوگئے تھے جس کے بعد انہوں نے المیہ کردار ترک کرکے ہلکے پھلکے رومانی اور مزاحیہ کرداروں پر زیادہ توجہ دی جس سے ان کا ذہنی بوجھ ہلکا ہوا۔

دلیپ کمار نے اپنے وقت کی تمام نامور ہیروئنوں کے ساتھ کام کیا لیکن وہ سب سے زیادہ نلنی جیونت کے معترف تھے۔ نلنی جیونت کے ساتھ انہوں نے صرف دو فلموں ''شکست'' اور ''انوکھا پیار'' میں کام کیا تھا مگر جس سنجیدگی اور توجہ سے نلنی جیونت کام کرتی تھیں اور جس طرح ہدایت کاروں کی ہدایات پر عمل کرتی تھیں یہ خوبیاں دوسری ہیروئنوں میں نہیں تھیں حالانکہ وہ اداکاری میں نلنی جیونت سے بہتر تھیں۔

ذرا سوچیے کہ دلیپ کمار بہت زیادہ کس ہدایت کار کے قائل تھے؟ محبوب خان کے، جن کے ساتھ انہوں نے انداز، امر، آن جیسی فلموں میں کام کیا تھا؟ یا پھر بمل رائے جن کی مدھومتی اور دیوداس جیسی فلموں میں انہیں بہت مقبولیت حاصل ہوئی تھی؟ ان دونوں کے برعکس دلیپ کمار ہدایت کار نتن بوس کے معترف تھے۔

نتن بوس ان کی فلموں دیدار، ملن اور گنگا جمنا کے ہدایت کار تھے۔ دلیپ کہتے ہیں کہ میں نے نتن بوس سے بہت کچھ سیکھا۔

دلیپ کمار اپنے کردار سے مطمئن ہونے کے بعد

فلم میں کام کرنے کی ہامی بھرتے تھے لیکن کچھ ایسی فلمیں اور کردار بھی تھے جنہیں انہوں نے مسترد کردیا تھا مگر ایک انٹرویو میں انہوں نے خود اعتراف کیا کہ یہ ان کی غلطی تھی۔ ہالی وڈ کے مایہ ناز ہدایت کار ڈیوڈ لین نے جب فلم ''لارنس آف عربیا'' بنانے کا ارادہ کیا تو اس فلم میں ایک اہم ترین کردار کے لیے دلیپ کمار سے رابطہ کیا تھا۔ اس فلم میں شریف علی نام کا ایک کردار تھا۔ مرکزی کردار کے لیے پیٹر اوٹول کو پہلے سائن کیا جاچکا تھا۔ دلیپ کمار نے مطالبہ کیا کہ انہیں لارنس کا مرکزی کردار دیا جائے لیکن ایسا ممکن نہ تھا کیونکہ پیٹر اوٹول سے پہلے ہی معاہدہ ہوچکا تھا۔ دلیپ کمار نے معاون کردار کرنے سے انکار کردیا ہے حالانکہ اس کے لیے انہیں بہت معقول معاوضہ پیش کیا گیا تھا اور یہ فلم انہیں ہالی وڈ میں بہت اچھی طرح متعارف کراسکتی تھی۔ شریف علی کا کردار اس فلم میں بعد میں عمر شریف نے کیا تھا اور اس کردار کی وجہ سے وہ ہالی وڈ میں اتنے مقبول ہوئے کہ پھر چند فلموں میں مرکزی کردار بھی ادا کیے اور بہت شہرت حاصل کی، دلیپ کمار یہ کردار مسترد کرنے کو اپنی ایک غلطی تسلیم کرتے ہیں۔

اسی طرح گرودت کی فلم ''پیاسا'' میں مرکزی کردار کے لیے گرودت انہیں منہ مانگا معاوضہ دینے کو تیار تھے کیونکہ یہ کردار دلیپ کمار کو سامنے رکھ کر ہی انہوں نے لکھوایا تھا۔

دلیپ کمار بعد میں یہ کردار مسترد کرکے پچھتائے اور انٹرویو میں تسلیم کیا کہ یہ ان کی غلطی تھی، اسی طرح فلم ''بیجو باورا'' میں انہیں مینا کماری کے مقابل ہیرو کا کردار پیش کیا گیا تھا مگر وہ رضامند نہ ہوئے۔ یہ کردار بھارت بھوشن نے ادا کیا تھا۔ یہ بہت اچھا کردار تھا اور یہ فلم بھی بے حد کامیاب ہوئی تھی۔ دلیپ کمار نے اعتراف کیا کہ انہیں یہ کردار قبول کرلینا چاہیے تھا لیکن انہوں نے فیصلہ کرنے میں غلطی کی تھی۔

اپنی غلطیوں کا اس طرح کھلا اعتراف ہر کوئی نہیں کرسکتا۔ جہاں تک دلیپ کمار کی اداکاری کا تعلق ہے اس کا اعتراف سبھی کرتے ہیں۔ امیتابھ بچن نے ایک انٹرویو میں کہا کہ اگر دلیپ کمار ہالی وڈ میں ہوتے تو کئی بار آسکر ایوارڈ حاصل کرچکے ہوتے۔ شاہ رخ خان دلیپ کمار کو اپنا آئیڈیل کہتے ہیں۔ فلم ساز، ہدایت کار اور اداکار منوج نے ان کے بارے میں کہا۔ ''سب کہتے ہیں کہ میں دلیپ کمار کی

اداکار اشوک کمار

نقل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مجھے بتائیے کہ ہندوستان کا کون سا اداکار اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا ہے اس نے دلیپ کمار کی نقل کرنے اور ان کی اداکاری سے سیکھنے کی کوشش نہیں کی؟''

اس کے برعکس یہ بات بھی ہے کہ دلیپ کمار کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اپنے مکالموں اور کرداروں میں تبدیلی کرتے ہیں یا کراتے ہیں اور اس طرح دوسرے اداکاروں کی حق تلفی کرتے رہے ہیں۔ سنجیو کمار نے ''سنگھرش'' میں دلیپ کمار کے ساتھ کام کیا تھا۔ انہوں نے بھی یہ الزام عائد کیا تھا۔ محبوب خان نے فلم ''مدر انڈیا'' میں دلیپ کمار کو نرگس کے بڑے بیٹے کا کردار سونپنے کا فیصلہ کیا تو وہ رضامند نہیں ہوئے۔ وہ چاہتے تھے کہ اسکرپٹ میں تبدیلی کی جائے اور ''مدر انڈیا'' میں باپ اور بیٹے کا کردار ایک ہی اداکار کرے تو وہ رضامند ہوسکتے ہیں مگر محبوب صاحب نہ مانے۔ اے آر کاردار جیسا معروف ہدایت کار یہ شکایت کرتا تھا کہ ان کی فلم ''دل دیا درد لیا'' کے اسکرپٹ میں دلیپ کمار نے اتنی تبدیلیاں کیں کہ کہانی کا حلیہ ہی بگڑ کر رہ گیا۔

ہدایت کار اپنی اس فلم کی ناکامی اور اپنی تباہی کا ذمے دار دلیپ کمار کو ٹھہراتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ دلیپ کمار ہمیشہ فلم سازوں کی زندگی اجیرن کردیا کرتے تھے، شکایات اپنی جگہ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ دلیپ کمار نے ہندوستان کے کروڑوں لوگوں کو فلموں کے ذریعے ڈھیر ساری خوشیاں اور آنسو دیے ہیں۔ ان کا یہ احسان فلم بین کبھی نہیں اتار سکتے۔

www.pdfbooksfree.pk

دیو آنند کی وفات کے بعد انڈیا کے ''تین بڑوں'' دلیپ کمار راجکپور دیو آنند'' میں سے صرف دلیپ کمار ہی رہ گئے ہیں۔ وہ 90 برس کے ہو چکے ہیں۔ پچھلے دنوں ان کی سالگرہ منائی گئی تو ساری فلمی صنعت (نئے اور پرانے) ان کے گھر پر انہیں مبارک باد دینے کو موجود تھے۔ دلیپ کمار کی صحت ٹھیک نہیں رہتی۔ انہیں بات کرنے میں بھی ہچکچاہٹ ہوتی ہے۔ ان کا حافظہ بھی خراب ہو گیا ہے، خیال ہے کہ شاید وہ الزائمر میں مبتلا ہو گئے ہیں لیکن وہ ان فن کاروں میں سے ہیں جنہیں ہمیشہ یاد رکھا جاتا ہے۔

☆☆☆

شاہ رخ خان کے مکان کے بارے میں آپ کو معلومات فراہم کی گئیں۔ قارئین کی طرف سے ان پرانے فن کاروں کے بارے میں معلومات کو بہت پسند کیا گیا۔ کافی حضرات اور خواتین نے شاہ رخ خان کے خاندان اور آبائی مکان کے بارے میں مزید جاننے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔

شاہ رخ خان نہ صرف برصغیر میں بلکہ ساری دنیا میں ایک جانا پہچانا نام ہے لیکن ان کے خاندان کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ آیئے، اس بارے میں آپ کو کچھ معلومات فراہم کی جا رہی ہیں۔ شاہ رخ خان کے کزن نے اس بارے میں بہت کچھ بتایا ہے جو نہ صرف شاہ رخ خان کے خاندان کے بارے میں اہم ہے بلکہ ان کے قریبی رشتے داروں کی زبانی شاہ رخ اور ان کے خاندان کے بارے میں بھی کافی کارآمد ہے۔

پشاور اس خطے کے قدیم ترین شہروں میں شمار کیا جاتا ہے، لیکن اس شہر کی اس اعتبار سے بھی اہمیت حاصل ہے کہ اس سرزمین نے ایسے فن کار پیدا کیے جنہوں نے سارے برصغیر میں دھوم مچادی اور اپنے کام کے حوالے سے پشاور اور سرحدی علاقے کا نام دنیا بھر میں عام کر دیا۔

شاہ رخ خان کے والد تاج محمد میر کا تعلق بھی پشاور سے ہے۔ وہ پرانے شہر کے علاقے میں رہتے تھے۔ ان کا آبائی مکان آج بھی شاہ ولی قتال کے علاقے میں موجود ہے جسے فلموں کے شائقین اور شاہ رخ کے پرستار دور دور سے دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔ شاہ رخ کے والد تاج محمد میر انگریزی دورِ حکومت میں ایک انقلابی مزاج کے حامل تھے۔ حکومت کو بھی ان کی طرف سے تشویش رہا کرتی تھی۔ خفیہ پولیس کے کارندے ان کے ارد گرد گھومتے پھرتے تھے اور ان کو تھانے لے جا کر تفتیش اور تحقیقات بھی کرتے رہتے تھے۔ ان حالات سے تنگ آ کر تاج محمد ملک کی تقسیم سے پہلے ہی پشاور چھوڑ کر چلے گئے تھے اور دہلی میں انہوں نے رہائش اختیار کر لی تھی تاکہ خفیہ پولیس کی سرگرمیوں سے نجات حاصل کر سکیں۔ تاج محمد ملک کی آزادی کے شدید حامی تھے اور ان لوگوں کے ساتھ تھے جو انگریزوں کو ہندوستان سے نکال کر آزادی کی فضا میں سانس لینے کے خواہش مند تھے۔ ان کے تعلقات سبھاش چندر بوس کی تحریکِ آزادی سے تھے اور وہ ان حلقوں میں مقبول بھی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دہلی میں انہوں نے میجر جنرل شاہ نواز خان کی صاحب زادی لطیف فاطمہ سے شادی کی۔ شاہ نواز خان بھی سبھاش چندر بوس کی انڈین نیشنل آرمی کے ایک رکن تھے۔

شاہ رخ خان کی پیدائش بھی دہلی میں ہوئی تھی۔ چند سال پہلے ایک پاکستانی صحافی ارشد یوسف زئی نے پشاور میں شاہ رخ خان کے آبائی مکان کے ساتھ ان کے رشتے داروں کو بھی ڈھونڈ نکالا۔ یہ داستان خود یوسف زئی کی زبانی سنیے:

شاہ رخ خان کے آبائی گھر تک پہنچنے کے لیے شاہ ولی قتال کے علاقے سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہاں ایک تنگ گلی میں وہ پرانا گھر آج بھی کھڑا ہوا ہے جہاں ان کے والد رہا کرتے تھے۔ یہ علاقہ دراصل قصہ خوانی کے تاریخی بازار کے عقب میں واقع ہے۔ قصہ خوانی بازار میں پرانے زمانے میں قصہ گو دلچسپ داستانیں سنا کر لوگوں کو تفریح فراہم کرتے تھے۔ اسی وجہ سے اس بازار کا نام قصہ خوانی پڑا جو کہ آج بھی اسی نام سے جانا جاتا ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں لوگ قہوہ خانوں میں گرم گرم قہوے کی چسکیاں لیتے ہوئے قصے کہانیاں سنا کرتے تھے۔ آج کل اس بازار میں قصے کہانیاں سنانے والوں اور قہوہ خانوں کی جگہ مختلف دکانیں ہیں جہاں شوقین خریداروں کا ہجوم رہتا ہے کیونکہ ان دکانوں میں سامانِ آرائش اور افزائشِ حسن کے سامان کی دکانیں کافی تعداد میں ہیں۔

قصہ خوانی بازار کے دکاندار شاہ رخ خان کے آبائی مکان کے بارے میں بخوبی جانتے ہیں لیکن صحیح پتا بتانے سے قاصر ہیں لیکن ایک مزدور نے مجھے بتایا کہ مقامی مسجد کے ساتھ جو تنگ و تاریک گلی نظر آ رہی ہے وہ شاہ رخ کے گھر کو جاتی ہے۔ مزدور نے پیشکش کی کہ آپ میرے ساتھ آئیں، میں آپ کو اس مکان تک پہنچا دوں گا لیکن آپ اس گھر والوں کو یہ نہ بتانا کہ میں نے آپ کو گھر دکھایا تھا کیونکہ وہ لوگوں کا اس گھر میں آنا پسند نہیں کرتے۔

مزدور کے ہمراہ کچھ دور چلنے کے بعد میں اس گھر کے سامنے پہنچ گیا جہاں شاہ رخ خان کے والد اور ان کے کزن رہا کرتے تھے۔ یہ چار منزلہ گھر گلی کے آخر میں واقع ہے۔

میں نے گھر کے سامنے رک کر مزدور کا شکریہ ادا کیا جو فوراً غائب ہو گیا۔ میں نے سبز رنگ کے دروازے پر دستک دی۔ کچھ دیر بعد ایک تیس سالہ شخص نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ وہ قمیص نہیں پہنے ہوئے تھا۔ میرے دریافت کرنے پر اس نے بتایا کہ اس کا نام جاوید احمد میر ہے اور وہ شاہ رخ کا کزن ہے۔ میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ میں بہت دور سے شاہ رخ خان کے رشتے داروں سے ملنے آیا ہوں اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے وقت دے دیں۔

جاوید احمد میر نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ ہم تنگ سیڑھیاں چڑھ کر گھر کی پہلی منزل پر پہنچ گئے جہاں جاوید کی بہن نور جہاں عرف منی اور ان کے تین بچوں سے ملاقات ہوئی۔ اسی گھر میں جاوید میر کے دو بھائی منصور احمد اور فاروق احمد بھی رہتے ہیں۔ یہ ایک پرانا گھر ہے جس کی چوتھی منزل پشاور میں دہشت گردوں کے مسلسل دھماکوں کی وجہ سے کمزور ہو گئی ہے اور کسی وقت بھی گر سکتی ہے۔

جب بات چیت شروع ہوئی تو منی نے ہمیں بہت سی پرانی اور دلچسپ باتیں سنائیں۔ منی نے بتایا کہ 1978ء میں شاہ رخ خان اپنے والد کے ساتھ پشاور آئے تھے اور تقریباً 22، 20 دن رہے تھے۔ اس وقت شاہ رخ کی عمر تیرہ سال تھی۔ منی نے بتایا کہ ہم سب بچے کھیلا کرتے تھے۔ لڑتے جھگڑتے تھے۔ ایک دوسرے کو مناتے بھی تھے۔ وہ بہت خوشگوار دن تھے جنہیں ہم کبھی نہیں بھول سکیں گے۔

نور جہاں عرف منی نے بتایا کہ اس وقت میری عمر دس سال تھی۔ اس پہلے دورے کے بعد اگلے سال یعنی 1979ء میں شاہ رخ دوبارہ اپنے والد اور اپنی بہن شاہ نازلالہ رخ کے ساتھ پشاور آئے تھے۔ اس بار..... شاہ رخ ایک مہینے تک پشاور میں ہمارے پاس رہے تھے۔ اس وقت تک شاہ رخ اداکار نہیں بنے تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ لڑکا ایک دن بالی وڈ کا بادشاہ بنے گا اور ساری دنیا میں مشہور ہو جائے گا۔

دویکا اور اشوک کمار فلم کے ایک سین میں

یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ شاہ رخ خان ایک ٹیلی ویژن سیریز ''فوجی'' میں کام کرنے کے بعد فلموں میں آئے تھے۔ ''فوجی'' 1988ء میں ریلیز ہوئی تھی اور اس کو بہت پسند کیا گیا تھا۔ ایک سال بعد جب شاہ رخ کی والدہ کا انتقال ہوا تو انہوں نے دہلی کو خیر باد کہہ دیا اور بمبئی چلے گئے۔

قدرت ان پر مہربان تھی۔ ان کی ڈراما سیریز ''فوجی'' فلم سازوں اور ہدایت کاروں نے دیکھی اور پسند کی تھی۔ کچھ عرصہ تک انہیں کام کی تلاش میں جدوجہد کرنی پڑی کیونکہ وہ چھوٹے موٹے کردار قبول کر کے اپنا مستقبل خراب نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہیں بالآخر ایک فلم ''دیوانہ'' میں منفی کردار ادا کرنے کا موقع ملا لیکن یہ کردار اہمیت کے لحاظ سے ہیرو کے کردار سے زیادہ اہم تھا اور اس میں اداکاری کے جوہر دکھانے کا زیادہ موقع تھا جس سے شاہ رخ خان نے فائدہ اٹھایا۔ فلم ''دیوانہ'' 1992ء میں نمائش پذیر ہوئی تھی۔ نہ صرف یہ فلم کامیاب ہوئی بلکہ اس فلم میں شاہ رخ کی اداکاری کو بہت سراہا گیا۔ اس کے بعد شاہ رخ خان نے پلٹ کر پیچھے نہیں دیکھا۔ وہ ایک کے بعد ایک کامیابی کے زینے چڑھتے رہے۔

نور جہاں نے بتایا کہ اس کے بعد ہم لوگوں کا شاہ رخ سے رابطہ ٹوٹ گیا تھا۔ بعد میں شاہ رخ خان سے رابطہ تو ہوا لیکن ان کے پاس پاکستان آنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ انہوں نے اپنی کزن کو بمبئی آنے کی دعوت دی۔ شاہ رخ سے رابطہ کرنے اور ان کو فون کرنے کا کوئی ذریعہ نظر نہیں آتا تھا۔ قسمت آزمائی کے لیے میں نے دہلی میں شاہ رخ کے گھر کے نمبر پر فون کیا تو ٹیلی فون شاہ رخ کی بہن لالہ رخ نے

www.pdfbooksfree.pk

اٹھایا۔نور جہاں کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہی۔لالہ رخ کے ساتھ خوب باتیں ہوئیں اور لالہ رخ نے انہیں شاہ رخ کے بمبئی والے گھر ''منّت'' کا فون نمبر دے دیا۔

''شاہ رخ سے میری بات ہوئی تو وہ بہت خوش ہوئے۔ان کی آواز میں پہلے جیسی اپنائیت اور محبت تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ ایک نامور اداکار بن کر بھی وہ پرانے رشتوں اور رشتے داروں کو بھولے نہیں تھے۔

''شاہ رخ خان کو اطلاع دیے بغیر نور جہاں اپنے شوہر کے ساتھ بمبئی پہنچ گئیں۔وہاں شاہ رخ خان کا بنگلہ تلاش کرنا مشکل نہ تھا۔ٹیکسی والے کو بتایا کہ ہمیں شاہ رخ خان کے گھر جانا ہے تو وہ خوشی خوشی تیار ہوگیا۔راستے بھر وہ ہم سے سوالات کرتا رہا کہ ہم کون ہیں اور شاہ رخ خان کے گھر کیوں جارہے ہیں۔''

''جب ہم شاہ رخ کے خوبصورت بنگلے ''منّت'' پہنچے تو معلوم ہوا کہ شاہ رخ خان آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لیے گئے ہوئے ہیں۔شاہ رخ خان رات کو ساڑھے بارہ بجے شوٹنگ سے واپس آئے تو ہم لوگوں کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئے۔''

''ارے منی، تو کب آئی؟''

''ہم لوگ صبح پانچ بجے تک باتیں کرتے رہے۔اتنے عرصے بعد ملاقات ہوئی تھی۔اور بہت کچھ کہنے اور سننے کے لیے تھا۔'' یہ واقعہ سناتے ہوئے نور جہاں کی آنکھیں بھر آئیں اور آواز بھی نمناک ہوگئی۔

''شاہ رخ خان ان دنوں فلموں کی شوٹنگ میں مصروف تھے۔اکثر رات گئے گھر آتے تھے لیکن پھر بھی وہ میرے اور میرے شوہر کے لیے وقت نکال لیتے تھے۔شاہ رخ خان نے اپنے ساتھ ہمیں بمبئی کی سیر کرائی اور شہر کے مشہور مقامات دکھائے۔وہ ہمیں اپنی فلم کی شوٹنگ پر بھی اپنے ساتھ لے گئے اور وہاں ہر ایک سے ہمارا تعارف کرایا۔انہوں نے سب سے یہ کہہ کر ملوایا کہ یہ میری بہن ہے۔پشاور سے آئی ہے۔میری فلم ساز ''لیش جوہر'' سے ملاقات ہوئی، ان کا بیٹا کرن جوہر بھی سیٹ پر موجود تھا جس سے شاہ رخ نے ہمیں ملوایا۔سیٹ پر اداکارہ جوہی چاولہ سے بھی ملاقات ہوئی۔شاہ رخ ان دنوں فلم ''ڈپلی کیٹ'' کی شوٹنگ میں مصروف تھے۔باتوں باتوں میں نور جہاں نے بتایا کہ فلم ''کل ہو نہ ہو'' میں شاہ رخ نے جو پشاوری چپل پہنی تھی وہ میں نے ہی انہیں تحفتاً دی تھی۔میں ان کے لیے قمیص شلوار بھی لے گئی تھی جسے پہن کر وہ بہت خوش ہوئے۔فلم ''کچھ کچھ ہوتا ہے'' میں انہوں نے یہ شلوار قمیص بھی پہنی تھی اور ہر ایک کو بتا رہے تھے کہ یہ تحفہ میری بہن پشاور سے میرے لیے لائی تھی۔

بمبئی میں نور جہاں اور ان کے شوہر نے بہت اچھے دن گزارے تھے۔ان کے شوہر تو اداکاروں سے مل کر اتنے خوش ہوئے تھے کہ وہ 1998ء میں دوبارہ بمبئی گئے اور وہاں ایک ماہ سے زیادہ شاہ رخ کے گھر مہمان رہے۔

نور جہاں نے بتایا کہ میں نے اپنے بیٹے کا نام شاہ رخ خان رکھا ہے۔جب دوسری مرتبہ ہم بمبئی گئے تو شاہ رخ خان جونیئر بھی ہمارے ساتھ جانے کو تیار تھا۔ماموں کا بہت زبردست ''فین'' ہے۔لیکن ہم دونوں ملکوں کے مابین ناخوشگوار حالات کی وجہ سے اس کو اپنے ساتھ نہیں لے گئے۔میرا دوسرا بیٹا شاہریز خان اس وقت چار سال کا تھا۔اتنے چھوٹے بچے کو ساتھ لے جانا بھی مشکل تھا اس لیے ہم دونوں میاں بیوی ہی بمبئی گئے تھے۔

2008ء میں بمبئی کے حملے کے بعد حالات اتنے خراب ہوگئے کہ ہم نے بمبئی جانے کا ارادہ ہی نہیں کیا۔پاکستان اور انڈیا کے تعلقات اس زمانے میں بہت خراب ہوگئے تھے۔

شاہ رخ خان جونیئر نے کہا ''میں بمبئی جاکر انکل سے ضرور ملنا چاہتا ہوں۔میری امی کہتی ہیں کہ ابھی چند سال تک ہم انڈیا نہیں جائیں گے۔جب حالات ٹھیک ہوجائیں گے تب جائیں گے۔''

شاہ رخ جونیئر سے پوچھا گیا ''کیا تم بڑے ہوکر اداکار بنو گے؟''

اس نے جواب دیا ''مجھے اپنے ماموں سے بہت محبت ہے، میں ان کا زبردست فین ہوں، مجھے ان کی فلمیں بہت اچھی لگتی ہیں۔فلم ''رب نے ملائی جوڑی'' مجھے بہت پسند ہے مگر میں خود بڑا ہوکر اداکار نہیں بننا چاہتا۔میں تو کرکٹر بننا چاہتا ہوں، یوم یوم آفریدی جیسا۔''

''ان کا آج کل صرف ٹیلی فون اور انٹرنیٹ پر ہی رابطہ رہتا ہے۔شاہ رخ کی بے پناہ مصروفیات کی وجہ سے زیادہ لمبی بات نہیں ہوسکتی.... میں گھر کے کاموں کے علاوہ پشاور میں کونسلر بھی رہ چکی ہوں جس کی وجہ سے میں بھی بہت مصروف ہوں۔''

ہم لوگوں نے چائے پی کر اجازت چاہی۔نور جہاں اور ان کے شوہر ہمیں باہر تک چھوڑنے آئے۔ہم لوگوں نے

غلام محمد، راگنی اور جایانت فلم شیریں فرہاد میں

اس پرانے بوسیدہ گھر کو دیکھا اور سوچا کہ اگر قدرت مہربان ہو اور انسان محنت کرے تو ایسے گھر میں رہنے والا بھی آسمان کی بلندیوں کو چھو سکتا ہے۔کہاں یہ گھر جس کی چوتھی منزل کی چھت کسی وقت بھی گر سکتی ہے اور کہاں بمبئی کے مہنگے ترین علاقے میں شاہ رخ خان کا سات منزلہ محل نما گھر جس میں دنیا کی ہر جدید سہولت موجود ہے۔

خود بڑے بڑے اداکار بھی اس شاندار گھر کو اور اس گھر میں رہنے والے پر رشک کرتے ہیں۔یہ سب اللہ کی مہربانیاں ہیں۔انسان ان نعمتوں کا شکر یہ ادا نہیں کرسکتا جو اللہ تعالیٰ نے اس کو عنایت کی ہیں۔بمبئی کا نام اب ممبئی ہے۔یہ وہ شہر ہے جہاں لاکھوں انسانوں کے پاس سر چھپانے کو جھونپڑا تک نہیں ہے۔وہ کھلے آسمان کے نیچے فٹ پاتھوں پر ساری زندگی گزار دیتے ہیں۔ایسے بدقسمت بھی ہیں جنہیں فٹ پاتھوں پر بھی جگہ نہیں ملتی تو وہ گندے نالوں اور سیوریج کے اندر پناہ لینے پر مجبور ہیں۔

یہ سب قدرت کے کرشمے ہیں۔

☆☆☆

دلیپ کمار کے حوالے سے انہیں دریافت کرنے والی ہستی اداکارہ، اسٹوڈیو اونر دیویکا رانی کا تذکرہ بھی آیا ہے۔دیویکا رانی کے بارے میں کئی بار مختصر اً بیان کیا جاچکا ہے لیکن تفصیل سے ان کے حالات اور واقعات بیان نہیں کیے گئے۔

ہندوستان کی فلمی صنعت کی ترقی اور اسے روشن خیالی کی راہ پر گامزن کرنے والوں میں دیویکا رانی بھی سرفہرست ہیں۔ان کا تعلق ہندوستان کی بنگالی زبان کے شاعر اعظم ٹیگور کے خاندان سے تھا۔ان کے والد کرنل چوہدری پہلے ہندوستانی فوجی سرجن تھے۔وہ ایک بہت اچھے ڈاکٹر اور سرجن تھے۔دیویکا رانی جنوبی ہند کے ایک قصبے میں پیدا ہوئی تھیں۔ان کی پیدائش کا سال 1908ء اور مہینا مارچ ہے۔ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے لندن کی رائل اکیڈمی آف آرٹ میں اداکاری اور رائل اکیڈمی آف میوزک سے موسیقی کی تعلیم حاصل کی چونکہ انہیں ابتدائی عمر ہی سے فنونِ لطیفہ سے دلچسپی تھی۔خصوصاً اداکاری اور موسیقی ان کے پسندیدہ شعبے تھے۔انہوں نے آرٹ کی ٹیچر، ڈیزائننگ اور آرائش کی تربیت بھی حاصل کی۔دیویکا رانی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور برہمن لڑکی تھیں اس لیے ہر لحاظ سے قابلِ عزت تھیں۔

دیویکا رانی کا عشق فلم اور اداکاری تھا، ہندوستان واپس آکر انہوں نے فلم ساز اور اداکار ہمنسو رائے سے شادی کی۔یہ شادی 1929ء میں ہوئی تھی۔ان دونوں نے باہمی صلاح ومشورے سے مشہور فلم ساز ادارے بمبئی ٹاکیز قائم کیا جس نے ہندوستان کی فلمی صنعت کے فروغ اور ترقی میں نمایاں حصہ لیا اور کئی حوالوں سے اس کو ایک تاریخی حیثیت حاصل ہے۔

بمبئی ٹاکیز میں ان دونوں نے بہترین دماغ، ہنرمند اور اداکار اکٹھے کرلیے تھے۔اسکرین پلے رائٹر نرنجن پال جن سے دیویکا رانی کی ملاقات لندن میں ہوئی تھی، وہ بہترین اسکرین پلے لکھنے کے لیے مشہور تھے۔دیویکا رانی نے انہیں بمبئی ٹاکیز سے منسلک کرلیا جہاں بیشتر فلموں کے اسکرپٹ نرنجن پال ہی نے لکھے تھے۔اشوک کمار گنگولی جو لیبارٹری میں کام کرنے کے لیے رکھے گئے تھے ان کو دیویکا رانی کی جوہر شناس نظروں نے اداکاری کے لیے موزوں سمجھا اور انہوں نے بمبئی ٹاکیز سے اپنی اداکاری کا آغاز کیا۔اشوک کمار ہندوستان کے سپر اسٹارز میں شمار کیے جاتے ہیں۔انہوں نے بہت سی یادگار فلموں میں کام کیا۔

www.pdfbooksfree.pk

یوسف خان کو دریافت کرکے دلیپ کمار بنانے میں بھی دیویکا رانی کا ہاتھ تھا۔ مدھوبالا بھی بمبئی ٹاکیز میں چائلڈ اسٹار کی حیثیت سے کام کرتی رہی ہیں۔ بمبئی ٹاکیز نے بھی نیو تھیٹرز کلکتہ کی طرح غیر ملکی کیمرامین اور دیگر ہنرمندوں کی خدمات حاصل کیں جن کی وجہ سے اس زمانے میں بھی ان فلم ساز اداروں کی بنائی ہوئی فلموں کا معیار بہت بلند تھا اور ان ہی غیر ملکی ماہرین نے ہندوستانیوں کو بھی تربیت دی تھی۔

بمبئی ٹاکیز نے ہندوستان میں فلم سازی کا ایک نیا اور اعلیٰ معیار قائم کیا تھا۔ لاہور کے ایک نوجوان خوبرو اور تعلیم یافتہ اداکار نجم الحسن بمبئی گئے تو انہیں بھی اداکار کی حیثیت سے رکھ لیا۔ دیویکا رانی نجم الحسن کے عشق میں گرفتار ہوگئیں اور ایک دن وہ دونوں فرار ہوگئے۔ ہمنسورائے دیویکا رانی کو تو منا کر واپس لے آئے مگر نجم الحسن کے لیے بمبئی ٹاکیز کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہوگئے تھے۔

ہمنسورائے نے 1936ء میں فلم اچھوت کنیا بنائی تھی جس نے سارے ملک میں سنسنی پھیلا دی تھی کیونکہ یہ ایک برہمن لڑکے (اشوک کمار) اور اچھوت لڑکی (دیویکا رانی) کی محبت کی کہانی ہے۔ اچھوتوں کو اونچی ذات کے ہندو چھونا بھی پسند نہیں کرتے کہاں یہ کہ ایک برہمن لڑکا اچھوت لڑکی سے محبت کرے۔ اس فلم کی نمائش پر کافی شور مچا لیکن اس کو بے حد کامیابی حاصل ہوئی اور آج یہ ایک یادگار فلم سمجھی جاتی ہے۔ اس زمانے کی فلموں میں بوس و کنار بھی دکھایا جاتا تھا لیکن بمبئی ٹاکیز کی فلم ''کرما'' میں ہمنسورائے اور دیویکا رانی کا یہ سین چار منٹ طویل ہے جسے دنیا بھر کی فلموں میں ایک ریکارڈ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس فلم اور اس منظر سے یہ اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اس قدیم دور میں بمبئی ٹاکیز کتنا روشن خیال اور ترقی پسند ادارہ تھا۔ ہندوستان اس زمانے میں تو بہت زیادہ قدامت پسند ملک تھا مگر ایک ہندوستانی فلم میں اس قسم کے مناظر پیش کرنے کے لیے بڑے دل و جگر کی ضرورت تھی۔

1940ء میں ہمنسورائے کی وفات کے بعد بمبئی ٹاکیز کی ملکیت کا جھگڑا شروع ہوگیا اور ایس مکرجی کو بمبئی ٹاکیز کا ایک پارٹنر بنانا پڑا۔ اشوک کمار بھی کمپنی کے حصے دار تھے، تین سال کے بعد ایس مکرجی اور اشوک کمار نے بمبئی ٹاکیز چھوڑ کر فلستان کے نام سے ایک نیا ادارہ قائم کرلیا۔ بمبئی ٹاکیز کے بہت سے نامور اور کارآمد لوگ فلستان سے وابستہ ہوگئے تو دیویکا رانی کو تن تنہا بمبئی ٹاکیز کو چلانے میں بہت مشکل پیش آئی اور اس معروف ادارے کا پہلا جیسا معیار قائم نہ رہ سکا۔ حالات سے تنگ آکر دیویکا رانی نے 1945ء میں ایک روسی مصور سے شادی کرلی اور بمبئی ٹاکیز جیسا ادارہ ختم ہوگیا۔ روسی مصور سے شادی کرنے کے بعد دیویکا رانی نے فلموں سے بھی قطع تعلق کرلیا اور اپنے شوہر کے ساتھ بنگلور میں رہائش اختیار کرلی۔ بنگلور میں کنک پورہ کے مقام پر ان کا ایک بہت وسیع و عریض اور خوبصورت فارم ہاؤس تھا جہاں یہ دنیا سے الگ تھلگ ہوکر رہتے تھے۔ اپنے روسی شوہر کی وفات کے بعد بھی دیویکا رانی اسی جگہ رہائش پذیر رہیں۔ فلمی دنیا سے ان کا کوئی تعلق اور واسطہ نہیں تھا لیکن فلمی دنیا کے بعض افراد سے ان کا تعلق قائم رہا، ان کی خدمات کے صلے میں بھارتی حکومت نے 1969ء میں دیویکا رانی کو ''پدم شری'' کے خطاب سے نوازا۔ انہیں سب سے پہلے فلموں کا سب سے بڑا اعزاز دادا صاحب پھالکے ایوارڈ بھی دیا گیا تھا۔

1994ء میں دیویکا رانی نے وفات پائی۔ پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ ان کی آخری رسوم ادا کی گئیں۔ ان کی وفات کے بعد ان کی رہائش گاہ کے بارے میں تنازعہ شروع ہوگیا تھا۔ یہ جائداد ان کی اور ان کے مصور روسی شوہر کی مشترکہ ملکیت تھی۔ روسی حکومت نے روسی مصور کے حصے کی ملکیت کے لیے دعویٰ کردیا لیکن بھارتی حکومت اسے تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھی یہ معاملہ عدالت تک پہنچا جس نے اس قیمتی جائداد کی ملکیت کا فیصلہ کیا۔

دیویکا رانی کو ہندوستان کی فلمی صنعت میں کئی حوالوں سے ایک یادگار اور انمول مقام حاصل رہے گا۔ وہ ہندوستان کی اعلیٰ ترین خاندانی لڑکی تھی جس نے لندن سے اعلیٰ ترین تعلیم حاصل کی تھی اور اس تعلیم سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہندوستانی فلمی صنعت کو بامِ عروج تک پہنچا دیا تھا۔

دیویکا رانی کو اس لیے بھی یاد رکھا جائے گا کہ انہوں نے دلیپ کمار جیسے مایہ ناز اداکار کو دریافت کیا تھا۔ ان کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ تیسویں دہائی سے تعلق رکھنے والی ایک اداکارہ ہونے کے باوجود وہ آج کی ماڈرن اداکاراؤں سے بھی زیادہ روشن خیال اور ترقی پسند تھیں۔ وہ آرکی ٹیکچر کی طالبہ تھیں جب، لندن میں ان کی ہمنسورائے سے ملاقات ہوئی تھی۔ ہمنسورائے کے کہنے پر بمبئی ٹاکیز کی

دلیپ کمار، سائرہ بانو، وجنتی مالا اور ان کی نواسی

فلموں کے سیٹ وہی ڈیزائن کرتی تھیں۔

لندن کے دورانِ تعلیم میں وہ ہمنسورائے کے ساتھ ایک اسٹیج ڈرامے میں کام کرنے کے لیے سوئٹزرلینڈ اور سکنڈے نیویا کے ملکوں کے دورے پر بھی گئی تھیں جہاں انہیں اس ڈرامے پر بہت داد ملی تھی۔ دیویکا رانی نے لندن میں اداکاری کے علاوہ اکیڈمی سے سیٹ اور ملبوسات ڈیزائن کرنے کی تربیت اور تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس زمانے میں انہوں نے لندن اکیڈمی آف آرٹ سے میک اپ سیٹ کی سجاوٹ اور دیگر شعبوں میں بھی ڈگری حاصل کی تھی۔

بمبئی ٹاکیز کی فلم ''کرما'' میں کام کرنے کے بعد وہ بہترین اداکار تسلیم کی گئی تھیں۔ بی بی سی نے انہیں پہلے ٹی وی ڈرامے میں کام کرنے کا موقع دیا تھا جو کہ ایک اعزاز تھا۔ انہیں ہندوستان کے لیے بی بی سی کے پروگرام نشر کرنے کے آغاز کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ دیویکا رانی ہندوستان کے مختلف آرٹ سے متعلق اداروں کی رکن تھیں۔ انہیں 1989ء میں سوویت یونین نے ''نہرو ایوارڈ'' بھی دیا تھا۔

دیویکا رانی ایک انتہائی معزز اور مشہور خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کی پردادی ٹیگور کی بہن تھیں۔ اس رشتے سے وہ شہرہ آفاق شاعر ٹیگور کی پڑنواسی تھیں۔ ان کے والد ایم این چوہدری بھی بنگال کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

دیویکا رانی کو ہندوستان کی فلمی صنعت میں ہمیشہ ایک نمایاں حیثیت حاصل رہے گی۔ انہوں نے فلم کے فن اور تکنیک کے علاوہ اداکاری، آرکی ٹیکچر اور ڈیزائننگ میں بھی لندن اکیڈمی آف آرٹ سے تعلیم حاصل کی تھی۔ اس دور میں جبکہ ہندوستانی لڑکیوں کے لیے اسکول کی تعلیم حاصل کرنے پر بھی پابندی تھی دیویکا رانی نے لندن کی اکیڈمیوں سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ اس تعلیم سے انہوں نے عملی فائدہ بھی اٹھایا اور ہندوستان کی فلمی ترقی کے لیے اپنی تعلیم اور تجربے کو استعمال کیا۔

دیویکا رانی کا ایک کارنامہ بمبئی ٹاکیز کا قیام ہے۔ اس زمانے میں کلکتہ میں نیو تھیٹرز اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ہنرمند لوگوں کے تعاون سے فلم سازی کررہی تھی لیکن دیویکا رانی نے بمبئی میں اس پیمانے کی ایک کمپنی قائم کی اور بہت اعلیٰ معیار کی فلمیں بنائیں۔ انہوں نے نیو تھیٹرز کی طرح جرمنی اور انگلستان سے کیمرامین، ہدایت کار اور دوسرے ہنرمندوں کی خدمات بھی حاصل کیں اور ہندوستان کے بہترین تخلیق کاروں اور ہنرمندوں کو بھی بمبئی ٹاکیز میں اکٹھا کیا جنہوں نے بہت اعلیٰ معیار کی فلمیں تخلیق کیں۔ ہندوستان کی فلمی صنعت کی ترقی اور فروغ کے لیے دیویکا رانی کی خدمات بھی فراموش نہیں کی جاسکیں گی۔ انہوں نے تعلیم یافتہ اور باصلاحیت افراد کو آگے آنے کے مواقع فراہم کیے۔

دیویکا رانی وقت سے بہت پہلے پیدا ہوگئی تھیں۔ لندن میں قیام اور تعلیم نے بھی انہیں ذہنی طور پر روشن خیال اور ترقی پسند بنا دیا تھا۔ وہ طبعاً رنگین مزاج تھیں۔ آزاد خیالی نے انہیں پرانی ہندوستانی روایات سے دور کردیا تھا۔ ہمنسورائے سے ان کی ملاقات لندن میں ہوئی تھی۔ دونوں کو اداکاری کا شوق تھا جس نے انہیں ایک رشتے میں باندھ دیا تھا۔ وہ ہمنسورائے کے ساتھ یورپ

www.pdfbooksfree.pk

کے مختلف ممالک میں اداکاری کا مظاہرہ بھی کرتی رہیں۔ ہندوستان واپس آکر ان دونوں نے بمبئی ٹاکیز کی بنیاد ڈالی اور اچھوتے موضوعات پر فلمیں بنائیں اور بنوائیں۔ ان کی آزاد خیالی کا اندازہ تو اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس زمانے میں انہوں نے فلم میں طویل بوسے کا ایک ریکارڈ قائم کیا۔ اس کے بعد ہندوستان میں سنسر نے اسکرین پر بوسہ بازی پر پابندی عائد کردی تھی۔

دیویکا رانی بمبئی ٹاکیز کے لیے تعلیم یافتہ اور خوبرو افراد کو تلاش کرکے اداکار بنایا کرتی تھیں۔ پنجاب سے جب نجم الحسن بمبئی گئے تو دیویکا رانی کی نگاہِ انتخاب نے انہیں بھی اداکار کی حیثیت سے منتخب کرلیا۔ نجم الحسن صاحب کو ہم نے اس وقت دیکھا جب وہ پچاس سے زائد عمر کے ہو چکے تھے۔ پاکستان کی چند فلموں میں بھی انہوں نے کام کیا اور ہمیں ان سے ملنے کے مواقع بھی ملے۔ وہ بہت باخبر اور تعلیم یافتہ آدمی تھے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ان کی شخصیت باوقار بارعب اور بہت موثر تھی۔

نجم الحسن بمبئی ٹاکیز سے وابستہ ہوئے تو دیویکا رانی ان کی محبت میں گرفتار ہوگئی۔ وہ اس وقت بھی ہمنوا رائے کی بیگم تھیں لیکن نجم الحسن کی محبت کے سحر میں گرفتار ہونے کے بعد وہ سب کچھ فراموش کرکے ان ہی کی ہوگئیں یہاں تک کہ نجم الحسن کی خاطر گھر بار اور شوہر کو چھوڑ کر ان کے ساتھ چلی گئیں۔ ہمنوا رائے نے دیویکا رانی کو واپس لانے کے لیے بہت کوشش کی کیونکہ وہ ان کے بغیر خود کو نامکمل خیال کرتے تھے مگر دیویکا رانی کے سر پر نجم الحسن کی محبت کا بھوت سوار تھا۔ کافی عرصے بعد انہیں سمجھا بجھا کر اپنے شوہر کے پاس واپس جانے پر رضامند کیا گیا اور وہ واپس اپنے گھر چلی گئیں۔

نجم الحسن صاحب لاہور کے شاہ نور اسٹوڈیوز میں ایک فلم کی شوٹنگ کررہے تھے جب ان سے ہمیں ملاقات کا موقع ملا۔ اس عمر میں بھی وہ ایک باوقار، بارعب اور دلکش شخصیت کے مالک تھے۔ دو تین ملاقاتوں کے بعد جب بے تکلفی ہوئی تو ہم نے جھجکتے ہوئے ان سے دیویکا رانی اور بمبئی ٹاکیز کے بارے میں معلوم کرنا چاہا۔ ان کی نگاہوں میں ایک لمحے کے لیے چمک پیدا ہوئی اور وہ مسکرا کر بولے۔ ''چھوڑیے، پرانی یادوں کو کیا کریدنا۔ ''رات گئی، بات گئی۔''

ان کے لب و لہجے سے کوئی اندازہ نہیں ہوسکا کہ محبت کی اس داستان سے وہ کتنے متاثر ہوئے تھے اور کیا وہ واقعی دیویکا رانی کے عشق میں گرفتار ہوگئے تھے یا محض وقتی جذبہ تھا۔ البتہ انہوں نے ایک منتظم اور اداکارہ کے طور پر دیویکا رانی کی خدمات کا اعتراف کیا اور بس ..... پھر خاموش ہوگئے۔

دیویکا رانی ہندوستانی فلمی صنعت میں دلیپ کمار کو دریافت کرنے کے حوالے سے بھی یاد رکھی جائیں گی، یہ برصغیر کی فلمی صنعت پر ان کا بہت بڑا احسان ہے۔

☆☆☆

پشاور سے تعلق رکھنے والی ایک اہم اور قابلِ ذکر شخصیت حبیب سرحدی بھی تھے، حبیب سرحدی فلم ساز، ہدایت کار، شاعر، اداکار، ادیب اور صحافی تھے۔ وہ جولائی 1910ء میں ایک مضافاتی قصبے میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا تعلق اورک زئی قبیلے سے تھا جو اپنی بہادری اور جنگجوئی کے حوالے سے بہت مشہور ہے۔

اسلامیہ کالج پشاور سے گریجویشن کرنے کے بعد انہوں نے داغ دہلوی کے ایک شاگرد قاضی محمد عمر کی شاگردی اختیار کی۔ وہ بہت جلد شاعر، ادیب اور افسانہ نگار کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے۔ انہوں نے عملی زندگی کا آغاز ایک کلرک کی حیثیت سے کیا تھا کہ ان کی ملاقات آغا حشر کے ایک شاگرد قمر سرحدی سے ہوئی جن کی وجہ سے ان کا رجحان تھیٹر اور ڈرامے کی طرف ہوا۔ چند ڈراموں میں اداکاری کرنے کے بعد انہوں نے اپنا تھیٹر کلب قائم کرلیا جس کا نام فرنٹیئر تھیٹر کمپنی تھا۔ اس زمانے میں ہندوستان بھر کی مشہور تھیٹریکل کمپنیاں پشاور آکر ڈرامے پیش کرتی تھیں۔ حبیب سرحدی تمام صوبے میں اپنی تھیٹر کمپنی کے ڈرامے پیش کرتے رہے اور کئی کامیاب ڈرامے پیش کیے جس کے مصنف شاعر اداکار اور ہدایت کار بھی وہ خود ہی تھے۔ ان کا ایک ڈراما پشاور میں کئی ماہ چلتا رہا۔

1942ء میں حبیب سرحدی نے بمبئی جاکر قسمت آزمائی کرنے کا فیصلہ کیا، بمبئی میں ان کی ملاقات فلمی ادارے واڈیا مودی ٹون کے مالک ہومی واڈیا سے ہوئی جو ان سے بہت متاثر ہوئے اور حبیب سرحدی کو اپنی فلم کمپنی میں ملازم رکھ لیا۔ وہاں انہوں نے ایک فلم میں ہومی واڈیا کے معاون کی حیثیت سے کام کیا۔ اس فلم کے موسیقار فیروز نظامی تھے۔ اس کے بعد انہوں نے ہومی واڈیا کے اسسٹنٹ کی حیثیت سے تین چار فلموں میں معاونت کی۔

اس کے بعد وہ فلم ساز اداکار اور ہدایت کار نذیر کی کمپنی میں شامل ہوگئے اور ان کے معاون کے طور پر کام کرتے رہے۔

1947ء میں انہوں نے اپنی ذاتی فلمی کمپنی حبیب پروڈکشنز کے نام سے بنائی جس میں گیتا نظامی، گلنار، مجید اور آزاد سایانی کام کررہے تھے لیکن تقسیم ملک کی وجہ سے یہ فلم 1948ء میں بمبئی میں ریلیز ہوئی تھی۔ 1949ء میں انہوں نے بمبئی میں ایک فلم ''دیرات'' بنائی جس کے اداکاروں میں شانتا، یعقوب اور حبیب نمایاں تھے۔ مسعود اس فلم کے ہیرو تھے۔ 1953ء میں انہوں نے فلم ''فریادی'' بنائی، 1956ء میں وہ اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان آگئے اور چند دن لاہور میں رہنے کے بعد پشاور چلے گئے اور اپنا فلم ساز ادارہ ''حبیب پروڈکشنز'' قائم کیا۔ وہ فلموں کے تقسیم کار بھی تھے۔ پشاور میں انہوں نے فلم تم نہ مانو، بنائی اس فلم کا ایک گانا ''ڈاچی والیا موڑ مہاروے'' بہت مقبول ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی صحافت بھی کرتے رہے۔ کراچی سے انہوں نے ایک فلمی ہفت روزہ ''گل رخ'' نکالا تھا جو کئی سال تک چلتا رہا۔ کراچی میں انہوں نے فلم ''ارادہ'' کا آغاز کیا تھا لیکن فلم کی تکمیل کے دوران میں ان کے بیٹے مظفر اورک زئی کا انتقال ہوگیا، مظفر اورک زئی ان کی فلموں کے گیت لکھتے رہے تھے اور اپنے والد کے بہت نزدیک تھے۔ بیٹے کے انتقال کے بعد حبیب سرحدی اتنے دل شکستہ ہوئے کہ فلمی دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ ان ہی دنوں ان کے دوسرے بیٹے جہانگیر اورک زئی بھی وفات پاگئے جس کے بعد وہ دنیا سے بیزار ہوگئے۔ ان کی صحت نے بھی جواب دے دیا۔ طویل بیماری کے بعد 1990ء میں وہ انتقال کرگئے۔

☆☆☆

پشاور کی سرزمین میں جنم لینے والوں میں نامور موسیقار ظفر خورشید اور اداکار بیگ سرحدی بھی شامل ہیں۔ بیگ سرحدی رام نگر چوک ناصر خان میں پیدا ہوئے تھے۔ خوبرو اور صحت مند جوان تھے۔ انہیں باڈی بلڈنگ کا بھی شوق تھا۔ پشاور میں ریڈیو اسٹیشن قائم ہوا تو بیگ سرحدی نے بھی اپنی آواز کا ٹیسٹ دیا مگر ناکام رہے۔ ایک روز گھر سے ناراض ہوکر بمبئی روانہ ہوگئے۔ وہاں انہیں فلم ''ایک دن کا سلطان'' میں مختصر کردار مل گیا۔ وہیں ان کی ملاقات ہدایت کار اے ایم خان سے ہوئی۔ وہ جادوئی اور ایکشن فلمیں

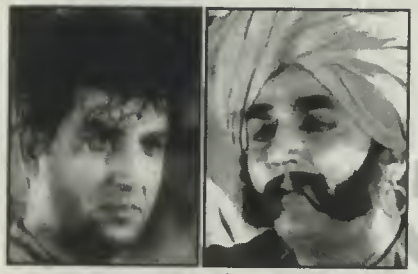

اداکار سدھیر

بنایا کرتے تھے۔ بیگ صاحب کے کسرتی جسم کو دیکھ کر انہوں نے ان کو اپنی زیرِ تکمیل فلم ''ہوائی کھٹولا'' میں ایک اہم کردار سونپ دیا، یہ فلم کامیاب ہوئی جس کے بعد بیگ سرحدی نے ہدایت کار اے ایم خان کی چند اور اسٹنٹ فلموں میں کام کیا۔ محبوب خان کی فلم ''انمول گھڑی'' اور سید شوکت حسین رضوی کی مسلم سوشل فلم ''زینت'' میں بھی انہوں نے بہت اچھے کردار کیے۔ بمبئی میں انہوں نے حبیب سرحدی کی فلموں میں بھی کام کیا۔ بیجو باورا، ساقی، آوارہ، داستان اور جادو میں بھی انہیں کام کرنے کا موقع ملا لیکن مرکزی کردار ادا کرنے کا کبھی موقع نہیں ملا۔ فلم ''شبستان'' کی شوٹنگ کے دوران میں فلم کے ہیرو گھوڑے سے گر کر وفات پاگئے تو باقی فلم میں شیام کا کام بیگ سرحدی نے ہی سرانجام دیا تھا کیونکہ قد و قامت اور جثے کے اعتبار سے وہ شیام سے بہت مشابہت رکھتے تھے۔ فلستان نے شیام کے بقایا مناظر فلمانے کے لیے بیگ سرحدی کو ڈپلی کیٹ کے طور پر استعمال کیا اور فلم دیکھنے والوں کو پتا ہی نہیں چلا کہ شیام کی جگہ کوئی اور اداکاری کررہا ہے۔ اتفاق یہ ہوا کہ فلم کے آخری مناظر فلماتے ہوئے یہ بھی گھوڑے سے گر کر زخمی ہوگئے اور کافی عرصے تک زیرِ علاج رہے۔

صحت مند ہونے کے بعد انہوں نے واپس پشاور آنے کا فیصلہ کرلیا۔ انہوں نے بمبئی میں شادی بھی کرلی تھی۔ جب وہ پشاور آنے لگے تو ان کی بیوی نے ان کے ساتھ پشاور آنے سے انکار کردیا۔ اس شادی سے ان کا ایک بیٹا بھی تھا۔ جب بیوی نے کسی قیمت پر بھی پشاور آنے سے انکار کردیا تو وہ مجبوراً اپنی بیوی اور بیٹے کو بمبئی میں چھوڑ کر اکیلے ہی واپس وطن آگئے۔ پشاور واپس آکر انہوں نے اپنا کاروبار شروع کردیا اور دوسری شادی کرلی مگر ان کی دوسری بیوی ایک بیٹے کو جنم دے کر وفات پاگئی۔ اس کے بعد

www.pdfbooksfree.pk

انہوں نے تیسری شادی کرلی۔ اس بیوی سے ان کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں۔

1957ء میں حبیب سرحدی نے پاکستان آکر کراچی میں ایک فلم ''تم نہ مانو'' کا آغاز کیا تو فلم میں ایک کردار کے لیے بیگ صاحب کو بھی کراچی بلایا۔ ''تم نہ مانو'' میں بہار اور حبیب نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ صابرہ سلطانہ اور نذر بھی اس فلم کے اداکاروں میں شامل تھے۔ فتح علی خان اس فلم کے موسیقار تھے۔ یہ فلم ان کی آخری فلم ثابت ہوئی۔ 1950ء میں پشاور میں انہوں نے وفات پائی۔ بیگ صاحب کا پورا نام فرزند پشاور بیگ سرحدی تھا۔

☆☆☆

پشاور میں پیدا ہونے والے موسیقار ظفر خورشید نے بھی موسیقی کے میدان میں کافی نام پیدا کیا۔ موسیقی سے محبت انہیں ورثے میں ملی تھی۔ ان کے والد پشتو کے ایک لوک گلوکار تھے۔ ظفر خورشید کی موسیقی سے دلچسپی دیکھ کر ان کے والد نے انہیں موسیقی کی تربیت دی۔ ان کے والد صحبت خان گانوں کی ریکارڈنگ کے لیے اکثر دوسرے شہروں میں جاتے رہتے تھے۔ ظفر خورشید بھی اپنے والد کے ساتھ جایا کرتے تھے اور اس طرح ان کی موسیقاروں اور گلوکاروں سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ انہوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر مختلف موسیقاروں سے استفادہ کیا۔ ظفر خورشید موسیقی کی دنیا میں نام پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے انہیں سب سے موزوں شہر بمبئی تھا۔ ظفر خورشید نے بھی بمبئی جا کر قسمت آزمائی کرنے کا فیصلہ کیا۔ بمبئی میں انہیں فلمی ادارے سن رائز پکچرز میں کام کرنے کا موقع مل گیا۔ اس زمانے میں سید شوکت حسین رضوی بمبئی میں فلم ''نوکر'' بنا رہے تھے۔ اس فلم کے موسیقار رفیق غزنوی تھے۔ ظفر خورشید نے معاون کے طور پر فلم ''نوکر'' میں رفیق غزنوی کے اسسٹنٹ کے طور پر کام کیا۔ ظفر خورشید نے اس فلم کے لیے دو گانے بھی ریکارڈ کرائے جو نور جہاں اور راج کماری کی آوازوں میں صدا بند کیے گئے تھے۔ ''نوکر'' کے بعد انہوں نے ماں باپ، گھر اور جیون چھایا میں موسیقار اے آر قریشی کے معاون کی حیثیت سے کام کیا۔ کچھ عرصے بعد وہ فلم ساز ادارے فضلی برادران سے منسلک ہوگئے۔ فضلی صاحب نے انہیں اپنی فلم ''دل'' کی موسیقی بنانے کی ذمے داری سونپ دی تو یہ ان کے لیے ایک اہم موقع تھا۔ اس فلم کے ہدایت کار حسنین فضلی تھے۔ اس فلم کی ہیروئن نور جہاں تھیں۔ فلم ''دل'' کے گیت کافی مشہور ہوئے تھے جو نور جہاں کی آواز میں تھے۔ خصوصاً یہ گیت۔

1۔ دے کے مجھے وہ دردِ جگر
بھول گئے کیا بھول گئے
2۔ ندیا کا بہتا پانی
آئی گھڑی سہانی

1947ء میں انہیں فضلی برادرز کی فلم ''راستہ'' کی موسیقی بنانے کا موقع ملا۔ اس فلم کے گانے پسند کیے گئے۔ ایک گانا بہت مقبول ہوا تھا۔

لکھی نصیب میں ہیں ٹھوکریں زمانے کی
تقسیم کے بعد بھی وہ بمبئی میں موسیقار کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔

1955ء میں خورشید ظفر پاکستان واپس آگئے اور انہیں کراچی میں فلم ''ستاروں کی دنیا'' کی موسیقی بنانے کا موقع ملا، ایک اور فلم ''عشقِ حبیب'' کی موسیقی بھی انہوں نے بنائی تھی۔ اس فلم میں ان کی بنائی ہوئی ایک قوالی بہت پسند کی گئی۔

میرا کوئی نہیں ہے تیرے سوا
میں بن کے سوالی آیا ہوں

''عشقِ حبیب'' ان کی آخری فلم تھی، ان کا انتقال کراچی میں ہوا۔

☆☆☆

آغا جی اے گل کا تعلق بھی پشاور سے ہی تھا۔ پاکستان میں فلمی صنعت کے عروج اور اس کو تعلیم یافتہ، ذہین اور ممتاز فن کار، ہنر مند، فلم ساز ہدایت کار مصنف نغمہ نویس فراہم کرنے کے لیے آغا گل کی خدمات کبھی فراموش نہیں کی جاسکیں گی۔ انہوں نے پاکستان کی فلمی صنعت کو وہ تخلیقی ذہن فراہم کرنے میں مدد کی جو اُن کی مدد کے بغیر فلم سازی اور ہدایت کاری کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔ انہوں نے ایشیا کا خوبصورت ترین اور جدید ترین ایور نیو اسٹوڈیو تعمیر کیا جو پاکستان کے فلمی حلقوں کے لیے ایک اکیڈمی اور فلم کلب کی حیثیت رکھتا تھا۔ انہیں صحیح معنوں میں پاکستان کی فلمی صنعت کے معماروں کی صفِ اول میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر ان کی کاوشیں شامل نہ ہوتیں تو پاکستان کی فلمی صنعت اس عروج سے ہم کنار نہ ہوتی جس کے باعث وہ انڈیا کے مقابلے میں معیاری اور خوبصورت فلمیں بنانے کے قابل ہوئی تھی۔ اگرچہ ایک زمانے میں وہ

دوسرے فلم تقسیم کاروں کی طرح پاکستان میں ہندوستانی فلموں کی درآمد پر پابندی عائد کرنے کے سخت مخالف تھے لیکن جب یہ پابندی عائد ہوگئی تو انہوں نے اپنی تمام توجہ اور وسائل پاکستان میں فلمی صنعت کی ترقی کے لیے وقف کردیے تھے۔

وہ آغا گل کے نام سے مشہور تھے۔ ان کا پورا نام آغا احمد گل تھا۔ وہ فروری 1913ء کو پشاور میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد لیفٹیننٹ کرنل غلام محی الدین افغانستان کے شاہ امان اللہ کے ذاتی معالج تھے۔ افغانستان میں امان اللہ کی حکمرانی ختم ہونے کے بعد وہ پشاور آگئے جہاں انہوں نے ادویات کا کاروبار بڑے پیمانے پر شروع کیا اور بیرونِ ملک بھی ادویات برآمد کرنے لگے۔ ان کے دو اور بیٹے حکیم جان اور عبدالرحیم جان بھی تھے۔

آغا احمد گل نے پشاور میں تعلیم حاصل کی۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد ان کا رجحان انہیں فلموں کی طرف لے گیا۔ ابتدائی عمر ہی سے وہ گھر والوں سے چوری چوری فلمیں دیکھنے جاتے تھے اور راز کھل جانے پر سزا بھی پاتے تھے مگر فلموں کا بھوت ان کے سر سے نہ اتر سکا۔ جبکہ ان کے دوسرے بھائی تعلیم میں دلچسپی رکھتے تھے اور بڑے عہدوں پر فائز ہوئے۔

گھر والوں کے تعلیم پر زور دینے پر وہ ایک روز پشاور سے دہلی روانہ ہوگئے۔ روانگی سے قبل وہ اپنے والد کی دکان سے کچھ رقم نکالنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ دہلی جا کر انہوں نے فلموں کی تقسیم کاری کے لیے اپنی تمام پونجی لگا کر تین فلمیں خریدیں، والد کے خوف سے راولپنڈی کی بجائے انہوں نے مری میں ان فلموں کی نمائش کی، بدقسمتی سے یہ تینوں فلمیں فلاپ ہوگئیں۔ (ایک انتہائی کامیاب تقسیم کار اور فلم ساز بن جانے کے بعد بھی آغا صاحب کو جو فلم پسند آتی تھی وہ عموماً فیل اور جو ناپسند ہوتی تھی وہ کامیاب ہوجاتی تھی لیکن قسمت کے دھنی تھے۔ جس کام میں بھی ہاتھ ڈالتے تھے دولت ان کے قدم چومتی تھی)

آغا صاحب ان فلموں کی ناکامی کے بعد شدید مالی مشکلات میں گرفتار ہوگئے یہاں تک کہ فاقوں کی نوبت آگئی مگر انہوں نے ہمت نہ ہاری، بغیر ٹکٹ سفر کرکے دوبارہ دہلی گئے اور تقسیم کار لالہ جگت نرائن کے دفتر جا کر ان سے اپنی رقم واپس لینے کا مطالبہ کردیا۔ لالہ جگت نرائن بہت بڑے فلم ڈسٹری بیوٹر تھے جو شمالی ہند کے وسیع علاقے کو فلمیں فراہم

فلم قسمت کے پوسٹر کا عکس، حبیب سرحدی کی فلم پکار کا پوسٹر

کرتے تھے۔

لالہ جگت نرائن نے ان کا یہ مطالبہ تسلیم نہ کیا کیونکہ یہ دستور کے خلاف تھا۔ آغا صاحب لالہ جی کے گھر پہنچ گئے۔ لالہ جگت نرائن کا تعلق بھی صوبہ سرحد سے تھا ان کے گھر پر آغا صاحب کی ملاقات جگت نرائن کی والدہ سے ہوئی اور انہوں نے تمام داستان انہیں سنائی۔ لالہ جی کی والدہ سے انہوں نے فارسی اور پشتو میں بات چیت کی۔ وہ بھی دونوں زبانیں جانتی تھیں۔ لالہ جگت نرائن کی والدہ ان سے بہت متاثر ہوئیں۔ انہیں گھر میں لے جا کر کھانا کھلایا اور بہت محبت سے گفتگو کی، لالہ جی کی والدہ ان سے اتنی متاثر ہوئیں کہ انہیں اپنا بیٹا بنالیا۔

لالہ جگت نرائن گھر واپس آئے تو وہاں آغا گل کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ان کی والدہ نے کہا کہ آج سے یہ بھی میرا بیٹا اور تمہارا بھائی ہے۔ اس سے بھائیوں جیسا سلوک کرنا اور کبھی شکایت کا موقع نہ دینا۔ لالہ جگت نرائن نے منہ بولے بھائی کو گلے لگالیا اور تمام زندگی ان سے بھائیوں جیسا ہی سلوک کیا۔ انہوں نے تمام شمالی علاقے کی ڈسٹری بیوشن کے حقوق آغا گل کو دے دیے۔ آغا گل نے پشاور میں اپنا تقسیم کار ادارہ قائم کیا اور فلموں کے کاروبار سے بہت فائدہ اٹھایا۔ لالہ جگت نرائن بہت بڑے فلم ساز تھے اور بمبئی کی بہترین اور کامیاب فلمیں خرید کر لاتے تھے۔ ان فلموں کو وہ شمالی ہند سرکٹ کے لیے آغا صاحب کو دے دیا کرتے تھے۔

اس طرح آغا گل بہت جلد خوشحال اور کامیاب تقسیم کار بن گئے۔ انہوں نے پشاور میں ایک سنیما بھی لے لیا۔ پشاور میں کاروبار چل پڑا تو انہوں نے لاہور کا رخ کیا جو فلمی مرکز تھا۔ لاہور میں دفتر قائم کرکے انہوں نے تقسیم کاری کا کام شروع کردیا۔ 1946ء میں انہوں نے پشاور میں ایک اور سنیما بنایا اور ڈیرہ دون میں بھی ایک سنیما خرید لیا۔

www.pdfbooksfree.pk

ان دنوں فلم ''شاہجہاں'' کی بڑی دھوم تھی جو کسی اور سنیما والے نے خریدی تھی۔ آغا گل نے لالہ جگت نرائن سے دہلی جا کر مطالبہ کیا کہ ''شاہجہاں'' ان کے سنیما میں چلنی چاہیے۔ سیٹھ نے کہا کہ وہ فلم تو میں کسی اور کو دے چکا ہوں مگر آغا صاحب اصرار کرتے رہے۔ لالہ کی والدہ نے اپنے بیٹے سے کہا کہ جو کچھ بھی ہو یہ فلم گل ہی چلائے گا۔ سیٹھ جگت نرائن نے مجبور ہو کر فلم کی نمائش کے حقوق آغا گل کو دے دیے۔ ایسا واقعہ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا اس لیے وہ بہت پریشان ہوئے۔ انہیں فکر اس بات کی تھی کہ آیندہ بھی لالہ جگت نرائن کی کامیاب فلمیں آغا گل ہی کو دی جائیں گی۔

ڈیرہ دون کے سنیما والوں نے مل کر آغا صاحب کا سنیما خریدنے کا فیصلہ کیا اور منہ مانگی قیمت پر سنیما خرید لیا۔ آغا صاحب نے تمام رقم یکمشت وصول کر لی اور پشاور آ گئے۔ اس وقت ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات شروع ہو چکے تھے۔ قسمت مہربان تھی جو آغا صاحب اپنا سنیما فروخت کر کے اور تمام رقم وصول کر کے پشاور لے آئے ورنہ تقسیم کے بعد تو وہ سنیما ہی سے محروم ہو جاتے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ قسمت آغا صاحب پر کتنی مہربان تھی۔ وہ خود بھی تقدیر کے بہت قائل تھے اور کہا کرتے تھے کہ وہی ہوتا ہے جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے۔ انسان کی کوئی تدبیر تقدیر کے لکھے کو مٹا نہیں سکتی۔

آغا گل نے لاہور میں مستقل کاروبار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ قیامِ پاکستان کے وقت وہ پاکستان میں ہندوستانی فلموں کے بہت بڑے ڈسٹری بیوٹر تھے۔ اس زمانے میں ہندوستانی فلموں کے حقوق پاکستان کے لیے پچاس ساٹھ ہزار روپے میں مل جاتے تھے۔

اور یہ فلمیں لاکھوں روپے کا بزنس کرتی تھیں۔ لالہ جگت نرائن سے بھائی بندی کے باعث آغا صاحب بہترین ہندوستانی فلمیں معقول قیمت پر خرید کر لے آتے تھے۔ اس طرح بہت جلد وہ ایک ممتاز تقسیم کار بن گئے۔

آغا گل نے لاہور میں مسلم ٹاؤن کا پنچولی اسٹوڈیو کرائے پر لے کر ایور نیو اسٹوڈیو کے نام سے وہاں فلموں کی شوٹنگ کا آغاز کر دیا۔ وہ پہلے تقسیم کار تھے جنہوں نے فلم سازی شروع کی اور ''سندری'' کے نام سے ایک پنجابی فلم بنائی تھی جس کے اداکاروں میں راگنی، الیاس کاشمیری چارلی، غلام محمد شامل تھے۔ آغا صاحب نے بمبئی کی اس زمانے کی سب سے مقبول فلمی ڈانسر ککو کا ایک ڈانس بھی بمبئی سے منگوا کر اس فلم میں شامل کیا تھا۔

آغا گل نے اس دور کے کامیاب ہدایت کار انور کمال پاشا کو بھی سرمایہ فراہم کیا۔ انور کمال پاشا نے آغا صاحب کے لیے کمال کچرز کے بینر تلے ''گمنام'' اور قاتل، بھی بنائی تھیں جو بے حد کامیاب ہوئی تھیں۔ خاص طور پر ان کی موسیقی کی ہندوستان میں بھی دھوم تھی۔ گمنام میں سدھیر اور صبیحہ خانم مرکزی کردار تھے۔ راگنی، ایم اسماعیل اور ایک نیا چہرہ سیما بھی اس فلم کی کاسٹ میں شامل تھے۔ موسیقی ماسٹر عنایت حسین نے بنائی تھی۔ ''گمنام'' کی موسیقی یادگار رہے گی۔ فلم ''قاتل'' میں صبیحہ اور سنتوش کی جوڑی تھی۔ مسرت نذر نئی نئی فلموں میں آئی تھیں۔ ''قاتل'' میں انہوں نے معاون اداکارہ کا کردار کیا تھا۔ یہ مسرت نذر کی پہلی اردو فلم تھی۔ ان کی زندگی کی پہلی فلم پنجابی زبان میں تھی۔ اس کا نام ''پتن'' تھا۔ سنتوش کمار اس فلم کے ہیرو تھے۔ ہدایت کار لقمان اور موسیقار جی اے چشتی تھے۔

''قاتل'' کے موسیقار ماسٹر عنایت حسین تھے، ''گمنام'' اور ''قاتل'' دونوں فلموں کے گیت بے حد مقبول ہوئے تھے جو اقبال بانو کی آواز میں صدا بند کیے گئے تھے۔

''گمنام'' کا گیت

''تو لاکھ چلی رے گوری تھم تھم کے
پائل میں گیت ہیں چھم چھم کے

اور فلم ''قاتل'' کا یہ نغمہ

الفت کی نئی منزل کو چلا
تو باہیں ڈال کے باہوں میں
دل توڑنے والے، دیکھ کے چل
ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں

لافانی بن چکے ہیں۔۔۔ گمنام، کے نغمہ نگار سیف الدین سیف اور ''قاتل'' کے نغمہ نویس قتیل شفائی تھے۔

آغا گل کی ''تقدیر'' حسب معمول ان پر مہربان تھی اور کامیابیاں ان پر نچھاور کر رہی تھی۔ اس دوران میں شاہ نور اسٹوڈیو کے ساتھ ہی آغا گل نے جدید ترین فلم اسٹوڈیو نیو ایور نیو اسٹوڈیو کی تعمیر بھی شروع کرا دی تھی۔ پنچولی اسٹوڈیو کا معاہدہ ختم ہونے کے بعد اس اسٹوڈیو کا نام ''ایور نیو اسٹوڈیو'' ہو گیا تھا۔ اس اسٹوڈیو کو ایشیا کا خوبصورت ترین اسٹوڈیو کہا جاتا تھا۔ خوبصورت باغ، فوارے، پھولوں کے تختے اور بہترین جدید فلیٹس جیسے فلمی دفاتر اس اسٹوڈیو کی منفرد پہچان تھے۔ آغا صاحب نے

اسٹوڈیو کی سجاوٹ اور صفائی کا بہترین بندوبست کیا تھا اور ذاتی طور پر بھی دیکھ بھال کرتے رہتے تھے جس کی وجہ سے یہ ایک قابلِ فخر اسٹوڈیو بن گیا تھا۔ بہترین فلم سازوں کی پہلی ترجیح یہی اسٹوڈیو ہوتا تھا۔ دوسرے ملکوں کے سربراہ پاکستان کا دورہ کرتے تھے تو انہیں ایور نیو اسٹوڈیوز میں ڈنر یا ظہرانہ ضرور دیا جاتا تھا۔ اسٹوڈیو کی سیر کرائی جاتی تھی اور فلموں کے مناظر بھی دکھائے جاتے تھے۔

آغا صاحب کی فلم سازی کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ انہوں نے پنجابی فلم ''دلا بھٹی'' بنائی جس کے ہدایت کار ایم ایس ڈار اور موسیقار جی اے چشتی تھے۔ یہ فلم بے حد کامیاب ہوئی۔ سدھیر، صبیحہ خانم، ایم اسماعیل، آشا پوسلے اور نذر اس فلم کے نمایاں اداکار تھے۔ فلم ''دلا بھٹی'' کے گانے بھی بہت مقبول ہوئے تھے۔ خصوصاً اس گیت نے تو مقبولیت کے ریکارڈ توڑ دیے تھے۔

سوں تینوں رب دی تو جاویں کبوترا

یہ گیت زبیدہ خانم کی آواز میں ریکارڈ کیا گیا تھا اور صبیحہ خانم پر فلمایا گیا تھا۔ فلم ساز کی حیثیت سے آغا گل نے اور بھی کامیاب اور مشہور فلمیں بنائیں جن میں ڈاچی، باغی سردار، پائل کی جھنکار، قیدی، اک تیرا سہارا، جانِ آرزو، نجمہ شامل ہیں۔ مغربی پاکستان کی پہلی رنگین فلم ''نائیلہ'' کے فلم ساز بھی آغا گل ہی تھے۔ ان کی بیشتر فلمیں بے حد کامیاب ہوئیں۔

آغا جی اے گل ایک کامیاب شفیق اور دور اندیش انسان تھے۔ انہوں نے نہ صرف کئی افراد کو سہولتیں اور سرمایہ فراہم کر کے فلم ساز بنا دیا بلکہ اپنے عملے کے ذہین ارکان کو بھی فلم ساز بننے کے مواقع فراہم کیے۔ وہ ان لوگوں کی کامیابیوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔ وہ خدا ترس اور پنج وقتہ نمازی تھے۔ ہر وقت باوضو رہتے تھے۔ انہوں نے کبھی اپنے کسی ملازم کو نوکری سے نہیں نکالا۔ ان کے خلاف شکایات اور ٹھوس ثبوتوں کے باوجود وہ ان پر وقتی طور پر ناراض تو ہوتے تھے مگر نوکری سے نہیں نکالتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ کسی کو بے روزگار کرنا گناہ ہے، نہ جانے میں کس کی قسمت کا کھا رہا ہوں۔ بڑے سے بڑے نقصان پر بھی وہ ناراض ہو کر متعلقہ عملے کے رکن کو برطرف کر دیا کرتے تھے مگر چند روز بعد دوبارہ رکھ لیتے تھے۔ ہر انسان میں کچھ خامیاں بھی ہوتی ہیں لیکن جس میں خامیاں کم ہوں اور خوبیاں زیادہ اس کو قابلِ تعریف انسان کہا جاتا ہے۔ آغا

اداکارہ نیلینی جیونت

گل آخر الذکر انسانوں کی قسم سے تعلق رکھتے تھے، اپنے عملے کا وہ بہت خیال رکھتے تھے، بیماری میں ان کا علاج کراتے اور جن دنوں یہ ذات خود بیمار ہو کر لندن گئے اس زمانے میں بھی ان کی خبر رکھا کرتے تھے۔ ان کی مالی امداد بھی کیا کرتے تھے مگر کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی تھی۔ ان کی وفات کے بعد معلوم ہوا کہ انہوں نے بے شمار گھرانوں کے مستقل وظیفے مقرر کر رکھے تھے اور مستحق طلبا کو بھی وظیفے دیتے تھے۔

آغا جی اے گل نے دو شادیاں کی تھیں۔ ایک بیگم کا تعلق پشاور سے تھا۔ دوسری بیگم ان کی پسند کی تھیں اور افغانستان کے سابق شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ پہلی بیوی پشاور میں رہتی تھیں اور دوسری لاہور میں۔ آغا صاحب دونوں بیویوں کے بچوں سے یکساں محبت کرتے تھے۔ پہلی بیوی کے تمام بچوں کو انہوں نے امریکا سے اعلیٰ تعلیم دلائی اور ہر طرح ان کی نگہداشت کی۔ دوسری بیگم کے بیٹے کاروبار سنبھالنے کے بعد تعلیم ترک کرنے پر مجبور ہو گئے مگر زندگی میں کامیاب ہیں۔ آغا صاحب نے اپنی زندگی ہی میں دونوں بیویوں اور ان کے بچوں کے حصے اور اثاثے انہیں سونپ دیے تھے جس کی وجہ سے ان کی وفات کے بعد لین دین کا کوئی جھگڑا نہیں ہوا اور سوتیلے بہن بھائی سگے بہن بھائیوں کی طرح بعد میں بھی زندگی بسر کرتے

www.pdfbooksfree.pk

رہے۔

آغا گل کے بارے میں پہلے بھی تفصیل سے بتایا جاچکا ہے لیکن بہت سی تفصیلات بیان کرنے سے رہ گئی تھیں جو کہ اب بیان کردی گئی ہیں۔

آغا صاحب نے ہمیشہ شاندار زندگی بسر کی۔ وہ ہر چیز بہترین چاہتے تھے۔ ان کا گھر، کوٹھی، فرنیچر، دفتر، اسٹوڈیو سب اعلیٰ درجے کے تھے۔ وہ خود بھی بہت خوش لباس انسان تھے، عموماً باہر سے لائے ہوئے ملبوسات پہنتے تھے۔ وہ اسٹائل سے رہنے کے عادی تھے۔ اللہ تعالیٰ کا ہمیشہ شکر ادا کیا کرتے تھے اور صحیح معنوں میں اللہ سے ڈرتے بھی تھے، اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ اپنی کامیابیوں کو وہ اللہ کی مہربانی کہا کرتے تھے۔ کبھی ان کی زبان سے یہ نہیں سنا کہ میں نے یہ سب کچھ کیا ہے۔ کہا کرتے تھے کہ یہ سب اللہ کی دین ہے۔ آغا صاحب کا لندن کے ایک شاندار علاقے میں بھی گھر تھا جہاں وہ چھٹیاں گزارنے جایا کرتے تھے۔ بیمار ہوئے تو علاج کے لیے لندن جاکر اسی فلیٹ میں ٹھہرے تھے جہاں ہماری ان سے اکثر ملاقات ہوتی رہی تھی۔ آخری بار اس وقت ملاقات ہوئی تھی جب ہم کینیڈا سے واپس پاکستان آتے ہوئے لندن میں ٹھہرے تھے، آغا صاحب بہت کمزور ہوگئے تھے۔ لیکن ہمیشہ کی طرح خوش لباس تھے۔ ان کی بیگم نے بتایا کہ کبھی کبھی سوٹ پہن کر اور ٹائی لگا کر کلب بھی چلے جاتے تھے۔ ہم رخصت ہونے لگے تو آغا صاحب گلے لگا کر ملے اور ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ لاہور اور لاہور والوں کو بہت یاد کرتے تھے۔ یہ ان سے ہماری آخری ملاقات تھی۔ 6 ستمبر 1983ء کو لندن میں ان کا انتقال ہوگیا۔ لاہور میں سپردِ خاک کیے گئے۔ پشاور کی سرزمین کے اس فرزند کو مٹی لاہور کی ملی جہاں انہوں نے زندگی کا بڑا حصہ گزارہ تھا۔ اپنی گوناگوں خوبیوں اور پاکستان کی فلمی صنعت کے لیے خدمات کے حوالے سے آغا صاحب ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

☆☆☆

پشاور کے فن کاروں میں دیگر پاکستانی فن کاروں کا بھی قابلِ قدر حصہ رہا ہے۔ پاکستان کے ایکشن ہیرو شاہ زمان عرف سدھیر کا تعلق بھی اسی تاریخی شہر سے تھا۔ پاکستان کی فلمی صنعت کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے میں انہوں نے نمایاں حصہ لیا ہے۔ سدھیر کے بارے میں پہلے بھی بہت تفصیل سے بیان کیا جاچکا ہے لیکن اس بار ان کے بارے میں کچھ اور معلومات بھی فراہم کی جارہی ہیں جو شاید آپ کے لیے دلچسپی کا سبب ہوں۔

سدھیر کا اصلی نام شاہ زمان خان تھا۔ جب انہوں نے فلموں میں اداکاری شروع کی تو خاندان کی ناراضی کے پیشِ نظر اپنا فلمی نام سدھیر رکھ لیا اور پھر ساری زندگی اسی نام کے ساتھ زندہ رہے یہاں تک کہ لوگ ان کا اصلی نام بھول گئے۔

سدھیر پاکستان میں اداکاروں کی پہلی کھیپ یا پہلی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ اور سنتوش کمار پاکستان کے دو ممتاز اور نامور ہیرو تھے۔ سنتوش کمار اردو فلموں کے اکلوتے ہیرو کہلاتے تھے۔ سدھیر نے بھی بہت سی اردو فلموں میں کام کیا، شہرت اور مقبولیت حاصل کی لیکن انہوں نے زیادہ کام پنجابی فلموں میں کیا اس لیے انہیں پنجابی فلموں کا سپر ہیرو کہا جاتا ہے۔ اس زمانے میں پنجابی فلمیں بھی بہت اعلیٰ معیار کی بنائی جاتی تھیں جو بہت کامیاب بھی ہوتی تھیں۔ پنجابی اور اردو فلموں کے اداکار مخصوص تھے۔ اگرچہ پنجابی فلموں کے اداکار اردو فلموں میں اور اردو فلموں کے اداکار پنجابی فلموں میں بھی کام کرتے تھے لیکن ان پر ٹھپّا پنجابی اور اردو فن کاروں کا ہی لگا ہوا تھا۔ اس لیے سدھیر پنجابی فلموں کے مقبول ترین ہیرو اور سنتوش کمار اردو فلموں کے ممتاز ترین ہیرو تھے۔

شاہ زمان جو بعد میں فلم ساز اور ہدایت کار بھی بن گئے تھے ستمبر 1921ء کو پشاور کے نواحی گاؤں حسن گڑھی میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا تعلق مشہور پٹھان قبیلے مہمند سے تھا۔ ان کا پورا نام شاہ زمان خان تھا۔ شاہ زمان خان کے والد کا نام سردار محمد اسلم خان تھا۔ انہیں بہادر مہمند قبیلے سے تعلق رکھنے پر بہت فخر تھا۔ شاہ زمان کے دادا افغانستان سے پاکستان آکر پشاور میں آباد ہوگئے تھے۔ شاہ زمان کے دادا کا نام میر عالم خان تھا۔ سردار اسلم خان کچھ عرصے بعد لاہور چلے گئے تھے اور انہوں نے وہیں شادی کرلی تھی لیکن خاندان والوں سے ان کا رابطہ ہمیشہ قائم رہا۔

شاہ زمان پشاور کے قریبی علاقے میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا بچپن اور لڑکپن پشاور ہی میں گزرا تھا۔ تعلیم انہوں نے لاہور میں مکمل کی تھی۔ اس زمانے میں انگریزی حکومت کے خلاف تحریک چل رہی تھی۔ اسلم خان بھی اس تحریک میں شامل تھے اور باغیانہ جذبات کے حامل تھے۔

آغا جی اے گل

مشہور تھیں۔ راگنی کے ساتھ پہلی ہی فلم میں کام کرنے کا موقع ملنا بھی ایک اہم بات تھی۔ اس فلم کے موسیقار ساگر تھے۔

''فرض'' میں کام کرنے کی ہامی تو شاہ زمان خان نے بھرلی تھی لیکن وہ ایک سیدھے سادے پٹھان تھے۔ جب ان کی شوٹنگ شروع ہوئی تو کافی مشکلات پیش آئیں۔ وہ فلمی طریقوں سے واقف نہیں تھے اور انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ فلم میں جو کچھ دکھایا جاتا ہے وہ محض دکھاوا ہوتا ہے۔ دراصل وہ اس طرح فلمایا جاتا ہے کہ حقیقت معلوم ہو۔ مثال کے طور پر اگر فلم میں طمانچہ یا گھونسا مارنا ہو تو سچ مچ تھپڑ یا گھونسا نہیں مارا جاتا مگر وہ ابتدائی دنوں میں ایسی غلطیاں کر بیٹھتے تھے جس پر ہدایت کار نذیر بیدی انہیں فلمی طور طریقے اور رموز سمجھاتے تھے۔ ایک منظر میں انہیں راگنی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنا تھا۔ سدھیر نے پوری طاقت سے راگنی کی کلائی تھام کر اپنی جانب کھینچا تو راگنی تکلیف برداشت نہ کرسکیں اور کئی روز تک ان کی کلائی میں درد رہا۔ ایک منظر میں انہوں نے ایک اداکار کو سچ مچ کا بھرپور طمانچہ مار دیا جس کی وجہ سے اس کا رخسار دو تین دن تک سوجا رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ فلم سازی کے رموز سیکھتے رہے۔ ابتدائی دنوں میں کئی بار شوٹنگ ملتوی کرنی پڑی۔ ایک بار تنگ آکر سدھیر نے اداکاری ترک کرنے کا ارادہ کیا اور فلم ساز سے وصول کی ہوئی رقم واپس لوٹانے کا فیصلہ

اسی زمانے میں ان کی دوستی حسین خان سے ہوگئی۔ حسین خان دراصل پولیس کے لیے مخبری کرتا تھا جس کا اسلم خان کو علم نہ تھا۔ حسین خان کی مخبری پر پولیس نے اسلم خان کے گھر پر چھاپا مار کر کافی اسلحہ برآمد کرلیا۔ سردار اسلم خان کو جب معلوم ہوا کہ حسین خان نے دوستی کے پردے میں ان کے ساتھ دشمنی کی ہے تو وہ غصے سے پاگل ہوگئے اور طیش کے عالم میں انہوں نے حسین خان پر گولیوں کی بوچھاڑ کر کے اسے ہلاک کردیا۔ ان پر قتل کا مقدمہ چلا اور سزائے موت سنادی گئی۔ اسلم خان نے عدالت عظمیٰ اور اس کے بعد لندن کی پریوی کونسل سے رحم کی درخواست کی مگر ان کی سزائے موت بحال رہی اور انہیں پھانسی دے دی گئی۔

اسلم خان کا خاندان لاہور میں رہائش پذیر تھا۔ شاہ زمان کے نانا ''لاہور میں اعلیٰ پولیس افسر تھے۔ نانا نے انہیں اپنی پناہ میں لے لیا اور بہت ناز و نعم سے رکھا۔ شاہ زمان کو اپنے ماموں کے ساتھ بمبئی جانے کا اتفاق ہوا۔ ان کے ماموں انڈین رائل نیوی میں تھے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی بمبئی جائے اور فلموں کی شوٹنگ نہ دیکھے۔ وہ ایک روز شاہ زمان کو اسٹوڈیو اور فلم کی شوٹنگ دکھانے کے لیے فلم اسٹوڈیو لے کر گئے جہاں فلم ساز و ہدایت کار اے آر کاردار نے انہیں دیکھا، ان کے بارے میں معلومات حاصل کی اور ان کو فلموں میں کام کرنے کی پیشکش کردی کیونکہ وہ ایک سرخ و سفید چہرے اور مضبوط جسم کے مالک تھے اور اپنی مردانہ وجاہت کے باعث سب کی نگاہوں کا مرکز بن جاتے تھے۔ اے آر کاردار نے انہیں فلموں میں کام کرنے کی پیشکش کی تو شاہ زمان سوچ میں پڑ گئے کیونکہ انہیں فلموں میں کام کرنے کا شوق نہیں تھا، دوسرے یہ کہ خاندانی روایات بھی راہ میں حائل تھیں اس لیے انہوں نے فلموں میں اداکاری سے معذرت کرلی اور لاہور واپس آگئے۔ لاہور میں بمبئی سے آئے ہوئے ہدایت کار نذیر بیدی کی نظر ان پر پڑی تو انہوں نے بھی شاہ زمان کو فلموں میں اداکاری کی دعوت دی۔ شاہ زمان نے ان سے بھی معذرت کرلی اور وجہ یہ بتائی کہ ان کے خاندان والے ان کا فلموں میں کام کرنا پسند نہیں کریں گے۔ نذیر بیدی نے کہا کہ اگر وہ کوئی فلمی نام اختیار کرکے بمبئی کی فلموں میں کام کریں گے تو ان کے خاندان والوں کو کانوں کان بھی خبر نہ ہوگی۔ نذیر بیدی نے ان کا فلمی نام سدھیر تجویز کیا اور انہیں فلم ''فرض'' میں کاسٹ کرلیا۔ اس فلم کی ہیروئن راگنی تھیں جو اس وقت کافی

www.pdfbooksfree.pk

کرلیا مگر ہدایت کار نذیر بیدی نے ان کی حوصلہ افزائی کی اور کہا کہ ہمت نہ ہارو، فلم میں تم بہت جلد ایڈجسٹ ہوجاؤ گے۔

فلم ابھی مکمل نہ ہوئی تھی کہ نذیر بیدی اور فلم ساز کے مابین اختلافات پیدا ہوگئے اور نذیر بیدی کی جگہ نرنجن کو فلم کی ہدایت کاری کے فرائض سونپ دیے گئے۔ سدھیر کو یہ بات پسند نہیں آئی اور انہوں نے بھی فلم سے علیحدہ ہونے کا فیصلہ کرلیا مگر نذیر بیدی نے انہیں سمجھایا کہ تم اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دو اور فلم میں بدستور کام کرتے رہو۔

خدا خدا کرکے فرض، 1947ء میں مکمل ہوئی اور تقسیم کے بعد نمائش کے لیے پیش کی گئی۔ شاہ زمان کے گھر والوں کو بھی معلوم ہوگیا کہ انہوں نے ایک فلم میں کام کیا ہے۔ اس ''جرم'' میں انہیں گھر سے نکال دیا گیا۔ گھر سے خرچہ ملنا بند ہوگیا تو سدھیر کو کچھ عرصے بہت مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑا مگر ان کی رگوں میں بھی پٹھانوں کا گرم خون گردش کررہا تھا۔ انہوں نے اپنے گھر والوں سے واپس جاکر معافی تلافی کرنے کی کوشش نہیں کی۔ قیام پاکستان کے بعد لاہور کی فلمی صنعت تباہ و برباد ہوچکی تھی۔ فلم بنانا بے حد مشکل ہوچکا تھا کیونکہ سرمایہ نہیں تھا۔ بڑے بڑے اداکار اور فنکار بے کار بیٹھے تھے۔ مگر سدھیر نے حالات سے ہار ماننا سیکھا ہی نہیں تھا۔ انہوں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اب فلمی دنیا میں کچھ بن کر ہی دکھائیں گے۔ حالات کی خرابی نے ان کے عزم کو زیادہ مضبوط کردیا تھا۔ ان کے مالی حالات اتنے خراب ہوچکے تھے کہ وہ داتا دربار کے لنگر سے کھانا لے کر کھاتے اور اپنی کامیابی کے لیے دعا کرتے تھے۔ آخر کار انہیں ہدایت کار اسلم ایرانی نے اپنی فلم ''تڑپ'' میں ہیرو کے طور پر منتخب کرلیا۔ سدھیر ایک خوبصورت اور باوقار شخصیت کے مالک تھے۔ سرخ وسفید رنگ، تیکھے نقش ونگار، چہرہ اور حرکات میں مردانہ پن، یہ سب خوبیاں تھیں جن کی وجہ سے انہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔

تڑپ کامیابی حاصل نہ کرسکی مگر ہدایت کار راؤ چاند نے سدھیر کو اپنی اگلی فلم ''ہچکولے'' میں ہیرو کے طور پر کام دینے کا فیصلہ کرلیا۔ اس فلم میں گلشن آرا اور شمی کے علاوہ علاؤالدین بھی کام کررہے تھے۔ اس فلم کے موسیقار ماسٹر عنایت حسین تھے۔ ''ہچکولے'' کے گیت بہت مقبول ہوئے تھے جو آج بھی لوگوں کو یاد ہیں۔

میں دل کا دیا جلاتا ہوں
تو چپکے چپکے آنا، چپکے سے آجانا

ماسٹر عنایت حسین کی موسیقی نے ''ہچکولے'' کو ایک یادگار فلم بنادیا تھا۔ ''ہچکولے'' مارچ 1949ء میں نمائش پذیر ہوئی تھی۔

سدھیر کو کامیابی اور شہرت ہدایت کار سبطین فضلی کی فلم ''دوپٹا'' سے ملی تھی۔ نور جہاں اس کی ہیروئن تھیں۔ سدھیر نے معاون اداکار کا کردار بہت خوبصورتی سے ادا کیا تھا۔ ''دوپٹا'' کے ہیرو کے لیے فضلی صاحب نے ایک خوبصورت نوجوان کو وجے کمار کے نام سے پیش کیا تھا۔ یہ فلم بے حد کامیاب تھی۔ قیام پاکستان کے بعد اس میں پہلی بار نور جہاں جلوہ گر ہوئی تھیں۔ جب فلم ریلیز ہوئی تو فلم بینوں کے ہجوم کی وجہ سے سینما گھر کے سامنے میکلوڈ روڈ پر ٹریفک بند ہوگیا تھا۔ اس فلم نے ہندوستان والوں کو بھی چونکا دیا تھا۔ اخبارات نے بہت تبصرے کیے تھے۔ بھارتی فلمی جرائد فلم فیئر نے لکھا تھا۔ انڈین فلم ساز خبردار ہوجائیں، پاکستانی فلم ''دوپٹا'' آگئی ہے۔ ''دوپٹا'' کی کامیابی اور مقبولیت ہندو متعصب طبقے کو ہضم نہ ہوسکی۔ کلکتہ کے جس سینما گھر میں ''دوپٹا'' کی نمائش ہورہی تھی اسے نذرِ آتش کردیا گیا جس کے بعد بھارتی سینما گھروں میں پاکستانی فلموں کی نمائش کا سلسلہ بالکل ختم ہوگیا۔ البتہ بھارتی فلمیں کھلے عام پاکستان آتی رہیں جن کی وجہ سے مقامی فلمی صنعت پنپ نہ سکی۔ ایوب خان کے دورِ حکومت میں بھارتی اور غیر ملکی فلموں پر پابندی عائد کردی گئی جس کے بعد پاکستان میں فلمی صنعت نے بہت ترقی کی۔ یہ ایک الگ کہانی ہے جو تفصیل سے بیان کی جاچکی ہے۔

''دوپٹا'' کی کامیابی نے نہ صرف سدھیر کو مقبول کردیا بلکہ پاکستان میں فلم سازوں کی حوصلہ افزائی بھی کی۔ فلم سازوں نے بھی حوصلے سے کام لیا اور ملک میں فلم سازی کا ایک دور شروع ہوگیا۔ اس کے بعد سدھیر نے اردو اور پنجابی فلموں میں اداکاری سے اپنا مقام بنالیا۔ وہ دونوں زبانوں کی بے حد کامیاب فلموں میں کام کرکے شہرت اور مقبولیت کی سیڑھیاں چڑھتے رہے۔ اپنی مردانہ وجاہت اور جرأت مندانہ کرداروں اور ایکشن فلموں کی مقبولیت کے بعد وہ جنگجو ہیرو کہلائے اور سپر ہیرو سنتوش کے شانہ بشانہ کھڑے نظر آئے۔ فلم ''یون'' کی ہیروئن شمی تھیں جو صبیحہ خانم کے مقابلے کی ہیروئن سمجھی جاتی تھیں لیکن ''یون'' کی ریلیز

کے بعد سدھیر سے شادی کرکے انہوں نے اداکاری ترک کردی اور فلمی دنیا سے ہی قطع تعلق کرلیا۔ وہ کبھی کسی فلمی تقریب میں بھی نظر نہیں آئیں۔ کافی عرصہ بعد انہوں نے سدھیر کی ذاتی فلم ''ساحل'' میں ہیروئن کا کردار کیا تھا اور فلم کے ہدایت کار بھی سدھیر ہی تھے۔ ''ساحل'' کے بعد پھر وہ روپوش ہوگئیں۔ شمی سدھیر کی دوسری بیوی تھیں۔ پہلی شادی انہوں نے خاندان میں کی تھی۔ کافی عرصے بعد سدھیر نے اداکارہ زیبا سے بھی شادی کرلی تھی جو مخصوص حالات میں ہوئی تھی اور صرف چھ ماہ قائم رہی۔ یہ تمام واقعات تفصیل سے بیان کیے جاچکے ہیں۔

سدھیر نے نہ صرف پنجابی فلموں میں بہت نام پیدا کیا اور پنجابی کے سپر اسٹار بن گئے بلکہ اردو فلموں میں بھی انہوں نے بہت نام پیدا کیا بلکہ دونوں کے ساتھ یکساں انصاف کیا۔ کامیابیوں کا یہ سفر زندگی بھر جاری رہا۔ سدھیر کی چند قابلِ ذکر فلموں کے نام یہ ہیں: جھیل کنارے، گمنام، دلا بھٹی، چھوٹی بیگم، جانِ بہار، مراد، سسی، سوسائٹی، چٹان، فرنگی، جھومر، آخری نشان، گل بکاؤلی، کالا پانی، اوکھا جٹ، منگیتر، جانی دشمن، میدان، چاچا خوامخواہ، خیبر پاس، پنڈ دی کڑی، ہرفن مولا، ساحل، عجب خان، پھنے خان، جی دار، چن مکھناں، چھین لے آزادی، آنکھ کا نشہ، ان داتا، وغیرہ۔ سدھیر کی کامیابیوں کی تعداد کم نہیں ہے۔ انہوں نے بے شمار فلموں میں کام کیا۔ اُس دور کی تمام نامور ہیروئنوں کے ساتھ انہوں نے کام کیا۔

سدھیر بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ فلمی صنعت میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ وہ فلمی اداکاروں کی ایسوسی ایشن کے کافی عرصے صدر رہے۔ اس کے بعد بھی اداکار اور فلم ساز اپنے مسائل کے حل کے لیے ان ہی کے پاس آیا کرتے تھے۔ سدھیر کے بارے میں تفصیل سے پہلے بیان کیا جاچکا ہے۔ سدھیر نے 1947ء سے 1987ء تک ڈیڑھ سو سے زائد فلموں میں کام کیا۔ فلمی صنعت پر ان کی حکمرانی کا عرصہ چالیس سال سے زائد ہے۔ ان کی آخری فلم حسینوں کی بارات تھی جس میں انہوں نے مہمان اداکار کی حیثیت سے کام کیا۔ انہوں نے 67 کے قریب پنجابی اور 92 کے قریب اردو فلموں میں اداکاری کی۔ 1974ء میں ان پر فالج کا حملہ ہوا تھا۔ وہ علاج کے لیے لندن بھی گئے اور صحت یاب بھی ہوگئے تھے مگر انہوں نے کام بہت کم کردیا تھا۔ 1997ء میں ان کا انتقال ہوا اور انہیں لاہور

نجم الحسن اوما ششی کے ساتھ فلم اناتھ اشرم

میں دفن کیا گیا۔ اس طرح فلمی صنعت ایک بہت اچھے اداکار، ہدایت کار اور فلم ساز سے محروم ہوگئی۔ سب سے بڑھ کر وہ ایک عظیم اور ہمدرد انسان تھے ...... دوستوں سے ناراض ہوتے تو اس کا اظہار بھی کردیتے تھے۔ فلمی صنعت میں ان کا غصہ اور صاف گوئی مشہور تھی۔ وہ دل میں کوئی بات رکھنے کے عادی نہ تھے۔

سدھیر صاحب سے ہماری ابتدائی ملاقاتیں اس وقت ہوئی تھیں جب ہم صحافی تھے۔ جب فلموں سے وابستہ ہوئے تو سدھیر سے تعلقات وسیع ہوگئے۔ فلمی صنعت میں اکثر لوگ ان سے ڈرتے تھے کیونکہ وہ بہت جلد غصے میں آجاتے تھے۔ وہ ہمیشہ اپنے ساتھ پستول ضرور رکھتے تھے اور لوگ جانتے تھے کہ وہ گولی چلانے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔ لیکن ہمارے ساتھ ان کے تعلقات مخلصانہ اور بے غرض تھے۔ انہوں نے ہمیشہ ہمارے ساتھ مہربانی اور دوستی کا سلوک کیا۔ ہم ان سے کبھی خوف زدہ نہیں ہوئے۔ ان کی فلموں پر بے لاگ تبصرے بھی کرتے تھے لیکن انہوں نے کبھی ان باتوں کا برا نہیں منایا۔ زیبا بیگم سے شادی کے دنوں میں جب زیبا زیرِ تکمیل فلموں میں کام کرنے کے لیے اسٹوڈیو آتی تھیں تو ایک سخت گیر ملازم ان کے ساتھ ہوتا تھا اور عموماً فلم والے ان سے ہنسی مذاق تو کیا بات کرتے ہوئے بھی کتراتے تھے مگر ہم اسٹوڈیو میں ان سے ملتے اور بات چیت کرتے رہے جس کا سدھیر صاحب نے کبھی تذکرہ بھی نہیں کیا۔ آخری دنوں میں ان سے ملاقاتیں اور بے تکلفی میں اضافہ ہوگیا تھا۔ ایک واقعہ بھی ان کے حوالے سے ہمیشہ یاد رہے گا جو ہم پہلے بھی بیان کرچکے ہیں۔ ہم ایک فلم کی کہانی لکھنے کے لیے مری گئے اور وہاں بیمار ہوگئے۔ سیزن ختم ہوچکا تھا اور سیسل ہوٹل کی ایک لسٹ میں ہم واحد

www.pdfbooksfree.pk

آغا حسن عابدی
(1922-1995ء)

بین الاقوامی شہرت یافتہ بنکار اور بی سی سی آئی کے بانی۔ وہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد راجا صاحب محمود آباد کے اسٹیٹ منیجر تھے۔ انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری لی، لیکن وکالت کی بجائے بینکاری کو بطور پیشہ اپنایا۔ 1946ء میں حبیب بینک بمبئی میں ملازمت اختیار کرلی۔ پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو حبیب بینک کراچی منتقل ہوگیا۔ آغا صاحب بھی کراچی چلے آئے۔ انہوں نے بنکاری میں اس قدر مہارت حاصل کرلی کہ معروف صنعت کار یوسف سہگل کو یونائیٹڈ بینک کھولنے کا مشورہ دیا۔ اس بینک کو جدید ترین خطوط پر استوار کرنے میں انہوں نے اہم کردار ادا کیا۔ 1966ء میں وہ ابوظہبی گئے اور وہاں شیخ زید بن سلطان النہیان سے ملاقات کی اور ابوظہبی میں یو بی ایل کی شاخ کھولنے کی اجازت حاصل کرلی۔ 72-1971ء میں انہوں نے اپنا بینک کھولنے کا منصوبہ بنایا۔ ان کے دو ساتھی بینکاروں صالح نقوی اور مسیح الرحمن نے بھی ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ ابوظہبی کے سلطان نے اس منصوبے کی سرپرستی قبول کرلی۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے بینک آف امریکا کے ایک اعلیٰ آفیسر بی ایم کارلسن کا تعاون بھی حاصل کیا، جس کے نتیجے میں بینک آف امریکا اڑھائی ملین ڈالر کی سرمایہ کاری کرنے پر رضامند ہوگیا جس میں آغا عابدی کے ادارے کا حصہ صرف 25 فیصد مقرر کیا گیا۔ آغا حسن عابدی نے بینک کے تمام انتظامی اختیارات اپنے پاس رکھے۔ انہوں نے سان فرانسسکو بینک کا تعاون بھی حاصل کرلیا اور اپنے بینک کا نام بینک آف کریڈٹ اینڈ کامرس انٹرنیشنل رکھ دیا۔ نومبر 1972ء میں انہوں نے یو بی ایل کے صدر کے عہدے سے سبکدوشی اختیار کرلی اور ابوظہبی اور کراچی میں بی سی سی آئی بینک میں کام شروع کردیا۔ بینک آف امریکا کا اڑھائی ملین ڈالر، شیخ زید اور کمال ادھم جیسے سرمایہ داروں کے سرمائے کے علاوہ 20 ملین ڈالر کا سرمایہ دیگر عرب کھاتہ داروں سے بھی حاصل کیا گیا تھا۔ 1973ء تک بی سی سی آئی نے اپنی پوزیشن بڑی مضبوط کرلی۔ پھر بی سی سی آئی نے لندن میں بھی اپنا دفتر کھول لیا اور 1974ء میں اس کی شاخیں کراموِیل اسٹریٹ، سلون اسٹریٹ اور فیشن ایبل اسٹریٹ میں قائم ہوگئیں۔ 1976ء میں برطانیہ میں بی سی سی آئی کی شاخیں دوگنی ہوچکی تھیں۔ پھر لکسمبرگ کے مین آئی لینڈ میں بھی بینک کی شاخیں قائم کی گئیں۔ امریکا میں بھی اس کی شاخیں قائم ہوچکی تھیں۔ 1977ء کے اواخر تک بی سی سی آئی کے اثاثے 200 ملین ڈالر سے بڑھ کر 202 ملین ڈالر ہوچکے تھے۔ پہلے پانچ ممالک میں اس کی 19 شاخیں تھیں، وہ بھی 32 ممالک میں بڑھ کر 146 ہوگئیں۔ خلیجی ریاستوں کے علاوہ افریقی ممالک، فرانس، مصر، مغربی جرمنی، جنیوا، زیورچ، ہانگ کانگ میں اس کے دفاتر موجود تھے۔ دنیا کے بڑے بڑے بینک آغا حسن عابدی کو اپنے لیے خطرہ محسوس کررہے تھے، چنانچہ ہر جگہ ان کے کاروبار کو ٹھپ کرنے کی کوششیں کی گئیں جس کے نتیجے میں بینک خسارے میں چلا گیا۔ بالآخر اسے بند کرنا پڑا۔

مرسلہ: نوشین اختر ملک، شیخوپورہ

مہمان رہ گئے تھے۔ ہوٹل انتظامیہ اور بیرے ہم سے بخوبی واقف تھے۔ ہوٹل کا بیشتر عملہ چھٹی پر جاچکا تھا مگر جو لوگ باقی رہ گئے تھے وہ ہماری بہت دیکھ بھال کرتے تھے۔

ہماری یہ بیماری بھی عجیب تھی۔ رات کو نو بجے کے قریب ہمیں بہت تیز بخار ہوجاتا تھا جو بڑھتا ہی رہتا تھا۔ صبح ہوتے ہی پسینا آتا اور ہم پسینے میں نہا جاتے۔ صبح اٹھتے تو بالکل تندرست اور چاق و چوبند۔ محسوس ہی نہیں ہوتا تھا کہ رات کو ہم شدید بخار میں مبتلا تھے۔ نہا کر لباس پہن کر ناشتے کے لیے جاتے پھر کام شروع کرتے، ویران مال روڈ پر ٹہلتے اور ڈنر کے وقت ہوٹل پہنچ جاتے۔ اس وقت تک جاڑوں میں مری جانے کا ''فیشن'' شروع نہیں ہوا تھا اس لیے مری بیوہ کے سہاگ کی طرح ویران اور اجاڑ ہوجایا کرتا تھا۔ نہ مال روڈ پر ٹہلنے والے ہوتے نہ ریستوران میں معزز مہمان۔

ایک رات جب ہمیں بخار چڑھنے والا تھا کہ اچانک ہماری نظر پڑی تو ہٹ کی دیوار پر ایک بہت بڑا سا مکڑا چپٹا ہوا نظر آیا۔ ہم حشرات الارض سے خوف کھاتے ہیں یا گھن کھاتے ہیں۔ لال بیگ، مکڑی اور مچھر تک کو مار نہیں سکتے۔ ہم خوفزدہ نظروں سے مکڑے کو دیکھتے رہے جو اپنی جگہ چھپا ہوا تھا۔ اچانک سدھیر صاحب آئے تو یوں لگا جیسے بہار آگئی۔ وہ کسی فلم کی آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لیے مری آئے تھے۔ ہمارے بارے میں علم ہوا تو ملنے چلے آئے۔ کافی ہنستے ہنساتے رہے مگر ہم کچھ سہمے ہوئے تھے۔ انہوں نے حیران ہوکر پوچھا۔ ''بات کیا ہے، آپ اتنے چپ کیوں ہیں؟''

ہم نے کہا۔ ''سدھیر صاحب آپ ہمارا ایک کام کردیں گے؟''

''کیوں نہیں، آپ بتائیے تو سہی۔''

ہم نے دیوار کی طرف انگلی کا اشارہ کیا۔ ''وہ بڑی سی مکڑی، آپ اس کا علاج کرسکتے ہیں؟''

''کیوں نہیں'' انہوں نے کہا اور پیر سے جوتا اتار کر مکڑی کو مار دیا۔ ہم نے اطمینان کی سانس لی اور کہا ''آپ تو فرشتہ بن کر اچانک آگئے ورنہ ہم ساری رات ڈرتے رہتے اور سو بھی نہیں سکتے۔''

وہ ہنسنے لگے۔ وہی بے ساختہ اور خوبصورت مسکراہٹ جس میں ان کے موتیوں جیسے دانت چمکتے نظر آتے تھے۔ کچھ دیر گپ شپ کرکے وہ چلے گئے اور ہم نے اطمینان کی سانس لی۔ دوسرے دن رانی بیگم اور چند دوسرے اداکار بھی ملاقات کے لیے آئے۔

ایک بار لندن میں سدھیر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ علاج کے سلسلے میں وہاں گئے ہوئے تھے۔ واپسی پر اتفاق سے ہم دونوں ایک ہی فلائٹ سے واپس آئے۔ سدھیر صاحب نے درخواست کرکے ہماری برابر کی سیٹ خالی کرالی اور ہم دونوں نے اس سفر میں اتنی باتیں کیں جو ساری زندگی میں نہیں کی تھیں۔ اس سفر میں ہم دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے۔ یہ قربت ان کی زندگی کی آخری سانس تک باقی رہی۔ ہم نے اصلی شاہ زمان کو اس سفر میں جانا تھا۔

سدھیر صاحب کے کسی بیٹے نے اداکاری کی طرف سنجیدگی سے توجہ نہیں دی مگر اب سنا ہے کہ ان کا نواسہ فلموں میں اداکاری کررہا ہے۔ افسوس کہ نہ ہم اسے جانتے ہیں نہ وہ ہمیں۔ کبھی ملاقات بھی نہ ہوئی۔ مگر سدھیر صاحب کے نواسے کے لیے دعا ہی کرسکتے ہیں کہ اللہ اس کو کامیابی دے۔

سدھیر صاحب کے ساتھ ہی فلمی صنعت کا ایک سنہرا دور ختم ہوگیا جو شاید اب کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔ اگر آ بھی گیا تو سدھیر صاحب جیسے لوگ تو پھر بھی نہیں آئیں گے۔ ان کی زندگی بجائے خود حیرتوں اور نشیب و فراز کی کہانیاں سمیٹے ہوئے ہے۔ اللہ نے زندگی دی اور موقع ملا تو ان کو متعارف کرائیں گے۔

وہ دور، وہ لوگ اب شاید کبھی لوٹ کر نہ آئیں گے۔

☆☆☆

پشاور سے شوکت رحمان خٹک ایک دلچسپ ذاتی واقعے کے ساتھ آئے ہیں۔ جن لوگوں کو اداکاری کا جنون ہوتا ہے وہ اسی قسم کی حرکتیں کرتے رہتے ہیں، ملاحظہ کیجیے۔

تقریباً ایک سال سے ذیابیطس میں پاؤں کے پنجے کٹنے سے جو تکلیف اٹھا رہا ہوں وہ اب تک قائم ہے۔ رات درد کی کیفیت سے دوچار تھا کہ فون پر اطلاع ملی کہ میرے بچپن کے دوست ارشاد کا انتقال ہوگیا ہے۔ مجھے ان کی وفات کا بے حد صدمہ ہوا اور میرا ذہن ماضی کے دریچوں کی طرف پلٹ گیا۔ فلموں میں کام کرنے کی لاہور روانگی سے قبل میرے دوست ارشاد نے مجھے بتایا کہ اپنے کام میں وسعت پیدا کرنے کے لیے تمہیں اپنا موڈ 24 گھنٹے اداکاری میں رکھنا چاہیے۔ فلمی ڈریس مثلاً پنجابی فلموں کے ولن کے لیے کالی قمیص، لاچا، ایک عدد ڈنڈا، کلہاڑی اور برچھا اپنے پاس رکھا کرو۔ مختلف کرداروں کے لیے بھی

www.pdfbooksfree.pk

لباس بنالو، چونکہ میں کھاتے پیتے گھرانے سے تھا میں نے آسانی سے یہ سب کام نبھایا۔ ارشاد کا مکان میرے مکان کے قریب واقع تھا۔ ٹی وی کی مشہور مزاحیہ سیریل الف نون کے نام سے مشہور ہے جس میں کمال احمد رضوی نے چالاک شخص کا کردار اور ننھا نے احمق کا کردار کیا تھا۔ ارشاد کی مثال کمال احمد رضوی جیسی تھی اور میں ننھا کی دوسری کاپی تھا اور ارشاد کے ہاتھوں کھلونا بنا ہوا تھا حالانکہ میں اسے اپنا سچا اور ہمدرد ساتھی سمجھ کر اس کا کہا مانتا تھا۔ میرے ساتھ والے مکان میں لاہور کی ایک فیملی بطور کرایہ دار رہائش پذیر ہوئی۔ چند دنوں بعد ان کی ایک لڑکی کی شادی ہوئی، مجھے ارشاد نے آکر سارے پروگرام سے آگاہ کردیا اور مجھے خوشخبری دی کہ تمہیں بہترین ولن کا کردار کرنے کا بھرپور موقع ہے۔ میں نے ارشاد کو کہا کہ یہ پٹھانوں کی سرزمین ہے یہاں تو عزت کے نام پر قتل ہوتے ہیں۔ میں اتنا بڑا کام کیسے کرسکتا ہوں۔ ارشاد نے کہا کہ میں تم سے قتل کرانا نہیں چاہتا اور نہ ہی تم کو کسی سے قتل کرانا مقصود ہے۔ میں تو تمہیں بااختیار ولن بنانا چاہتا ہوں کہ تم ریڈی میڈ ولن بن جاؤ، تاکہ لاہور جاکر فلم انڈسٹری میں تمہارا اتنا نام ہوجائے کہ اداکار مظہر شاہ اور اداکار ساون کو گھر بھگادو، میری گھبراہٹ دیکھ کر اس نے مجھے نپولین بوناپارٹ کی مثال دی کہ اس نے لنگڑا ہوتے ہوئے بھی حکمرانی کی، طارق بن زیاد نے اپنی کشتیاں جلا کر دشمن پر غلبہ حاصل کیا۔ آخرکار میں ارشاد کی چکنی چپڑی باتوں میں آگیا۔ ارشاد نے مجھ سے وعدہ کیا کہ میں بھی اس جگہ پر تمہارے سامنے بیٹھ کر تمہیں ڈائریکشن دوں گا تاکہ تمہاری حوصلہ افزائی ہوتی رہے۔ مگر اردو ڈائیلاگ بولتے وقت پنجابی ڈائیلاگ استعمال نہ کرنا۔ پٹری سے نیچے بھی نہ اترنا۔ میں نے ارشاد کے کہنے کے مطابق ولن کے کردار کے لیے ہامی بھرلی۔ کالی قمیص اور رنگین لاچا زیب تن کیا، گھر کے جھاڑن سے ڈنڈا نکال کر اور ہاتھ میں کلہاڑی لے کر شادی والے گھر پہنچا، ارشاد پہلے سے وہاں موجود تھا۔ لڑکے کا نکاح پڑھانے کے لیے مولوی صاحب موجود تھے، لڑکے اور لڑکی کے والد اور دولہا موجود تھے، جونہی مولوی صاحب نے بسم اللہ پڑھ کر نکاح کا آغاز کیا میری آواز فضا میں بلند ہوئی ”رک جاؤ! یہ شادی نہیں ہوسکتی۔“ محفل میں ایسی خاموشی طاری ہوئی جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ لڑکے کے باپ نے بہت عاجزی سے کہا۔ ”بیٹے یہ کیا کہہ رہے ہو؟“ دراصل ارشاد ظالم نے میرا گیٹ اپ اتنا خطرناک بنایا تھا کہ آئینہ دیکھنے پر میں خود بھی ڈر گیا تھا۔ میں نے بھرپور غصے میں لڑکے کے باپ کو جواب دیا کہ براتلے جانے سے پہلے تمہیں میری لاش پر سے گزرنا ہوگا۔ لڑکی کا باپ اپنی کرسی سے اٹھا اور کچھ کہنے سے پہلے گھبراہٹ میں اس کی پگڑی اس کے سر سے زمین پر گرگئی۔ میری آواز دوبارہ فضا میں گونج اٹھی۔ ”پگڑی سنبھال جٹا۔ زمین زمیندار دی ماں ہوندی اے۔“

میں نے جب ارشاد پر نظر ڈالی تو وہ اپنے غضب ناک چہرے سے مجھے یہ تاثر دے رہا تھا کہ میں پٹری سے اتر چکا ہوں۔ میں نے دوبارہ اردو ٹریک سنبھالا۔ ”ارادے سچے ہوں تو انسان سمندر کی تہ سے موتی بھی نکال سکتا ہے۔“ لڑکی کے بھائی نے غصے میں کہا میں تمہیں گولی ماردوں گا۔ میں نے گرجدار آواز میں کہا ”گرجو گے بھی یا برسو گے بھی؟“ میں نے آخری مکالمہ اتنی زور سے کہا کہ میری نقلی مونچھ زمین پر گر پڑی اور میرا بھید کھل گیا۔ لوگوں نے مجھے بے تحاشا مارنا شروع کردیا۔ ارشاد پر نظر دوڑائی لیکن وہ وہاں سے رفوچکر ہوچکا تھا۔ دوسرے دن میں نے ارشاد سے گلہ کیا۔ ارشاد نے جواباً کہا کہ تم میں ایک بڑے اداکار کی نشانیاں پائی جاتی ہیں۔ تم فوراً لاہور پہنچو، وہاں فلموں میں کام تمہارا انتظار کررہا ہے۔ مجھے اپنی کیریئر کی پہلی فلم ”جاگیردار“ (پنجابی) میں کام کرنے کا موقع ملا۔ میں نے اپنا کردار بڑی مہارت سے نبھایا۔ پشاور آکر میں نے اپنے تمام دوستوں، عزیزوں کو آگاہ کردیا کہ میری پہلی پنجابی فلم ”جاگیردار“ اگلے ماہ ریلیز ہورہی ہے۔ یہ فلم دیکھنا نہ بھولیے کیونکہ میرا رول بہت ٹریجک قسم کا ہے۔ وہ دن بھی آن پہنچا، جن لوگوں نے میری فلم دیکھی وہ ملاقات میں مجھ سے بہت ناراض ہوئے کہ تم نے ہمیں بے وقوف بنادیا۔ فلم میں تمہارا نام ونشان ہی نہ تھا۔ مجھے بے حد غصہ آیا کہ اتنا شاندار کام کرنے پر بھی ان لوگوں میں حسد وبغض پایا جاتا ہے اور ان سے یہ برداشت نہ ہوسکا کہ میں نے اتنا بڑا کردار بھرپور طریقے سے کیسے نبھایا۔ میں نے ان سب سے پوچھا کہ اس فلم میں جنازے کا سین تھا؟ سب نے بیک وقت جواب دیا کہ ہاں اس فلم میں جنازے کا سین ہے۔ میں نے کہا ”جنازے میں مردے کا رول میں نے ہی ادا کیا تھا، نظر اس لیے نہیں آیا کہ مجھ پر چادر پڑی تھی اور میں پھولوں میں لدا تھا۔“

جاری ہے

سپر اسٹار

شاھد جھانگیر شاھد

خاموش فلموں کے دور میں پشاور کو یہ فخر حاصل تھا کہ اس دور کا سپراسٹار اسی علاقے کا تھا اور اس نے یہ مقام اپنی محنت اور صلاجیت سے حاصل کیا تھا۔ اس دور میں لوگ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے پاگل ہواٹھتے تھے لیکن جب وہ شہرت کی بلندی پر پہنچا تو زندگی نے دغادے دی۔

برصغیر کے پہلے سپر اسٹار کی داستانِ زیست

کلکتہ کا مشہور فلمی اخبار دی ورائٹیز ویکلی کا شمارہ دسمبر 1935ء میرے سامنے ہے۔ اس خاص نمبر میں اس دور کے سب سے کامیاب فلمی اداکار کی خودنوشت ہے۔ اس اداکار کا تعلق ہمارے پشاور سے ہے۔ اس کا خاندان آج بھی یہاں موجود ہے۔ یہ نایاب شمارہ بھی ان کے بھتیجے نے صندوق سے نکال کردیا ہے۔ میں اس شمارے کے اس خاص مضمون کو پڑھنے لگا۔ وہ لکھتے ہیں۔

”1929ء میں لاہور کے مرکزی حصے میں کانگریس

www.pdfbooksfree.pk

کا اجلاس منعقد ہوتا تھا۔ فرنٹیئر پولیس نے خصوصی طور پر مجھے اس ڈیوٹی پر تعینات کیا تھا کہ میں کانگرس کی تمام کارروائی پر نظر رکھوں۔ دن بھر کی تھکن کے بعد ذہن کسی تفریح کا متلاشی رہتا ہے ۔ اسی غرض سے میرا ایک دوست مجھے سینما لے گیا۔ جہاں اس وقت ڈائریکٹر اے آر کاردار کی فلم "Mysterious Eagle" عرف ''حسن کا ڈاکو'' زیرِ نمائش تھی۔ اسے اتفاق کہیے کہ وہاں میری ملاقات مسٹر کاردار سے ہوگئی۔ انہوں نے مجھے فلم میں کام کرنے کی پیش کش کی اور 24، دسمبر 1929ء کو میں نے کاردار.... صاحب کی فلم کمپنی یونائیٹڈ پلیئرز کارپوریشن میں شمولیت اختیار کرلی۔ مجھے ''صفدر جنگ'' میں بطور معاون اداکار متعارف کروایا گیا اور 40 روپے ماہوار تنخواہ دی جانے لگی جوکہ اس سستے دور میں اچھی خاصی رقم تھی۔ میری دوسری فلم "Brave Hearts" عرف ''سرفروش'' تھی جو 1930ء میں بنی تھی۔ اس فلم میں مجھے نسبتاً بہتر یعنی ولن کا کردار دیا گیا تھا۔ میری تیسری فلم "Golden Dagger" عرف ''قاتل کٹار'' تھی۔ اس فلم میں مجھے ہیرو کا کردار دیا گیا۔ مس گلزار میری ہیروئن تھی۔ پھر میری زندگی کا سب سے شاندار لمحہ آگیا۔ "wandering Dancer" عرف ''آوارہ رقاصہ'' میں مجھے فلم کا سب سے بڑا کردار یعنی ولن کا کردار ملا۔ لیکن نجانے کیوں میں نے یہ کردار ادا کرنے سے انکار کردیا اور ولن کی بجائے فلم میں ہیرو کا کردار ادا کرنے پر اصرار کیا اور کاردار صاحب نے میری بات مان لی۔

فلم وانڈرنگ ڈانسر عرف آوارہ رقاصہ میں مجھے ہیرو کا کردار دیا گیا تھا جبکہ ہیروئن کے کردار کے لیے کلکتہ سے رقیہ خاتون کو خاص طور پر بلوایا گیا تھا۔ یہاں میں آپ کو بتاتا چلوں کہ آج تک میں جتنی لڑکیوں سے بھی ملا ہوں مس رقیہ خاتون ان سب سے زیادہ پُرکشش تھی۔ وہ نہایت شرمیلی، سادہ اور معصوم طبیعت کی لڑکی تھی بعد میں معلوم ہوا کہ متکلم فلموں (بولتی فلموں) کے لیے اس کی آواز کو مناسب نہیں سمجھا گیا جس کی وجہ اس کی آواز کی لرزش اور شرمیلا پن تھا۔ فلمی دنیا سے مایوسی کے بعد رقیہ خاتون نے ایک مہارانی کے ہاں بطور گورنس ملازمت اختیار کرلی اور اس کے بعد سے پھر فلمی دنیا میں اس کے بارے میں کچھ نہیں سنا گیا۔

متکلم فلموں (Talkies) کی آمد سے غیر متکلم (خاموش) فلموں کے بہت سے مشہور فنکار بے روزگار ہو گئے اور آہستہ آہستہ قصۂ پارینہ بن گئے۔ فلم کمپنیوں کی تعداد بھی بے حد محدود تھی۔ کلکتہ میں میڈن اور نیو تھیٹرز اور بمبئی میں چند فلم کمپنیاں تھیں جہاں دن رات کام ہوتا تھا اور مختلف زبانوں کی فلموں کی عکس بندی ہوتی تھی۔

خاموش فلموں کا دور ختم ہونے کے بعد میں کچھ عرصہ بے روزگاری کا شکار رہا اور کلکتہ ہی میں فلم کمپنی میں اپنی قسمت آزمانے کی کوشش میں لگا رہا۔ دراصل میرے اندر ''نیو تھیٹرز'' کے لیے ابتدا ہی سے ایک خاص کشش تھی۔ چنانچہ میں سیدھا نیو تھیٹرز کے مینجنگ ڈائریکٹر مسٹر بی۔ این سرکار سے ملنے چلا گیا۔ وہ مجھ سے نہایت اچھی طرح سے ملے پھر انہوں نے مجھے اپنی کمپنی کے منیجر ''حافظ جی'' کے پاس ان ہدایات کے ساتھ بھجوایا کہ وہ میری آواز کا ٹیسٹ لے لیں۔

میں حافظ جی کے پاس پہنچا۔ نہ جانے کیوں حافظ جی کا رویّہ شروع دن سے ہی میرے ساتھ کچھ مناسب نہیں تھا۔

انہوں نے میری آواز کا ٹیسٹ کیسے لیا؟ پہلے میرے چہرے پر کچھ لائٹ ڈالی اور پھر مائک پر میری آواز چیک کیے بغیر ہی فوراً اپنی رائے دے دی اور کہا کہ تمہاری آواز مائیکروفون کے لیے موزوں نہیں ہے۔ میں نے بھی غصے میں انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تم دیکھو گے کہ ایک دن میں غیر متکلم فلموں کی طرح متکلم فلموں کا بھی کامیاب فنکار بنوں گا۔

یہاں میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ جس وقت میرے چہرے پر روشنی پھینک کر میری آواز کا امتحان لینے کا دنیا کا عجیب وغریب واقعہ وقوع پزیر ہو رہا تھا اس وقت ایک شریف اور معزز شخص بھی وہاں موجود تھے اور خاموشی سے اس تمام واقعہ کا جائزہ لے رہے تھے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ مشہور فلم میگزین "The Varieties" کے ایڈیٹر تھے۔ وہ میرے ساتھ انتہائی خوش اخلاقی سے پیش آئے۔ وہ میرا مقصد سمجھ گئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ وہ اپنے میگزین میں اس واقعہ کے بارے میں ضرور لکھیں گے۔ میرے منع کرنے کے باوجود انہوں نے اپنے خصوصی شمارے ٹیگور نمبر میں ''فن برائے فن'' (Art For Art's Sake) کے عنوان سے میرے بارے میں لکھ دیا۔ یہ میری زندگی کا پہلا موقع تھا کہ جب کسی میگزین میں میرے فوٹو کے ساتھ میرے بارے میں تبصرہ کیا گیا تھا۔ اس وقت کے دی ورائیٹیز کے ایڈیٹر کا ہمیشہ ممنون رہوں گا۔

یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہی بڑی وجہ تھی کہ جس نے ''ورائیٹیز'' کے لیے مجھے یہ مضمون لکھنے پر مجبور کیا۔

1931ء کا سال میری زندگی کا مشکل ترین سال تھا۔ مجھے ایک متکلم اداکار بننے کے لیے سخت جدوجہد کرنا پڑی۔ ناامیدی ہر جگہ میرا راستہ روکے کھڑی تھی۔ دل برداشتہ ہوکر میں نے مسٹر بی سی لینڈ جو کہ اس وقت آئی جی پولیس لاہور تھے کو خط لکھا کہ وہ مجھے دوبارہ محکمۂ پولیس میں میری سابقہ ملازمت پر بحال کردیں۔ مسٹر لینڈ نہایت مہربان، عالی ہمت اور فیاض انسان تھے۔ انہوں نے

گل حمید، سلطانہ بانو فلم بدروحی (باغی)

جواب میں لکھا کہ وہ مجھے میری موجودہ اختیار کردہ لائن میں کامیاب دیکھنا پسند کریں گے۔

ان مشکل حالات میں اپنے روزمرہ کے اخراجات پورے کرنے کے لیے مجھے ایک سرکس کی گراؤنڈ منیجری بھی کرنا پڑی۔

ایک دن میرے صحافی دوست ٹی۔ کے طارق مجھے ایز رامیر کے پاس لے گئے اور مجھے ان سے متعارف کروایا۔

دیوکی بوس سنہرا اسنسار کے ہدایت کار

مسٹر میر خوش اخلاقی اور پُرتپاک انداز سے ملے اور میری ہمت بندھائی۔ یہ مسٹر میر ہی تھے جنہوں نے اس دور کی مشہور فلم ''نورجہاں'' کی اداکارہ مس وِملا سے میرا تعارف کروایا۔ اس لڑکی سے میں درجنوں بار ملا ہوں لیکن ہر بار ملنے پر اس نے اجنبیت کا اظہار کیا تاہم ایک بار مسٹر میر نے مجھے بمبئی میں بننے والی ایک مشہور فلم ''زرینہ'' میں کام کرنے کی پیش کش کردی کہ میں اس فلم میں شمولیت اختیار کرلوں۔ لیکن یہ ایک مختصر اور غیر اہم کردار تھا۔ میں نے اس فلم میں کام کرنے سے معذرت کرلی بعد میں مسٹر میر نے بھی میرے ساتھ اتفاق کیا اور کہا کہ چھوٹے چھوٹے کرداروں کے لیے بار بار بمبئی جانے سے بہتر ہے کہ یہیں اچھے کردار کا انتظار کیا جائے۔ مسٹر کاردار ان دنوں بمبئی میں تھے۔ اچانک ایک دن ان کا ٹیلی گرام مجھے موصول ہوا کہ کلکتہ آرہے ہیں۔ وہاں سے لاہور جائیں گے جہاں وہ ایک متکلم فلم بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ کلکتہ سے لاہور جاتے وقت وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لاہور لے گئے۔ جہاں ان کے ادارے ''پلے آرٹ فوٹو ٹون'' نے لاہور کی پہلی بولتی فلم حورِ پنجاب عرف ہیر رانجھا بنانے کا اعلان کیا۔ اس فلم میں پہلی بار میں

www.pdfbooksfree.pk

نے مائیکروفون کا سامنا کیا اور خدا کی مہربانی سے اس امتحان میں کامیاب رہا اور میری آواز کو مائیک کے لیے موزوں سمجھا گیا۔ میں نے مذکورہ فلم میں ''راجہ عدلی'' کا مختصر مگر اہم کردار ادا کیا۔ یہ ایک لحاظ سے متکلم (بولتی) فلموں کے لیے میری آواز کی اہلیت جانچنے کا ٹیسٹ بھی تھا۔ لیکن مجھے نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ لاہور کی پہلی متکلم فلم بری طرح ناکام ہوگئی اور اس ناکامی کی اصلی وجہ فلم کی ناقص فوٹوگرافی تھی۔ فلم کے اکثر مناظر آؤٹ آف فوکس تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ شخص یعنی فلم کا عکاس باقاعدہ کیمرا مین بھی نہ تھا۔ لاہور کی پہلی بولتی فلم کا یہ حشر ہوا جس کا کاردار صاحب اور فلم کے تمام یونٹ کو بے حد صدمہ پہنچا اور یہ سب کچھ ہوا صرف ایک شخص کی ناقص کارکردگی کے باعث۔ کاردار صاحب اس صدمے سے بیمار ہوگئے۔ پہلے لاہور میں علاج کرواتے رہے پھر بہتر علاج کے لیے کلکتہ چلے گئے۔

1932ء کے اوائل میں مجھے ''گوپی چند'' نامی فلم میں مرکزی کردار کے لیے منتخب کیا گیا۔ میں اس کردار کے لیے ریہرسل بھی مکمل کر چکا تھا۔ لیکن بعد میں فلم کے پروڈیوسرز اور ہدایتکار نے اپنا ارادہ تبدیل کرلیا۔ ان کے مطابق چونکہ یہ ہندوؤں کا ایک مذہبی واقعے سے متعلق کردار تھا اور ہندو مذہب سے تعلق رکھنے والے ایک مسلمان کا انتخاب جذبات کو ٹھیس پہنچانے کا باعث ہوسکتا تھا اور بڑے ہنگاموں کا اندیشہ تھا۔ چنانچہ مجھے یہ کردار چھوڑنا پڑا حالانکہ میری بعد میں آنے والی کئی کامیاب فلموں میں میں نے ایسے کردار ادا کیے اور کسی نے بھی ان پر اعتراض نہیں کیا۔ بلکہ ایسے کرداروں میں مجھے بے حد پسند کیا گیا۔

یہ 1933ء کا ذکر ہے۔ میں فلم حورِ پنجاب عرف ہیر رانجھا کی نمائش کے بعد سے ابھی تک لاہور ہی میں قیام پذیر تھا۔ کاردار صاحب علاج کے سلسلے میں کلکتہ جا چکے تھے۔ صحتیاب ہونے کے بعد انہوں نے کلکتہ کی مشہور فلم کمپنی ''ایسٹ انڈیا فلم کمپنی'' میں بطور ہدیتکار ملازمت اختیار کرلی تھی۔

ایسٹ انڈیا فلم کمپنی نے انہیں ایک تاریخی فلم ''چندر گپت'' بنانے کا کام سونپا۔ مسٹر کاردار، چندرگپت کے مرکزی کردار کے لیے کسی مناسب چہرے کی تلاش میں تھے۔ انہوں نے مجھے اور اداکار نذیر کو کلکتہ سے بلوالیا۔ ہم دونوں کلکتہ سے روانہ ہوگئے۔ میرا انتخاب چندرگپت اور نذیر کا انتخاب چانکیہ کے کردار کے لیے کیا گیا۔ اس کے بعد مہینے گزر گئے۔ لیکن فلم کی شوٹنگ شروع ہونے میں نہیں آرہی تھی۔ مجھے معلوم ہوا کہ اسٹوڈیوز میں میری زبان اور لہجہ کے بارے میں عدم تسلی کا اظہار ہو رہا ہے۔ حالانکہ اس تمام عرصے میں جبکہ میں بے روزگاری کے دور سے گزر رہا تھا میرا زیادہ تر وقت زبان کی درستگی اور مکالموں کی صحیح اور بہترین ادائیگی میں صرف ہوتا تھا۔ خاموش فلموں میں تو صرف اچھی اداکاری اور چہرے کے بہترین تاثرات سے کام چل جاتا تھا۔ وہاں زبان کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ لیکن بولتی فلموں کے لیے لہجہ اور مکالموں کی درست ادائیگی بھی ضروری ہوتی ہے۔ مجھے متکلم فلموں کی آمد کے ساتھ ہی اس بات کا احساس ہوگیا تھا اور فارغ اوقات میں، میں اپنی اس کمزوری کو دور کرنے کی بھرپور کوششوں میں لگا رہتا تھا اور اب میں اس قابل ہوگیا تھا کہ درست لہجہ میں اپنی فلموں کے مکالمے ادا کرسکوں۔ اداکاری کرنا اب میرے لیے کوئی مشکل مسئلہ نہ تھا۔ کیونکہ باڈی لینگوج اور چہرے پر ہر قسم کے تاثرات دینا میں پہلے ہی جانتا تھا۔ یہاں خاموش فلموں کا تجربہ بہت کام آیا۔ میری اداکاری کو زبان مل جانے کے باعث اب متکلم فلموں میں کامیابی حاصل کرنا میرے لیے مشکل مرحلہ نہ تھا۔

میں نے کاردار صاحب تک اپنی بات پہنچائی کہ میری زبان اور اداکارانہ صلاحیتوں کو جانچنے کے لیے ایک ریل کی آزمائشی فلم بنا کر اسے دیکھا جائے۔ میری بات کاردار صاحب اور ایسٹ انڈیا فلم کمپنی کے مالکان کو پسند آئی اور فلم کے لیے بنائے گئے میرے کاسٹیوم میں فلم چندرگپت کے بعض انتہائی مشکل اور ڈرامائی سین فلمائے گئے۔ اپنی اس ایک ریل کی فلم میں میں نے اپنی پوری فنکارانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر کارکردگی کا کھل کر مظاہرہ کیا کیونکہ اس ایک ریل کی فلم سے ہی میری آیندہ کی فلمی زندگی کی کامیابی کا راز وابستہ تھا۔ چنانچہ اس ایک ریل کی آزمائشی فلم کو بنا کر پروجیکٹر پر دیکھا گیا۔ کمپنی مالکان کاردار صاحب اور اسٹاف کے دیگر ممبران نے بھی میری موجودگی میں یہ فلم دیکھی اور سب کو میری اداکاری اور مکالمے بولنے کا انداز پسند آیا۔ کمپنی مالکان نے مجھے وہاں قیام کرنے کی اجازت دے دی۔

فلم چندرگپت میرے لیے اس لحاظ سے بھی نہایت اہمیت کی حامل ہے کیونکہ اس فلم میں میری ملاقات میرے

گل حمید کی خاموش فلمیں

نمبر شمار	فلم	ریلیز	ہدایت کار	کمپنی	کاسٹ
1	صفدر جنگ	1930	اے۔آر۔کاردار	یونائیٹڈ پلیرز کارپوریشن لاہور	ہیرالال، عنایتی سنیاری ففل شاہ گل حمید
2	بریو ہارٹ	1930	اے۔آر۔کاردار	یونائیٹڈ پلیرز کارپوریشن لاہور	غلام قادر، گلزار، ایم ظہور، رفیق غزنوی، گل حمید
3	شفیر ڈگنگ	1930	اے۔آر۔کاردار	یونائیٹڈ پلیرز کاربوریشن لاہور	ایم اسماعیل، گلزار بیگم، ففل شاہ، حسن دین، گل حمید
4	گولڈن ڈیگر	1930	اے۔آر۔کاردار	یونائیٹڈ پلیرز کارپوریشن لاہور	گل حمید، گلزار بیگم، حسن دین، رفیق غزنوی
5	آوارہ رقاصہ	1931	جے۔کے۔نندہ	یونائیٹڈ پلیرز کارپوریشن لاہور	گل حمید، رقیہ خاتون، حسن دین، ہیرلال
6	میسٹریس بینڈٹ	1931	اے۔آر۔کاردار	یونائیٹڈ پلیرز کارپوریشن لاہور	نذیر، گلزار بیگم، اسماعیل، گل حمید
7	سویٹ ہارٹ	1931	جے۔کے۔نندہ	یونائیٹڈ پلیرز کارپوریشن لاہور	اے۔آر۔کاردار، بہار اختر، سردار اختر، ایم ظہور، حسن دین، گل حمید (ریلیز نہ ہوسکی)

خوابوں کی ہیروئن مس سیتا دیوی سے ہوئی۔ میری دلی خواہش تھی کہ میں اس سے ملوں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار جب میری اس سے ملاقات ہوئی تو میں نے یونہی اس سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ بھی فلم ''چندر گپت'' میں کوئی کردار کرے۔ میری بات کے جواب میں اس نے کہا تھا کہ وہ ابھی اتنی بڑی اسٹار نہیں ہے کہ وہ اتنا اہم رول ادا کرسکے۔ لیکن بالآخر اسے ''چھایا'' کے کردار میں کاسٹ کرلیا گیا اور اس طرح میرے خوابوں کی ہیروئن میری فلم کی بھی ہیروئن بن گئی۔

''چندرگپت'' کے بعد میری فلمیں ''ممتاز بیگم'' اور ''عورت کا پیار'' آئیں یہ دونوں فلمیں بھی ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنائی تھیں۔ ان فلموں میں مجھے کریکٹر رول دیے گئے تھے۔ اسی دوران مجھے ''رادھا فلم کمپنی'' کے مسٹر چھاردرائے نے اپنی فلموں میں کام کرنے کی دعوت دی۔ مگر ڈائریکٹر دیو کی بوس کی فلم ''سیتا'' نے مجھے رادھا فلم کمپنی میں شمولیت سے روک دیا۔

میں نے مسٹر بوس سے اصرار کیا کہ مجھے فلم کے دو مرکزی کرداروں میں سے کوئی ایک کریکٹر رول دیا جائے۔ انہوں نے مجھے انتظار کے لیے کہا اور میں انتظار کرنے لگا۔ اس دوران مسٹر بوس نے تین یا چار افراد کو ''لکشمن'' کا کردار کرنے کے لیے آزمایا۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی مسٹر بوس کے معیار پر پورا نہ اترا۔ تب مجھے ''لکشمن'' کا کردار ادا کرنے کے لیے بلوایا۔ فلم سیتا میں میرے ساتھ پرتھوی راج کپور اور مس دُرگا کھوٹے تھیں۔

1933ء کے اواخر میں مسٹر کاردار نے ایسٹ انڈیا فلم کمپنی کے لیے ''سلطانہ'' بنانے کا اعلان کیا جو کہ ان کی کامیاب خاموش فلم "Wandering Dancer" کا بولتا روپ تھی۔ مجھے ہیرو کے رول کی پیش کش کی گئی۔ اس بار ''مس زرینہ خاتون'' میری ہیروئن تھی۔ مس زرینہ بہت سیدھی سادی اور بے حد بصورت تھی۔ وہ سیٹ پر ہر قسم کی سچویشن میں خود کو ڈھالنا جانتی تھی۔

یہاں میں کھلے دل سے تسلیم کروں گا کہ ''سلطانہ'' ہی وہ فلم ہے جس نے مجھے میرے موجودہ مقام تک پہنچایا اس فلم کی بے پناہ کامیابی اور مقبولیت کی وجہ سے ہندوستان

www.pdfbooksfree.pk

بھر سے میرے پرستاروں اور مداحوں کے خطوط میں اضافہ ہوا جن میں سے زیادہ تعداد لڑکیوں کے خطوط پر مشتمل ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ وہ جنون کی حد تک مجھے چاہتی ہیں اور میرے آٹو گراف شدہ فوٹو کی مجھ سے طلب گار ہیں۔ بعض مجبوریوں کے باعث اپنے تمام تر خلوص کے باوجود میں ان کی خواہشات پوری نہ کرسکا۔ کیونکہ ہندوستان کی فلم انڈسٹری کے فنکار اتنے امیر نہیں اور نہ انہیں اس قدر خطیر معاوضہ ملتا ہے جیسا کہ دوسرے ملک کے فنکاروں کو ملتا ہے۔ (یہ ہندوستان کی فلم نگری کی 1930ء کی دہائی کی بات ہے جب ملک کے دیگر محکموں کی طرح فلم انڈسٹری سے وابستہ افراد بھی ماہوار تنخواہ پر ملازم ہوا کرتے تھے اور ایک لگی بندھی تنخواہ میں وہ اپنے قیام وطعام کا بندوبست کرتے تھے اور اپنے اپنے خاندانوں کی کفالت بھی ان کے ہی ذمے ہوتی تھی)

یہ 1934ء کا ذکر ہے جب ڈائریکٹر مسٹر ڈی جی (دھیرن گنگولی) نے "Night Bird" عرف ''رات کا راجا'' کے نام سے ایک حیران کن جاسوسی فلم بنانے کا آغاز کیا۔ اس بار مس انوری نے میرے مقابل ہیروئن کا کردار ادا کیا۔ میں اس لڑکی کو اس وقت سے جانتا ہوں جب یہ میری پہلی متکلم فلم ''حورِ پنجاب'' عرف ''ہیر رانجھا'' میں ہیروئن آئی تھی۔ مس انوری کے بارے میں اس کے سوا کچھ نہیں کہوں گا کہ ''وہ جیسی تھی ویسی ہی ہے۔'' یہاں میں صرف اتنا کہنا چاہوں گا کہ فلم کے سیٹ سے باہر میرا اس کا کوئی تعلق نہیں رہا۔

اب آتے ہیں ہدایتکار ''مدھوبوس'' کی دھوم مچاتی کامیاب فلم ''سلیمہ'' کی طرف۔ اس فلم میں میرے مقابل مس مادھوی ہیروئن تھی۔ مجھے اس سے متعلق ایک واقعہ یاد آرہا۔ جب ایک بار میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے غضبناک نظروں سے مجھے دیکھا اور بے حد ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس کے کندھوں سے ہاتھ ہٹالوں۔ لیکن گزرتے...... وقت کے ساتھ ساتھ وہ ''معصوم لڑکی'' ان باتوں سے مانوس ہوتی چلی گئی اور یہاں تک کہ فلموں میں وہ بڑی بے باکی سے بوسے کے مناظر بھی فلمبند کروانے لگی۔

رواں سال 1935ء میں ''ڈائریکٹر دھیرن گنگولی'' کی ہدایت میں بننے والی فلم ''بدروہی'' عرف ''باغی راجپوت سوار'' کا ذکر کرتے ہیں۔ اس فلم میں ''مس سلطانہ'' (بمبئی والی) میری ہیروئن تھی۔ مس سلطانہ بہ محتاط اور لوگوں میں زیادہ گھلنے ملنے والی لڑکی نہیں تھی۔ اسے ہمیشہ اپنی حیثیت کا زعم رہتا۔ وہ واقعی دلفریب حسن کی مالک تھی۔ اس کے بعد جو ہیروئن مجھے پسند آئی وہ مس راد تھی۔ ''سہراب جی کیر اوالا'' کی فلم step Mother" عرف ''سوتیلی ماں'' میں مس رادھا میری ہیروئن تھی۔ وہ ایک بہت صاف گو، ہمدرد اور آزاد خیال لڑ تھی۔ "Victim or Murderer"۔ مظلوم یا قاتل عرف ''خونی''...... مسٹر جی آر سیٹھی ہدایہ کار تھے اور مس للیتا دیوی میرے مقابل ہیروئن کا کردار کررہی تھی۔

اس کے بعد میں نے اپنی ہدایتکاری میں...... ''خیبر پاس'' شروع کی۔ اس فلم کی کہانی اور منظر نامہ بھ میرا ہی لکھا ہوا تھا۔ یہاں یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ مجھے کبھی بھ ہدایتکاری کا شوق نہیں رہا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ایک وقت میں ہدایتکاری واداکاری دونوں کام نبھانے میں بہ سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسی لیے پہلے پہل میر نے ''خیبر پاس'' کی ہدایتکاری سے انکار کردیا تھا۔ مگر ایسٹ انڈیا فلم کمپنی کے مالک مسٹر بی ایل کھیمکا کے بے حد اصرار کے باعث انتہائی جھجک کے ساتھ میں نے اس فلم کی ہدایتکا... قبول کرلی کہ اپنی ہی لکھی ہوئی کہانی کو اس کی اصل لوکیشن پر جاکر فلمبند کروں۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ اس فلم میں خوش قسمتی سے مس پیشنس کوپر بطور ہیروئن کام کررہی تھیں۔ مس کوپر اس قدر مقبول تھیں کہ ان کی تعریف میں جو کچھ بھی میں کہوں وہ بہت کم ہوگا۔''

مس کوپر تک آکر مضمون ختم ہوگیا تھا مگر جذبۂ شوق بھڑک چکا تھا۔ میں نے اپنے طور پر معلومات اکٹھا کرنا شروع کی، تو معلوم ہوا کہ گل حمید نے خیبر پاس کی کامیابی کے بعد مزید دو بے حد کامیاب فلم باغی سپاہی اور سنہرا اسنسار میں بھی بطور ہیرو کام کیا تھا۔ خاص طور پر ڈائریکٹر اے آر کاردار کی ہدایتکاری میں بننے ولای فلم باغی سپاہی نے تو کامیابی اور مقبولیت کے تمام ریکارڈ توڑ دیے تھے۔ یہ فلم گل حمید کو شہرت اور مقبولیت کی بلند چوٹی پر لے گئی۔ اس فلم میں ان کے ساتھ اس دور کے مشہور فنکاروں نے کام کیا تھا، جن میں محمد اسحاق، بملا کماری، پیشنس کوپر، مظہر خان، حسن دین، چوہدری گل زمان اور اکبر پشاوری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ باغی سپاہی کی بے پناہ کامیابی پر ہندوستان

باغی سپاہی میں بملا کماری کے ساتھ

بھر سے گل حمید کے نام ہزاروں مبارک باد کے خطوط پہنچ رہے تھے جن میں گل حمید کے پرستاروں، دوستوں اور فلمی دنیا کے دیگر فنکاروں نے گل حمید کی شاندار کارکردگی اور کامیابی کی دل کھول کر تعریف کی تھی۔ خوش قسمتی سے وہ فلم مجھے بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا اور گل حمید کی شاندار پرسنیلٹی اور حقیقت سے قریب تر اداکاری سے بے حد متاثر ہوا اور سچ تو یہ ہے کہ گل حمید نے تھیٹر کے دور میں آج کے دور کی اداکاری کی تھی۔

''سنہرا اسنسار'' جسے مشہور کلاسک ڈائریکٹر مسٹر بوس ڈائریکٹ کررہے تھے۔ وہ فلم گل حمید کے کیریئر کی آخری فلم ثابت ہوئی۔ اسی فلم کی تکمیل کے دوران گل حمید کے گلے پر اچانک یکے بعد دیگرے کئی گلٹیاں نمودار ہوگئیں۔ پہلے تو گل حمید نے توجہ نہ دی پھر جب درد کی شدت میں اضافہ ہونے لگا تو اپنے طور پر اس نے ڈاکٹروں سے رجوع کیا۔ ان کی دی ہوئی دوائیں کھاتے رہے اور کام کرتے رہے۔ دواؤں سے کچھ افاقہ نہ ہوا بلکہ سردرد اور بخار بھی رہنے لگا جس سے ان کی کارکردگی بھی متاثر ہونے لگی۔ گل حمید نے پہلے تو اپنی بیماری کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی لیکن پھر اپنی فلم کے مالک مسٹر کھیمکا کو اطلاع دی کہ میں بیماری کے باعث کمپنی کی کسی اور فلم میں کام نہ کرسکوں گا لہٰذا سنہرا سنسار کی تکمیل کے ساتھ ہی کمپنی سے کیا ہوا معاہدہ منسوخ کردیا جائے کیونکہ مجھے جلد از جلد اپنے گاوں واپس پہنچنا ہے۔ مسٹر کھیمکا یہ سن کر بے حد پریشان ہوگئے اور گل حمید کو ان کی رہائش گاہ پر آکر تسلی دی اور پھر کلکتہ کے سب سے بڑے ڈاکٹر کو بلوا کر گل حمید کا معائنہ کروایا۔ ڈاکٹر نے تمام کیفیت کا بہ غور معائنہ کیا اور پھر مسٹر کھیمکا کو لے کر کمرے سے باہر چلے گئے۔

ڈاکٹر اور مسٹر کھیمکا کے جانے کے بعد گل حمید نے

زرینہ خاتون، گل حمید، فلم سلطانہ میں

اپنے ساتھی فنکار حسن دین سے کہا کہ حسن دین تم جانتے ہو کہ... ڈاکٹر مسٹر کھیمکا سے کیا کہے گا۔

حسن دین حیرت سے ان کی جانب دیکھنے لگا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد گل حمید نے کہا۔ ''ڈاکٹر مسٹر کھیمکا سے کہے گا کہ گل حمید لاعلاج ہوچکا ہے۔''

حسن دین نے گل حمید کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''ایسا نہ کہو دوست مایوسی کفر ہے۔ تم بہت جلد ٹھیک ہوجاؤ گے اور ہم پھر ایک ساتھ بہت سی فلموں کام کریں گے۔''

www.pdfbooksfree.pk

گل حمید نے ایک اداس مسکراہٹ کے ساتھ اپنے دوست کو دیکھا اور پھر کہا کہ تم ابھی جاؤ اور مسٹر بوس سے کہو کہ وہ جلد از جلد سنہرا سنسار کو مکمل کریں یا میرا کام مکمل کرلیں تاکہ میں جلد از جلد اپنے گاؤں جاسکوں۔

غرض سنہرا سنسار تیزی سے تکمیل کی جانب اور اپنے وقت کا سپر سٹار موت کی وادیوں کی طرف بڑھتا رہا۔ گل حمید نے دن رات کام کر کے فلم مکمل کروا دی اور فلم کی نمائش کا انتظار کیے بغیر اپنے گاؤں واپس جانے کی تیاری کرنے لگا۔ کاردار صاحب اور مسٹر کھیمکا نے انہیں کلکتہ میں رہ کر علاج کروانے پر زور دیا لیکن گل حمید کسی بھی طرح راضی نہ ہوئے۔ مجبوراً انہیں جانے کی اجازت دے دی گئی اور اگر اجازت نہ بھی ملتی تو وہ کب رکنے والے تھے۔ اسی دوران کسی نے کاردار صاحب اور گل حمید کو بتایا کہ لکھنؤ کے ایک حکیم صاحب گلٹیوں کے علاج کے سلسلے میں بے حد مشہور ہیں کیوں نہ پشاور جاتے ہوئے لکھنؤ میں کچھ دن رک کر حکیم صاحب سے بھی مشورہ کرلیا جائے۔ کاردار صاحب کے بے حد اصرار پر گل حمید نے لکھنؤ والے حکیم صاحب سے مشورے کی ہامی بھر لی۔

گل حمید نے لکھنؤ رکنے کا وعدہ تو کر لیا تھا لیکن اب انہیں گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ چنانچہ فرنٹیئر میل سے پشاور کی سیٹ بک کروالی۔ کاردار صاحب نے اپنے یونٹ کے ایک اداکار لالہ یعقوب کو سفر میں گل حمید کی دیکھ بھال کے لیے ساتھ بھجوایا۔ چلتے وقت گل حمید اپنے تمام دوستوں اور اسٹوڈیوز کے تمام چھوٹے بڑے ملازمین سے فرداً فرداً ملے۔ سب ہی گل حمید کے اس طرح رخصت ہونے کی وجہ سے اداس تھے، اختر نواز، لالہ یعقوب اور پیشنس کوپر کار میں بیٹھ چکے تھے۔ گل حمید بھی سب سے ملنے کے بعد کار کی طرف روانہ ہوئے۔ کار میں بیٹھنے سے قبل گل حمید نے مڑ کر ایسٹ انڈیا فلم کمپنی اور اس سے منسلک اپنی رہائش گاہ کی جانب ایک نظر دیکھا جہاں انہوں نے اپنی زندگی کے بہترین لمحات گزارے تھے۔ جہاں متکلم فلموں میں کامیابی کے حصول کے لیے بے پناہ جدوجہد کی تھی اور پھر شہرۂ آفاق کامیابی، عزت، شہرت اور مقبولیت کی چوٹی تک پہنچنے کے واقعات ان کی نظروں کے سامنے گزر گئے۔ اور اس سے پہلے کہ کوئی ان کی دلی کیفیت کا راز ان کے چہرے سے پڑھ لیتا وہ فوراً کار میں بیٹھ گئے اور کار کلکتہ ریلوے اسٹیشن کی جانب روانہ ہوگئی۔ کچھ دوست بھی اسٹوڈیوز کی گاڑی

پیشنس کوپر کا خط گل حمید کے نام

میرے پیارے سرتاج

مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ جب آپ کا تار مجھے ملا کے لیے میں آپ کی بے حد مشکور ہوں۔ لیکن آپ نے اس وقت تار کیوں نہ بھجوایا جب آپ لکھنؤ سے جا رہے اگر آپ کی روانگی کا علم ہوتا تو خطوط اور تار لکھنؤ کے نہ بھجواتی۔ میں اس قدر پریشان تھی کہ اسی پریشانی میں کو ایک ہی دن میں دو عدد تار بھجوا دیے۔ تو اب نے آپ کو خط لکھا تھا جو کہ میں نے اس کے لیے تحریر کیا تھا۔

ان خطوط اور ڈائیریوں کا کیا بنے گا؟ کیا وہ واپس مل جائیں گی؟

حقیقتاً یہ جان کر مجھے بے حد رنج ہوا کہ تم ابھی شدید بیمار ہو اور تمہیں سخت درد کی شکایت ہے۔ جانْ کیا لکھنؤ میں حکیم آپ کے لیے کچھ نہ کر سکے۔ وہاں آپ نے زیادہ قیام نہیں کیا اور پھر اچانک چھوڑ کر اپنے گاؤں چلے گئے۔ جبکہ لکھنؤ میں آپ کا ایک ہفتہ ٹھہرنے کا ارادہ تھا۔

میری جان، میرے سرتاج! اب تم کیا کر رہے ہو گھر میں تمہارا کیا علاج ہو رہا ہے۔ میں تمہارے لیے دعا کر ہوں اور امید کرتی ہوں کہ گھر میں تمہیں کچھ آرام ملے اگر دس پندرہ یوم تک تمہیں کسی قسم کا افاقہ نہ ہو تو پھر پیار فوراً کلکتہ واپس آجاؤ۔ اور اس بار مجھے موقع دو تا کہ تمہارے لیے کچھ کر سکوں۔ پیارے آپ کے علاقے ان دنوں شدید سردی ہوگی، لیکن یہاں موسم کافی گرم گزشتہ روز سے بارش ہو رہی ہے جس کی وجہ سے موسم حد تک خوشگوار ہوگیا ہے۔ لیکن کچھ زیادہ ہی سردی ہے زیادہ محسوس ہو رہی ہے شاید میری طبیعت کچھ ناساز ہے۔

میں ایک بار پھر بے روزگار ہوگئی ہوں۔ کسی نے سے کہہ دیا کہ میں کام نہیں کرنا چاہتی لہٰذا مجھ سے تصدیق کیے بغیر کمپنی نے اپنے منیجر کو میرے گھر بھیج دیا جو اپنے ساتھ فروری کے 10 روز کی تنخواہ بھی لایا جو کہ اس نے مجھے کر دی۔ میرا خیال ہے کہ کوئی بھی اس بات سے انکار نہیں کر سکتا۔ اسے قسمت کہتے ہیں۔ لیکن میں نہیں جانتی کہ قسمت نے اس قدر جلد میری قسمت میں اتنی زیادہ بدنصیبی کیوں دی۔ گزشتہ چھ ماہ سے یکے بعد دیگرے مصیبتیں ہیں

چلی آرہی ہے۔ بس میں اس انتظار میں رہتی ہوں کہ اس کے بعد کیا ہوگا۔

مجھے امید ہے اور میں بار بار تمہارے لیے دعا کر رہی ہوں کہ تم جلد صحتیاب ہو جاؤ اور فوراً میرے پاس چلے آؤ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ پیارے سرتاج! اب تم مجھے کبھی بھی چھوڑ کر نہیں جاؤ گے نا۔ میں اس قدر تنہا ہوں۔ میرا دل اور دنیا اندھیر ہوگئی ہے۔ میرے دل میں تمہاری جتنی چاہت ہے وہ میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی۔

جان سے زیادہ عزیز میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ میرے دل میں تمہاری چاہت اتنی زیادہ ہو جائے گی۔ میں ایک ایک دن گن گن کر گزار رہی ہوں کہ کب ایک بار پھر میں تمہاری آغوش محبت میں ہوں گی۔

میری جانْ تم جلد اور ضرور واپس آجاؤ اور میری خوشیاں مجھے لوٹا دو۔

مسٹر رام کرشن نے اپنی فلم شروع کر دی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ فلم میڈن اسٹوڈیوز میں مسٹر کاردار ڈائریکٹ کریں گے۔ معلوم نہیں اس فلم کا ہیرو کون ہوگا اور کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں۔ یہاں کے حالات کچھ اچھے نہیں ہیں۔

میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ میں آپ سے کس قدر محبت کرتی ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ مجھے معلوم نہ تھا میں اس قدر تمہارے پیار میں گھو جاؤں گی مجھے ایک طویل اور پیارا سا خط جلد تحریر کریں اور اپنی صحت کا حال بھی ضرور لکھیں کہ اب آپ کی طبیعت کیسی ہے اور کیا علاج ہو رہا ہے۔ اور سارا دن تمہاری کیا مصروفیات رہتی ہیں؟ کیا اب بھی تم سنسپرین (دوا) استعمال کرتے ہو۔ اور یہ بھی لکھنا کہ وہاں کا موسم کیسا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ تمہیں چوم لوں۔ خدا تم پر اپنا فضل کرے اور تمہاری حفاظت کرے اور پیارے تمہیں ڈھیروں خوشیاں نصیب ہوں۔

تمہاری اپنی

پیشنس کوپر

کیا تم جبکہ اب اپنے گھر میں ہو کچھ افاقہ محسوس کرتے ہو؟ کیا درد میں کچھ کمی ہوئی ہے اور کیا بخار کم ہوا ہے۔ میرا سارا دن بستر پر کروٹیں بدلتے اور یہ سوچتے ہوئے گزرتا ہے کہ میں اب کیا کروں گی اور میرا اب کیا بنے گا؟

گل حمید کی پسندیدہ ہیروئن پیشنس کوپر

میں سوار ہو کر انہیں الوداع کہنے کے لیے اسٹیشن تک ساتھ آئے۔ فرنٹیئر میل کچھ دیر میں روانہ ہونے والی تھی۔ گل حمید ریلوے پلیٹ فارم پر اپنے دوستوں کے ساتھ الوداعی ملاقات کر کے گاڑی میں سوار ہوگئے۔ ان کی سیٹ کھڑکی کے ساتھ تھی۔ گاڑی آہستہ آہستہ روانہ ہوئی تو گل حمید نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ تمام دوست ابھی تک پلیٹ فارم پر کھڑے اداس نظروں سے گاڑی کو روانہ ہوتے دیکھ رہے تھے۔ سب کی آنکھیں پُرنم تھیں۔

پیشنس کوپر کی آنکھوں سے برسات کی جھڑی لگی تھی۔ آخری بار دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ گل حمید نے زخمی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی جانب دیکھا اور ہاتھ ہلا کر الوداع کہا اور پھر اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ گئے۔

گل حمید سوچوں میں گم اپنی سیٹ پر بیٹھے کھڑکی سے باہر کی جانب دیکھ رہے تھے۔ گاڑی اب پوری رفتار سے اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی اور اس سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ گل حمید کے ذہن کے پردے پر تمام گزرے واقعات کسی فلم کی طرح چل رہے تھے۔ وہ تمام چہرے جن کے ساتھ اچھے اور برے دنوں کی یادیں وابستہ تھیں ایک

www.pdfbooksfree.pk

گل حمید کی بولتی فلمیں

نمبر شمار	فلم	ریلیز	ہدایت کار	کمپنی	کاسٹ
1	ہیر رانجھا	1932	اے۔آر۔کاردار	پلے آرٹ فوٹو ٹون، لاہور	مس انوری، رفیق غزنوی، لالہ یعقوب، گل حمید
2	عورت کا پیار	1933	اے۔ار۔کاردار	ایسٹ انڈیا فلم کمپنی، کلکتہ	گل حمید، مختار بیگم، مظہر خان
3	ممتاز بیگم	1934	اختر نواز	ایسٹ انڈیا فلم کمپنی، کلکتہ	مس اختری، مظہر خان، علی، اے۔ار۔پہلوان، گل
4	چندر گپت	1934	اے۔ار۔کاردار	ایسٹ انڈیا فلم کمپنی، کلکتہ	گل حمید، سیتا دیوی، مظہر خان، حسن دین
5	سلطانہ	1934	اے۔ار۔کاردار	ایسٹ انڈیا فلم کمپنی، کلکتہ	گل حمید، زرینہ خاتون، طلحہ محمد، اکبر پشاوری
6	سیتا	1934	دیوکی بوس	ایسٹ انڈیا فلم کمپنی، کلکتہ	دُرگا کھوٹے، پرتھوی راج کپور، گل حمید
7	نائیٹ برڈ	1934	دھیرن گنگولی	ایسٹ انڈیا فلم کمپنی، کلکتہ	گل حمید، مس انوری، طلحہ محمد، مظہر خان
8	سلیمہ	1935	مادھو بوس	ایسٹ انڈیا فلم کمپنی، کلکتہ	گل حمید مس مادھوری، علی، مظہر خان
9	اسٹیپ مدر	1935	ایس۔کیراوالہ	ایسٹ انڈیا فلم کمپنی، کلکتہ	گل حمید، رادھا بائی، اے پہلوان، مظہر خان
10	بدروہی	1935	دھیرن گنگولی	ایسٹ انڈیا فلم کمپنی، کلکتہ	گل حمید، مس سلطانہ، حسن دین، مظہر خان
11	مرڈر	1935	جی۔ار۔سیٹھی	ایسٹ انڈیا فلم کمپنی، کلکتہ	گل حمید، للیتا دیوی، پیشنس کوپر، مظہر خان
12	خیبر پاس	1936	گل حمید	ایسٹ انڈیا فلم کمپنی، کلکتہ	گل حمید، پیشنس کوپر، طلحہ محمد، اکبر پشاوری
13	باغی سپاہی	1936	اے۔ار۔کاردار	ایسٹ انڈیا فلم کمپنی، کلکتہ	گل حمید، بملا کماری، محمد اسحاق، مظہر خان
14	سنہرا سنسار	1936	دیوکی بوس	ایسٹ انڈیا فلم کمپنی، کلکتہ	گل حمید، رام پیاری، وجے کمار، مظہر خان

ایک کرکے..... یاد آرہے تھے اور ان کے خوبصورت چہرے پر کبھی ایک اداس مسکراہٹ اور کبھی غم کی پرچھائیاں لہرانے لگتیں۔ لالہ یعقوب نے ان سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن انہیں یادوں میں ڈوبا دیکھ کر خاموش رہنا مناسب سمجھا۔

فرنٹیئر میل اپنی پوری رفتار سے اُڑی جارہی تھی

سنہرا سنسار میں ہیرو سُن رام پیاری کے ساتھ

کھڑکی سے باہر کے تمام مناظر پیچھے کی جانب بھاگتے نظر آرہے تھے۔ گل حمید کی نگاہیں بھی پیچھے کہیں دور اپنے ماضی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ یہ وہی فرنٹیئر میل تھی جس سے گل حمید نے کئی بار پشاور، لاہور کی جانب سفر کیا تھا صرف کامیابی کی منزل کی تلاش میں اور اب جبکہ وہ اپنی منزل پا چکا تھا اور شہرت اور کامیابی کی بلند ترین چوٹی پر براجمان ہو چکا تھا تو یہی فرنٹیئر میل اسے لیے ہوئے کامیابی کی منزلوں سے دور موت کی انجان وادیوں کی جانب گامزن تھی۔ کسی اسٹیشن پر جب گاڑی رکتی تو مسافر اور خوانچے والوں کی آوازوں سے یادوں کا سلسلہ تھوڑی دیر کے لیے منقطع ہوجاتا۔ گاڑی کے چلتے ہی پھر وہی یادیں وہی ماضی غرض یادوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا۔

لکھنؤ کے اسٹیشن پر جب گاڑی رکی تو لالہ یعقوب نے اسے ماضی کی یادوں سے جگایا۔ گل حمید نے آنکھیں کھول کر ان کی جانب دیکھا۔ لالہ یعقوب نے کہا کہ لکھنؤ آگیا ہے۔ یہاں ہمیں ان حکیم صاحب سے ملنا ہے جن کے بارے میں کاردار صاحب اور دیگر دوستوں نے تاکید کی تھی۔ لالہ یعقوب کی منتوں پر جب گل حمید نہیں مانے تو لالہ اداس چہرہ لیے ایک جانب بیٹھ گئے۔ کسی کی دل آزاری خصوصاً دوستوں کی ناراضی گل حمید کا شیوہ نہیں تھا۔ اپنی دل فریب مسکراہٹ کے ساتھ لالہ یعقوب کے روٹھے چہرے کی جانب دیکھا۔ لالہ نے منہ موڑ لیا اور دوسری جانب دیکھنے لگے۔ گل حمید نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ چلو اٹھو اب زیادہ ایکٹنگ کی ضرورت نہیں ہے تم کوئی مجھ سے بڑے ایکٹر نہیں ہو۔ لالہ اس بات پر مسکرا دیے اور جلدی سے سامان اتار کر پلیٹ فارم پر رکھ دیا کہ کہیں گل حمید کا ارادہ بدل نہ جائے۔ گل حمید بھی گاڑی سے نیچے اتر آئے۔ اس وقت انہوں نے اپنا چہرہ مفلر سے ڈھانپ رکھا تھا تاکہ کوئی پہچان نہ لے۔ دونوں دوست ایک تانگے میں سوار ہوکر حضرت گنج میں واقع گل حمید کے دوست مسٹر اے حفیظ کے گھر کی جانب روانہ ہوگئے۔ گل حمید نے ہوٹل میں ٹھہرنے کی بجائے دوست کے ہاں ٹھہرنا

پروڈیوسر بی ایل کھیمکا جی

مناسب سمجھا کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اگر ہوٹل میں ٹھہرے تو ان کی آمد کی خبر پورے لکھنؤ میں پھیل جائے گی اور اس شدید تکلیف کی حالت میں وہ کسی ہجوم کا سامنا کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ تانگا جب اے حفیظ کے گھر

www.pdfbooksfree.pk

گل حمید کی آخری آرام گاہ

پہنچا تو مسٹر حفیظ گل حمید کی یوں اچانک آمد پر حیران بھی ہوئے اور خوش بھی۔ انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ گل حمید نے اپنی مشہور زندہ دلی سے مسکراتے ہوئے کہا کہ اب حیران ہی ہوتے رہو گے یا ہمیں اندر آنے کے لیے بھی کہو گے حفیظ شرمندہ ہو کر آگے بڑھے اور گل حمید سے اور لالہ یعقوب سے گلے ملے اور انہیں مہمان خانے میں لے آئے جو کہ مکان کی اوپر والی منزل پر تھا۔ یہ مکان بازار کے بیچوں بیچ تھا جس کی ایک بڑی کھڑکی بازار کی طرف کھلتی تھی جہاں سے دور تک بازار کا منظر دیکھا جاسکتا تھا۔

اے حفیظ نے جلدی جلدی مہمانوں کی تواضع مشروبات اور کھانے سے کی۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد گل حمید اور لالہ یعقوب نے حکیم صاحب کے پاس چلنے کے لیے کہا۔ حفیظ نے جواب دیا کہ آپ آرام کیجیے میں حکیم صاحب کے مطب جا کر اوقات کار کے بارے میں معلومات حاصل کر آتا ہوں۔

کچھ دیر بعد حفیظ واپس ہوئے اور کہا کہ جس حکیم صاحب سے ملنے آپ تشریف لائے ہیں وہ چند روز قبل فریضہ حج کے لیے لکھنؤ سے مکہ معظمہ جا چکے ہیں۔ البتہ ایک اور مشہور حکیم صاحب عبدالحسیب جو کہ شفاء الملک کے نام سے مشہور ہیں ان سے میں بات کر آیا ہوں۔ میں نے ان سے آپ کی تمام کیفیت بیان کر دی ہے۔ انہوں نے شام میں آپ کو بلایا ہے۔

گل حمید نے لالہ یعقوب سے کہا کہ میرا خیال ہے رات کی گاڑی سے پشاور کے لیے روانہ ہو جائیں لیکن لالہ یعقوب اور حفیظ کے اصرار پر گل حمید حکیم صاحب سے ملنے کے لیے راضی ہو گئے لیکن شرط رکھی کہ صبح کی فرنٹیئر میل سے ہر حالت میں روانہ ہونا ہے۔ بہرحال شام کو گل حمید، لالہ یعقوب اور اے حفیظ، حکیم صاحب کے مطب پہنچے۔ حکیم صاحب کو حفیظ کے ذریعے گل حمید کی شخصیت، مقام اور شہرت کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ انہوں نے گل حمید سے ان کی بیماری کے بارے میں تفصیلی گفتگو کی اور آخر اس نتیجے پر پہنچے کہ گل حمید چند دن کے لیے دواخانے کی اوپر منزل میں رہائش اختیار کریں تاکہ وہ اپنی نگرانی میں ان کا علاج کر سکیں لیکن گل حمید اس کے لیے تیار نہ ہوئے اور حکیم صاحب سے دوائیں اور ان کے استعمال سے متعلق نسخہ لے کر واپس حفیظ کے مہمان خانے

گل حمید کے چھوٹے بھائی سید جمال خان

میں آگئے اور اپنے لیے مخصوص کمرے میں آرام کی غرض سے لیٹ گئے۔ اب رات ہو چکی تھی لیکن گل حمید کی قسمت میں آرام کہاں۔ لالہ یعقوب کو آواز دے کر بلوایا اور ان سے کہا کہ لالہ صبح ہر صورت میں فرنٹیئر میل کے لکھنؤ پہنچنے سے قبل ہمیں ریلوے اسٹیشن پہنچنا ہے۔ اب تم بھی آرام کرو اور میں بھی سونے کی کوشش کرتا ہوں۔

لکھنؤ کی وہ رات گل حمید پر بہت سخت گزری۔ ایک تو سر کا درد شدت اختیار کر گیا دوسرے بازار کا شور اس قدر تھا کہ گل حمید ایک لمحہ بھی آرام سے سو نہ سکے۔ یہ لکھنؤ شہر تھا جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ عام حالات میں گل حمید بھی شاید اس رونق سے لطف اندوز ہوتے لیکن اس تکلیف کے عالم میں ایک رات کاٹنی بھی کسی عذاب سے کم نہ تھی۔

صبح ہوتے ہی گل حمید اور لالہ یعقوب اے حفیظ کے ہمراہ اسٹیشن پہنچے۔ گاڑی آچکی تھی گل حمید اور لالہ یعقوب گاڑی میں سوار ہو گئے۔ گاڑی کے چلنے تک اے حفیظ کھڑکی کے قریب کھڑے گل حمید سے باتیں کرتے رہے۔

اب پھر وہی فرنٹیئر میل تھی، گل حمید تھے اور یادوں کی برات لاہور پہنچی تو گل حمید نے ایک بار پھر چہرے کو مفلر سے ڈھانپ لیا کہ کوئی پہچان نہ لے۔ گل حمید لاہور کے پلیٹ فارم پر گھومتے رہے۔ لاہور کے اسٹیشن پر ہمیشہ سے گاڑی کافی دیر تک رکتی ہے۔ وہ پلیٹ فارم پر کافی دیر چہل قدمی کرتے رہے۔ یہ وہی لاہور تھا جہاں سے انہوں نے اپنے فلمی کیریئر کی ابتدا کی تھی۔ جہاں ان کے بہت سے فلمی اور غیر فلمی دوست تھے۔ ایک لمحہ کو ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ چند لمحے اپنے لاہور کے دوستوں کے پاس گزارے جائیں لیکن پھر یہ سوچ کر اپنا ارادہ بدل دیا کہ اگر ایک بار لاہور ٹھہر گئے تو پھر دوستوں کی محبت پاؤں کی زنجیر بن جائے گی۔ وقت ان کے پاس بہت کم رہ گیا تھا

گل حمید کا ایک انداز

پھر اچانک انہیں خیال آیا کہ کلکتہ سے روانگی کے وقت انہوں نے اپنے گھر والوں کو تو اپنی آمد کی اطلاع ہی نہیں دی، کہیں یوں غیر متوقع اور اچانک آمد سے سب گھر والے پریشان نہ ہو جائیں۔ یہ سوچ کر گل حمید فوراً اسٹیشن پر موجود تار گھر پہنچے اور اپنے چھوٹے بھائی سید جمال خان جو کہ اس وقت نوشہرہ کے اسلامیہ ہائی اسکول میں زیر تعلیم تھا اس کے نام ایک مختصر سا ٹیلی گرام تحریر کیا۔

www.pdfbooksfree.pk

’’طبیعت ناساز ہے آج کی فرنٹیئر میل سے پہنچ رہا ہوں۔گل حمید۔‘‘

10 فروری 1937ء کو ٹرین اپنے مقرر وقت پر نوشہرہ پہنچ گئی جہاں سے ان کا گاؤں پیر پیائی نزدیک تھا۔سید جمال خان گاڑی کے ساتھ اسٹیشن پر موجود تھا۔لہٰذا گل حمید اور لالہ یعقوب اس کے ہمراہ پیر پیائی کے لیے روانہ ہو گئے۔گاؤں پہنچ کر گل حمید نے لالہ یعقوب کو اپنے ذاتی حجرے میں ٹھہرایا ...اور بھائی سے کہا لالہ یعقوب کی خاطر تواضع میں کسی قسم کی کمی نہ آنے پائے اور پھر خود اپنے آبائی گھر اپنی والدہ کے پاس پہنچ گئے گھر والوں کو اطلاع مل چکی تھی۔گل حمید فرداً فرداً سب سے ملے اور ان کی خیریت دریافت کی۔اس اچانک آمد پر سب ہی خوش ہوئے اس خوشی میں کسی کو یہ دھیان نہ رہا کہ گل حمید کی کمزوری کس قدر بڑھ چکی ہے،خود گل حمید نے بھی کسی کو کچھ نہ بتایا کہ وہ بیماری کے کس عذاب سے دوچار ہیں لیکن ان کی والدہ سے بیٹے کی حالت چھپی نہ رہ سکی۔گل حمید سب سے مل کر اپنے کمرے میں یہ کہہ کر چلے گئے کہ مجھے سفر کی تھکاوٹ ہے ۔ذرا آرام کرنا چاہتا ہوں۔ لالہ یعقوب چند دن تک مہمان کی حیثیت سے ان کے حجرے میں مقیم رہے اور پھر گل حمید سے اجازت لے کر کلکتہ لوٹ گیا۔

گل حمید کے چند قریبی دوستوں کے علاوہ کسی کو بھی معلوم نہ تھا کہ اپنے وقت کا سپر اسٹار بھرا میلہ چھوڑ کر انتہائی خاموشی سے اپنے گاؤں پہنچ گیا ہے۔ دوسرے شہروں میں رہنے والے اس کے دوستوں اور پرستاروں کے خطوط اب بڑی تعداد میں ایسٹ انڈیا فلم کمپنی کلکتہ کے پتے پر پہنچ رہے تھے جہاں سے اسٹوڈیو کا عملہ تمام ڈاک گل حمید کے گاؤں کے پتے پر روانہ کر دیتا تھا۔گاؤں میں گل حمید کی اب کوئی مصروفیت نہ تھی سوائے اس کے کہ ماں کے زانو پر سر رکھے ان سے باتیں کرتے رہتے یا کمپنی کی معرفت آئے ہوئے خطوط کا مطالعہ کرتے رہتے۔

گھر والوں اور دیگر رشتے داروں کے مجبور کرنے اور ان کا دل رکھنے کی خاطر ایک بار پشاور کے مشہور لیڈی ریڈنگ ہسپتال بھی گئے ۔ڈاکٹر نے معائنہ کیا اور آپریشن کی تجویز پیش کی لیکن گل حمید راضی نہ ہوئے اور واپس گاؤں لوٹ گئے گل حمید کو اب صرف موت کا انتظار تھا موت جو کہ ایک اٹل حقیقت ہے۔

دن تیزی سے گزرتے رہے اور وقت کا سپر اسٹار موت کی جانب بڑھتا رہا اور آخر ایک دن موت کا وار چل گیا۔گل حمید اپنی والدہ کے زانو... پر سر رکھے لیٹے ہو[ئے] تھے۔گھر والے جاگ رہے تھے۔آج درد بھی کچھ سوا تھا گل حمید سب سے اپنی تکلیف چھپانا چاہتے تھے کیونکہ ایک کامیاب اداکار تھے اور اپنے جذبات کو چھپانے کا ہنر جانتے تھے لیکن ماں ایک ایسی ہستی ہے جو اپنی اولاد کی خوشی اور غم کو ہر حال میں جان لیتی ہے ۔ کوئی کتنا بھی اداکار کیوں نہ ہو اپنی ماں سے اپنے اوپر گزرنے والی کیفیت نہیں چھپا سکتا۔گل حمید کی ماں بھی اپنے بیٹے کی تکلیف سے پوری طرح آگاہ تھیں۔

یہ 18 اپریل 1937ء کی رات تھی۔شام سے ہی گل حمید کی تکلیف میں شدت آگئی تھی۔گل حمید کی بے چینی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ والدہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ دیگر اہلِ خانہ بھی اشکبار تھے لیکن فرشتۂ اجل کو کب کسی کے آنسوؤں کی پروا تھی ۔وہ آیا اور گل حمید کی روح کو ساتھ لے کر آسمان کی بلندیوں کی جانب محوِ پرواز ہو گیا۔گھر میں سب ہی کے دل غم سے بوجھل تھے اور آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات تھی جو تھمنے میں نہیں آرہی تھی۔دوسرے دن گل حمید کو اپنے والد محترم سیف اللہ خان کے پہلو میں بے شمار اشکبار آنکھوں کے ساتھ سپردِ خاک کر دیا گیا۔امان گڑھ اور ہیڈ برج کے قریب جی ٹی روڈ کے کنارے اپنے آبائی قبرستان میں گل حمید ابدی نیند سو رہے ہیں۔ ان کی قبر پر لگے سنگِ مرمر کے کتبے پر یہ عبارت کندہ ہے۔

ستارۂ ہند
جواں مرگ گل حمید
تاریخ وفات 18 اپریل 1937ء

ہائے گل چینِ اجل کیا تجھ سے نادانی ہوئی
پھول وہ توڑا کہ گلشن بھر میں ویرانی ہوئی

گل حمید کی موت کی خبر پورے ہندوستان میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔اسٹوڈیوز میں ہر قسم کی فلمبندی کا کام روک دیا گیا۔سب دوست احباب اور اسٹوڈیو کے ورکرز کاردار صاحب کے گرد جمع ہو گئے ایسٹ انڈیا فلم کمپنی کے مالک بی ۔ایل ۔ کھیمکا صاحب بھی وہیں چلے آئے۔ اس اندوہ ناک خبر سے سب ہی نڈھال تھے۔گل حمید سب کے بے تکلیف دوست تھے سب کی آنکھوں میں گل حمید کا پھولوں کی طرح شگفتہ اور مسکراتا ہوا چہرہ تھا جو کہ اب ان سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا تھا۔

تلاشِ مرقد

مختار آزاد

قلوپطرا، ایک ایسا نام، ایک ایسا کردار جو صدیوں سے ذہنوں میں تازہ ہے اور منفی مانا جاتاہے۔ کیا وہ واقعی منفی کردار کی حامل تھی۔ کیا وہ واقعی حیوانی جبلّت کی حامل تھی؟ ایک ایسا تحقیقی مضمون جو آپ پر سوچ کے در وا کردے گا۔

انتہائی تلاش و جستجو کے بعد ترتیب دی گئی جامع تحریر

ارے کہاں......اوہ قلوپطرہ......کہاں ہے وہ؟

حیرانی کی ضرورت نہیں، دیکھنے نکلو گے تو وہ بہت ساری جگہوں پر نظر آجائے گی۔وہ خود تو دنیا میں نہ رہی مگر موت کو دو ہزار سال سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود اس کا نام اور تذکرہ، تاریخ اور عوام، دونوں میں اب تک زندہ ہے۔دنیا کے بازار میں دریائے نیل والے مصر کی اُس آخری فرعون کے نام کا سکہ اب بھی چلتا ہے۔ادب، تاریخ فلم اور موسیقی سے لے کر بازار میں بکنے والی جس شے پر قلو

www.pdfbooksfree.pk

پطرہ کے نام کی مہر لگی ہو تو کامیابی کے لیے صرف یہی اِک نام کافی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بورڈ گیمز، ڈرائی کلینز، فحش رقاصاؤں، آئس کریم پارلر، فلم، کتاب، تھیٹر، بیلے رقص حتیٰ کہ بحیرۂ روم کی آلودگی پر قابو پانے کے لیے شروع کیے گئے پراجیکٹ تک کا نام قلوپطرہ کے نام پر کبھی نہ رکھا جاتا۔ صرف اس پر ہی موقوف کیا، اس نام نے فلک پر نظریں جمائے تحقیق میں مصروف ماہرینِ فلکیات کو بھی اپنے حُسنِ بلا خیز کی گرفت میں جکڑ رکھا ہے۔ ماہرینِ فلکیات نے بہت پہلے ایک سیارچہ دریافت کیا جو سورج اور مریخ کے درمیان محوِ گردش ہے۔ اس کا مدار سورج ہے۔ ماہرینِ فلکیات نے اس سیارچے کو نام دیا '216 قلوپطرہ'۔

قلوپطرہ کا غسلِ خوشبو مشہور تھا۔ اس مناسبت سے مغرب کے ایک مشہور خوشبو ساز ادارے نے اپنے بہت مہنگے پرفیوم کا نام 'قلوپطرہ' رکھا۔ فراعین کے مصر کی آخری حکمران ملکہ زہر کی شوقین تھی۔ وہ نت نئے اقسام کے سمِ قاتل کی ہلاکت خیزی کا پتا چلانے کے لیے قیدیوں پہ تجربہ کیا کرتی تھی۔ قیدیوں کو زہر پلا کر، زہریلے سانپوں سے ڈسوا کر، تڑپتے انسانی وجود کے ٹھنڈا پڑنے کے دورانیے سے اُسے تجربے کی کامیابی کا یقین ہو جاتا تھا۔ قلوپطرہ کے اُس شوق کی مناسبت سے مشرقِ وسطیٰ کے ایک مشہور سگریٹ کا نام رکھا گیا۔ نام بھی چلتا ہے اور موت کی نسبت بھی برقرار ہے۔ قلوپطرہ کا زہر اب بھی پیا جاتا ہے۔ اب یہ کام زہریلے سانپ نہیں، اُس کے نام پر بکنے والی سگریٹ کر رہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ملکہ کا زہر سریع الاثر تھا، سگریٹ کا دھواں سست رو موت لاتا ہے مگر کام دونوں کا ایک ہی ہے۔

دنیا کی مختلف زبانوں میں قلوپطرہ پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ حال ہی میں امریکا میں اس پر ایک کتاب شائع ہوئی ہے جسے 'بیسٹ سیلر' قرار دیا گیا۔ کتاب کا نام ہے 'قلوپطرہ: 1540 سے 1905۔' کتاب میں قلوپطرہ کے نام کی اسی حکومت کا جائزہ ہے، جس کا ذکر ہم کر چکے۔

کتاب کے مطابق گزشتہ ساڑھے تین صدیوں کے دوران قلوپطرہ کے نام کو استعمال کر کے جہاں اور بہت سی چیزوں نے شہرت اور دولت پائی، وہیں اس کے افسانوی کردار پر پانچ بیلے رقص کے نام رکھے گئے، اس کی زندگی پر 77 اسٹیج ڈرامے پیش ہوئے۔ قلوپطرہ کے مرکزی خیال پر امریکا میں دنیا کی سات مشہور فلمیں بن چکی ہیں۔ آٹھویں

فلم تیاری کے مراحل میں ہے۔ جس میں امریکا کی مشہور خوبرو اداکارہ انجلینا جولی قلوپطرہ کے کردار میں جلوہ گر ہوگی۔ مصنف نے امریکا کا جائزہ پیش کیا مگر قلوپطرہ کی شہرتِ دنیا کے ہر براعظم کے فلک پر جگمگا رہی ہے۔

معروف امریکی نقاد ہیرلڈ بلوم کے سنہرے لفظ اس نہ ختم ہونے والی بحث کا اختتام ہے، اُن کا فقرہ ہے:

''قلوپطرہ دنیا کی پہلی سلیبرٹی عورت تھی۔ یہ اعزاز اب بھی اس کے پاس ہے اور آنے والے ہر دور میں وہ سلیبرٹی ہی رہے گی۔''

شیکسپیئر کے الفاظ میں ذرا سا ردّوبدل کر کے کہیں تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ گر تاریخ ایک اسٹیج ہے تو پھر اس جیسی ورسٹائل اداکارہ آج تک اس اسٹیج پر نہیں آئی وہ بادشاہ کی بیٹی تھی، بادشاہ کی ماں تھی، بادشاہ کی بہن تھی...... اُس کی رگوں میں جرنیلی خون تھا۔ وہ صحیح معنوں میں جرنیلی خون اور 'شاہی مزاج' کی منفرد عورت تھی۔ اس کا ہر رشتہ، ہر تعلق سلطنت سے جڑا تھا اور ہر انداز نخوتِ شاہی کا عکاس تھا۔ اس کا ہر حکم جرنیلوں جیسے اٹل لہجے کا عکاس تھا۔

قلوپطرہ کی شہرت کا ڈنکا آج بھی چہار سُو بج رہا ہے...... وہ دنیا میں ہوگی تو اس کے حُسن کا چرچا اشرافیہ کی محفلوں کی جان ہوگا، اُس سے ملنا زندگی کا یادگار لمحہ تصور ہوتا ہوگا۔ اُس کی ہیبت اور حُسنِ فسوں خیز دلوں کو گرما دیتا ہوگا۔ وہ نہ رہی تب بھی اُس کے تذکرے چٹخارے لے لے کر پڑھے جاتے ہیں۔ تاریخ کو خشک موضوع خیال کیا جاتا ہے مگر تاریخ کی جن کتابوں کے صفحات پر قلوپطرہ کا نام لکھا ہے وہاں دُور تک رنگینیاں بکھری ہیں۔ قلوپطرہ کے جلوۂ حُسن کی طرح اس کے رومانوی قصے آج بھی رنگین مزاجوں کے تصور کو گرما دیتے ہیں۔

قلوپطرہ تاریخ کی وہ ملکہ ہے جو فرعون کہلائی۔ وہ سلطنتِ مصر کی بادشاہ تھی اور خود اپنی ملکہ بھی۔ کہتے ہیں کہ اُس کی ذات سے فرعونیت کے وہ تمام معنی و مطالب جھلکتے تھے جو اُردو میں لفظ 'فرعون' سے وابستہ ہیں۔ اُس کے نام سے تاریخ میں اَن گنت قصے منسوب ہیں۔ اُس کا نام اور بدنامی ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ ممکن ہے کہیں کہیں زیبِ داستاں بڑھانے کے لیے مورخوں اور مصنفوں نے رنگ آمیزیاں کی ہوں ہیں مگر انہیں حذف بھی کر دیا جائے تب بھی اُس کا نام ہی سب کچھ بیان کر دینے کے لیے کافی ہے۔ یہ نام لیتے ہی تخیل میں سرو قامت دِلرُبا کا پری چہرہ اور

ریشم کے حریری لبادے میں لپٹا حسین سراپا چشمِ تصور کے رُوبرُو ابھر آتا ہے۔

''قلوپطرہ واقعی اپنی زندگی میں بہت خوش نصیب عورت تھی مگر زندگی کے انجام .. اور تاریخ کے سفر میں بد نصیب ثابت ہوئی۔'' یہ رائے تھی امریکی ادیب اور قلوپطرہ کی سوانح کو ایک نئے اسلوب سے لکھنے والے مائیکل گرانٹ کی۔ وہ مزید کہتے ہیں۔ ''اس کے نام سے ہوس جڑی ہے۔ اس کا ذکر افسانوی داستانوں اور دشنام طرازی کی دھند میں کھو گیا ہے۔ یہ دھند اتنی دبیز ہے کہ اس کے پردے میں قلوپطرہ کی شخصیت کا اصل رنگ اور اس کے ارد گرد کی پوری دنیا ہی تاریخ میں دھندلا کر رہ گئی ہے۔ وہ کہیں نہیں، اس کے مقبرے کا نام و نشان اور محلات کے آثار بھی نہیں ملتے۔ وہ دو ہزار برس سے بھی بہت پہلے اس دنیا سے جا چکی مگر اب بھی نہ ہونے کے باوجود ہر جگہ موجود ہے۔ اُس کے ساتھ جنسی ہوس کی داستانیں منسوب ہیں اور ان افسانوی داستانوں نے طرح طرح کے ایسے چہرے تراشنے کی کوشش کی ہے کہ جن کے ہر زاویے سے ہوس ٹپکتی نظر آئے۔ فلم، رقص، تاریخ یا پھر ادب...... قلوپطرہ کی شخصیت صرف مجسم پیکرِ ہوس نظر آتی ہے۔ اس کے اصل خدّ و خال کیا ایسے ہی تھے، کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ایک نام، شاید تھوڑی سی حقیقت اور بڑی مقدار میں افسانوی داستانوں کا نام قلوپطرہ ہے۔ اس کے چٹ پٹے قصوں کو پڑھ کر ہر تخیل یہ سوچنے میں آزاد ہے کہ قلوپطرہ ایسی ہی ہوگی۔ فنونِ لطیفہ کے اس تخیل نے ایسے ایسے چہرے اس حسین ملکہ کے نام پر تراشے کہ تقابلی جائزہ لو تو اُن میں رتی بھر مشابہت نظر نہیں آتی۔ نظر بھی آئے تو کیوں، ایسی کوئی پینٹنگ یا مجسمہ اب تک دنیا کی نگاہوں کے سامنے نہیں آیا، جس کی طرف اُنگلی اٹھا کر ہم کہہ سکیں ارے! ایسی نظر آتی تھی ملکہ قلوپطرہ۔''

مائیکل گرانٹ ٹھیک کہتے ہیں مگر اب صورتِ حال بدل رہی ہے۔

کچھ عرصے پہلے بحیرۂ روم کے سمندر کی تہ سے ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے بیس فٹ اونچا سنگی مجسمہ دریافت کیا ہے جو سمندر بُرد ڈینڈیرا نامی مندر میں تھا اور اب عجائب گھر میں رکھا ہے۔ سنگِ مرمر سے بنے اس مجسمے کی اصل حقیقت تو اب تک پردے میں ہے لیکن نہایت واضح اور بالکل درست حالت میں بے چہرہ مجسمے کے باقی خطوط صاف کہتے

ہیں کہ یہ اپنے دور کی کسی عظیم عورت کا ہوگا۔ کچھ کا کہنا ہے کہ یہ قلوپطرہ کا مجسمہ ہے۔ بات اب تک ثابت تو نہیں ہو سکی مگر تحقیق جاری ہے۔ اگر یہ خیال سچ ثابت ہوا تو شاید مائیکل گرانٹ کو اپنی رائے بدلنی پڑے گی۔ لوگ اُس مجسمے کو دیکھ کر یہ ضرور کہہ سکیں گے ''ارے ایسی نظر آتی تھی حُسن کی دیوی ملکہ قلوپطرہ۔''

قدیم مصری اور اطالوی مورخین نے بھی قلوپطرہ کے ذکر پر اُس کے حُسنِ فسوں خیز اور جنسی کشش کو ہی واضح کیا ہے، اس کے چہرے کے خدوخال کا کہیں ذکر نہیں ملتا کہ جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ صدیوں تک سمندر کی تہ میں روپوش مجسمہ کیا واقعی قلوپطرہ کا ہو سکتا ہے۔ مگر حقیقت تو یہ ہے کہ مجسمے کے خطوط، لباس، زیرِ آب مجسمے سے کچھ فاصلے پر ملنے والے شکستہ سنگی سر پہ بندھا ہیئر بینڈ جیسا اسکارف اور اس کے چہرے کے خدوخال اس بات کی بڑی حد تک دلیل پیش کرتے ہیں کہ وہ عورت تھی بہت ناز و اداؤں، تمکنت اور طنطنے والی۔ سنگی چہرے پر بیک وقت معصومیت، چالاکی، شاہی رعونت اور جرنیلوں جیسا حوصلہ... سب کچھ نظر صاف آتا ہے۔

قلوپطرہ اپنے عہد کی عظیم ترین رومن تہذیب کے دو طاقت ور مردوں کے دلوں پر حکمرانی کرتی تھی۔ وہ دونوں مرد جن کے اشارۂ ابرو پر سب کچھ ممکن تھا مگر وہ اس کے آگے بے بس تھے۔ ان دونوں میں سے ایک تھا جولیس سیزر جس کے ایک بیٹے نے قلوپطرہ کے بطن سے جنم لیا۔ دوسرا تھا مارک انتونی جو ایک دہائی تک اس کا محبوب رہا اور قلوپطرہ کے بطن سے اُس کی تین اولادوں نے جنم لیا۔ دونوں اس کی نگاہوں کے سامنے مارے گئے یا یوں کہیں کہ اُس کی ادا پہ اپنی جان نچھاور کر کے دنیا سے رخصت ہوئے۔ وہ حُسنِ فسوں خیز...... قدیم یونانی مورخ پلوٹارک کے الفاظ میں پڑھیے:

''وہ نہایت حسین و جمیل تھی۔ شاید ہی اتنی حسین عورت اُس وقت دنیا میں کوئی اور ہو۔ اُس کی چال میں تمکنت، سراپا میں وقار اور آنکھوں میں غرور تھا۔ وہ بڑی شان سے کنیزوں کے جلو میں محل کی راہ داریوں میں چلتی تھی۔ اس کے ریشمی لبادے کو تھام کر پیچھے پیچھے درجنوں کنیزیں چلا کرتی تھیں راہ داری کے کسی موڑ پہ مڑتی تو اس کی کمر ہلکے سے لچک جاتی تھی۔ جب وہ اپنے عہد کے بڑے بڑے امرا کو معاملاتِ سلطنت پر گفتگو کے لیے بلاتی

www.pdfbooksfree.pk

تو اس کے حُسن کی تاب نہ لاتے ہوئے اُن جری مردوں کے پتے پانی ہونے لگتے تھے۔ آدابِ شستہ گفتگو کا سلیقہ اور تحکمانہ لہجہ اس کا شاہی ورثہ تھا مگر وہ اسے برتنا بھی خوب جانتی تھی۔ وہ جوانی میں ملکہ اور بچپن میں شہزادی تھی۔ غرور، تکبر اور حکم اُس کے خون میں شامل تھا۔ اُس کی آواز بھی اُس کی طرح نہایت خوبصورت اور لہجہ غنائیت بھرا تھا۔ جب وہ اپنی دلکش آواز میں بولتی تو ایسا لگتا تھا کہ ساز کے سارے تار ماہر موسیقار کی اُنگلی کی جنبش سے ایک ساتھ تھرتھرا اٹھے ہوں۔ اُس کی آواز سے محل کے در و دیوار میں جلترنگ بجتے محسوس ہوتے تھے۔''

تاریخ میں پلوٹارک کے انداز میں جہاں اور بہت کچھ مواد ملتا ہے وہیں ابہام بھی باقی ہے۔ ابہام جسے دور کرنے کے لیے اکیسویں صدی میں ماہرینِ آثارِ قدیمہ کی کوششیں اپنے عروج پر ہیں۔۔ شاید ابہام کی دُھند چھٹنے میں کچھ ہی وقت رہ گیا ہے۔

☆☆☆

قلوپطرہ نسلاً یونانی تھی۔ اس کی رگوں میں جرنیلی خون شامل تھا۔ اُس کے انداز میں نڈرپن اسی خون کا نتیجہ تھا۔ وہ بطلیموس لاگس کی اولادوں میں سے تھی۔ بطلیموس سکندرِ اعظم کی فوج کا ایک جی دار جرنیل تھا۔ سکندر نے 332 قبل مسیح میں سلطنتِ مصر کو فتح کیا اور پھر اس کا انتظام اسی جرنیل کے سپرد کر کے جہاں داری کی مہم سر کرنے کے لیے آگے بڑھ گیا۔ 323 قبل مسیح میں سکندر کی موت ہوئی، جس کے بعد بطلیموس نے خود کو فرعون قرار دے کے آزاد حاکمیت کا تاج اپنے سر پہ سجایا اور مصری فرعونوں کا تختِ جہاں داری سنبھال لیا۔ یہاں سے اُس عہد کا آغاز ہوا جو آج بھی تاریخ میں 'بطلیموسی عہد' کہلاتا ہے۔

بطلیموس ملکہ قلوپطرہ کے جدِ امجد تھے۔ اُس سے پہلے بطلیموسی شاہی خاندان میں چھ قلوپطرائیں گزر چکی تھیں۔ 69 قبل مسیح میں جنم لینے والی بچی کو 'قلوپطرہ ہفتم' کا نام ملا۔

51 قبل مسیح میں جب وہ تختِ فرعون پہ بیٹھ کر سلطنتِ مصر کے سیاہ و سفید کی مالک بنی، اُس وقت قلوپطرہ ہفتم کی عمر صرف اٹھارہ سال تھی۔ اُس وقت شاید ہی کسی کو یہ خیال آیا ہو کہ کم عمر دوشیزہ تاریخ پہ کیا قیامت ڈھائے گی۔

47 قبل مسیح میں اُس کے بطن سے جولیس سیزر کے بیٹے نے جنم لیا۔ یہ قلوپطرہ کی پہلی اولاد تھی۔

40 قبل مسیح میں اُس کے محبوب مارک انتونی کے جڑواں بیٹوں نے ملکہ مصر کے بطن سے جنم لیا۔

36 قبل مسیح میں قلوپطرہ نے مارک انتونی کے ایک اور اپنے چوتھے بیٹے کو جنم دیا۔

فرعون قلوپطرہ جہاں ایک عورت، محبوبہ اور ماں تھی، وہیں اسے سلطنت کے تاج و تخت کی بھی پاسداری تھی۔ مارک انتونی اس کا صرف محبوب اور اس کے بچوں کا باپ ہی نہیں تھا، وہ یونانی اس کی مصری فوج کا کمان دار بھی تھا۔ قلوپطرہ کی اداؤں کو رومانوی ادب میں 'نشتر' اور 'تیر و تفنگ' سے تشبیہ دی گئی ہے۔ شاعرانہ استعارے اپنی جگہ وہ حقیقی تلوار سے جنگ و جدل کرنا اور کروانا بھی جانتی تھی۔

31 قبل از مسیح میں مارک انتونی کی سپاہ ایکٹم کی لڑائی میں رومی اوکٹاوین کی فوج کے ہاتھوں شکست کھا گئی۔ فتح کے نشے میں سرشار جرنیلی خون والی مصری فرعون اور اس کے عسکری کمان دار کو شکست بھلائے نہ بھولی۔ ہار کا یہ احساس 30 قبل از مسیح میں، ماہِ اگست کے ایک روز اُس وقت ختم ہوا جب قلوپطرہ کے مارک انتونی نے تلوار گھونپ کر خودکشی کر لی۔ زخمی محبوب کو محبوبہ کے دربار پہنچایا گیا، جہاں اُس نے قلوپطرہ کی بانہوں میں آخری سانسیں لی تھیں۔

یہ وقتِ زوال کا منطقی انجام تھا!

قلوپطرہ کے ہاتھوں سے مصری سلطنت نکل چکی تھی۔ اُس کے خاندان کے تین سو سالہ عہد کا خاتمہ اور رومن دور کا آغاز ہونے والا تھا۔ قلوپطرہ کی وسیع و عریض سلطنت کا سورج ڈوب چکا تھا۔ بحیرۂ روم میں ڈوبنے والے بطلیموسی سورج کی سرخی صرف اسکندریہ پر چمک رہی تھیں۔ یہ بھی پل دو پل کی بات تھی۔ وہ قلوپطرہ کی زندگی کا کٹھن وقت تھا۔ وہ زندگی کے سب سے بڑے امتحان سے گزر رہی تھی۔ شکست، محبوب اور فوج کے کمان دار کی خودکشی، رومن کے ہاتھوں ممکنہ گرفتاری اور آنے والا تاریک دورِ غلامی..... جب تک اسکندریہ آزاد تھا، تب تک وہ فرعونِ مصر تھی مگر صرف چند روز یا چند ہفتے..... وہ آنے والے وقت کا بہت اچھی طرح ادراک کر چکی تھی۔

مارک انتونی کی موت کے لگ بھگ ہفتہ دس دن بعد احساسِ شکست سے دوچار اور محبوب کی موت کے صدمے سے نڈھال ہارے ہوئے مصر کی فرعون نے بھی موت کو گلے لگا لیا۔ اُس کی رگوں میں جرنیلی خون دوڑتا تھا۔ حکمرانی اُس کے لہو میں صدیوں سے شامل تھی۔ وہ ہمیشہ سربلند رہی تھی۔ حاکمیت اس کے جذبوں پر ہمیشہ حاوی رہی۔ اس نے چند

روز کی..... آزادی اور شان و شوکت کو غنیمت جانا اور اپنی پسند کی موت منتخب کر کے بطور فرعون اس دنیا سے رخصت ہونے کا فیصلہ کیا۔

قلوپطرہ کو زہر اور سانپ پسند تھے۔ اُس نے ایک نہایت زہریلے سانپ سے خود کو ڈسوایا۔ زہر سے موت کا کھیل دیکھنے والی ملکہ ڈسے جانے کے بعد تڑپنے کے بجائے سکون سے بستر پر لیٹ گئی اور زندگی کا خاتمہ کر لیا۔

شاہی انداز سے آخری رسومات کی تکمیل کے بعد اس کی تدفین بھی اسی مقبرے میں ہوئی جہاں اس کا محبوب انتونی آسودۂ خاک تھا۔ دونوں مر کر بھی اکٹھے رہے۔ موت کے وقت اُس حشر ساماں ہاری ہوئی فرعون کی عمر صرف اُنتالیس برس تھی۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ جنگ ہار جانے والی فرعون موت کے وقت بھی تخت و تاج کی مالکہ تھی۔ یہ اور بات کی بطلیموس لاگس کی وسیع و عریض مصری سلطنت صرف اسکندریہ تک محدود رہ گئی تھی۔

ملکہ اور محبوبِ ملکہ کی موت کے ساتھ ہی مصر کی سلطنتِ رومن کے ہاتھوں مکمل طور پر فتح ہو گئی۔ قلوپطرہ کو ورثے میں بطلیموس کی وہ مصری سلطنت..... ملی تھی جو لگ بھگ تین سو برس سے قائم تھی مگر قلوپطرہ کی موت کے ساتھ ہی تاریخ کے بطلیموسی عہد کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

قلوپطرہ کی زندگی افسانوی تھی تو اُس کا انجام بھی افسانوی تھا۔ اُس کی موت کے بعد بھی افسانے کی تشنگی ختم نہیں ہوئی تھی۔

☆☆☆

یونانی اور رومی مؤرخین کے ہاں ملکہ اور جرنیل کی موت کا تذکرہ تفصیل سے ملتا ہے۔ اُن کی تدفین بھی صراحت سے بیان کی جاتی ہے۔ قلوپطرہ کے انجام کو بھی وضاحت سے بیان کیا گیا۔ یہ بھی بتایا جاتا کہ اُن کی تدفین ایک ہی مقبرے میں ہوئی تھی۔

قلوپطرہ نے خودکشی کی تو موت کے بعد اُس کے بسترِ مرگ کا بھی بیان موجود ہے۔ خود پلوٹارک کے الفاظ میں:

''بعد از مرگ پُروقار ملکہ قلوپطرہ سونے سے بنے اور ہیرے جڑے تخت پر لیٹی تھی۔ سونے کا وہ تخت جس پر ملکہ کا جسدِ خاکی تھا، وہ بہت خوبصورت اور دلکش تھا۔ اُس تخت پر مصری انداز کی کندہ کاری کے دلکش نمونے کندہ تھے۔''

تاریخ کے صفحات پر یہ سب کچھ تفصیل سے لکھا ہوا ملتا ہے مگر یہ نشاندہی کہیں نہیں کی گئی کہ قلوپطرہ کا مقبرہ کس جگہ واقع تھا۔ شیکسپیئر نے سولہویں صدی میں کہا تھا:

''زمین پر کوئی ایسی قبر نہیں کہ جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہم کہہ سکیں یہ اُس مشہورِ جوڑے کی ہے۔''

شیکسپیئر کے یہ الفاظ دعویٰ نہیں حقیقت تھے۔ ان میں راز تھا اور وہ راز اُس کے گزر جانے کے کئی صدیوں بعد آشکار ہونے والا تھا۔

اپنے وقت کا جدید ساحلی شہر اسکندریہ، مصر کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے لیکن اُس سے زیادہ مال دار بابِ تاریخ مصر کے صحرا میں بکھرے ہوئے تھے۔ غزہ اور لکسر کے صحراؤں میں مصری فرعونوں کے اہرام تلاشِ خزانہ میں سرگرداں لٹیروں کے لیے زیادہ پُرکشش تھے۔ اس لیے کئی صدیوں تک کسی کو یہ خیال نہ آیا کہ قلوپطرہ اور اس کے محبوب کا مقبرہ کہاں ہے؟ سب کی نظریں غزہ اور لکسر کے اہراموں پر مرکوز تھیں۔ اس میں حیرت کی کوئی بات بھی نہیں، سونے چاندی نے ہمیشہ انسانوں کی نگاہوں کو خیرہ کیے رکھا ہے۔

زلزلے، سمندری موجیں، سمندر کی سطح میں اونچائی، ریت کے طوفان، خانہ جنگی، مقامی تنازعات، قدیم عمارات سے غیر جذباتی وابستگی کے سبب شکستہ پتھریلی عمارتوں کا انہدام اور ان کے پتھروں کا دوبارہ استعمال..... کئی سو سال کی کشمکشِ حیات کے سبب اُس مقام کے تمام آثار صفحۂ ہستی سے مٹتے چلے گئے، جہاں تین سو سال تک قلوپطرہ کے اجداد نے زندگی بسر کی تھی یعنی 'فرعون کا جزیرہ اور اس کا ملحقہ اسکندریہ'۔ سب سے بڑی حیرت کی بات یہ ہے کہ موسمی جبر کے باعث قلوپطرہ کے زمانے کا اسکندریہ پہلے زیرِ آب آیا اور پھر اُس کی عمارتیں منہدم ہو کر ملبے کی صورت تہِ آب منتشر ہوتی چلی گئیں۔

برصغیر میں اُردو، فارسی شاعری کے شہنشاہ مرزا غالب نے کیا خوب کہا تھا:

ہوئے مر کے ہم جو رُسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کہیں جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

قلوپطرہ واقعی مرنے کے بعد تاریخ میں بہت رسوا ہوئی۔ اسے مرنے کے بعد غرقِ دریا نہیں، زمین کی کوکھ میں سپردِ خاک کیا گیا تھا مگر شیکسپیئر کا خیال چونکا دینے والا تھا۔ شیکسپیئر کے الفاظ میں اُس مشہور جوڑے کی قبر زمین پر کہیں نہیں تو پھر کیا وہ پانی میں ہے؟ قدیم اسکندریہ تہِ آب ہے۔ اس پر سب کو یقین ہے۔ کہیں اسکندریہ کے ساتھ قلوپطرہ کا مقبرہ بھی تو تہِ آب نہیں..... یہ تلاش اور تحقیق کا نکتۂ

www.pdfbooksfree.pk

آغاز تھا۔

زیرِ آب اسکندریہ میں قلوپطرہ کے مقبرے کی تلاش دو دہائی پہلے شروع ہوئی تھی۔ مقبرے کی تلاش کی یہ پہلی سنجیدہ کوشش تھی جس کا آغاز پانی کی تہ سے شروع ہونے والا تھا۔

زیرِ آب آثارِ قلوپطرہ کی تلاش کا آغاز 1992ء میں فرنچ ماہرِ آثارِ قدیمہ فرینک گوڈیو کی سربراہی میں شروع ہوا۔ منصوبہ فرینک کے ادارے 'یورپین انسٹیٹیوٹ آف انڈرواٹر آرکیالوجی' کے توسط سے شروع ہوا تھا۔ جس کا مقصد پانیوں میں دفن قدیم اسکندریہ کا ایک نقشہ تیار کرنا تھا۔ یہی وہ علاقہ ہے جہاں کبھی قلوپطرہ کا شاہی محل واقع تھا۔ زیرِ آب تحقیق کرنے والے ماہرینِ آثار نے جو کچھ دریافت کیا وہ اسے سطحِ زمین پر لاتے رہے۔ بڑے بڑے ستون، لائم اسٹون کے بڑے بڑے بلاک اور اسی طرح کی دوسری تعمیراتی اشیا پانی سے نکال کر خشکی پر لائی گئیں۔ ان سب کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا مشکل نہیں تھا کہ جو کچھ ملا وہ یقیناً قلوپطرہ کے محل کی باقیات ہی تھیں۔

''میرا خواب تھا کہ قلوپطرہ کا مجسمہ تلاش کیا جائے تاکہ اس کے اصلی خدوخال دنیا کے سامنے آسکیں۔'' فرینک نے بتایا...... زیرِ آب اسکندریہ کے آثار میں کسی بھی ایسے مقام کا پتا چلانے میں ناکام رہے جو قلوپطرہ کا مقبرہ ہوسکتا تھا۔ قلوپطرہ کے نام پر صرف ایک ہی شے دریافت ہوئی، وہ 'قلوپطرہ سگریٹ' کی خالی ڈبیاں تھیں۔

یہ تو مہم ناکام ہوئی مگر حال ہی میں قدیم اسکندریہ کی حدود سے کچھ میلوں کی دوری پر ایک مندر کے بارے میں سراغ ملا ہے جو ریت کے ڈھیر میں دفن ہونے کے سبب اب تک ہر قسم کی انسانی دست بُرد سے محفوظ تھا۔ اس مقام کی اطلاع ملنے کے بعد یہ سوچ کر ماہرینِ آثار نے اپنی تحقیق کا رخ اس پر مرکوز کردیا کہ ممکن ہو کہ یہی قلوپطرہ اور انتونی کا مرقد ہو۔ ممکن ہے کہ ان کی حنوط شدہ لاشیں وہیں موجود ہوں۔ ماہرین کا خیال اور ان کی کوششیں اپنی جگہ مگر یہ ایک اتفاق تھا۔ حیرت انگیز اتفاق...... ایک فون کال اور پھر کئی برس کی محنت کے بعد گمنام مقام کو جدید مصر کی تاریخِ آثاریات میں اہم مقام ملنے والا تھا جس کے پیچھے ایک نوجوان لڑکی کا دماغ کارفرما تھا۔

☆☆☆

یہ نومبر 2006ء کی بات ہے۔ عالمی شہرت یافتہ ماہرِ آثارِ قدیمہ اور مصر کی سپریم کونسل برائے نوادرات کے سربراہ ڈاکٹر زاہی حواس قاہرہ میں واقع اپنے دفتر میں بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے نیل ہلٹن کی بنائی ہوئی اسٹیشنری کی بڑی سی شیٹ پھیلی ہوئی تھی جس پر ایک سائٹ کا نقشہ بنا ہوا تھا۔ یہ وہ مقام تھا جہاں چند سال قبل تک ماہرین کی ایک ٹیم آثار کی تلاش میں کھدائی کررہی تھی۔

''ہم قلوپطرہ کا مقبرہ تلاش کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ اسی سلسلے میں کھدائی کی جارہی تھی۔'' ڈاکٹر زاہی حواس نے بتایا۔ ''یہ پہلا موقع تھا قلوپطرہ کے مقبرے کی تلاش کا۔ اس سے پہلے مصر کی ملکہ کا مقبرہ تلاش کرنے کے لیے باضابطہ طور پر کوئی کوشش نہیں کی گئی تھی۔''

ڈاکٹر زاہی حواس بارے بتارہے تھے، وہ تلاش ایک فون کال کے نتیجے میں شروع ہوئی۔ ہوا یہ کہ ڈومینکن ریپبلکن کی ایک نوجوان لڑکی کیتھلن مارٹینز نے 2004ء میں ڈاکٹر حواس سے رابطہ کیا اور پھر اُن سے ملنے کے لیے مصر پہنچی۔ وہ قلوپطرہ کے مقبرے کے بارے میں ایک تھیوری لے کر اُن سے ملنے آئی تھی مگر وہ اس کے بارے میں کچھ کہنے سے کترا رہی تھی۔

کیتھلن کا خیال تھا کہ قلوپطرہ کو ایک خستہ حال معبد میں دفن کیا گیا تھا جو اسکندریہ سے اٹھائیس میل دور مغرب میں واقع ساحلی اور صحرائی قصبے تپوسیرز مگنا میں واقع تھا۔ یہ مقام آج اَبوسر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ تپوسیرس مگنا بحیرۂ روم اور جھیل ماریوتز کے درمیان واقع ہے۔ قلوپطرہ کے عہد میں یہ معروف بندرگاہ تھی۔ یہاں پر پھلوں سے شراب کشید کی جاتی تھی جس کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔

اسٹربو دورِ قبل مسیح کا معروف جغرافیہ داں گزرا ہے۔ 25 قبلِ مسیح میں وہ مصر میں تھا۔ اس نے اپنے روزنامچے میں تپوسیرس مگنا کے روز و شب کا احوال تفصیل سے تحریر کیا ہے۔ جس میں اس نے ایک مذہبی اجتماع کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ اجتماع اوسیرس دیوتا کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے منعقد ہوتا ہے، جس کا مندر پتھریلے ساحل کے قریب واقع ہے۔ اس بارے میں وہ لکھتا ہے:

''یہاں ہر سال بڑی تعداد میں لوگ جمع ہوکر دیوتا کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔ اس اجتماع میں شامل ہونے والوں کے لیے یہ لمحہ زندگی کا سب سے اہم لمحہ ہوتا ہے۔''

زاہی حواس کہتے ہیں ''کھدائی شروع کروانے سے پہلے میں نے سوچا کہ جس مقبرے میں مبینہ طور پر اسے دفن کیا گیا ہوگا، اُس کا سامنے کا رُخ اسکندریہ میں واقع قلوپطرہ کے محل اور شاہی قبرستان کی طرف ہوگا مگر کھدائی سے قبل کیتھلن نے ایک اور چونکا دینے والی تھیوری پیش کی۔'' یہ کہہ کر وہ رکے اور شیٹ پر بنے سائٹ کے نقشے کی طرف دیکھ کر کہنے لگے۔ ''اُس نے میری سوچ سے اتفاق نہیں کیا۔ اس کی دلیل میں وزن تھا۔ کیتھلن کا کہنا تھا کہ قلوپطرہ بہت چالاک اور شاطر تھی۔ اُس نے انتونی اور اپنی تدفین کو نہ صرف خفیہ رکھا ہوگا بلکہ ایسا انتظام کیا ہوگا کہ تدفین کے بعد کوئی دشمن اُن کی لاشوں تک نہ پہنچ سکے۔ اسے بعد از مرگ روم کی دشمن سپاہ کے ہاتھوں اپنی لاش کی بے حرمتی کا خوف تھا۔'' یہ کہہ کر انہوں نے میری طرف دیکھا اور کہا۔ ''اُس کی بات درست تھی۔ دشمن سپاہ ایسا کرسکتی تھی۔''

کیتھلن مارٹینز بلا کی ذہین اور جنونی شخصیت کی مالک ہے۔ اس نے انیس سال کی عمر میں قانون کی اعلیٰ ڈگری حاصل کی اور اُس کے بعد سانتو ڈومینگو یونیورسٹی کے شعبۂ آرکیالوجی میں پڑھانے لگی۔ اسے آثاریات سے بہت دلچسپی تھی۔ وہ یہ مضمون پڑھا رہی تھی مگر اس سے پہلے نہ تو وہ کبھی مصر آئی اور نہ ہی اس نے کسی کھدائی میں حصہ لیا تھا۔ اس نے تو کبھی سائٹ پر کھرپی تک نہیں چلائی تھی۔

قلوپطرہ کے مقبرے سے اُس کی دلچسپی بھی بذاتِ خود بہت دلچسپ واقع ہے۔ یہ دلچسپی شروع ہوئی ایک دلیل سے جو اس نے چوبیس سال کی عمر میں اپنے والد سے گفتگو کرتے ہوئے 1990ء میں پیش کی تھی۔ کیتھلن کے والد فاسٹو مارٹینز پروفیسر ہیں اور قانون پڑھاتے ہیں۔

ہوا یہ تھا کہ ایک دن وہ اُن کی نجی لائبریری میں شیکسپیئر کی کتاب 'انتونی اور قلوپطرہ' تلاش کررہی تھی۔ اس نے شیلف سے کتاب نکالی اور اُن کے سامنے بیٹھ کر پڑھنے لگی۔ بس! یہیں سے دونوں میں مکالمہ شروع ہوا جس نے کچھ دیر میں بحث کی شکل اختیار کرلی۔ قلوپطرہ کے بارے میں کیتھلن کے باپ کی رائے وہی تھی جو زمانے بھر کی ہے...... عیاش، شاطر، مکار، اور بے کردار ملکہ۔

کیتھلن کو اپنے والد کی رائے سے بالکل اتفاق نہیں تھا۔ وہ گھنٹا بھر بحث کرتے رہے اور پھر کیتھلن نے مدلل انداز میں کہا۔ ''یہ سب اس کی کردار کشی کے لیے گھڑی من گھڑت باتیں ہیں۔'' وہ خاصی جذباتی ہورہی تھی۔ ''یہ سب تاریخ کا ابہام ہے جو جان بوجھ کر پھیلایا گیا۔ اس کی کردار کشی اس کے دشمنوں کی چال تھی اور وہ اس میں کامیاب رہے۔ وہ کامیاب فرعون تھی۔ وہ ذہین حکمران تھی۔ اس نے مصر کی جغرافیائی حدود کو وسعت بخشی۔ انتونی نے اس کی مشورے پر مصر کی سلطنت کی سرحدیں دور دراز علاقوں تک پھیلائیں۔ انہیں وسعت بخشی۔ ان سب کے پیچھے قلوپطرہ کا ذہن کارفرما تھا۔ ایک عورت حکمران اور اتنی ذہین اور کامیاب...... اسی لیے تاریخ میں اس کے مخالف رومنوں نے ابہام پیدا کیا۔ آج تاریخ میں قلوپطرہ کے لیے جو کچھ بُرا لکھا ہوا ہے، وہ رومنوں کا پراپیگنڈا تھا اور اب تک موجود ہے۔''

طویل بحث بے نتیجہ رہی۔ کیتھلن اپنے پروفیسر باپ کی رائے بدل نہ سکی اور نہ وہ اُن کی دلیل کے آگے سرنگوں ہوئی مگر وہ ایک فیصلے تک پہنچ چکی تھی۔ کیتھلن نے فیصلہ کیا کہ تاریخ میں موجود قلوپطرہ سے متعلق ابہام دور کرنے کی کوشش کرے گی۔ قلوپطرہ سے متعلق سب سے بڑا راز اُس کا مقبرہ ہے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ مقبرہ تلاش کرنا چاہیے۔ اسے یقین تھا کہ قلوپطرہ کا مقبرہ تلاش کرنے کے لیے ماہرینِ آثار نے متعدد اہم شواہد اور سراغ نظر انداز کیے ہیں، جس کی بنا پر یہ اب تک راز کے پردے میں اخفا ہے۔

کیتھلن نے اپنے طور پر مقبرے کی تلاش شروع کردی۔ اس نے تمام قدیم تحریروں کا مطالعہ شروع کیا۔ ''آپ قدیم مخطوطات اور تحریروں سے اس بارے میں کوئی سراغ نہیں پاسکتے کہ قلوپطرہ کا مقبرہ کس مقام پر واقع تھا۔'' طویل مطالعے کے بعد اس نے اپنی نوٹ بک میں لکھا:

''اُس نے جہاں اپنے جینے کے لیے شاندار اقدامات کیے تھے، وہیں اس نے مرنے کے بعد اپنی مستقل سکونت کا بھی بندوبست ضرور کیا ہوگا۔ حالات کے باعث اس کی تدفین ضرور خفیہ انداز میں کی گئی ہوگی مگر جس مقبرے میں وہ دفن ہوئی، وہ اس نے خود تعمیر کروایا ہوگا اپنی زندگی میں، اپنی شخصیت کے شایانِ شان یا پھر وہ ایسے کسی مقدس مقام پر دفن ہوئی ہوگی جو اس کے مذہبی عقیدے کا محور ہوگا۔ قلوپطرہ سے اس بات کی توقع ہی نہیں کی جاسکتی کہ اس نے ایسا نہیں کیا ہوگا۔ جو شاندار طرزِ زندگی بسر کررہی ہو، مرنے کے بعد رہنے کے لیے اس نے کچھ نہ کیا ہو، ممکن ہی نہیں۔ البتہ یہ اور بات کہ رومن کے ہاتھوں شکست کے بعد مصر کی ملکہ کے

www.pdfbooksfree.pk

حالات بدل گئے ہوں گے۔ اگر اس نے اپنی زندگی میں اپنا مقبرہ بنوایا تھا تو ممکن ہے کہ اُس وقت لوگ جانتے ہوں کہ یہ مقبرہ قلوپطرہ نے اپنے لیے بنوایا ہے مگر تدفین کو راز رکھنے کے لیے اس نے اپنے معتمدین کو وصیت کر کے خود مشہور کروادیا ہو کہ وہ اس مقبرے میں دفن نہیں ہوئی۔ میں سمجھتی ہوں کہ وقتی حالات کے سبب اس نے اپنی لاش کو خفیہ رکھنے کی کوشش کی ہوگی مگر وہ یہ بھی جانتی ہوگی کہ حالات ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہیں گے۔ وہ بھی یہ چاہتی ہوگی کہ حالات سازگار ہوں تو اس کا مقبرہ لوگوں کی نظروں میں آجائے۔ وہ خود چاہتی ہوگی کہ لوگ اس کی آخری آرام گاہ کو دریافت کریں۔ اس کی ستائش کریں..... مرنے والے ہر بادشاہ کی یہ خواہش ہوتی ہے اور وہ تو تھی فراعینِ مصر کی عظیم الشان سلطنتِ مصر کی فرعون۔''

اپنے طور پر لگ بھگ پندرہ برس تحقیق کرنے کے بعد کیتھلن نے 2004 میں ڈاکٹر زاہی حواس سے رابطہ کیا۔ اس نے انہیں ایک ای میل بھیجا مگر اسے جواب نہیں ملا۔ کچھ عرصے کے بعد اس نے ایک اور تفصیلی ای میل بھیجا۔ اس بار بھی جواب ندارد رہا۔ اب اسے یقین ہوگیا کہ زاہی سے جواب نہیں ملے گا۔ اس نے مصر جانے کی ٹھانی اور پہنچ گئی۔ اب اسے اتفاق کہیں کہ لکسر کے اہراموں میں گھومتے ہوئے اس کی ملاقات اچانک اُس وقت ڈاکٹر زاہی حواس سے ہوئی، جب وہ ایک مقام پر کھدائی کی نگرانی کررہے تھے۔ کیتھلن سیاحوں کے گروپ میں تھی اور گائیڈ انہیں اہراموں کے بارے میں بتا رہا تھا مگر وہ لپک کر ڈاکٹر زاہی کے پاس پہنچی۔ رسمی کلمات کے بعد اس نے ملاقات کی خواہش ظاہر کی اور انہوں نے اسے ملنے کا وقت دے دیا۔ اس وقت وہ مصر کی سپریم کونسل برائے نوادرات کے سربراہ بھی تھے۔

''تم کون ہو اور مجھ سے کیا چاہتی ہو؟'' ڈاکٹر زاہی نے کیتھلن سے اپنے دفتر میں ملاقات کے موقع پر سوال کیا۔

''میں چاہتی ہوں کہ مصر کے اُن مقبروں کا دورہ کروں جو اب تک نہیں کھولے جاسکے اور نہ ہی عام لوگ اس کے بارے میں جانتے ہیں۔'' کیتھلن نے جان بوجھ کر یہ بتانے سے گریز کیا کہ وہ دراصل قلوپطرہ کا مقبرہ تلاش کرنے کی جستجو کررہی ہے۔

ڈاکٹر زاہی حواس نے آرکیالوجی کی اس نوجوان استاد کو اسکندریہ، غزہ اور قاہرہ کے اُن مقامات کے دورے کی اجازت دے دی جواب تک سربستہ راز تھے۔ وہاں اب تک نہ تو قابلِ ذکر کھدائی کی گئی تھی اور نہ ہی ان مقامات کے نقشے تیار کیے گئے تھے۔

کیتھلن کے لیے یہ بڑی کامیابی تھی۔ وہ سیاح کے ویزے پر مصر آئی تھی اور اس نے ضروری تیاریاں بھی نہیں کی تھیں۔ وہ زاہی حواس سے معاملات طے کر کے واپس چلی گئی اور پھر اگلے سال مارچ 2005ء میں دوبارہ مصر آئی۔ اس نے ڈاکٹر زاہی حواس کو فون کر کے بتایا کہ اس کے ملک ڈومینکن ری پبلک نے اُسے 'سفیرِ ثقافت' مقرر کردیا ہے۔

یہ سن کر ڈاکٹر زاہی ہنسے اور کہا ''تم ابھی اتنی چھوٹی ہو اور سفیرِ ثقافت۔'' انہیں کیتھلن کی بات پر یقین نہیں آرہا تھا مگر یہ سچ تھا۔

کیتھلن نے ڈاکٹر زاہی کو بتایا کہ پچھلے سال مصر کے دورے کے دوران وہ قدیم اسکندریہ کے علاقے تپوسیرز مگنا گئی تھی۔ اب وہ دوبارہ وہاں جانا چاہتی ہے۔ ''وہاں ایک قبطی کلیسا کے آثار ہیں اور میرا ملک تاریخِ عیسائیت میں دلچسپی رکھتا ہے۔ اسی لیے میں اس کلیسا کے بارے میں تاریخی معلومات حاصل کرنا چاہتی ہوں۔'' کیتھلن نے اس کی تسلی کے لیے دورے کا جواز بتایا۔ اس بار بھی وہ جان بوجھ کر قلوپطرہ کے مقبرے کی تلاش والی بات گول کرگئی تھی جو اس ساری بھاگ دوڑ کا محور تھی۔

کیتھلن نے وہاں جانے کی ٹھوس وجہ بیان کی تھی۔ اس بار بھی ڈاکٹر زاہی حواس کا جواب تھا ''ہاں..... تم وہاں جاسکتی ہو۔''

کیتھلن تپوسیرز مگنا کے مقام پر گھوم رہی تھی اور بغور مشاہدے کے ساتھ وہ فوٹوگرافی میں مصروف تھی۔ یہیں سے اس نے ڈاکٹر زاہی حواس کو فون کیا۔ ''دو منٹ ہوں گے آپ کے پاس؟'' ڈاکٹر زاہی کے فون اٹھاتے ہی اس نے فوراً پوچھا۔

''ہاں، ہاں..... تم بولو، کیا بات ہے؟''

''میں تپوسیرز کے مقام پر کھدائی کروانا چاہتی ہوں۔ اس کے لیے میرے پاس ایک تھیوری ہے۔'' جس بات کو وہ اب تک ڈاکٹر زاہی سے چھپائے ہوئے تھی، اُس پر پڑا پردہ اٹھانے کا وقت آگیا تھا۔

کچھ دیر تک دونوں کے درمیان اس موضوع پر گفتگو ہوتی رہی۔ آخر کیتھلن نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''مجھے یقین

ہے کہ اس مقام پر قلوپطرہ کا مقبرہ ریت میں دفن ہے۔''

''کیا.....'' ڈاکٹر زاہی نے چونکتے ہوئے کہا۔ یہ سن کر انہیں شدید جھٹکا لگا تھا۔ وہ سخت حیرت زدہ تھے کہ یہ نوجوان لڑکی کیا کہہ رہی ہے۔ جس وقت کیتھلن یہ کہہ رہی تھی، اُس سے چند ہفتوں پہلے ہی ہنگری کے ماہرینِ آثاریات نے تپوسیرز کے مقام پر اپنی کھدائی مکمل کی تھی۔ اُس وقت بھی فرنچ ماہرین کا ایک گروہ 'رومن باتھ' کی تلاش میں معبد کی بیرونی دیوار کے ساتھ کھدائی کررہا تھا۔

''مجھے صرف دو مہینے چاہئیں۔'' کیتھلن نے پُریقین لہجے میں جواب دیا۔ ''مجھے یقین ہے کہ میں اُسے تلاش کرلوں گی۔''

☆☆☆

سکندریہ یونان کی فتح سے شروع ہونے والے بطلیموسی عہد میں سربلند مصر کو مزید سربلندی حاصل ہوئی۔ اس کی جغرافیائی حدود میں وسعت ہوئی۔ تعمیرات میں جدت آئی اور شہرت چہار سُو پھیلی۔ ایک وقت میں یہ دنیا کی مشہور ترین اور جدید شہروں والی سلطنت بھی کہلائی۔ بطلیموسی عہد کی تین سو سالہ تاریخ میں یہاں یونانی طرزِ تعمیر پر مشتمل، بڑے پیمانے پر شاندار تعمیرات ہوئیں۔

تاریخ کا دعویٰ ہے کہ اُس دور میں اسکندریہ مثالی، جدید ساحلی شہر تھا۔ قدیم یونانی اور رومن مؤرخین کے مطابق اسکندریہ کا مرکزی ایونیو سونفٹ چوڑا تھا جس کے دونوں طرف لائم اسٹون اور دوسرے قیمتی پتھروں سے بنے، اونچے اونچے ستونوں والے محلات تھے۔ اسکندریہ کی بندرگاہ پر بہت بلند 'لائٹ ہاؤس' تھا جس کی وجہ سے یہ اُس وقت کی قدیم دنیا کے سات عجوبوں میں سے ایک سمجھا جاتا تھا۔ وہیں فرعون کا جزیرہ تھا جس پر اس کا پُرتعیش وسیع و عریض محل واقع تھا۔ اسکندریہ اُس وقت کی دنیا کا کثیر القومیتی اور آج کے معنوں میں سمجھیں تو جدید کاسموپولیٹن ساحلی شہر تھا۔ یہاں بسنے والوں میں یہودی، یونانی اور رومن بھی شامل تھے۔ اسکندریہ کی گلیاں مختلف نسلوں کی حسین و جمیل دوشیزاؤں کے دم قدم سے آباد تھیں۔ خوش حالی اس شہر کے در و دیوار سے ٹپکتی تھی۔

اسکندریہ میں ہی دنیا کی پہلی جدید درس گاہ اور اس شہر کا عظیم ترین کتب خانہ قائم کیا گیا تھا۔ یہیں پہلی بار بائبل کے عبرانی نسخے کو یونانی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ 'زمین سمیت نظامِ شمسی کے سارے سیارے سورج کے گرد گھومتے ہیں'۔ یہ نظریہ تسلیم کیے جانے سے اٹھارہ صدیوں پہلے اسکندریہ کی اسی درس گاہ میں پیش کیا گیا تھا۔

اسکندریہ ہی وہ شہر ہے جہاں وقت کے ایک فرعون نے اظہارِ رائے کی آزادی کی حدود متعین کی تھیں۔ یہاں اپنے عہد کے معروف یونانی شاعر سوتادیس کو موت کی سزا دی گئی۔ اس پر فحش نگاری اور فحاشی پھیلانے کا الزام تھا، جس کی پاداش میں اس کے سینے میں لوہے کی چھ موٹی موٹی نوکدار سلاخیں گھونپ کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ شاعر کا جرم یہ تھا کہ اس نے فرعونِ مصر طالمے دوئم کی اپنی سگی بہن سے شادی کے موقع پر احتجاجاً ایک نظم لکھی تھی جسے عوام میں بہت پذیرائی حاصل ہوئی۔ شاعر جسے غلط سمجھتا تھا، اُسے غلط کہہ گیا اور ستم یہ کہ عوام نے اسے درست سمجھا بھی اور وہ درست تھا بھی۔ بادشاہ کے مطابق اس کی شاعری فحش نگاری کے علاوہ 'اظہارِ رائے کی آزادی سے تجاوز' کے زمرے میں آتی تھی۔ مصر کے یونانی النسل فرعون نے شاعر کو سزا دے کر 'اظہارِ رائے کی آزادی کی نئی حدود' متعین کردی تھی۔ فرعون کا 'جمہوری فیصلہ' اسکندریہ کے تاریخی شہر میں ہی ہوا تھا۔

اسکندریہ وہی شہر ہے جہاں 280 قبل مسیح میں طالمے سلسلۂ فرعونیت کا پہلا تاسیسی جشن منایا گیا تھا۔ مؤرخین کہتے ہیں کہ اس موقع پر اسکندریہ کی سڑکوں پر رنگ برنگے طائفے گزرے تھے۔ زر و جواہر اور منوں سونا لٹایا گیا تھا۔ شراب پانی کی طرح بہی اور بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے اور شکم سیری کے لیے عوام کو کھلی چھوٹ تھی۔ اسکندریہ کی تاریخ کے اس سب سے منفرد جشن کی عکاسی یونانی مورخین نے جزئیات کے ساتھ بیان کی ہیں۔ آج کے ماہرینِ معیشت کی رائے میں اگر اُس وقت جشن پہ خرچ کی گئی دولت کا آج کے امریکی ڈالر سے تقابلی موازنہ کیا جائے تو نہایت محتاط تجزیوں کے بعد بھی وہ کئی ملین ڈالر سے تجاوز کرتی ہے۔

بحیرۂ روم کے کنارے واقع یہ بندرگاہی شہر اپنی جدت اور ترقی کے باعث اُس وقت کی پوری دنیا میں مثالی سمجھا جاتا تھا۔ طالمے فرعونیت کے تقریباً دو سو برس تک تو سلطنت پر عروج رہا مگر رفتہ رفتہ اسے زوال کی ہوا لگنا شروع ہوئی۔ تین سو سالہ دورِ فرعونیت کا اختتام رومن کی فتح اور قلوپطرہ کی موت پر ہوا۔ قلوپطرہ ہفتم نے جب 51 قبل مسیح میں طالمے سلطنت کی نئی فرعون کا تاج اپنے سر پر رکھا تھا، اُس وقت نازک اندام فرعون کی عمر صرف اٹھارہ برس تھی۔ جب اس کا

www.pdfbooksfree.pk

دور آیا تو طالمے سلطنت کی شکست و ریخت کا عمل خاصا تیز ہو چکا تھا۔ سائپرس، سائرین (جو آج کے لیبیا میں واقع ہے) طالمے فرعون کے ہاتھوں سے نکل چکے تھے۔ رومی فوج کے بحری بیڑے بہت جلد اسکندریہ کے قریب فوجی اڈے بنانے والے تھے۔ قحط اور غذائی قلت کے سبب سلطنت میں خانہ جنگی کی کیفیت تھی۔

قلوپطرہ کو احساس تھا کہ سلطنت کی اب وہ شان باقی نہیں رہی جو اس کے اجداد کے زمانے میں تھی۔ اس نے حالات کو قابو میں کرنے کے لیے متعدد اہم فیصلے کیے۔ قحط کے سبب غذائی قلت کو دور کر کے عوامی بے چینی کو کم کرنے کے لیے بحری راستوں سے ہمسائی ریاستوں سے اجناس درآمد کیں۔ سلطنت کی شان و شوکت لوٹانے کے لیے اس نے ہمسائیوں سے روابط بڑھانے کا فیصلہ کیا۔ روم کے مشہور جنرل جولیس سیزر کو اپنی نجی زندگی میں شامل کیا، جس کی یادگار اُس کا پہلا بیٹا سیزر ہے۔ روم سے تعلق بڑھانے کے لیے اس نے رومی رسم و رواج کو فروغ دینا شروع کیا۔ جس کی وجہ سے وہ مصری تہذیب و ثقافت سے دور ہوتی چلی گئی۔ کہتے ہیں کہ یہ مصر کی پہلی طالمے فرعون تھی جو مصری زبان سیکھنے اور بولنے سے گریزاں تھی۔ طالمے مصری مذہبی عقائد کے پیروکار تھے لیکن غیر مصریوں بالخصوص رومن قوم سے سیاسی مصلحتوں کی بنا پر قلوپطرہ کی بڑھنے والی قربت کا اثر مصر کے سرکاری مذہب پر بھی پڑا۔ وہ قدیم مصری مذہبی عقائد سے دور اور رومن دیوی دیوتاؤں کے قریب ہوتی چلی گئی۔

جولیس کے دنیا سے اٹھ جانے یا اٹھا دیے جانے کے بعد مارک انتونی اس کی زندگی میں آیا۔ وہ اوسیرس دیوتا کو ماننے والا تھا۔ قلوپطرہ بھی اس کی مذہبی ہم نوا نکلی۔ وہ دو قدم اور آگے بڑھی۔ اس نے خود کو آئرس دیوی کے روپ میں پیش کیا۔ اوسیرس اور آئرس میاں بیوی تھے قلوپطرہ نے رعایا پہ دھاک بٹھانے کے لیے روپ دھارا اور 'دیوی ماں' کے روپ میں سامنے آئی۔

تاریخ بتاتی ہے کہ قلوپطرہ کو اپنا آپ اور اپنی سلطنت، دنیا کی ہر شے سے پیاری تھی مگر اس کی بدقسمتی کہ سلطنت مٹھی میں بند ریت کے مانند ہر لمحہ اُس کی دسترس سے غیر محسوس انداز میں سرکتی جا رہی تھی۔ 37 قبل مسیح میں اس کا سب سے بڑا مقصد اپنی سلطنت کی وسعتوں میں اضافہ کرنا ہی رہ گیا تھا۔ وہ ہر قیمت پر وہ علاقے دوبارہ اپنی سلطنت میں شامل کرنا چاہتی تھی جو اس سے علیٰحدہ ہوئے یا چھن گئے تھے۔ وہ اپنی اولاد کو مستحکم طالمے سلطنت دینا چاہتی تھی۔ اسے احساس تھا کہ اس کی عمر بڑھ رہی ہے۔ اسے نئے طالمے فرعون کے لیے مصر کو مستحکم اور وسیع سلطنت میں تبدیل کرنا تھا جس کے لیے اُس کی کوششوں میں تیزی آ گئی تھی۔ مارک انتونی، قلوپطرہ کی سپاہ کا جرنیل تھا۔ اس کی کوششوں سے قلوپطرہ کی سلطنت کے کئی علاقے واگزار ہوئے۔

34 قبل مسیح میں انتونی جنگِ آرمینیا سے کامیاب لوٹا تو قلوپطرہ کو اس کی کامیابی میں اپنے مقاصد پورے ہوتے نظر آئے۔ یہ وقتی فتح تھی مگر وہ نہیں جانتی تھی۔ اس نے انتونی کے لوٹنے پر اسکندریہ میں شاندار جشن کا اہتمام کیا۔ اس جشن میں وہ اوسیرس آئرس مندر سے دیوی آئرس کا روپ دھار کر عوام کے سامنے آئی۔ یہ انتونی کی خود کشی سے چار سال پہلے کی بات ہے۔

''یہ قلوپطرہ کی زندگی کا بہت شاندار پہلو ہے۔'' کیتھلن نے کہا۔ ''وہ مصری سلطنت میں توسیع اور استحکام کے ساتھ ساتھ عوامی تشخص قائم کرنے کے لیے دیوی آئرس کے روپ میں سامنے آ رہی تھی۔ یہ اس کے عوامی تصور کو بہتر بنانے کا سیاسی حربہ بھی ہو سکتا ہے مگر یہ روپ بہت خوب تھا۔ اُس وقت اس کی سلطنت مختلف مسائل سے دوچار تھی۔ ایسے میں یہ روپ اس کی عوام کے لیے حوصلہ افزا تھا۔ مصری عوام کی بڑی تعداد بھی اس دیوی دیوتا کی عبادت کرتی تھی۔ آئرس اُن کے لیے شفقتِ مادری، خوشحالی اور جادو کی دیوی تھی۔ ایک طرف قلوپطرہ فرعون تھی اور ایک بادشاہ کی طرح امورِ مملکت چلا رہی تھی۔ دوسری طرف وہ دیوی کے روپ میں لوگوں کے سامنے آ رہی تھی۔ ایک طرف انتونی اس کے لیے علاقوں پہ علاقے فتح کرنے کی کوشش کر رہا تھا تو دوسری طرف وہ لوگوں کے دلوں کو فتح کرنے کی جستجو کر رہی تھی۔'' یہ کہہ کر وہ چند لمحے کے لیے رکی اور کچھ سوچنے لگی۔ ''افسوس کہ ان سب کوششوں کے باوجود نہ تو اس کی سلطنت بچی، نہ زندگی اور نہ ہی کردار..... اگر وہ واقعی ایک دیوی ہوتی تو شاید تاریخ میں اس سے زیادہ بدنام کوئی اور دیوی نہ ہوتی۔ بدنام دیوی، شاطر ملکہ یا عیاش عورت..... کچھ کہنا مشکل ہے۔''

چند لمحوں کے توقف کے بعد کیتھلن نے میری طرف دیکھا اور کہنے لگی۔ ''کتنی عجیب بات ہے۔ اس کی ذات پر ہر طرح کا الزام لگانے والے خود اس کی ذات اور اُس سے

منسوب قصوں میں دلچسپی لیتے ہیں خاص طور پر مرد طبقہ۔'' وہ روانی میں بولے جا رہی تھی۔ ''قلوپطرہ کے نام کا لیبل مصنوعات پہ چسپاں کر کے طوائف کے وجود کی طرح بیچا جاتا ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ اُس کے نام کو بیچ کر جو لوگ دولت کما رہے ہیں، وہی اپنی نجی محفلوں میں قلوپطرہ کا تذکرہ جنسی لطف اندوزی کے لیے کرتے ہیں۔ قلوپطرہ نے ذلت سے بچنے کے لیے موت کو گلے لگایا۔ بے حرمتی کے خوف سے اپنا مقبرہ خفیہ رکھا مگر بدنامی دو ہزار برس سے اُس کے نام سے چمٹی ہوئی ہے۔'' اُس نے نہایت افسردگی سے بات مکمل کی اور خاموش ہو کر چھت کو گھورنے لگی۔ کیتھلن مارٹینز صرف قلوپطرہ کا مقبرہ تلاش نہیں کرنا چاہتی، وہ اُس کی ذات سے منسوب بدنامی کا ہر قصہ مٹا دینا چاہتی ہے۔

''تم کامیاب ہو سکتی ہو مگر مقبرے کی تلاش میں۔'' میں نے کہا تو اس نے میرے چہرے کی طرف نظر گھمائی۔ یہ سن کر اس کی آنکھوں میں خوشی کی چمک نظر آئی تھی۔ ''مگر تاریخ کے لگے داغوں کو دھونا مقبرے کی تلاش سے زیادہ مشکل کام ہے۔'' میں نے اپنی بات مکمل کی۔ یہ سن کر اس کی خوشی افسردگی میں ڈھل گئی تھی۔ میں سمجھ نہیں سکا کہ اس کے لیے بڑی بات کیا ہے، مقبرے کی تلاش یا پھر تاریخ کے داغ جسے وہ قلوپطرہ کے خلاف رومی فاتحین کا پراپیگنڈا کہتی ہے۔

تپوسیرز مگنا میں قلوپطرہ کے مقبرے کی تلاش کے لیے کیتھلن نے اسٹریبو کے بیان کا سہارا لیا تھا۔ اس نے عہدِ قلوپطرہ کے مصر کو سمجھنے اور پھر اس کی مدد سے نقشہ تیار کر کے مقبرے کے آثار کی تلاش شروع کی۔ اسٹریبو قلوپطرہ کی زندگی کے دوران مصر میں تھا اور اس نے اسکندریہ کا احوال تفصیل سے اپنی یادداشتوں میں رقم کیا ہے۔

مصر میں اوسیرس دیوتا اور آئرس دیوی سے منسوب 14 مندروں کی موجودگی تاریخی حوالوں سے ثابت ہوتی ہے۔ تپوسیرز مگنا میں واقع مدفون مندر ممکن طور پر انہی میں سے ایک تھا جس کے متعلق کیتھلن کو یقین تھا کہ وہی قلوپطرہ کا مدفن ہو سکتا ہے۔

اوسیرس دیوتا اور آئرس دیوی مصر کے قدیم دور کے معروف دیوی دیوتا تھے۔ قدیم مصری تاریخ میں اُن دونوں سے منسوب افسانوی داستان کے مطابق یہ دونوں دیوی دیوتا بہن بھائی تھے۔ اوسیرس نے جوان ہونے پر اپنی بہن سے شادی کی تھی۔ داستان کے مطابق اوسیرس کو اس کے ایک بھائی سیٹھ نے قتل کر کے اس کی لاش کے کئی ٹکڑے کیے اور انہیں ملک کے دور دراز حصوں میں پھنکوا دیا۔ ان ٹکڑوں کو دیوتاؤں کے حکم پر اٹھا اٹھا کر دفن کیا گیا اور ان قبروں کے اوپر مندر بنا دیے گئے۔ یہ کل چودہ ٹکڑے تھے۔ ان ہی میں سے ایک ٹکڑا تپوسیرز مگنا میں دفن تھا۔ اوسیرس اُس وقت کے رومن اور مصریوں کا مقدس دیوتا تھا۔ تپوسیرز مگنا میں اس کے مرقد سے منسوب جگہ پر مندر تعمیر ہوا تھا جو بعد میں بہت مقدس سمجھا گیا۔ اُس کے تقدس سے کسی بھی پیروکار کے لیے انکار ممکن نہیں تھا۔ جہاں دیوتا کے مقدس جسم کا کوئی حصہ دفن ہو، وہاں پھر اُس کے بعد، اُس مندر میں کوئی فرعون ہی دفن ہو سکتا تھا۔

''بس! یہی وجہ تھی جس کے باعث مجھے یقین تھا کہ انتونی اور قلوپطرہ وہیں دفن کیے گئے ہوں۔'' کیتھلن نے یقین سے کہا جو سرگری سے اوسیرس دیوتا کے مندر کے آثار کی تلاش کر رہی تھی۔ اُس کا کہنا تھا۔

''تپوسیرز مگنا میں قلوپطرہ کا مقبرہ ہونے کے اس ٹھوس یقین کی کئی وجوہات تھیں، ایک وجہ یہ تھی کہ قلوپطرہ خود اس دیوتا کی پوجا کرتی تھی۔ تاریخی حوالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کی آخری رسومات مکمل مذہبی طریقے سے ادا کی گئی تھیں۔ پلوٹارک نے بھی سونے سے بنے، نفیس تخت پر اس کی لاش رکھے جانے کا واقعہ بیان کیا ہے۔ اہم بات یہ کہ وہ اپنی زندگی میں خود کو دیوی آئرس کا اوتار بتاتی تھی۔ وہ اس کا روپ بھرتی تھی۔ اس کا محل اسکندریہ کے جزیرۂ فرعون پہ تھا اور تپوسیرز مگنا اپنے مقدس معبد کے باعث اہم اور مشہور تھا۔ وہ خود یہاں مذہبی رسومات کی ادائیگی کے لیے بھی آتی تھی۔ ویسے بھی مصریوں کے ہاں موت کے بعد دوبارہ زندگی کا تصور تھا۔ اس لیے اُس نے اوسیرس اور آئرس کے معبد میں دفن ہونا پسند کیا ہوگا کہ وہ دوبارہ ملکہ یا دیوی کے روپ میں جنم لے۔ قلوپطرہ کی موت کے وقت اسکندریہ کے سوا سارا علاقہ رومن نے فتح کر لیا تھا۔ اس لیے یہ بات یقینی ہے کہ اس کے پاس تپوسیرز مگنا کے مقدس معبد میں تدفین کے سوا کوئی اور مقام نہیں بچا ہوگا اور اگر ہوگا تو اسکندریہ کے باہر اس کی رسائی مسدود ہو چکی تھی۔''

تپوسیرز مگنا میں کافی تلاش کے باوجود اسے کوئی خاص کامیابی نہیں ملی تھی مگر اس کے باوجود وہ اپنے مضبوط ارادے کے سبب کوششیں جاری رکھے ہوئے تھی۔

تپوسیرز مگنا میں تقریباً درجن بھر مندروں کے آثار پر تحقیق کرنے کے بعد اس نے مغرب میں اسکندریہ کا رخ

www.pdfbooksfree.pk

کیا۔ آگے بڑھنے کے لیے اس نے بحیرۂ روم کی ساحلی پٹی کے ساتھ ساتھ تعمیر کی گئی قدیم پتھریلی دیوار کے ساتھ سفر شروع کیا تھا۔ اس نے اب تک جتنے مندروں کے آثار کا تجزیہ کیا تھا، ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ طالمے دوئم کے عہد سے متعلق تھے۔ اسے مزید قدیم مندروں کے تجزیے کی ضرورت تھی تاکہ وہ قلوپطرہ کے مرقد کو تلاش کر کے اپنی تھیوری درست ثابت کر سکے۔

وہ آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کے سیدھے ہاتھ پر بحیرۂ روم اور اُلٹے پر جھیل میریوٹ واقع تھی۔ یہی وہ قدیم راستہ تھا، جسے قلوپطرہ تپوسیرز مگنا آنے جانے کے لیے استعمال کرتی تھی۔ جب لیتھلن آگے بڑھ رہی تھی تو یہ سوچ رہی تھی کہ قلوپطرہ نے اسی راستے پر واقع اوسیرس دیوتا کے مندر کو اپنی تدفین کے لیے چُنا ہوگا۔ اس یقین کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ مقدس مقام تھا، دوسرا یہ کہ قلوپطرہ کی سلطنت کے آخری ایام میں موت سے پہلے وہ جس آزاد مملکت کی فرعون تھی، وہ اسکندریہ کا یہی جغرافیائی علاقہ تھا۔ وہ زیرِ آب قدیم اسکندریہ کے مقام سے کچھ فاصلے پر تھی کہ ایک ویرانے میں وہ ٹھہر گئی۔ دور دور تک لائم اسٹون کے بڑے بڑے ٹوٹے بلاک اِدھر اُدھر بکھرے تھے۔ کہیں پر ستون زمیں بوس تھے تو کہیں اور اسی طرح کی دوسری چیزیں۔ آثار بتا رہے تھے کہ کچھ خاص ہوا کرتا تھا اُس جگہ پر۔ وہ گاڑی سے اتری اور تیزی سے اُس مقام کی طرف بڑھی۔

''انہیں دیکھ کر میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ آثار تھے کسی عظیم عمارت کے، ممکن ہے کہ وہ آثار ہوں قلوپطرہ کے بے نشان مرقد کے۔'' اپنے دل کی بات بتاتے ہوئے لیتھلن خاصی جذباتی ہو رہی تھی۔ ''میں ہاتھ لگا لگا کر اُن پتھروں کو محسوس کر رہی تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ ممکن ہے وہ یہیں کہیں ریت میں دفن ہو۔ ممکن ہے کہ یہی اس کے مقبرے کے آثار ہوں۔''

1935ء میں برطانوی سیاح انتھونی ڈی کون بھی اُس مقام پر پہنچا تھا جہاں لیتھلن پتھر کے ٹوٹے بلاکوں کو چھو کر محسوس کر رہی تھی۔ تپوسیرز مگنا کے حوالے سے اس مقام کا مختصر تذکرہ انتھونی نے اپنی سفری یادداشتوں میں کچھ یوں کیا ہے:

''ہم اہراموں کو اپنے پیچھے، مغرب میں چھوڑ کر آگے بڑھ آئے ہیں۔ اس وقت ہمارے دائیں جانب نفیس اور قدیم تاریخی یادگاریں موجود ہیں۔''

لیتھلن کہتی ہیں ''انتھونی کا بیان حیران کر دینے والا ہے۔ مصری آثاریات کے اس اہم ترین مقام پر اتنا بھی کام نہیں ہوا تھا کہ یہاں آنے والا سیاح اس مقام کے بارے میں کچھ اور بھی تفصیل سے بیان کر سکے۔''

1905ء میں تپوسیرز مگنا کے اس مقام پر معروف اطالوی ماہرِ آثارِ قدیمہ ایور ستوبریٹیا نے چوتھی صدی عیسوی کے ایک قبطی کلیسا کے آثار کی چار دیواری کے قریب کھدائی شروع کی تھی، جہاں پر اُس نے 'رومن باتھ' کے آثار دریافت کیے تھے۔

1998ء میں اسی مقام پر ہنگری سے تعلق رکھنے والے ماہرینِ آثاریات کی ایک ٹیم نے ڈاکٹر گیوزو وروز کی سربراہی میں 'رومن باتھ' کے قریب کھدائی شروع کی۔ کھدائی کے بعد ملنے والے آثار کی روشنی میں وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اُس مقام پر کبھی آئزس دیوی کا مندر واقع تھا۔

ڈاکٹر گیوزو نے اس پراجیکٹ کی تکمیل کے بعد ایک کتاب لکھی، جس کا نام ہے 'تپوسیرز مگنا'۔ یہ کتاب 2004 میں شائع ہوئی۔ مصنف نے اس کتاب میں تفصیل سے بیان کیا ہے:

''میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اُس مقام پر دریافت شدہ آثار کو تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں، ان میں پہلا طالمے سنگچوری ہے دوسرا حصہ رومن قلعے کے آثار پر مشتمل ہے، تیسرا حصہ قبطی کلیسا کا ہے۔''

تو کیا یہ ساری کہانی یونہی تھی اور بس صرف یہی کچھ تھا؟

ڈاکٹر گیوزو کو مندر کے آثار سے سیاہ گرینائٹ کے ٹکڑے ملے تھے۔ زاہی حواس ڈاکٹر گیوزو کی تحقیق اور اس کے دریافت کردہ آثار کے حوالے سے ایک اور خیال پیش کرتے ہیں۔

''سیاہ گرینائٹ کے ٹوٹے ٹکڑے کسی مجسمے کے چہرے کے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ قلوپطرہ کے مجسمے کا چہرہ ہو۔ گیوزو آئزس مندر کی تصدیق کرتا ہے۔ قلوپطرہ آئزس دیوی کے روپ میں لوگوں کے سامنے آتی تھی۔ ممکن ہے کہ اس کا قدِ آدم مجسمہ وہاں لگا ہو اور گیوزو کو جو ٹکڑے ملے ہیں، وہ اسی مجسمے کے ہوں۔ گیوزو کے مطابق وہ ٹکڑے مجسمے کے چہرے کے ہیں..... میرے خیال میں سیاہ گرینائٹ کے وہ چند ٹکڑے قلوپطرہ کے ہی چہرے کا سنگی عکس ہو سکتے ہیں۔''

گیوزو نے اپنے کتاب میں تفصیل سے بیان کیا ہے

کہ اسے تحقیق کے دوران اُس مقام سے جو اُس کے خیال میں آئزس دیوی کا مندر تھا، وہاں سے سیاہ گرینائٹ کے کچھ ایسے ٹکڑے ملے ہیں، جن کے بغور تجزیے سے پتا چلتا ہے کہ وہ مجسمے کا چہرہ تھا مگر افسوس کہ وہ مکمل ٹکڑے نہیں تھے کہ جنہیں جوڑ کر شکل دی جا سکے۔ البتہ یہ ضرور واضح ہے کہ وہ چہرے کے ہی ٹکڑے ہیں۔

جس مقام پر آئزس دیوی کے مندر کی موجودگی کا خیال پیش کیا گیا تھا، وہاں پر اکتوبر 2005ء میں کھدائی شروع کر دی گئی تھی۔

☆☆☆

یہ اکتوبر 2010ء کی بات ہے۔ آسمان صاف تھا اور چمکتے سورج کی روشنی میں فل آستینوں کی شرٹ پہنے، سر پہ اسکارف باندھے اور ہاتھوں پر اونی دستانے چڑھائے لیتھلن مارٹینز آئزس دیوی کے مبینہ مندر کی جگہ پر کھربی تھائے کھدائی میں مصروف تھی۔ ''عجیب بات ہے۔ میں جب بھی یہاں کام کرتی ہوں، مجھے شدید ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے۔ اتنی ٹھنڈک کہ چمکتے سورج اور اچھے خاصے گرم دن کے باوجود میں ٹھنڈ سے کپکپانے لگتی ہو۔ سردی سے میری انگلیاں اکڑنے لگتی ہیں۔ مجھے آج تک اس کی وجہ سمجھ نہیں آئی۔''

یہ سن کر مجھے حیرت ہوئی۔ اس احساس کے باوجود وہ بدستور اُس جگہ کھدائی کے کام میں ڈٹی ہوئی تھی۔

لیتھلن نے کھدائی کر کے قلوپطرہ کے مدفون مقبرے کی تلاش کے لیے ابتدائی طور پر دو ماہ کی مہلت مانگی تھی۔ کچھ ہی دن میں اس نے درخواست کی کہ یہ مدت تین ماہ تک بڑھا دی جائے اور اب اُس کے تین ماہ پانچ برسوں کے ساٹھ مہینوں پر پھیل چکے ہیں مگر تحقیق اور تلاش بدستور جاری ہے۔ نہ کھدائی مکمل ہوئی ہے اور نہ ہی لیتھلن کا حوصلہ کمزور پڑا۔ اس کھدائی کے دوران لیتھلن نے کئی اور دریافتیں کر لی ہیں مگر اُس کے لیے یہ سب کچھ غیر اہم ہے مگر سب کے لیے نہیں۔ ڈاکٹر زاہی حواس وہاں سے ملنے والے نوادرات کو بہت اہم قرار دیتے ہیں مگر اُس کے لیے تو سب سے اہم چیز قلوپطرہ کا مرقد ہے۔

تپوسیرز مگنا میں کھدائی کے دوران، اس مقام سے صرف چند انچ آگے جہاں پر ہنگری کے ماہرین نے اپنی کھدائی روک دی تھی، زیرِ زمین ایک اور مندر اور کئی سرنگوں کے آثار ملے ہیں۔ مندر کے حوالے سے ڈاکٹر زاہی حواس

آئین (دستور)

ان ضابطوں اور اصولوں کے مجموعے کا نام جن پر کسی ملک کے تمام قوانین اور اختیارات کی بنیاد رکھی جاتی ہے اور جن کی رُو سے حاکم اور محکوم کے باہمی تعلق کا تعین کیا جاتا ہے۔ دستور اساسی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کون کون سے کام کرنے کی مجاز ہے اور شہری کن کن باتوں کا مطالبہ حکومت سے کر سکتے ہیں اور ان کے حقوق کیا ہیں۔ حکومت کے ہر فرد کے حقوق کیا ہیں۔ حکمرانی کے اختیارات کن کن لوگوں کے ہاتھوں میں دیے جائیں گے؟ حکومت کی طرف سے باشندگانِ مملکت کے تحفظ کی ضمانت کیا ہوگی؟ اور کون کون سے آئینی ذرائع سے وہ اپنے اپنے حقوق منوا سکتے ہیں یا ان کی حفاظت کر سکتے ہیں؟

بعض ملکوں میں ایسا دستور کسی حد تک باقاعدہ تحریر میں لایا گیا ہے جس کا فائدہ یہ ہے کہ شک وشبہ، اختلاف ونزاع کی صورت میں تحریر کی جانب رجوع کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس میں ردّوبدل کی گنجائش نہیں ہوتی، لیکن زیادہ تر ملکوں میں یہ دستور دستاویزی صورت میں محفوظ نہیں رکھا جاتا بلکہ اس مملکت کے عام اور مسلمہ اصولوں اور رسم ورواج کے مطابق ضوابط وضع کر لیے جاتے ہیں۔ جن ملکوں میں دستور غیر تحریری صورت میں ہوتا ہے وہاں بھی کچھ حصہ تحریر میں لایا جاتا ہے۔ مثلاً انگلستان میں منشور اعظم، درخواست حقوق، مسودہ قوانین، اصلاحات پارلیمان وغیرہ کتاب آئین میں درج ہیں۔ موجودہ زمانے میں لوگ غیر تحریری دستور پر تحریری دستور کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ اس طرح ان کو اپنے حقوق کے پامال ہونے کا خدشہ کم ہوتا ہے اور شک وشبہ کی شکل میں وہ تحریری دستاویز کی جانب رجوع کر سکتے ہیں۔

پاکستان کا پہلا آئین 1956ء میں نافذ ہوا جو اکتوبر 1958ء میں مارشل لاء کے نفاذ کے بعد منسوخ کر دیا گیا۔ دوسرا آئین 1962ء میں نافذ ہوا، اور یہ بھی مارچ 1969ء میں مارشل لاء لگنے کے بعد کالعدم قرار دے دیا گیا۔ تیسرا آئین 14 اگست 1973ء کو نافذ ہوا، لیکن جولائی 1977ء میں، مارشل لاء کے نفاذ کے بعد اسے بحال رکھا گیا، گو اس کی چند دفعات معطل کر دی گئیں۔ اس میں 1999ء تک پندرہ ترامیم کی جا چکی ہیں۔

مرسلہ: نزہت افشاں، ملتان

www.pdfbooksfree.pk

اور کیتھلن متفق ہیں کہ وہ دیوتا اوسیرس کا مندر ہے۔ ڈاکٹر ھواس کا کہنا ہے یہ مندر طالمے چہارم کے دور کا تعمیر کیا ہوا لگتا ہے۔ طالمے چہارم نے قلوپطرہ سے پہلے ڈیڑھ سو سال تک مصر پر بطور فرعون حکومت کی تھی۔ مندر کے مقام پر دریافت پُراسرار سرنگوں کی اب تک انہیں سمجھ نہیں آئی ہے۔

ان سرنگوں کی دریافت بھی بہت دلچسپ واقعہ ہے۔

کھدائی کے پہلے سال ہی کیتھلن کو مبینہ مندر کے مقام پر ایک چمنی نما شے ملی جو زمین میں گہرائی تک جارہی تھی۔ جب اس نے مزید تحقیق کی تو پتا چلا کہ نیچے تو سرنگوں کا ایک جال ہے، ممکن ہے کہ یہ ان سرنگوں میں تازہ ہوا کی فراہمی کا ذریعہ ہو۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک سرنگ میں سے ایک عورت اور بچے کا ڈھانچا ملا ہے۔ بچہ دورانِ ولادت ہی انتقال کر گیا تھا اور عورت بھی دردِزہ کے باعث زچگی کے دوران ہی چل بسی تھی۔ دورانِ پیدائش مرجانے والے بچے کی ہڈیاں بھی شکمِ مادر کے زیریں حصے کے نہایت قریب سے ملی ہیں۔ عورت کا جبڑا اتنا ہوا تھا جبکہ اس کی بھنچی ہوئی مٹھی میں ایک سفید ماربل کا ٹکڑا دبا ہوا تھا۔

کیتھلن کا کہنا ہے ''میرے لیے عورت اور اس بچے کا ڈھانچا ملنا معما ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آیا کہ اس حالت میں وہ وہاں کیسے اور کیوں پہنچی؟، وہ کون تھی؟..... مقدس مندر کے ساتھ بنی ان سرنگوں میں اس حالت سے دوچار عورت..... کچھ بات سمجھ نہیں آتی۔''

کیتھلن نے ابتدائی تحقیق کے بعد تابوت بنوایا اور ماں بچے کی ہڈیوں کو کفن میں لپیٹ کر احترام سے دفن کر دیا۔

کیتھلن سے قبل تپوسیرز مگنا کے اس تاریخی مقام پر دو تین چھوٹی چھوٹی اور غیر اہم کھدائی کو چھوڑ کر کوئی بڑی کھدائی نہیں کی گئی تھی۔ اس ضمن میں کیتھلن سے قبل سب سے بڑا کام ہنگری کے ڈاکٹر گیوزو نے کیا تھا مگر جب سے کیتھلن نے اس مقام پر کام شروع کیا، تب سے وہ مقام پورے مصر میں مشہور ہونے لگا۔ تپوسیرز مگنا کے مقام پر کیتھلن کی نگرانی میں گزشتہ چھ سال سے کھدائی اور دریافت کا سلسلہ جاری ہے۔ اب تک اس مقام سے ایک ہزار سے زائد نوادرات دریافت ہو چکے ہیں، جن میں سے دو سو سے زائد نوادرات کو ماہرین نہایت اہم قرار دے رہے ہیں۔ اس دریافت سے مصری تاریخ کے اس گم گشتہ مقام کی اہمیت واضح ہوتی جارہی ہے۔ اب تک دریافت شدہ نوادرات میں برتن، سکے، سونے کے زیورات، سنگِ مرمر سے بنے مجسموں کے ٹوٹے ہوئے چہرے شامل ہیں۔

ماہرینِ آثار کا خیال ہے کہ اشاعتِ عیسائیت کے ابتدائی دور میں کٹر عیسائیوں نے مجسموں کو غیر شرعی قرار دیتے ہوئے ان کے چہرے توڑ ڈالے ہوں گے۔

تپوسیرز مگنا کے اس مقام پر اب تک دریافت شدہ آثار میں سب سے اہم دریافت قبرستان کو قرار دیا جارہا ہے۔ ممکنہ مندر کی بیرونی دیوار کے ساتھ ایک قبرستان ملا ہے کیتھلن کا کہنا ہے کہ یہ ان پجاریوں کا قبرستان ہوگا جو مندر میں ہی رہتے ہوں گے۔ موت کے بعد بھی وہ مندر اور فراعین کے شاہی قبرستان کے قریب دفن ہونے کی خواہش رکھتے ہوں گے۔ مقدس مذہبی حیثیت کے باعث ان کی خواہش پوری کر دی گئی ہوگی۔

☆☆☆

کیتھلن مارٹینز کی پُرجوش کوششیں جاری ہیں۔ ڈاکٹر زاہی ھواس بھی بہت پُرامید ہیں مگر کئی سالوں کی کھدائی اور متعدد اہم دریافتوں کے باوجود اب تک قلوپطرہ اور انتونی کے مرقد کا کچھ نہیں پتا چل سکا۔ ایک مندر کی تلاش ہو چکی ہے مگر کیتھلن کا کہنا ہے کہ وہ اس کی منزل نہیں۔ ڈاکٹر زاہی ھواس کا بھی خیال ہے کہ وہ مندر دیوی آئرس کا نہیں۔

کیا مصر کی آخری فرعون کا مقبرہ بھی دریافت ہو پائے گا!!!

اگر یہ مقبرہ مل گیا تو تاریخ کی ایک بہت بڑی دریافت ہوگا۔ یہ دریافت اپنے وقت کی سب سے بڑی خبر بن جائے گی مگر فی الحال اس حوالے سے قطعی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے کہ یہ خبر کب آئے گی۔

مقبرہ دریافت نہ ہوا تو.....

ابھی مقبرے کی تلاش میں کامیابی اور ناکامی کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے، البتہ ایک بات سو فیصد یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ قلوپطرہ کے مقبرے کی تلاش کے لیے کیتھلن مارٹینز کے سر ہے۔

قلوپطرہ کے مقبرے کی دریافت کے لیے کیتھلن کی تھیوری کو ڈاکٹر ھواس جیسے بڑے ماہرینِ مصری آثاریات نے تسلیم کیا۔ کیتھلن کی کوششوں کے باعث تپوسیرز مگنا کا گمنام علاقہ سیاحوں اور ماہرینِ آثاریات کی توجہ کا مرکز بنا۔ ان سب باتوں کے باوجود جہاں اس کے بے شمار طرف

دار ہیں، وہیں اس پر تنقید کرنے والے بھی موجود ہیں۔

ڈوآن رولر ''کیتھلن تھیوری'' کے ناقدین میں سے ایک ہیں۔ وہ قلوپطرہ پر لکھی گئی کتابوں کے مصنف ہیں اور وہ اس کی شخصیت پر مستند ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ''آثاریات کے شعبے میں یہ بہت ہی نادر بات ہے کہ کوئی اٹھ کر تھیوری پیش کرے اور کہے کہ اب وہ اُسے تلاش کرنے جارہا ہے اور پھر حقیقت میں وہ ایسا کرنے میں کامیاب بھی ہو جائے۔''

ڈوآن مزید کہتے ہیں۔ ''اس بات پر یقین کرنا بہت مشکل ہے کہ آکٹاوین کے خوف سے قلوپطرہ کے مقبرے کو خفیہ رکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس کے جسدِ خاکی کو ممیا نے اور پھر اُس کی تدفین میں شامل کئی لوگ تھے۔ اُن کی گواہی موجود ہے کہ قلوپطرہ کو اُس کے اجداد کے مقابر کے ساتھ دفن کیا گیا تھا۔ ان کے ذریعے رومن دشمن جائے تدفین با آسانی معلوم کر سکتے تھے۔ ایک اور بات یہ ہے کہ جس معنی خیز مواد کی بنا پر اس کی تدفین یا مقبرے کا تعلق تپوسیرز مگنا سے جوڑا جارہا ہے، وہ مصر میں کئی اور جگہ بھی موجود ہو سکتا ہے۔''

''میں اتفاق کرتی ہوں کہ آکٹاوین قلوپطرہ کے مقبرے کے بارے میں جانتا تھا۔ جس مقام پر اسے دفن کیا گیا، اس کی اجازت آکٹاوین نے ہی دی تھی۔'' کیتھلن نے ناقدین کی رائے تسلیم کرتے ہوئے جواب دیا مگر اُس کا اگلا جملہ چونکا دینے والا تھا۔ ''جہاں تک میرے یقین کا تعلق ہے تو ایسا شاید نہیں ہوا تھا مگر یہ میری ایک تھیوری ہے۔ میرا خیال ہے کہ جب انتونی اور قلوپطرہ کی لاشوں کو ممیائے جانے کا عمل مکمل ہو گیا ہوگا تب تپوسیرز مگنا کے پجاریوں اور پروہتوں نے اُن دونوں کی لاشوں کو رومن حکمرانوں سے پوچھے یا اجازت لیے بنا الگ الگ خفیہ طور پر دفن کر دیا ہوگا۔ ممکن ہے کہ اُن دونوں کو معبد کے احاطے میں، کسی خفیہ جگہ پر دفن کیا گیا ہو۔''

اگر کبھی یہ انکشاف ہوا کہ قلوپطرہ کا مقبرہ تو بہت پہلے ہی دریافت ہو چکا تھا تو اس بات پر پردہ ڈالنے کے جرم میں جس ہستی پر سب سے زیادہ لعن طعن ہو سکتی ہے، وہ ہیں ہاورڈ کارٹر، جنہوں نے 1922ء میں مصری بادشاہ ٹٹ کا مقبرہ دریافت کیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس نے قلوپطرہ کا مقبرہ یا اس کی ممی دریافت کی تھی؟ اگر ایسا تھا تو وہ کیسے کہہ سکتا تھا کہ وہ مقبرہ یا ممی مصر کی فرعون قلوپطرہ کی ہے یا کسی اور کی۔ اس کا جواز یہ بھی ہے کہ قلوپطرہ کے مقبرے یا اس کے حوالے سے ٹھوس شواہد نہیں ملتے۔ گزشتہ ایک سو سال کے دوران مصری آثارِ قدیمہ کے بارے میں جو بھی نئی دریافتیں ریکارڈ کا حصہ بنی ہیں، اُن میں صرف ایک شکستہ کاغذ پر ہاتھ سے لکھی تحریر سامنے آئی ہے، جس کا تعلق قلوپطرہ سے ثابت ہوا ہے۔ قلوپطرہ کی یہ تحریر نباتاتی کاغذ Papyrus پر لکھی ایک مختصر عبارت ہے جو اُس نے مصر کے ایک رومن شہری کو محصولات کی ادائیگی سے چھوٹ دینے کے لیے 33 قبل مسیح میں اپنے ہاتھ سے لکھ کر دی تھی۔

شیکسپیئر نے لکھا تھا ''وہ لامحدود جہتوں کی مالک تھی۔'' ممکن ہے کہ اس کا مقبرہ بھی اُس کی لاتعداد جہتوں میں شامل ہو جس کی بنا پر اب تک ممکن ہے کہ کئی ماہرینِ آثار اس تک پہنچے ہوں مگر شناخت نہیں کر پائے اور اُسے جُوں کا تُوں چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ ویسے ہی جیسے قلوپطرہ سے کئی صدیوں پہلے کے وہ مقامی مصری فرعون کہ جن میں سے بعض کے مقابر کو ہاتھ تک نہیں لگایا گیا اور ان میں سے بھی کئی ایسے ہیں جو کھولے گئے مگر ماہرین سمجھ نہ پائے کہ ان میں مدفون شخصیات کون ہیں؟ اور پھر وہ اسے ویسے ہی بند کر کے آگے بڑھ گئے۔

قلوپطرہ کی ملنے والی صرف ایک تحریر کے انداز سے اس کی شخصیت کے بارے میں کچھ کہنا ناممکن ہے۔ قدیم مؤرخین سے لے کر جدید محققین تک، سب اس بات پر متفق ہیں کہ وہ نہایت ذہین اور متنوع شخصیت کی مالک تھی۔ تاریخ اور نوادرات کی دنیا میں اس سے زیادہ مشہور اور متنوع شخصیت کی مالک کوئی اور ہستی نہیں۔ کتنی عجیب بات ہے کہ دو ہزار برس سے کچھ زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود اس کی شخصیت کے سحر نے اب تک تاریخ، نقاد اور جدید عہد کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے، وہ بھی صرف تذکروں اور قصوں کی بنیاد پر، حالانکہ آثارِ قدیمہ کے حوالے سے شخصیت کا تاثر دریافت پر قائم ہوتا مگر قلوپطرہ کے معاملے میں صورتِ حال بالکل اُلٹ ہے۔ اس سے منسوب اب تک صرف ایک کاغذ کا ٹکڑا ٹھوس حقیقت بن کر سامنے آسکا ہے، اس کے علاوہ کوئی مستند شے نہیں جو تاریخ کی اس ساحرہ سے نسبت ثابت کر سکے مگر پھر بھی وہ زندہ ہے۔ یہ جاننے کے باوجود کہ اس کی موت کے وقت اس کی ریاست صرف اسکندریہ کے چھوٹے سے علاقے تک محدود ہو گئی تھی مگر اس کے باوجود کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کہاں دفن ہے۔ اس کی لاش کو ممی

www.pdfbooksfree.pk

بنانے کے عمل سے گزارنے والے کئی لوگ ہوں گے، اس کی تدفین میں بھی کچھ لوگوں نے تو ضرور شرکت کی ہوگی مگر کسی نے تاریخ میں یہ نشاندہی نہیں چھوڑی کہ اسے کس مقام پر ابدی نیند سونے کے لیے لٹایا گیا تھا۔ جیسی پیچ در پیچ اُس کی شخصیت تھی، اتنی ہی پیچ دار وہ مرنے کے بعد ثابت ہوئی کہ کسی کو اس کے مقامِ آخر کا علم نہیں۔

قلوپطرہ اپنی زندگی میں جتنی خوش لباس ہوگی، مرنے کے بعد بھی اس کا نام آج کی جدید فیشن کی صنعت میں پُرکشش ہے..... وہ جتنی نازک اندام ہوگی، اُس کے نام پر اتنی ہی نفیس خوشبوئیں نہایت مہنگے داموں دنیا بھر کے مہنگے ترین بازاروں میں بیچی جارہی ہیں..... وہ زندہ ہوگی تو کنیزیں اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہوں گی، آج اس کے نقشِ آخر کی تلاش میں کیتھلن اور اس کے کئی ساتھی ماہرینِ آثاریات سرگرداں ہیں..... کل اُس کا حسن اُمرا کے دلوں کو تڑپاتا ہوگا، آج بھی اُس کے قصے جواں دلوں کو گرما دیتے ہیں..... واقعی وہ ہمہ جہت اور متنوع شخصیت کی مالکہ تھی۔

قلوپطرہ حقیقت تھی لیکن اُس کی شہرت ایک افسانوی خیال بن کر ابھری اور خوشبو بن کر پھیل گئی۔ کیتھلن سے پہلے کسی نے بھی اتنی تن دہی سے اُس کے مرقد کی تلاش نہیں کی تھی۔ لوگوں کا تو اس طرف خیال ہی نہیں گیا۔ شاید وہ کپڑے کی پٹیوں میں لپٹی، سوکھی چمڑی، کھلے منہ اور کھلی آنکھوں والی خوفناک ممی کی تصاویر کے بجائے اُس کے حسن آفریں تصور کو ہی فوقیت دیتے ہیں..... قلوپطرہ، لاتعداد جہتوں کی مالکہ، مصر کی فرعون اور اب کیتھلن کا جنون.....

مقبرے کی تلاش لگ بھگ بائیس تیئس برس پہلے ایک بحث سے شروع ہوئی تھی مگر اب وہ کیتھلن کا جنون بن چکا ہے۔ شوق سے جنون بننے والی اس تلاش کی بہت بڑی قیمت ادا کررہی ہے۔ وہ دن دن بھر سائٹ پر کھدائی میں مصروف رہتی ہے اور راتوں کو بیٹھ کر تحقیق کو لکھنے میں مصروف رہتی ہے۔ وہ سینٹو ڈومینگو کے کالج میں پڑھاتی تھی، وہ نوکری کب کی چھوٹ چکی۔ وہ لاء گریجویٹ تھی اور اپنے ملک میں وکالت بھی کرتی تھی مگر اب مدت ہوئی کہ یہ ساتھ بھی چھوٹ چکا۔ اس نے جو کچھ پس انداز کیا تھا، اُس کا بڑا حصہ اس جستجو پر صرف کرچکی۔ وہ اپنے خاندان اور دوستوں سے بہت دور ہوچکی ہے۔ کیتھلن گزشتہ کئی برسوں سے مستقل طور پر مصر میں مقیم ہے۔ اس نے اسکندریہ میں ایک اپارٹمنٹ کرائے پر لے رکھا ہے۔ اب وہ اپنے کام کو مزید تیزی سے آگے بڑھانے کے لیے عربی زبان کی تعلیم حاصل کررہی ہے۔ وہ مصر آئی تو جوان جہان لڑکی تھی مگر اب وہ عمر کی پانچویں دہائی کے نصف کے قریب ہے۔ مصر کے صحرا میں مارے مارے پھرتے رہنے میں اس کی جوانی کب ڈھلی، اسے یہ سوچنے کی بھی مہلت نہیں ملی۔ اس کی زندگی پہ صرف ایک سوچ غالب ہے..... قلوپطرہ کا مقبرہ۔

2011ء کے مصری انقلاب کے دوران چند مشتعل مصری مظاہرین نے اس پر بھی اپنا غصہ اتارنے کی کوشش کی تھی۔ ایک دن وہ اپنی سائٹ پر کام کررہی تھی کہ حسنی مبارک کے خلاف احتجاج کرنے والے کچھ مشتعل نوجوانوں نے اس پر حملہ کردیا۔ ساتھیوں کی مداخلت سے وہ بچ گئی مگر اس کے باوجود خوف زدہ نہیں ہے۔ وہ اب بھی تن دہی سے تپوسیرز میکنا کے مقامِ آثارِ قدیمہ پر پورا دن کام میں گزارتی ہے!

''مجھے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں۔'' اس نے کام سے وقفے کے دوران چائے پیتے ہوئے کہا۔ ''میں نہ مصر سے خوف زدہ ہوں نہ وقتی طور پر مشتعل مصریوں سے..... مجھے اپنا کام پورا کرنا ہے۔ میری زندگی کا مقصد صرف قلوپطرہ کے مقبرے کی تلاش ہے۔ مجھے کوئی فکر نہیں کہ اس کام میں بوڑھی ہوجاؤں گی۔ مجھے اپنی کامیابی کا یقین ہے۔'' اس نے اُنگلی سے اُس جگہ کی طرف اشارہ کیا، جہاں وہ کچھ دیر پہلے ایک گڑھے میں بیٹھی کھرپی سے مٹی نکال رہی تھی۔ ''مجھے مقبرے کی تلاش میں بھی کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں۔ یقین ہے جس شے کی مجھے تلاش ہے وہ یہیں کہیں پر ہے۔ آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں.....'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکی اور میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہنے لگی!

''میں قلوپطرہ کی ممی اور اس کے مقبرے کو دنیا کے سامنے لاؤں گی اور اس کے حوالے سے تاریخ مجھے بھی ہمیشہ زندہ رکھے گی۔''

مجھے یقین ہوگیا کہ تاریخ میں جگہ پانے والے ضرور سر پھرے اور اُن کی لگن سو فیصد خالص ہوتی ہوگی ورنہ تو عیش کی زندگی گزار کر گمنام مرجانے والوں سے قبرستان بھرے پڑے ہیں۔ تاریخ میں زندہ رہنے کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ شاید کیتھلن بھی وہی قیمت ادا کررہی ہے۔

لازوال محبتیں

منزہ قادری عطاری

عشق' ازل سے لازوال مانا جاتا ہے۔ جس نے بھی بحرِ عشق میں غوطہ لگایا وہ جاوداں ٹھہرا۔ برصغیر میں لاتعداد عشق و محبت کے قصّوں نے جنم لیا۔ ان میں سے چند حکایتیں' چند قصّے۔

سچی محبت کے حقیقی کرداروں کا تذکرہ

محبت کی اس لازوال داستان کا تعلق برصغیر (سندھ) سے ہے۔

یہ کہانی آج بھی لوک ادب کا شاہکار سمجھی جاتی ہے۔ اور بار بار دہرائی جاتی ہے۔ یہ ایک خوبصورت لیکن الم ناک داستان ہے۔

اس تاریخی محبت بھری کہانی کا تعلق دور یا ستوں یا صوبوں سے ہے۔ یعنی سندھ اور بلوچستان، یہ ایک عورت کی ایسی داستان ہے جو وفا کی پتلی تھی اور جس کے لیے اس کا

www.pdfbooksfree.pk

محبوب ہی سب کچھ تھا۔ وہ یہ گوارا نہیں کرسکتی تھی کہ کسی غیر کے ہاتھ اس کے بدن کو چھو سکیں۔

دوسری طرف یہ ایک ایسے مرد کی بھی کہانی ہے جو اتنا ہی وفادار تھا جتنی وفاداری اس کے محبوب نے دکھائی تھی۔

اس کہانی میں یہ بھی شامل ہے کہ کس طرح خود قدرت سچا پیار کرنے والوں کو اپنی آغوش میں پناہ دے دیتی ہے۔

سسی

سسی سندھ کے شہر بھنبھور کے راجا بھنبھور کی بیٹی تھی۔ لیکن یہ وہ بیٹی تھی جس کو ابتدا ہی سے آفتوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔

جس کے دکھوں کی ابتدا اس کی پیدائش کے ساتھ ہی ہوگئی تھی۔ اس کی پیدائش پر جشن بھی منایا گیا۔ لیکن یہ خوشی اس وقت خاک میں مل گئی جب نجومیوں نے اس کا زائچہ دیکھنے کے بعد اعلان کردیا کہ یہ لڑکی پورے خاندان کے لیے تباہی اور بربادی کا سبب بن جائے گی۔

اس کی وجہ سے تمہارے خاندان کی عزت خاک میں مل جائے گی۔ اور خود راجا کی زندگی کو خطرہ ہے۔ راجا یہ سن کر پریشان ہوگیا۔

ایک ترکیب اس کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے حکم دیا کہ اس بچی کو لکڑی کے صندوق میں بند کرکے دریا میں بہادیا جائے۔ پھر اس کی قسمت کہ دریا کی لہریں اسے اپنے ساتھ جہاں لے جائیں۔

اس کے حکم کی تعمیل ہوئی اور ننھی سسی کو لکڑی کے صندوق میں بٹھا کر دریائے سندھ میں چھوڑ دیا گیا۔ لیکن قدرت کو اس کی موت منظور نہیں تھی۔

آگے چل کر اس بچی کو محبت کا ایک ناقابلِ فراموش داستان کا مرکزی کردار بننا تھا۔ اس لیے گھاٹ پر کپڑا دھونے والے ایک دھوبی نے اس صندوق کو دیکھ لیا۔

وہ اس صندوق کو کنارے پر لے آیا۔ بے اولاد دھوبی نے جب اس صندوق میں ایک چاند سی بچی دیکھی تو خدا کا شکر ادا کرنے لگا۔

قدرت نے اسے دریائے سندھ کے ذریعے ایک اولاد سے نواز دیا تھا جو اتنی خوبصورت تھی کہ دھوبی اسے دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔

اس کا خیال تھا کہ قدرت نے اسے ایک بہت بڑے تحفے سے نواز دیا ہے اور یہ بچی اس کے لیے خوشیاں لے کر اس کے پاس آئی ہے۔

وہ اسے اپنے گھر لے آیا۔ اس کی بیوی بھی اس بچی کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ دونوں نے اس کا نام سسی رکھ دیا اور اس طرح دھوبی کے گھر میں سسی کی پرورش ہونے لگی۔

جب سسی جوان ہوئی تو اس کے حسن کے چرچے پھیل گئے۔ وہ آسمانوں سے اتری ہوئی پری کی طرح حسین تھی جو دیکھتا حیران ہوکر رہ جاتا۔

کسی کو یقین ہی نہیں آتا تھا کہ ایک دھوبی کی لڑکی اتنی خوبصورت بھی ہوسکتی ہے۔ اس کے حسن کی داستان پنوں تک پہنچ گئی اور وہ اسے دیکھنے کے لیے بے تاب ہوگیا۔

پنوں بھی ایک خوبصورت نوجوان تھا۔

وہ بلوچستان کے علاقے مکران کا شہزادہ تھا۔ وہ کسی کو بتائے بغیر بھنبھور کی طرف چل پڑا۔ عشق کی شدت ایسی تھی کہ وہ سسی سے بن دیکھے کا سودا کر بیٹھا تھا۔

ہوسکتا تھا کہ اس نے سسی کے حسن کی جو داستانیں سنی تھیں، وہ ویسی نہ ہوں۔ اس کے باوجود کوئی کشش اسے سسی کے شہر کی طرف کھینچے لیے جارہی تھی۔

کئی دنوں کے دشوار ترین سفر کے بعد بالآخر وہ بھنبھور پہنچ ہی گیا۔ اس نے ایک سرائے میں قیام کیا تھا۔ ابھی فکر یہ تھی کہ سسی کا دیدار کیسے کیا جائے۔

اس نے اپنے کچھ کپڑے دھوبی کے پاس دھونے کے لیے بھیج دیے۔ تاکہ کپڑے واپس لینے کے بہانے وہ سسی کو دیکھ سکے۔

اس کی ترکیب کامیاب رہی۔ وہ جب کپڑے واپس لینے پہنچا تو سسی اس کے سامنے آگئی۔ دونوں کے لیے پہلی جھلک ہی کافی تھی۔ ایک دوسرے کو دیکھتے ہی دونوں ایک دوسرے کے ہوگئے تھے۔

یہ محبت تو اسی طرح ہوا کرتی ہے۔

ایک دوسرے کا ہونے کے لیے مہینوں یا برسوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بس ایک نگاہ کافی ہوتی ہے۔" چھاپ تلک سب چھین لی موسے نیناں ملا کے"

نیناں مل گئے تو پھر کسی اور بات کا یارا نہیں رہا۔ دونوں ایک دوسرے سے ملنے لگے۔ یہ ملاقات پہلے سے زیادہ محبت بھری ہوا کرتی۔ ہر ملاقات میں یہ آگ تیز اور تیز اور تیز ہوجایا کرتی۔

سسی کا دھوبی باپ سسی کی شادی کسی دھوبی ہی سے کرنا چاہتا تھا۔ اب یہ پنوں درمیان میں آگیا تھا۔ اس نے

دیکھ لیا تھا کہ سسی پنوں کی محبت میں پاگل ہوتی جارہی ہے۔

اس نے پنوں کے سامنے ایک شرط رکھ دی اور شرط یہ تھی کہ پنوں کپڑے دھوکر دکھائے کہ آیا وہ اس کی برادری میں شامل ہونے کے قابل ہے یا نہیں۔

محبت کے مارے ہوئے پنوں نے یہ شرط مان لی۔ اسے ڈھیر سے کپڑے دے کر دریا کی طرف بھیج دیا۔ پنوں کے لیے یہ بالکل نیا تجربہ تھا۔

وہ شہزادہ تھا۔ اس نے کبھی ایسے کام نہیں کیے تھے۔ لیکن محبت اسے اس مقام تک لے آئی تھی۔ اس نے کپڑے دھونے کی کوشش تو کی۔ لیکن بات نہیں بنی۔ اس سے کپڑے نہیں دھوئے گئے۔ اس نے غصے میں آکر سارے کپڑے پھاڑ دیے۔ لیکن ہر کپڑے میں اس نے سونے کا ایک ایک سکہ رکھ دیا۔

اس کی ترکیب کام آگئی تھی۔

دھوبی پنوں کی شادی سسی سے کرنے کے لیے رضا مند ہوگیا تھا۔

دوسری طرف پنوں کے باپ کو جب یہ پتا چلا کہ پنوں ایک دھوبی کی بیٹی سے شادی کرنے والا ہے تو اس پر قیامت ٹوٹ پڑی۔

پنوں اس کا بیٹا تھا۔ ایک راجا کا بیٹا تھا۔ وہ یہ کیسے برداشت کرسکتا تھا کہ پنوں کی شادی دھوبی گھرانے میں ہو۔ اس نے پنوں کے بھائیوں کو یہ حکم دیا کہ کسی طرح بھی ہو، بھنبھور جاکر یہ شادی رکواؤ۔

پنوں کے بھائی تیز رفتاری سے سفر کرتے ہوئے پنوں تک پہنچ گئے۔ انہوں نے پہلے تو پنوں کو سمجھانے کی کوشش کی۔ پھر دھمکیاں دینے لگے۔ لیکن یہ وہ نشہ نہیں جسے ترش اتار دے۔

پنوں نے اپنے بھائیوں کی بات ماننے سے انکار کردیا۔ پھر انہوں نے ایک چال چلی۔ انہوں نے پنوں سے کہہ دیا کہ وہ سب پنوں کی محبت سے متاثر ہوگئے ہیں۔ اس لیے پنوں کا ساتھ دینے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ پنوں کے لیے یہ بہت بڑی بات تھی کہ اس کے ناراض بھائی اس کا ساتھ دے رہے ہیں۔

بھائیوں نے شادی والے دن اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنا دیا۔ کسی مشروب میں بے ہوشی کی دوا شامل کرکے پنوں کو پلادی گئی اور جب وہ دوا کے اثر سے بے ہوش ہوگیا تو اسے راتوں رات اٹھا کر اس کے آبائی شہر لے آئے۔

سرگزشت کا ایک اور معرکتہ الآرا خاص شمارہ

بینا نابینا نمبر

بے بصارتی کے اندھیرے میں روشن ستارہ بن کر چمکنے والوں کی داستانیں۔ وہ نابینا تھا لیکن مظاہر فطرت کی تصاویر ایسے بناتا ھے کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے ھیں۔ وہ اندھا ضرور تھا لیکن اس کی بنائی ہوئی دھنیں ھندو پاک میں مقبولیت پاتیں۔ وہ پیدائشی نابینا ھیں لیکن ان سے امریکا بھی ڈرتا ھے۔ ایسے بہت سارے دل کو دکھا دینے والے قصے' سچ بیتیاں' حقیقی واقعات

ایک ایسا خاص شمارہ جسے آپ مجلد کرا کر رکھیں گے

بہت جلد پیش کیا جارہا ہے آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر اپنا شمارہ بک کرائیں

www.pdfbooksfree.pk

دوسری صبح جب سسی کو ہوش آیا تو اسے احساس ہوگیا کہ ان دونوں کے ساتھ بہت بڑا دھوکا ہوا ہے۔ پنوں کے بھائیوں نے وہ مشروب سسی کو بھی پلوا دیا تھا۔

صورتحال کا اندازہ ہوتے ہی سسی پر ایک جنونی کیفیت طاری ہوگئی۔ اس کے محبوب کو اس سے دور کردیا گیا تھا۔ یہ سانحہ اس کے لیے موت سے کم نہیں تھا۔

وہ اندازہ لگا سکتی تھی کہ پنوں کے بھائی پنوں کو کہاں لے جاسکتے ہیں۔ اس نے جنونی حالت میں کچھ مکران کی طرف دوڑ لگادی جو وہاں سے کوسوں دور تھا اور راستے میں بے رحم ریگستان بھی تھا۔ ایک طرف سندھ، دوسری طرف بلوچستان۔

ایک نازک سی لڑکی، جس کے پاؤں لہولہان ہوتے جارہے تھے لیکن وہ ایک جنونی کیفیت میں پنوں پنوں پکارتی ہوئی دوڑتی چلی جارہی تھی۔ صحرا کی تیز دھوپ نے اسے جھلسا کر رکھ دیا تھا۔ اس کے ہونٹ پیاس کی شدت سے تڑخ گئے تھے، حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے۔

موت اس کے سامنے تھی۔ اس وقت ایک چرواہا اس طرف آنکلا۔ اس نے سسی کو پانی بھی پلایا اور بکری کا دودھ بھی پینے کو دیا۔

سسی کے چہرے کی تازگی واپس آگئی تھی۔ اس نے چرواہے کا شکریہ ادا کیا۔ وہ وہاں سے آگے جانے ہی والی تھی کہ چرواہے کی نیت بدل گئی۔

سسی جیسا حسن اس کے سامنے تھا۔ اس کی دسترس میں تھا۔ ذرا سی جرات اسے سرشار کرسکتی تھی۔ اس نے سسی کو پکڑنا چاہا۔

سسی اس کا ارادہ بھانپ چکی تھی۔ اس نے ایک دفعہ پھر دوڑ لگادی۔ اور ساتھ ہی خدا سے دعا مانگتی جارہی تھی کہ اے خدا، تو میری عزت بچالے۔ اور اگر مرنا ہی ہے تو عزت بھری موت دے۔

قدرت کو اس پر رحم آگیا۔

اسی وقت زمین نے ایک کروٹ لی اور سسی پھٹی ہوئی زمین میں سماتی چلی گئی۔ وہ چرواہا یہ دیکھ کر سکتے کے عالم میں کھڑا رہ گیا تھا۔

دوسری طرف پنوں کے ساتھ بھی یہی ہوا۔

اسے جب ہوش آیا تو اس نے خود کو اپنے ابائی گھر میں دیکھا۔ اسے اندازہ ہوگیا کہ اس کے بھائی اس کے ساتھ دھوکا کرکے اسے یہاں اٹھا کر لے آئے ہیں۔

اس پر بھی جنونی کیفیت طاری ہوئی۔ اس نے پھر جنون کے عالم میں سسی سسی پکارتے ہوئے ریگستان کی طرف دوڑ لگادی۔

شہزادہ بھی ننگے پاؤں اپنی منزل، اپنی محبت کی طرف دوڑ اچلا جارہا تھا۔ اس کے پاؤں بھی لہولہان ہوگئے تھے۔

وہ ٹھیک اس وقت اس جگہ پہنچا جہاں زمین نے سسی کی عزت محفوظ کرکے اسے اپنی آغوش میں چھپالیا تھا اور وہ چرواہا حیران و پریشان کھڑا ہوا تھا۔

اس نے پنوں کو صورت حال بتادی کہ ایک لڑکی اس طرف سے پنوں پنوں پکارتی ہوئی چلی جارہی تھی کہ مجھ بدبخت کی نیت بدل گئی۔ میں نے اس پر مجرمانہ حملہ کرنا چاہا لیکن اس نے خدا سے دعا مانگی اور اسی وقت زمین پھٹی اور اس کی نگاہوں کے سامنے وہ اس زمین میں سما گئی ہے۔

پنوں نے ایک چیخ ماری، اور خدا سے وہی دعا کی جو سسی کی دعا تھی۔ قدرت نے ان دونوں کو قیامت تک کے لیے ایک کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اسی لیے ایک بار پھر زمین پھٹی اور پنوں اس میں سماتا چلا گیا۔

ان دونوں کی محبت کی داستان آج بھی زندہ ہے۔ ان کی قبریں آج بھی اس وادی میں موجود ہیں۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی نے محبت کی اس لازوال داستان کو بہت موثر انداز میں اپنی شاعری میں بیان کیا ہے۔

☆☆☆

سوہنی مہینوال

محبت کی دکھ بھری کہانیوں میں سے ایک سوہنی مہینوال بھی ہے۔

یہ ایک ایسی المیہ کہانی ہے جو ضرب المثل بن کر رہ گئی ہے اور جس کا انجام آنکھوں میں آنسو لے آتا ہے۔

سوہنی اور مہینوال کی محبت کی داستان کا آغاز رومان کی سرزمین گجرات سے ہے۔ اس مٹی نے کیسے کیسے دلگداز واقعات پروان چڑھائے ہیں۔

ہوسکتا ہے کہ آج بھی کسی گھر میں سوہنی موجود ہو اور کوئی مہینوال اس کے لیے بھٹک رہا ہو۔ محبت تو ہر دور میں زندہ رہتی ہے۔

اس کے روپ مختلف ہوسکتے ہیں۔ لیکن جذبہ وہی ہوتا ہے۔ یہ کہانی اٹھارہویں صدی کی ہے۔

یہ زمانہ مغل سلطنت کا تھا۔ سوہنی کی پیدائش ایک کمہار

تولا کے گھر میں ہوئی تھی۔ وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی۔

یہ لوگ گجرات کے رہنے والے تھے۔ دریائے چناب کے کنارے آباد اس شہر کی اس زمانے میں بہت اہمیت تھی۔ کیونکہ شہر بخارا سے نکلنے والے تاجروں کے قافلے گزرتے ہوئے وہیں ٹھہرا کرتے تھے۔

ان قافلوں کا قیام گجرات ہی میں ہوا کرتا تھا۔ جہاں کئی عدد سرائے بنی ہوئی تھیں۔ یہ قافلے دو چار دن گجرات میں آرام کرکے دہلی کی طرف نکل جاتے۔

سوہنی کے ہاتھوں میں قدرت نے بہت ہنر دیا تھا۔ اس کا باپ جب گھڑے اور صراحیاں وغیرہ بنا کر لاتا تو سوہنی اپنے خوبصورت ہاتھوں سے ان پر خوبصورت نقش و نگار بنادیا کرتی تھی۔

بازار میں یہ بہت اچھی قیمت پر فروخت ہوجاتے۔ سوہنی کا باپ اپنی بیٹی کے اس ہنر سے بہت خوش ہوا کرتا تھا۔

شہزادہ عزت بیگ بخارا (ازبکستان) کا ایک تاجر تھا۔

اس کا گزر عام طور پر ان ہی راستوں سے ہوا کرتا۔ اس کا قافلہ گجرات میں کچھ دن رک کر دہلی کی طرف کوچ کرجاتا تھا۔

لیکن اس بار کا سفر بہت مختلف تھا کیونکہ اس بار اس کی محبت اسے اس طرف لے آئی تھی۔ یہ سفر تاریخ کا یادگار سفر بننے جارہا تھا۔ اس لیے عزت بیگ کے پاؤں گجرات میں آکر رک گئے۔ اس کی محبت اسے کھینچ کر..... یہاں لے آئی تھی۔ اس نے جب تولا کی دکان میں سوہنی کو دیکھا تو اس کے پاؤں جم گئے۔ مرکوز ہوکر رہ گئیں ان پر نگاہ شوق۔

عزت بیگ دیوانہ ہوکر رہ گیا۔ اسے کچھ لینا نہ تھا۔ مٹی کی یہ چیزیں اس کے کس کام آتیں لیکن اس نے ایک صراحی خرید لی اور سوہنی کو سونے کا ایک سکہ دے دیا۔

دوسری طرف سوہنی کا بھی یہی حال ہوگیا تھا۔

یہ انوکھا گاہک نگاہوں کے راستے اس کے دل میں اتر گیا تھا۔ ایسا بانکا چھبیلا... جوان پورے گجرات میں کوئی نہیں ہوگا۔

عزت بیگ دوسری شام پھر سوہنی کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے پھر ایک صراحی خرید لی۔ مقصد تو سوہنی کو دیکھنا تھا۔ اس سے دو چار باتیں کرنی تھیں اور اپنے آتش شوق کو ہوا دینا تھی۔

عزت بیگ سونے کے سکے لے کر جاتا اور واپسی

آیوڈین

ایک کالا، چمک دار اور ٹھوس عنصر۔ آزاد حالت میں نہیں بلکہ مرکبات کی شکل میں پایا جاتا ہے۔ اسے سب سے پہلے ایک کیمیا دان برناڈ کرٹوائس نے 1811ء میں دریافت کیا تھا۔ سمندر کے پانی، پودوں، سمندری جڑی بوٹیوں، اسفنج وغیرہ میں تھوڑی تھوڑی مقدار آیوڈین کی ہوتی ہے۔ کاڈ مچھلی کے جگر کے تیل اور چلی سالٹ پیٹر میں بھی آیوڈین کی کچھ مقدار ہوتی ہے۔ تجربہ گاہ میں مینگنیز ڈائی آکسائیڈ، پوٹاشیم آیوڈائیڈ اور تیز سلفیورک ایسڈ کو ملا کر گرم کرنے سے تیار کی جاتی ہے۔ بڑے پیمانے پر صنعتی مقاصد کے لیے سمندری جڑی بوٹیوں کو سکھانے کے بعد جلا کر حاصل شدہ راکھ (جسے کیلپ کہتے ہیں) سے تیار کرتے ہیں یا چلی سالٹ پیٹر سے حاصل کرتے ہیں۔ یہ چمک دار کالے رنگ کا قلمی ٹھوس ہوتا ہے جو 114.2 درجے سینٹی گریڈ پر پگھلتا ہے۔ گرم کرنے سے اس میں سے بنفشی رنگ کے کلورین کی سی بو دینے والے بخارات نکلتے ہیں۔ پانی میں کم حل ہوتی ہے، البتہ پوٹاشیم آیوڈائیڈ کے محلول میں بہت جلد حل ہوتی ہے۔ الکحل، ایتھر، کلوروفارم، بینزائن اور کاربن ڈائی سلفائیڈ میں بھی حل ہوجاتی ہے۔ عناصر کے ساتھ مل کر ان کے آیوڈائیڈ اور نائٹرک ایسڈ میں حل ہوکر ایوڈک ایسڈ بناتی ہے۔ ادویات میں استعمال ہوتی ہے۔ رنگ سازی اور فوٹوگرافی میں بھی کام آتی ہے۔ انسانی جسم کے ایک اہم غدود Thyroid Gland کو تھائی راکسن ہارمون بنانے کے لیے اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ سمندر کی مچھلی، کیکڑے اور قدرتی پانی وغیرہ میں یہ عنصر موجود ہوتا ہے۔ اس کی کمی سے گلہڑ (Goitre) کا مرض لاحق ہوجاتا ہے۔

مرسلہ: ضیاء الدین اشرفی، فیصل آباد

www.pdfbooksfree.pk

میں اس کے ساتھ اس کی محبت ہوتی۔

اسی طرح سوہنی بھی مٹی کے برتنوں پر خوبصورت نقش ونگار بنانا بھول چکی تھی۔ اب وہ مٹی سے محبت کے گھروندے بنا رہی تھی۔

ان میں سے ہر گھروندے میں اس نے اپنے محبوب عزت بیگ کو بیٹھا رکھا تھا۔

اب قافلے کے کوچ کرنے کا وقت آ گیا تھا لیکن عزت بیگ کہاں جا سکتا تھا۔ اس کے قدم سوہنی کی دکان کے سامنے آ کر جم گئے تھے۔ اس کا ظاہری سفر تو ختم ہو چکا تھا۔

اس کی منزل سوہنی کی صورت میں اس کے سامنے تھی۔ وہ اپنی منزل کو چھوڑ کر کہاں جا سکتا تھا۔ دوسری طرف اس کے پاس سکے بھی ختم ہو چکے تھے۔

اس نے دہلی یا بخارا جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور وہیں گجرات میں رہائش اختیار کر لی۔ سوہنی کے باپ نے سوہنی کے کہنے پر اسے اپنی دکان میں ملازمت دے دی تھی۔

محبت بھی کیسے کیسے تماشے دکھایا کرتی ہے۔ کہاں بخارا کے ایک امیر خاندان کا تاجر شہزادہ اور کہاں ایک کمہار کی نوکری جو اس سے مٹی کے برتن بھی بنوایا کرتا اور اپنے مویشی بھی عزت بیگ کے حوالے کر دیتا کہ وہ انہیں چراگاہ میں لے جایا کرے۔

عزت بیگ .... یہیں سے مہریا مہینوال کے طور پر مشہور ہو گیا۔

سوہنی اور مہینوال ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ ان کی محبت روز بروز پروان چڑھتی گئی۔ پھر جب ان کے پیار کے چرچے عام ہو گئے تو کمہار برادری میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔

یہ بات ان کی برداشت سے باہر تھی کہ کوئی غیر کمہار ان کی برادری کی کسی لڑکی سے پیار کرے۔ یا اس سے شادی کر لے۔ ان کے یہاں ایسی کسی بات کا تصور ہی نہیں تھا۔ اور وہ بھی انجانے دیس سے آیا ہوا کوئی غیر ملکی۔

سوہنی کے باپ نے بہت خاموشی کے ساتھ سوہنی کا رشتہ کسی سے طے کر دیا۔ سوہنی بے چاری کو اس وقت خبر ہوئی جب اس کی برات اس کے دروازے تک آ چکی تھی۔

وہ بے بسی سے تڑپ اٹھی۔ لیکن اس کے بس میں کچھ نہیں تھا۔ اسے زبردستی دلہن بنا کر ڈولی میں بیٹھا کر شوہر کے گھر بھیج دیا گیا۔

سوہنی کی جدائی نے مہینوال کو پاگل بنا دیا۔ اس کے لیے زندگی میں اب کچھ نہیں رہا تھا۔ اس کی ساری خوشیاں ہو چکی تھیں۔ اس نے اپنی نیند، اپنا آرام سب کچھ کر دیا۔

وہ فقیر بن گیا۔ کھانے پینے کا اسے ہوش ہی نہیں تھا۔ وہ جوگی بن کر بھٹکتا رہتا۔ اس نے اپنی رہائش دریا اس پار کے جنگلوں میں کر لی تھی۔

وہ روزانہ دریا عبور کر کے سوہنی کے گاؤں جایا کرتا کیونکہ وہی جگہ تھی جہاں سے اس نے محبت حاصل کی تھی جہاں کے چپے چپے پر اس کی محبت سوہنی کے قدموں کے نشانات ثبت تھے۔ جہاں کی فضائیں سوہنی کی خوشبو سے آراستہ تھیں۔ جہاں ہر طرف سوہنی کی یادیں بکھری ہوئی تھیں۔ اس دوران اسے پتا چل گیا کہ سوہنی بیاہ کر کس گاؤں گئی ہے۔

اب مہینوال نے وہاں کے چکر لگانے شروع کر دیے۔ اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔ ایک دیوانے کے لیے اس کا محبوب ہی سب کچھ ہوا کرتا ہے۔

اس آوارہ گردی کے دوران سوہنی سے پھر ملاقات ہو گئی۔ دونوں ایک بار پھر ایک دوسرے سے مل گئے۔ قدرت نے انہیں ایک رہنے کے لیے پیدا کیا تھا۔ ان کے درمیان یہ جدائی تو عارضی تھی۔

پھر سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اب یہ ملاقاتیں رات میں ہوا کرتیں۔ مہینوال دریا میں تیرتا ہوا سوہنی کے پاس آ جاتا اور دونوں کہیں بیٹھ جاتے۔ دوسری طرف سوہنی بھی کبھی کبھی گھڑے کا سہارا لے کر دریا عبور کر کے مہینوال کے پاس پہنچ جاتی۔ مہینوال اس کے لیے روز مچھلی پکڑ کر رکھتا اور اسے مچھلی کھلایا کرتا۔

کہتے ہیں کہ جب ایک بار دریا زوروں پر تھا اور اس رات مہینوال کو کوئی مچھلی نہیں مل سکی تو اس نے اپنی ران سے گوشت کا ایک ٹکڑا کاٹ کر سوہنی کو کھلا دیا تھا۔

دوسری رات جب وہ سوہنی کے پاس پہنچ نہیں سکا تو سوہنی اس گھڑے کا سہارا لے کر مہینوال کے پاس پہنچ گئی۔

اس موقع کے لیے اس نے جو گھڑا رکھا ہوا تھا وہ اسے گھر سے کچھ فاصلے پر چھپا دیا کرتی تھی۔ اس نے جب مہینوال کو دیکھا تو تڑپ اٹھی۔

مہینوال کے ران کا زخم اسے بہت تکلیف دے رہا تھا۔ اس نے جب مہینوال کو اپنی قسم دی تو مہینوال چھپا نہیں سکا، اس نے بتا دیا کہ یہ زخم کیسا ہے۔

سوہنی ساری رات روتی رہی تھی۔ اس کے محبوب نے اس کے لیے کتنی بڑی قربانی دی تھی۔

اس کے بعد وہ ہر رات مہینوال سے ملنے جانے لگی۔ دریا عبور کرنے کا اس کے پاس ایک ہی ذریعہ تھا۔ وہی گھڑا، اس کی نند کو ایک رات اس پر شک ہو گیا۔

اس نے خاموشی سے سوہنی کا تعاقب کیا اور اسے پتا چل گیا کہ سوہنی ہر رات کس سے ملنے جایا کرتی ہے۔ اس عورت نے وہ گھڑا تبدیل کر کے اس کی جگہ ایک کچا گھڑا رکھ دیا۔

دوسری رات سوہنی جب گھڑا لے کر دریا کے پاس پہنچی تو اس رات دریا چڑھا ہوا تھا لیکن اسے اس کی پرواہ نہیں تھی۔ اس کا محبوب دوسرے کنارے اس کے انتظار میں تھا۔ اس نے اپنا گھڑا دریا میں ڈال دیا۔

کچھ دیر بعد ہی کچی مٹی پانی میں گلنے لگی۔ دوسرے کنارے کھڑے ہوئے مہینوال نے بھی اسے ڈوبتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

سوہنی اس کی آنکھوں کے سامنے ڈوب چکی تھی۔

اب خود اس کے زندہ رہنے کا کیا جواز ہو سکتا تھا۔ اس نے بھی دریا میں چھلانگ لگا دی اور کچھ دیر بعد دونوں محبت کرنے والے دریا کی تہہ میں کہیں گم ہو چکے تھے۔ سوہنی تو کچے گھڑے سے دریا عبور نہیں کر سکی لیکن اس نے قیامت تک کے لیے محبت کے سمندر کو عبور کر لیا ہے اور یہ مقام کسی کسی کو ملا کرتا ہے۔

کچے گھڑے نے جیت لی ندی چڑھی ہوئی، مضبوط کشتیوں کو کنارا نہیں ملا۔

☆☆☆

عمر ماروی

یہ ایک مختلف قسم کی داستان ہے۔

یہ داستان عشق کی تو ہے لیکن اس میں عشق کا انداز بالکل مختلف ہے۔

عمر ماروی کی داستان عشق میں ناکامی کی داستان نہیں ہے۔ بلکہ خوبصورت جذبے اور رسم وفا کی داستان ہے۔

وہ وفا جو کسی شخص کو اپنی زمین اور اپنی مٹی سے ہو سکتی ہے۔

ماروی، تھرپارکر کے علاقے کھور کی رہنے والی تھی۔

آکوپنکچر

چین کا چار ہزار سالہ قدیم طریق علاج، اب اس طریق علاج نے مغرب کو بھی بڑی حد تک متاثر کیا ہے۔ اس میں ٹھنڈی یا گرم سوئی کو جلد کے نیچے بافت میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ یہ سوئی عموماً اسٹیل کی بنی ہوئی ہوتی ہے اور اس کی لمبائی چند سینٹی میٹر ہوتی ہے۔ یہ جسم کے اس حصے میں جلد کے نچلی بافت میں داخل کی جاتی ہے جو حصہ بیمار ہو۔ آکوپنکچر سے کون کون سے جسمانی اعضا درست ہوتے ہیں، واضح طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔ تاہم اعصابی درد، دمہ، کسی جوڑ میں موچ آنا اور ایسی ہی کئی دیگر بیماریوں کے لیے آکوپنکچر طریق علاج بہت مفید ثابت ہوا ہے۔ مشرق بعید میں اعصابی درد کی جگہ آپریشن کے لیے سوئیوں کا استعمال کیا جا رہا ہے۔ یہ دراصل ہر قسم کے دردوں کے لیے بہترین طریق علاج ہے۔ یہ دماغ کی طرف جانے والے ان اشاروں کو بھی روکتا ہے، جن کے سبب جسم کے کسی حصے میں درد ہوتا ہے۔

آکوپنکچر کے ذریعے چین میں تو درختوں اور پودوں کی بیماریوں تک کا علاج کیا جا رہا ہے۔ ایک ایسا ہی تجربہ مکئی پر بھی کیا گیا، جس کی مدد سے وقت سے بہت پہلے مکئی کی نسبتاً زیادہ میٹھی فصل حاصل کی گئی۔ اس قسم کے آکوپنکچر کے لیے کسی دھاتی سوئی کی نہیں بلکہ صرف ایک تنکے کی مدد کافی ہوتی ہے۔ جب مکئی کا چھلکا سبز ہوتا ہے اس وقت تنکے کو بھٹے کے ڈنٹھل میں اس جگہ سے قدرے اوپر کی جانب پرو دیتے ہیں، جہاں سے بھٹا پودے سے منسلک ہوتا ہے۔ چونکہ پودے بھی انسانوں کی طرح سانس لیتے اور غذا حاصل کرتے ہیں لہٰذا پودا اس زخم کی تکلیف محسوس کرتا ہے اور زخم بھرنے کی غرض سے فوری طور پر اضافی شکر اس سمت روانہ کر دیتا ہے، جس سے مکئی کہیں زیادہ خوش ذائقہ اور میٹھی ہو جاتی ہے۔

پاکستان میں اس کی تدریس کا آغاز پاکستان کالج آف آکوپنکچر سائنس میں کیا گیا، یہاں سے دو سالہ ڈپلوما کورس کرایا جاتا ہے۔ چین کی حکومت نے 29 جولائی 1986ء کو اس کالج سے حاصل کردہ ڈپلوے کو اپنے ڈپلوے کے برابر قرار دیا تھا۔

مرسلہ: زاہد بشیر، لاہور

www.pdfbooksfree.pk

وہ صحرا میں کھلنے والا ایک لاجواب اور خوبصورت ترین پھول تھی۔

ماروی شروع ہی سے دوسروں کے دکھ درد میں کام آنے والی لڑکی تھی۔ اس کے دل میں صحرا میں بسنے والوں کے لیے بے پناہ پیار تھا۔ وہ ان کے دکھ درد میں کام آیا کرتی۔

اس کی ان خوبیوں نے اسے ہر دل عزیز بنا دیا تھا۔

کیت نام کے ایک نوجوان نے اسے دیکھا اور اسے اپنی روح میں بسا لیا۔

دونوں ایک دوسرے سے ٹوٹ کر محبت کرنے لگے۔ دونوں کے لیے زندگی کا ایک ہی مقصد تھا۔ پیار، پیار، اور پیار۔

ایک دوسرے سے پیار۔ ایک دوسرے کی بانہوں میں زندگی گزارنے کا خوبصورت خواب۔ اسی دوران ان کا ایک رقیب بھی پیدا ہوگیا۔ جس کا نام پھوگی تھا۔ وہ بھی ماروی کو بے تحاشہ پسند کرتا تھا۔ لیکن ماروی نے اپنی ساری محبتیں، ساری وفائیں اپنے محبوب کیت کے لیے وقف کر رکھی تھیں۔

اس کے لیے کیت سے بڑھ کر کوئی بھی نہیں تھا۔ پھوگی نے اسے حاصل کرنے کی بہت کوششیں کیں لیکن ماروی نے اس کی ہر کوشش ناکام بنا دی۔

ہر طرح سے ناکامی کے بعد پھوگی کے دل میں انتقام اور غصے کی آگ دہک اٹھی۔ اس نے یہ فیصلہ کرلیا کہ وہ ماروی کو کسی بھی صورت کیت کی نہیں ہونے دے گا۔

وہ عمر کوٹ کے راجا عمر کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے ماروی کے حسن کی ایسی داستانیں بیان کیں کہ عمر ماروی کو دیکھنے کے لیے بے تاب ہوگیا۔

وہ خود ماروی کے گاؤں اسے دیکھنے کے لیے پہنچ گیا۔ اس نے ماروی کے باپ کو ماروی سے شادی کی پیشکش کردی۔

ماروی کے باپ کے لیے اس سے بڑی بات اور کیا ہوسکتی تھی۔

اس نے ماروی کے احتجاج کے باوجود ماروی کی شادی عمر سے کردی۔ عمر ماروی کو لے کر عمر کوٹ آگیا۔ یہاں سے عمر کی شریف النفسی کی کہانی شروع ہوتی ہے۔

اس نے ماروی پر کوئی جبر نہیں کیا۔ ماروی نے اسے اپنے قریب تک آنے نہیں دیا۔ لیکن عمر اس کی دل جوئی میں لگا رہا۔

اس نے ماروی کو بتایا کہ رانی بن جانے کی صورت میں وہ اس کی زندگی کس طرح بدل سکتا ہے۔ اس کے پاس سونے کے زیورات ہوں گے، محل ہوں گے، نوکر چاکر ہوں گے لیکن ماروی کو ان باتوں کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ وہ اپنے گاؤں، اپنی مٹی اور اپنی محبت کے لیے تڑپتی رہی۔

اور ایک دن اس نے عمر کو بتا دیا کہ وہ کیت سے محبت کرتی ہے۔ یہ سنتے ہی عمر نے اسے طلاق دے دی۔ بہت عزت اور احترام کے ساتھ مال و دولت دے کر اسے گاؤں واپس بھجوا دیا۔

روایت ہے کہ عمر نے اس کے ساتھ بھائی جیسا سلوک کیا تھا۔ اپنے گاؤں پہنچ کر جب ماروی کو اپنی فضا، اپنا ماحول ملا تو صحرا کا یہ پھول پھر سے کھل اٹھا۔

ماروی کی شادی کیت سے ہوگئی تھی۔

یہ تھی ایک ایسی محبت کی کہانی جس میں ناکامی وغیرہ تو کوئی تصور نہیں ہے لیکن یہ کہانی وفاداری اور ایثار کی مثل کہانی ہے۔

وفاداری ماروی کی اور ایثار عمر کا۔ اس لیے یہ کہانی ماروی کی کہانی کے نام سے ہماری تاریخ اور ہمارے لوک گیتوں کا سرمایہ بن چکی ہے۔

نوری جام تماچی

سرزمین سندھ کی ایک اور پیار کی داستان۔ جام تماچی ٹھٹھہ کے ایک علاقے سما کا حکمران تھا۔ جبکہ نوری ایک مچھیرے کی بیٹی تھی۔

اس علاقے میں دو جھیلیں مل کر ایک بڑی جھیل کینجھر میں تبدیل ہوجاتی تھیں۔ کینجھر کے کنارے آج بھی وہ یادگاریں موجود ہیں جو جام تماچی نے نوری کے لیے بنوائی تھیں۔

نوری ایک غریب لڑکی تھی اور جام تماچی ایک شہزادہ تھا۔ اس کے باوجود دونوں کے درمیان پیار کا رشتہ قائم ہوگیا تھا کیونکہ یہ رشتہ مفلسی اور امیری کو نہیں دیکھتا۔ اس کا اپنا مسلک ہوا کرتا ہے۔

جام نے نوری سے شادی کرلی تھی۔

شادی کے بعد دونوں مرتے دم تک ایک دوسرے کے وفادار رہے تھے۔ پوری ریاست میں ان کی محبت کی مثالیں دی جاتی تھیں جو آج بھی دی جاتی ہیں۔

افریقا اوافریقا

لطاف شیخ
ترجمہ: ابراہیم جمالی

پُراسراریت کی سرزمین افریقا جہاں قدرت کی فیاضی قدم قدم پر منتظر ہے، جہاں ہرے بھرے انتہائی گھنے جنگل ہیں تو خونخوار درندے بھی۔ جہاں معصوم صفت لوگ ہیں تو آدم خور قبائل بھی مگر کئی شہر ترقی یافتہ اتنے ہیں کہ ان پر یورپ و امریکی شہروں کا دھوکا ہوجائے۔ عام طور پر افریقا کے سفرناموں میں صرف اور صرف جنگل کا ذکر نظر آتا ہے لیکن یہ الطاف شیخ کا کمال ہے کہ وہ روداد سفر سناتے وقت سب سے الگ زاویہ سامنے لاتے ہیں۔ زیرِنظر سفرنامے میں آپ کو افریقا کا ایک نیا رخ نظر آئے گا۔

افریقا پہنچ کر ماضی کے کئی واقعات یاد آرہے ہیں۔ جو ہمیں یہاں کے مختلف ملکوں میں پیش آئے۔ یہ قصہ بھی ابتدائی دنوں کا ہے۔ تب ہم صحیح معنوں میں سمندری زندگی سے واقف بھی نہیں تھے۔ ہم دنیا کی تمام بندرگاہوں کو ایک جیسا سمجھتے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ دنیا کی تمام بندرگاہوں میں ایک جیسا قانون ہے۔ مغربی یورپ کی بندرگاہوں کی طرح مشرقی یورپ، افریقا اور ایشیا... کی ساری بندرگاہوں میں لاء اینڈ آرڈر کی صورتِ حال بہتر ہے۔

www.pdfbooksfree.pk

ان دنوں ہمارا جہاز بیلجیم، فرانس، انگلینڈ اور جرمنی جیسے ترقی یافتہ ملکوں کی بندرگاہوں سے مال اٹھا کر جنوب میں افریقا کے مغربی کنارے والے ممالک سینیگال، گنی بساؤ، لیانڈا، نائجیریا اور گیمبیا وغیرہ جانے والا تھا۔ ہم افریقا کے ان ممالک کی بندرگاہوں میں بھی دن رات ایسے بے فکر ہو کر گھومتے رہتے تھے جیسے لندن، مانچسٹر، ہیمبرگ، اینٹورپ اور راٹرڈم وغیرہ ہیں۔ جیسے ہی ہماری ڈیوٹی ختم ہوتی ہم جہاز کی سیڑھی اتر کر بندرگاہ سے باہر نکل جاتے تھے اور سوچے سمجھے بغیر منہ اٹھائے کہیں بھی چل دیتے تھے۔ ہمیں یہ خیال بھی نہ آتا کہ اس ملک کے حالات کیا ہیں۔ کوئی ایمرجنسی یا ہنگامہ تو نہیں۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ تک پہنچنے کے لیے بس سروس ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو یہ سہولت رات میں بھی دستیاب ہوگی یا واپسی پر پیدل مارچ کرنا پڑے گا۔ کبھی نقشہ یا ایڈریس اپنے ساتھ نہیں رکھتے تھے۔ بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ ملک کے سماجی اور سیاسی حالات کی خبر تک نہ رکھتے۔ حالانکہ وہ ایسے دن تھے جب افریقی ملکوں میں آزادی کی تحریکیں زور روں پر تھیں۔ یہ ساٹھ کے عشرے کے آخری سال کی بات ہے۔

کئی ملکوں میں مقامی لوگ گوروں سے سخت نفرت کرتے تھے۔ کئی علاقوں میں ہم ایشین، خاص طور پر برصغیر کے لوگ قابلِ نفرین تھے۔ جو ملک آزاد ہو چکے تھے وہاں سیاسی چپقلش عروج پر تھی اور حصولِ اقتدار کے لیے مقامی لوگ آپس میں برسرِ پیکار تھے۔ بدامنی، اغوا، چوری، ڈکیتی کی وارداتیں عام تھیں۔ لیکن ہمارے لیے دنیا صرف دو خانوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ایک جہاز کی دنیا، جو قید و بند کی علامت تھی یعنی ہم جہاز چلانے والوں کے لیے۔ دوسری جہاز سے باہر کی دنیا جو آزادی، سیر و تفریح اور رنگینیوں سے آراستہ تھی۔

ابتدائی دنوں میں ہمیں یہ خیال تک نہ آتا کہ افریقا وہ جگہ ہے۔ جہاں سانپ، بچھو اور جنگلی جانور پائے جاتے ہیں۔ ٹیٹزی جیسی زہریلی مکھیاں اور دوسرے رینگنے اور اڑنے والے حشرات ہیں جن کا کاٹا زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ ایسی جگہ پر سادہ پانی مل جائے تو وہ بھی بڑی عیاشی ہے۔ فلٹرڈ یا ابلے ہوئے پانی کا تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ جہاں دریاؤں کے رواں پانی میں "بلہارزیا" جیسی بیماریاں اور اس میں چھپے ہوئے مگرمچھ ہیں جن سے خود کو محفوظ رکھنا ضروری ہے...... لیکن ہم تھے کہ بے فکروں کی طرح شہروں اور قصبوں کی گلیوں میں آوارہ گردی کرتے رہتے۔ بس ہمارے لیے ایک بات اہم تھی اور وہ یہ کہ ہم کسی طرح بھی اپنے آپ کو جہاز کی آہنی چار دیواری سے دور رکھیں۔

ان ہی دنوں ہمارا جہاز گنی بساؤ کی بندرگاہ میں لنگر انداز ہوا۔ بندرگاہ کیا تھی، بس یوں سمجھیں کہ جیسے ہم کے کسی دور دراز کے گاؤں میں آ گئے ہوں۔ وہاں کی عمارتیں گارے مٹی کی تھیں۔ تاحدِ نگاہ ریت کا سمندر، کہیں کہیں کچے گھر نظر آتے تھے۔ جن کی چھتیں گھاس پھوس اور تنکوں کی تھیں۔ چاروں طرف تپتی دھوپ، پانی کی اور خشک سالی کا عالم تھا۔ ہر جانب عجیب ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ بندرگاہ کے قریب کچھ پختہ عمارتیں ضرور تھیں پرتگالیوں کے دفاتر کے طور پر زیرِ استعمال تھیں۔ یہ ملک "گنی بساؤ" پتلی پٹی کی طرح دوسرے ملک سینیگال اور گنی میں اندر تک جا رہا تھا۔ اس ملک کی سڑکیں اور دوسرے ملک سے گزرتے تھے۔ جس طرح کراچی سے حیدرآباد جاتے ہوئے سپر ہائی وے دو مقامات پر ٹھٹھہ دادو اضلاع کی حدود سے گزرتا ہے۔

میں نے نیا نیا جہاز جوائن کیا تھا۔ ایک دن شام وقت میں جہاز کے تھرڈ انجینئر کے ساتھ شہر گھومنے کے لیے بندرگاہ سے باہر آیا۔ کوئی طے شدہ پروگرام نہیں تھا۔ میں ڈیوٹی مکمل کر کے جہاز کی سیڑھی کے پاس کھڑا تھا۔ ایسے میں تھرڈ انجینئر صاحب بھی سیڑھی اتر کر وہاں آ گئے۔

"کہاں کی تیاری ہے تین صاحب؟" (تھرڈ انجینئر صاحب) میں نے پوچھا۔

"کہیں نہیں...... بس ایسے ہی بیٹھے بیٹھے خیال آیا بندرگاہ کا چکر لگا آؤں...... چلنا ہے تو آ جاؤ۔"

میں نے ان کی دعوت فوراً قبول کی اور انجن روم کے جوتوں ہی میں ان کے ساتھ چل پڑا۔ ہم مٹھی اور تھانہ بولا خان شہر جیسی واحد اور ویران مارکیٹ میں اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بعد ایک ہوٹل میں آ بیٹھے جس کی دیواریں مٹی اور گوبر سے بنی ہوئی تھیں۔ ایک سیاہ فام اور بھدے نقوش والے بیرے نے ہمارے سامنے کافی لا کر رکھی جو اس کی رنگت سے میچ کرتی ہوئی کالی اور کسیلی تھی۔ کسی قریبی شہر یا ملک سے ایک قافلہ وہاں پہنچا تھا جس کے مسافر ہوٹل کے چاروں طرف نظر آ رہے تھے۔ فضا میں اونٹوں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کی آواز، ہوٹل میں بجنے والے افریقین میوزک کا شور اور اونٹ، گدھوں کی مخصوص بو پھیلی ہوئی تھی۔ قافلے کے مسافر مسلمان تھے کیونکہ عورتوں کے چہرے کالے رنگ کے نقاب

سے ڈھکے ہوئے تھے۔ کچھ مردوں نے بھی اپنے چہرے پگڑی کے گوشے سے ڈھانپ رکھے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ مسلمان نہ ہوں۔ مردوزن نے تیز دھوپ اور اڑتی ریت کے ذرات سے بچنے کے لیے چہرے ڈھانپ رکھے ہوں۔ بہرحال ان کے لباس اور کلائی پر بندھی جدید فیشن کی گھڑیاں دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی خوش حال ملک سے تعلق رکھتے ہیں۔ کیونکہ مقامی لوگ مفلوک الحال اور لاغر جسم سے ان میں الگ ہی پہچانے جاتے تھے۔ بہرحال ان لوگوں میں کچھ مسلمان ضرور شامل تھے جو شمال مشرق کی سمت رخ کر کے عصر کی نماز پڑھ رہے تھے۔ وہاں سے کعبۃ اللہ اس رخ پر ہے۔

ہمارے تھرڈ انجینئر نے سکرنڈ اور جنگ شاہی سے بھی گئے گزرے اس شہر سے باہر چل کر دیہی علاقوں کا مشاہدہ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ میں نے آمادگی ظاہر کی اور پھر ہم آپس میں باتیں کرتے ہوئے "ٹریفک" سے بچتے بچاتے شہر سے باہر جانے لگے۔ وہاں کا ٹریفک بھی منفرد تھا۔ شکستہ سڑک پر گدھا گاڑیوں کے ساتھ پرانے ماڈل کی منی مورس کاریں، ٹیکسیاں اور شتر سوار رواں دواں تھے۔ آوارہ اور بیمار کتوں کی بھی بہتات تھی۔

"یار، کوئی سواری دیکھی جائے۔" آخر کار سڑک کے کنارے رک کر تھرڈ انجینئر نے مشورہ دیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ آوارہ کتوں سے خائف ہے جو کبھی کبھی پیدل چلنے والوں پر غرانے لگتے تھے۔ ایک کتے کو بھگانے کے لیے میں پتھر اٹھانے کے لیے جھکا تو تھرڈ انجینئر نے مجھے ٹھوکا دیتے ہوئے کہا تھا۔ "نہیں الطاف! یہ غلطی مت کرنا۔"

"کیوں......؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ پتھر میں اٹھا چکا تھا۔

"سنا ہے... کہ بھونکنے والے کتے کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہ کی جائے تو وہ خود ہی ایک طرف چلا جاتا ہے۔ دوسری صورت میں وہ پیچھا نہیں چھوڑتا...... اور یہاں ایک دو نہیں کتوں کا پورا غول موجود ہے۔ اگر ہم نے کسی ایک کو پتھر مارا اور وہ مائنڈ کر گیا تو احتجاجاً آسمان سر پر اٹھا لے گا۔ اور ظاہر ہے اس کام میں اس کی پوری برادری اس کا ساتھ دے گی۔ ہمیں یہ رسک نہیں لینا چاہیے۔" تھرڈ انجینئر نے مدلل انداز میں کتوں کی نفسیات پر لیکچر دے مارا جیسے وہ جہاز کے انجن روم میں کلوں پرزوں کے بارے میں سمجھاتے تھے۔ میں نے تفہیمی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے مٹھی ڈھیلی کی اور پتھر زمین پر جا گرا۔

"سواری کے نام پر ہم کوئی گدھا گاڑی یا اونٹ ہائر کرسکتے ہیں۔" میں نے کہا کیونکہ... ہم ایسی ہی سواری افورڈ کرسکتے تھے۔

"یہاں بس سروس بھی تو چلتی ہوگی۔" انہوں نے میری بات کا برا منائے بغیر کہا اور اسی وقت دور سے مینڈک جیسے منہ والی کھٹارا بس کھڑکھڑاتی ہوئی آتی نظر آئی۔ ایسی بسیں ڈیپلو، عمرکوٹ، مٹھی اور چھاچھرو روٹ پر آج بھی چلتی ہیں جنہیں ڈرائیور اور کنڈکٹر "راکٹ" کہتے ہیں۔ اسے دیکھ کر تھکاوٹ کا احساس ہوا۔ وہ بس جیسے ہی قریب آئی ہم نے اسے ہاتھوں کے اشاروں سے اور چیخ چیخ کر رکوایا۔ ہم دوڑ کر اس میں سوار ہو گئے ... کیونکہ وہ کافی آگے جا کر رکی تھی۔ شاید اس کے بریک ٹھیک کام نہیں کر رہے تھے۔ ڈرائیور نے مالک کو کچھ مالی فائدہ پہنچانے کے لیے مزید دو پسینجر، یعنی ہمیں بٹھانے کے لیے بس کو روک لیا تھا۔ ویسے بھی اس کا رکنا ضروری تھا۔ کیونکہ ہمارے سوار ہونے اور آخری اسٹاپ کا کرایہ دینے کے بعد بھی بس کافی دیر تک وہیں رکی رہی۔ ڈرائیور اور کنڈکٹر بس کے ریڈی ایٹر کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اس میں پانی ڈالتے رہے۔ ہر ایک میل چلنے کے بعد یہ مشق دہرائی جاتی رہی۔ یہاں تک کہ پانی کا آخری ڈبا بھی خالی ہو گیا۔ پانی کے ڈبوں کے لیے ڈرائیور کے پیچھے والی پوری سیٹ وقف تھی۔ بس میں موجود پانچ کنگ سائز سیاہ فام عورتوں میں سے ایک اپنے اکلوتے شوہر کے ساتھ، دو اپنے نصف درجن بچوں میں گھری ہوئی اور باقی دو اپنے مشترکہ میاں کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ یعنی اس کی دو بیویاں تھیں۔

اردگرد کا نظارہ دلکش ہرگز نہیں تھا۔ بس کے اندرونی ماحول سے نظر چرا کر کھڑکی سے باہر دیکھتے تو وہاں ریت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور منظر تھا جسے ہم گویا ایکشن ری پلے کے طور پر بار بار دیکھ رہے تھے اور وہ تھا بس کا رکنا، کنڈکٹر کا پانی کا ڈبا اٹھا کر نیچے جانا اور اسے ریڈی ایٹر میں ڈالنا۔

"آخری ڈبا ختم ہونے کے بعد کیا ہوگا؟" تھرڈ انجینئر نے خدشہ ظاہر کیا۔ "بس میں کوئی FWE (فریش واٹر ایوپوریٹر) تو ہے نہیں جو پانی بنائے۔"

میں خاموش رہا۔ اس قسم کا مذاق ایک انجانا سا خوف پیدا کرنے لگا تھا۔ ہم نے سوچا تھا کہ آخری اسٹاپ پر پہنچ کر اسی بس میں یا اس روٹ کی دوسری بس کے ذریعے

www.pdfbooksfree.pk

واپس بندرگاہ آ جائیں گے۔ یورپ یا انگلینڈ میں ہم ایسا ہی کرتے تھے۔ ہم اس طرح کم خرچ میں کافی سیر کر لیتے تھے۔ لیکن یہاں ایک تو دیکھنے کے لیے کوئی رومانٹک منظر یا چیز نظر نہیں آتی تھی۔ چاروں طرف ریت ہی ریت تھی۔ دوسرے انجانے خوف نے پریشان کر رکھا تھا۔ آخر کار وہی ہوا جس کا ہمیں خدشہ تھا۔ تقریباً سات کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد بس ساتویں مرتبہ رکی تو پھر چلنے کا نام نہیں لیا۔ ڈرائیور نے بہت کوشش کی لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ ہوتی بھی کیسے اس کا ریڈی ایٹر پھٹ چکا تھا جو پہلے ہی درست حالت میں نہیں تھا اور اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے پانی کی ایک بوند بھی باقی نہیں رہی تھی۔

ہم اس وقت حیران رہ گئے جب بس کے مسافر نیچے اتر کر اِدھر اُدھر غائب ہو گئے۔ شاید وہ قریبی گاؤں اور جنگلی بستیوں کے باسی تھے۔ انہوں نے کنڈکٹر کو کرایہ بھی نہیں دیا۔ جو مسافر ہماری طرح کرایہ دے چکے تھے، ڈرائیور نے ان کا نصف کرایہ ضبط کر کے جنرل ایوریج ڈکلیئر کر دیا۔ اس کے بعد ہمیں گائیڈ کیا گیا کہ ہم دو میل مزید آگے جائیں گے تو وہاں سے پڑوسی ملک کی ایک سڑک گزرتی ہے۔ جہاں ہمیں کوئی نہ کوئی سواری ضرور مل جائے گی۔

''یہاں سے کوئی بس واپس بندرگاہ کی طرف جاتی ہے؟'' ہم نے کنڈکٹر سے پوچھا۔

''یہی تو ایک بس ہے جسے کل واپس آنا تھا'' اس نے جواب دیا''اب یہ خراب ہو چکی ہے۔ اس کے ٹھیک ہونے میں تین چار دن تو لگ ہی جائیں گے۔''

''اچھا یہ بتائیں......'' ہم نے دریافت کیا۔'' آگے جانے پر ہمیں کون سی سواری ملے گی؟''

''اے کیمل ......!'' کنڈکٹر نے مختصر جواب دیا جو شروع سے گردن ٹیڑھی کر کے انگریزی میں گفتگو کر رہا تھا۔ کیونکہ اس نے دو سال گھانا میں کسی انگریز سپاہی کے گھوڑے کی مالش کرتے ہوئے انگریزی سیکھی تھی۔

یعنی سواری کے لیے ہمیں اونٹ مل سکتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں یہاں کے شیڈول پر کوئی بس یا ریل گاڑی نہیں چلتی۔ یہ جان کر ہمیں اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا۔ ہم اچھے بھلے جہاز کے محفوظ اور ائر کنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھے ہوئے تھے، خوامخواہ گرمی اور بیابان میں نکل آئے۔ اس وقت ہمارے ساتھی جہاز کے عرشے پر آرام دہ کرسیوں پر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف ہوں گے اور چائے، کافی سے لطف اندوز ہو رہے ہوں گے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ ان کے دو جہازی اپنے کیبن میں موجود ہونے کی بجا بندرگاہ سے سات آٹھ کلومیٹر دور بیابان میں پر کھڑے ہیں اور انہیں واپسی کا کوئی بندوبست اور را نہیں آرہی۔

''کبھی کبھی انسان بہت بڑی غلطی کر بیٹھتا ہے۔'' تھرڈ انجینئر نے الفاظ چباتے ہوئے کہا۔

''اور یہ غلطی بڑے نامناسب وقت پر ہوئی...'' میں نے انہیں یاد دلایا۔'' اب رات کا اندھیرا چھانے ہے اور کل ہی ہمارے جہاز کو یہاں سے روانہ ہونا ہے۔''

تھرڈ انجینئر صاحب نے عقل کے گھوڑے دوڑا ہوئے فیصلہ صادر کیا کہ ہمیں مزید آگے چلنے کی بجا واپسی کا رخ اختیار کرنا چاہیے۔

''سعید منزل اور کیماڑی کے درمیان بسوں میں کرتے کرتے مجھے اتنا آئیڈیا ہو گیا ہے کہ ہم یہ جو فا طے کر کے یہاں پہنچے ہیں، وہ کوئی چھ سات کلومیٹر سے ز نہیں ہو گا۔ یہ زیادہ سے زیادہ صدر سے ٹاور جتنا ہے۔ ہم ہمت سے کام لیں تو یہ فاصلہ پیدل طے کر سکتے ہیں۔''

میں بھلا کیا اعتراض کر سکتا تھا۔ وہ میرے افسر بالا تھے۔ مجھے ان کے ساتھ سمندر پر دن اور رات کے بار سے چار بجے تک جہاز چلانا پڑتا تھا۔ جہازی دنیا میں ا واچ (12 سے 4 والی ڈیوٹی) کو بدترین سمجھا جاتا ہے۔ لیکن تھرڈ انجینئر کی خوش مزاجی، اپنائیت اور مشینوں سے واقف کے سبب اچھا وقت گزر رہا تھا۔ وہ مجھ سے پانچ سال سینئر تھے اور جہاز کے انجن کے ساتھ ساتھ دنیا کی بندرگا کی بھی خاطر خواہ معلومات رکھتے تھے۔ لیکن اس د میں دیکھ رہا تھا کہ ان کی رہنمائی میں ہم گھاٹے میں ر تھے۔ خاص طور پر جب انہوں نے عقل دوڑا کر ایک شار کٹ دریافت کر لیا جو در حقیقت تھا ہی نہیں۔ ہم غلطی ایک قدرے شکستہ ہی سہی، سڑک کو چھوڑ کر پگڈنڈیوں پر چل کر سمت کھو بیٹھے۔ ہم ریت پر چلتے رہے۔ دوڑ کے مقا میں حصہ لینے والے کے لیے تو ریت پر چلنے کی پریکٹس فر فائدہ مند ہو سکتی ہے۔ لیکن پورا دن انجن روم میں محنت مشقت کرنے کے بعد ہم جیسے تھکے ہارے لوگوں کے یقیناً سزا سے کم نہ تھا۔ سورج غروب ہونے لگا تھا۔ ریگستا ہواؤں کی وجہ سے فضا میں دھندھی چھائی ہوئی تھی۔ سور دھند کی تہ کے عقب میں پہلے ہی غروب بلکہ غائب

ہو چکا تھا۔ اب رات کی تاریکی بھی چھانے والی تھی۔

ہم ریت کے میدانوں میں چلتے رہے۔ سخت پیاس کی وجہ سے ہماری حالت خراب تھی لیکن ہم آگے بڑھتے رہے۔ اب جہاز سے زیادہ کسی آبادی کی تلاش تھی جہاں ہمیں پینے کے لیے پانی مل جائے۔ ہماری نظریں کسی جھگی یا مکان کی تلاش میں دور دور تک بھٹکتی رہیں۔ ایسے میں ہم نے دیکھا کہ سامنے سے ایک زبردست بگولے کی طرح کوئی ریت اڑاتا ہوا آ رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کئی گھڑسوار مٹی اڑاتے چلے آ رہے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہوا کہ وہ چار پانچ شتر مرغ جیسے جانور تھے جو ہمارے قریب سے گزر گئے۔

''یہ Antelope نسل کے جانور ہیں جو افریقا کے ایسے ریگستانی علاقوں میں عام پائے جاتے ہیں۔'' تھرڈ انجینئر صاحب نے ان کے بارے میں معلومات فراہم کی۔ بہرحال ہلکی روشنی اور اڑتی ریت میں ہم انہیں غور سے نہیں دیکھ سکے۔ اگرچہ وہ خطرناک یا خونخوار جانور نہیں تھے لیکن ہم خوفزدہ ضرور ہو گئے تھے۔ ہمیں شدت سے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ یہ افریقا کا وہ حصہ ہے جہاں لوگ اب تک آزاد نہیں ہوئے۔ یہاں کے باشندے اپنے یورپی حاکموں کے ساتھ ایشین سے بھی نفرت کرتے ہیں جو ملک کی اکانومی کے ایک حصے پر قابض تھے۔

اندھیرا بڑھنے لگا تھا۔ دن کی تپتی ہوئی ریت کے ذرات سانس کے ذریعے حلق میں اٹک کر چبھن پیدا کر رہے تھے۔ لیکن سب سے زیادہ اذیت کا باعث پیاس تھی۔ چلتے چلتے اچانک سامنے چند گھروندے نظر آئے اور ہماری جان میں جان آئی۔ ہمیں یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ زندگی کے آثار تو نظر آئے۔ جھونپڑیوں میں لالٹین کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ ہم تیز قدم اٹھاتے بستی کے قریب پہنچ گئے۔ کچے مکانات کے سامنے پھولے ہوئے پیٹ والے کمزور بچے اور آوارہ کتے کھڑے تھے۔ کچھ بڑی عمر کے بچے بھی تھے اور انہوں نے ڈنڈے اٹھائے ہوئے تھے۔ یہ بھی تقریباً لباس سے محروم تھے اور گیلی مٹی ان کے گھٹنوں اور بازوؤں کی کہنیوں تک لگی ہوئی تھی۔ شاید یہ کیچڑ میں کھیلتے رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر ایک دو کتوں نے بھونکنا شروع کر دیا۔ اس دوران کونے والے مکان سے ایک سیاہ فام عورت باہر آئی اور اس نے کتوں کو ہشکار کر بھگا دیا۔ گھر کا کوئی دروازہ نہیں تھا۔ بس دیوار میں قدِ آدم خلا سا تھا جس پر کپڑا لٹک رہا تھا۔ وہ سیاہ فام عورت جسامت، شکل صورت اور آواز سے مرد معلوم ہوتی تھی۔ اس کے چہرے پر آڑے ترچھے زخموں کے نشانات تھے جیسے نامی گرامی چوروں اور ڈاکوؤں کے چہرے پر سجے ہوتے ہیں۔ بعد میں تھرڈ انجینئر نے بتایا کہ یہ نشانات بچپن میں بنائے جاتے ہیں اور اس سے قبیلے کی پہچان ہوتی ہے۔

ہم نے سیدھے ہاتھ سے اوکے بنا کر اشارہ کرتے ہوئے سیاہ فام عورت کو بتایا کہ ہمیں پانی چاہیے۔ اس نے اپنی زبان میں کچھ کہتے ہوئے ہمیں گھر میں آنے کا اشارہ کیا۔ ہم اندر جانے سے گھبرا رہے تھے۔ میں اس مرد نما عورت کا چہرہ غور سے دیکھے جا رہا تھا۔ مجھے وہ کچے کے علاقے کے کسی ڈاکو کا چہرہ لگ رہا تھا۔ اس نے دوبارہ انگلی سے اشارہ کیا۔ میں تذبذب کے عالم میں اندر جانے یا نہ جانے کا سوچ رہا تھا۔ اتنے میں تھرڈ انجینئر نے میرے پاؤں کی طرف اشارہ کر کے زوردار چیخ ماری۔ میں کانپ کر رہ گیا اور نیچے دیکھا۔ دھندلی سی ہلکی روشنی میں ایک انسانی ہاتھ کے پنجے کے برابر کالے رنگ کا بچھو میرے جوتے پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید اس کی ٹانگ میرے جوتے کے نیچے آگئی تھی اور وہ اپنی جان بچانے کے لیے اوپر نیچے پھدک رہا تھا۔ بہرحال اس وقت ایک خوفناک اور جسیم بچھو کو دیکھ کر میں بھی اپنی چیخ پر قابو نہ پا سکا۔

ہماری اس حرکت پر دائیں بائیں کھڑے بچے ہنس ہنس کر دہرے ہو گئے۔ ایک نے دور بیٹھے ہوئے بچے کو پکارا جس کے ہاتھ میں کانچ کی کھلے منہ والی بوتل اور دوسرے ہاتھ میں لمبا سوا تھا۔ اس نے سوئے کی نوک بچھو کے جسم میں پروئی اور اسے اٹھا کر بوتل کے اندر ڈال دیا۔ اس میں پہلے ہی پانچ چھ پیلے اور براؤن رنگ کے بچھو موجود تھے۔ ان میں کالا بچھو یہی ایک تھا۔ وہ بچہ ہمیں ڈرانے یا مذاق کرنے ...... یا شدید یونہی داد وصول کرنے کے لیے بچھوؤں والی بوتل ہمارے چہرے کے سامنے ہلانے لگا۔ اس کے ساتھی بچے دوبارہ قہقہے لگانے لگے۔ ہم دونوں خوفزدہ ہو کر ڈاکو ... کے ساتھ کچے کے علاقے میں چلے گئے۔ یعنی اس سیاہ فام مرد نما عورت کے گھر میں گھس گئے۔ ہم نے گویا اپنے آپ کو بچھوؤں سے بچا کر آدم خور ٹائپ عورت کے حوالے کر دیا۔

گھر کے اندر دیوار میں بنے ہوئے ایک کھانچے میں مٹی کا دیا جل رہا تھا۔ دروازے کے قریب ایک اور موٹی

www.pdfbooksfree.pk

اور بھاری بھرکم عورت کھڑی تھی جو جلاد قسم کی کالی مائی سے خاصی کم عمر تھی۔ شاید وہ اس کی بیٹی یا بہو تھی۔ وہ بھی مختصر لباس میں تھی۔ یعنی صرف اپنے درمیانی حصے کو تولیے نما کپڑے سے ڈھانپا ہوا تھا۔ بالائی حصہ کپڑوں سے بے نیاز تھا۔ وہ اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ میں نے اس سے قبل اس قسم کی افریقی عورتیں دھان صاف کرتی یا ایک دوسرے کے سروں سے جوئیں نکالتی ہوئی صرف جیوگرافک میگزین کی تصویروں میں دیکھی تھیں۔

گھر کے ایک کونے میں کوئی تازہ ذبح کیا ہوا جانور لٹک رہا تھا جس کی کھال اتری ہوئی تھی۔ ہوسکتا ہے وہ کوئی بکری یا گائے بھینس کا بچھڑا ہو۔ گدھا یا خچر بھی ہوسکتا تھا۔ ہم اس لیے بھی اسے شناخت نہیں کرسکے کہ اس کی کھال کے ساتھ سر بھی غائب تھا۔ اس کے جسم کے مختلف حصوں سے گوشت کاٹ کر نکال لیا گیا تھا۔ تازہ ذبح کیا ہوا اس لیے کہا جاسکتا تھا کہ اب تک اس کے خون کے قطرے زمین پر ٹپک رہے تھے۔ قریب ہی ایک مٹی کا برتن خون سے بھرا ہوا تھا۔ ایک چھچھوندر نما چیز بار بار آکر اس برتن سے خون پینے کی کوشش کررہی تھی۔ جسے جوان عورت زمین پر پاؤں مار کر بھگا رہی تھی۔ بچوں سے صبر نہ ہوسکا اور وہ بھی تھوڑی دیر کے بعد اندر گھس آئے۔ وہ لٹکے ہوئے جانور کی طرف اشارہ کرکے ہمیں کچھ بتانے کی کوشش کرنے لگے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کوئی اہم بات ہوئی ہے بلکہ بہت بڑا سانحہ ہوچکا ہے جسے ہم کوشش کے باوجود سمجھنے سے قاصر تھے۔ ہوسکتا ہے وہ جانور شکار کیا گیا ہو یا کوئی خاص دن منانے کے لیے قربانی دی گئی ہو۔ بہرحال عجیب ڈراؤنا سا ماحول تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم نے ڈرتے ڈرتے دوبارہ اس طرح پانی کی بات کی جیسے کسی کا رشتہ مانگ رہے ہوں جس کے انکار کا اندیشہ ہو۔ بڑی عمر کی عورت نے ایک رسی اور پلاسٹک کی بالٹی اٹھائی۔ پھر اس نے تھرڈ انجینئر کو اپنے ساتھ چلنے اور مجھے وہیں رکنے کا اشارہ کیا۔ میں نے جاتے ہوئے تھرڈ انجینئر کا بازو مضبوطی کے ساتھ پکڑتے ہوئے التجا کی۔

''میں بھی ساتھ چلوں گا..... اس لٹکے ہوئے جانور، نوجوان نیم برہنہ عورت اور ان شرارتی بچوں کو دیکھ دیکھ کر میں انتقال فرما جاؤں گا۔''

بہرحال یہ ہنسی مذاق کی باتیں اب سوجھ رہی ہیں۔ جبکہ اس وقت ہم دونوں نے لرزتے ہوئے، اشاروں ہی اشاروں میں اس مفہوم کا پیغام ایک دوسرے کو ٹرانسمٹ کیا کہ چاہے کچھ بھی ہوجائے، ہمیں ساتھ رہنا ہے۔ یہ ہی تھرڈ انجینئر کے ساتھ جانے کے لیے پلٹا، پیچھے پلانے والی سیاہ فام عورت زور سے چیخی اور میں دل میرے پاؤں وہیں جم گئے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے گھما کر اس کی طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس کا کانشانہ میں نہیں بلکہ وہ کمبخت چھچھوندر تھی جو بار بار موجود خون پینے کے لیے لپک رہی تھی۔ میرے رکے قدم پھر اٹھنے لگے۔

تھوڑی ہی دور ایک غار نما کنواں تھا۔ جس میں کا پانی جمع تھا۔ اس میں موجود درجنوں مینڈکوں کی آواز دور تک سنی جاسکتی تھی۔ ڈاکو جیسی کالی مائی کے ذریعے پانی کی بالٹی بھردی۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں پانی اتنا ہائی جینک نہیں تھا۔ لیکن شدید پیاس کے باعث پانی بہت بھلا لگا۔

پانی پی کر جب ہوش ٹھکانے پر آئے تو ہم نے اشاروں سے اور بعد میں ریت پر جہاز بنا کر سیاہ فام عورت کو سمجھانے کی کوشش کی کہ ہم یہاں پھنس جانا چاہتے ہیں۔ ہمیں بتاؤ۔ ہم نے اس مدد کے عوض کچھ رقم دینے کا لالچ بھی دیا۔ تھرڈ انجینئر پانی پی کر کچھ زیادہ ہی جذباتی ہوگئے تھے۔ انہوں نے اپنی گھڑی دینے کی پیشکش بھی کرڈالی۔ میں نے انہیں خبردار کیا کہ وہ ایسی حماقت ہرگز نہ کریں۔ جہاز چلانے کے دوران ہم آدھی رات کو بار بار کس وقت دریافت کریں گے۔ دوسری بات یہ کہ گھڑی عورت کے کس کام آئے گی۔ اسے کون سا آئس جانا ہوائی جہاز اڑانا ہے جس کی خاطر ٹائم کی فکر کرے۔

بہرحال ہم اپنی بات سیاہ فام عورت کو سمجھانے کامیاب ہوگئے۔ وہ دوبارہ ہمیں اپنے گھر لے آئی۔ موجود بچے ایک دفعہ پھر اس ذبح کیے ہوئے جانور کی طرف اشارے کرنے لگے۔ لیکن آخر تک ہمیں اس کا رنا نہیں چل سکا کہ یہ کیوں کاٹا گیا ہے اور کون سا جانور عورت ہمیں گھر میں چھوڑ کر خود باہر چلی گئی۔ وہ تھوڑی کے بعد لوٹی اور ہمیں باہر آنے کا اشارہ کیا۔

وہاں سفید بالوں والا بوڑھا سیاہ فام اور مریل سے خچروں کے ساتھ کھڑا تھا۔ ہماری سواری کا انتظام کردیا گیا تھا۔ ایک پر اور دوسرے پر میں بیٹھا۔ دونوں خچر کچھ اپنے پاؤں

بڑھے کے کھینچنے اور ڈنڈے مارنے پر آگے بڑھتے رہے۔

آدھے گھنٹے کی تگ ودو کے بعد ہم ایک نیم پختہ سڑک پر جا پہنچے جہاں پٹرول پمپ بھی تھا۔ رات کے دس بج چکے تھے لیکن افریقا کی گرم ہوائیں اب بھی جھلسا رہی تھیں۔ چاندنی رات تھی اس لیے کچھ نہ کچھ دکھائی دے رہا تھا۔ پٹرول پمپ پر ایک ٹیکسی کھڑی تھی جو شاید اس بندرگاہ والے شہر کی واحد ٹیکسی تھی۔ ڈرائیور کچھ زیادہ پیسوں کی ڈیمانڈ کرکے چلنے پر آمادہ ہوگیا۔ پٹرول پمپ پر ریڈیو آن تھا اور پاکستان کے کسی بین الاقوامی ریڈیو اسٹیشن سے گانے نشر ہورہے تھے۔ ان دنوں راولپنڈی، ڈھاکا (جو کہ ایسٹ پاکستان کا شہر تھا) اور تہران، زاہدان کے ریڈیو اسٹیشن دور دور تک سنے جاتے تھے۔ ہم نے یہ ریڈیو اسٹیشن رومانیہ اور بلغاریہ میں بھی سنے۔ ان اسٹیشنوں سے پاکستانی ہندوستانی گانے سنائے جاتے تھے۔ اس وقت بھی اس اسٹیشن سے نور جہاں کا کوئی پنجابی گانا چل رہا تھا۔

پٹرول پمپ کے مالک نے اس گانے کی طرف متوجہ کرتے ہوئے ہم سے پوچھا کہ کیا آپ اس ملک سے تعلق رکھتے ہیں؟ فخر بلکہ غرور سے ہماری گردنیں اونچی ہوگئیں۔ تھوڑی دیر پہلے والا خوف ہوا ہوچکا تھا۔ ہم خود کو ہشاش بشاش اور مطمئن محسوس کررہے تھے۔

جب تک ٹیکسی ڈرائیور قہوہ پیتا رہا، ہم اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرتے ہوئے افریقین صحرا میں نور جہاں کے گانے کو انجوائے کرتے رہے۔ ہم اس طرح پُرسکون ہوگئے تھے جیسے چند گھنٹے خوار وخراب ہونے والے ہم نہیں بلکہ کوئی اور تھے۔ بہرحال ٹیکسی ڈرائیور سیٹ پر بیٹھا تو حکم صادر کیا۔

''دھکا لگاؤ۔''

''کیا بکواس کرتا ہے۔'' تھرڈ انجینئر کا پارا چڑھ گیا۔ میں نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے ان کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

''غصہ نہ کریں باس! اگر اس کالے نے غصے میں آکر چلنے سے انکار کردیا تو یہاں ہمیں خچر بھی نہیں ملیں گے۔''

بہرحال ہم نے ٹیکسی کو دھکا لگانا شروع کیا۔ کافی دیر تک دوڑانے کے بعد ڈرائیور جیسے ہی کلچ چھوڑتا ٹیکسی پر کھانسی کا دورہ پڑ جاتا لیکن اسٹارٹ نہ ہوتی۔ پھر یہ پریکٹس دہرائی جاتی۔

''یار..... یہ بدبخت ہمیں اس طرح تو بندرگاہ تک پہنچانے کا ارادہ نہیں رکھتا؟'' تھرڈ انجینئر نے دھکا لگاتے ہوئے کہا۔ وہ بری طرح ہانپ رہے تھے۔

''شاید اس کی ٹیکسی خراب ہے۔'' میں نے کہا۔

''اسے بھی شہر جانا ہوگا اور یہ ہم سے دھکا لگوا کر ٹیکسی وہاں تک لے جانا چاہتا ہے۔''

اسی دوران خدا خدا کرکے ٹیکسی اسٹارٹ ہوگئی۔ ہم ہانپتے کانپتے اس میں سوار ہوگئے۔ چاروں طرف ریت کے انبار تھے اور سڑک کی وہ حالت تھی جو یونس آباد سے منوڑہ جانے والی سڑک کی جولائی اگست میں ہوتی ہے۔ یعنی پوری سڑک ریت سے ڈھکی ہوئی تھی۔ کہیں کہیں ایک فٹ چوڑی پٹی کی طرح سڑک نظر آرہی تھی۔ ایسی سڑک پر ڈرائیور کس طرح ٹیکسی چلا رہا تھا، یہ اس کا دردِ سر تھا۔ اس نے کوئی پندرہ بیس منٹ کے بعد ہمیں اپنے جہاز کے سامنے لاکھڑا کیا۔

زندگی میں پہلی بار جہاز ہمیں بہت پیارا لگا۔

☆☆☆

آپ کو افریقا کے ان مشرقی کنارے کے ملکوں، خاص طور پر کینیا، زنیز بار اور یوگنڈا میں برصغیر کے کئی لوگ ملیں گے کیونکہ افریقا کے ان ملکوں پر بھی انگریزوں کی حکومت رہی ہے۔ ان میں زیادہ تعداد گجرات کے ہندوؤں کی ہے۔ دوسرے نمبر پر انڈیا کے مختلف سمندری کناروں والے شہروں کے آغا خانی، بوہری، سکھ، سندھی ہندو، کاٹھیا واڑی میمن اور دوسرے لوگ شامل ہیں۔ انگریزوں کا ملایا (آج کے ملائیشیا)، سنگاپور اور افریقا کے جن ملکوں میں بھی راج رہا، ان کی خواہش تھی کہ وہاں دفاتر، فیکٹریاں، دکانیں، ریلوے ڈیپارٹمنٹ وغیرہ قائم کیے جائیں۔ ان کی نظر میں ان کاموں کے لیے برصغیر کے لوگ موزوں تھے۔ کیونکہ وہ عقل مند، ہنرمند، تعلیم یافتہ اور سلجھے ہوئے لوگ تھے۔ اس خیال کے تحت انگریزوں نے ان کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ اپنا وطن چھوڑ کر مختلف ملکوں میں کمانے کی غرض سے نکلیں۔ انگریزوں نے انہیں تحفظ اور امن وامان کی یقین دہانی کرائی۔ پھر کئی لوگوں نے انگریزوں کے قبضے میں آنے والے ملکوں میں کام کرنا شروع کردیا۔ جس طرح انگریزوں نے سنگاپور میں ریلوے کے کام کے لیے جنوبی ہندوستان کے تامل باشندوں کو بلوایا تھا، اسی طرح انہوں نے 1860ء میں ممبا ساسے کمپالا تک جنگل صاف کرکے ریلوے لائین بچھانے کی غرض سے برصغیر کے تیس ہزار افراد کو تین سال کے معاہدے پر افریقا بلوایا۔ ان میں

www.pdfbooksfree.pk

سکھوں کی تعداد زیادہ تھی۔ جن میں سے کئی لوگ مرکھپ گئے اور کچھ وطن واپس چلے گئے۔ معاہدہ ختم ہونے کے بعد تقریباً سات ہزار ہندوستانیوں نے افریقا کے شہروں ہی میں رہنا پسند کیا۔ ان کے ساتھ کئی گجراتی ہندو اور مسلمانوں نے بھی تجارت کی غرض سے ممباسا، زینز یبار، کمپالا، نیروبی، دارالسلام میں سکونت اختیار کرلی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ انڈین، جن میں پنجاب اور سندھ کے بیوپاری بھی شامل تھے، خوشحال ہوتے چلے گئے۔ اس وقت پاکستان وجود میں نہیں آیا تھا۔ اس لیے یہ تمام لوگ انڈین کہلاتے تھے۔ خواہ ان میں بڑودا کا گجراتی ہو یا امرتسر کا سکھ۔ لاہور کا پنجابی ہو یا شکارپور کا سندھی، سب انڈین تھے۔ ان کی اولاد آج بھی خود کو انڈین کہلاتی ہے۔ حالانکہ نیروبی، ممباسا اور کمپالا کی گلیوں میں آپ کو کئی ایسے آغاخانی، بوہری اور سندھی ہندو ملیں گے جن کے عزیز اور خاندان کے لوگ حیدرآباد، سکھر اور تلہار میں رہتے ہیں۔

انگریزوں کے دور میں یہاں آنے والے آغاخانی، بوہری، سندھی ہندو، گجراتی دکاندار اور سوداگر تھے۔ ان کے علاوہ محنت مزدوری کے لیے آنے والے لوگ بھی یہیں رہ گئے۔ لیکن بعد میں مزدوروں کی دوسری اور تیسری نسل نے تعلیم حاصل کرکے سرکاری اداروں میں ملازمتیں حاصل کرلیں۔ کئی لوگوں نے رقم جمع کر کے چھوٹے موٹے کاروبار کا آغاز کردیا اور کچھ لوگ امپورٹ ایکسپورٹ کے بزنس کی طرف چلے گئے۔ انگریز ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ کیونکہ انہیں مقامی سیاہ فاموں پر کنٹرول حاصل کرنے اور دفاتر کے کام چلانے کے لیے ان انڈین کلرکوں، چپڑاسیوں اور نچلی سطح کے افسروں کی ضرورت تھی۔ یہ لوگ بے چوں وچرا حکم کی تعمیل کرنے والے اور سخت محنتی تھے۔

ایسا ہرگز نہیں ہے کہ ہندوستان کے لوگوں کو افریقا لانے والے انگریز ہی تھے۔ انگریز خود انڈیا اور افریقا بہت بعد میں پہنچے تھے۔ ان سے بہت پہلے ہندوستان کے مغربی کنارے، یعنی آج کے کراچی، گوادر، پسنی، چاہ بہار (ایران) اور عمان کے باشندوں کی افریقا آمدورفت جاری رہتی تھی۔ اگر آپ بحرِ ہند کے نقشے پر نظر ڈالیں تو آپ کو حیرت بالکل نہیں ہوگی کہ عرب ملکوں، مشرقی افریقا اور مغربی انڈیا کے کنارے والی بندرگاہوں کے درمیان تجارت عام تھی جس کی نشانیاں دو ہزار سال پرانی ہیں۔ انگریزوں کو تو ان سمندروں کی خبر ہی نہیں تھی۔ انگریزوں سے پہلے پرتگالی ملاح اور Explorer واسکوڈی گاما 1497ء میں موزمبیق، ممباسا اور لنڈی پہنچا تو وہ وہاں بڑی تعداد میں عربوں اور ہندوستانیوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

واسکوڈی گاما، براعظم افریقا کے کیپ آف گڈ ہوپ سے ہوتا ہوا شمالی کنارے پر اس لیے پہنچا کہ کسی طرح سمندر کے ذریعے انڈیا تک پہنچنے کا راستہ تلاش کیا جاسکے۔ خشکی کے راستے یورپین اور انگریزوں کو چین جاتے ہوئے معلوم ہو چکا تھا اور وہ زمینی راستے سے آگاہ ہو چکے تھے لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آبی گزرگاہ سے ہوئے کس طرح انڈیا تک رسائی حاصل کی جائے۔ یورپین میں واسکوڈی گاما پہلا شخص تھا جو ہندوستان جنوبی کنارے پر پہنچا۔ اگر اس سلسلے میں کانجی مالم ہندوستانی نے اس کی مدد نہ کی ہوتی تو وہ شاید اس کامیاب نہ ہوتا۔ کانجی مالم افریقا میں رہتا تھا اور واسکوگاما کی رہنمائی کے لیے اس کے ساتھ ہولیا تھا۔

واسکوڈی گاما جب افریقا پہنچا تو وہاں اس نے دیکھا کہ عرب ملکوں کی خوبصورت بادبانی کشتیاں افریقا آرہی ہیں اور مسافروں اور تجارتی سامان کو اٹھا کر عرب ملکوں کی جانب سفر کررہی ہیں۔ اس کے مشاہدے میں آیا کہ افریقا کنارے والے شہروں میں کئی عرب مسلمان آباد ہیں اور انہوں نے ان شہروں میں مساجد بھی تعمیر کرلی ہیں۔ وہاں انڈین زیادہ تر عارضی طور پر مقیم تھے۔ وہ چوماسی کی ہوا چلنے کے منتظر ہوتے تھے اور موافق ہوا کے چلتے ہی انڈیا روانہ ہوجاتے تھے۔ ان ایام میں انجن ایجاد نہیں ہوئے تھے۔ سمندری سفر بادبان کے ذریعے ہوتا تھا۔ چھوٹی بڑی کشتیوں میں ایک سے زیادہ بادبان بھی ہوتے تھے جو موٹے کپڑے کے بنے ہوتے تھے۔ وہ چوبی کشتیاں اور چھوٹے جہاز ہوا کے دوش پر سفر کرتے تھے۔ ہوشیار اور تجربہ کار ناخدا بادبانوں کا رخ قدرے تبدیل کرکے اپنی کشتیوں کو تھوڑا سا دائیں بائیں موڑ سکتے تھے۔ لیکن پیچھے کی جانب، یعنی ہوا کی مخالف سمت میں سفر نہیں کرسکتے تھے۔ ہوا کے بند ہوتے ہی جہاز وہیں رک جاتا تھا یا لہروں کے رحم وکرم پر بے سمت رہتا تھا۔ ایسے مواقع پر کناروں پر چھپے ہوئے چوراپنی چپو والی کشتیوں کے ذریعے ان جہازوں پر پہنچ کر لوٹ مار کرکے اور فرار ہوجاتے تھے۔ اس زمانے کے ناخدا ہماری طرح کھلے سمندر میں جہاز نہیں چلا سکتے تھے۔ وہ کنارے کنارے سفر کرتے تھے اور سمندری۔ ڈاکوؤں (قزاقوں) کا آسان

شکار ہوتے تھے۔ آج طاقتور انجن کی مدد سے ہم جہازوں کو کھلے اور گہرے سمندر میں سے گزار کرلے جاتے ہیں..... لیکن قزاقوں کا خوف اب بھی دامن گیر رہتا ہے۔ اب وہ چپوؤں والی کشتیوں کی بجائے اسپیڈ بوٹ میں آتے ہیں۔ اب وہ کلہاڑیوں اور چھریوں کی بجائے جدید، آٹو میٹک آتشیں ہتھیار رکھتے ہیں۔

بہرحال ہم پچھلے زمانے کے ہندوستان کا ذکر کررہے تھے۔ جب بادبانی کشتیوں کے ذریعے سفر کیا جاتا تھا۔ جن کا دارومدار صرف اور صرف ہواؤں کے رخ پر ہوتا تھا۔ سردیوں کی چوماسی، یعنی دسمبر اور فروری کی درمیانی مدت میں ہند کے مختلف علاقوں سے سندھی ہندو، گجراتی مسلمان، آغاخانی، اثنا عشری، بوہری اور کچھی وغیرہ اپنی کشتیوں کے ذریعے افریقا تک پہنچتے تھے۔ وہاں تین چار ماہ تک اپنا تجارتی سامان فروخت کرکے اور نیا مال خرید کر موسم گرما کی چوماسی یعنی مون سون کی ہواؤں کا انتظار کرتے تھے۔ پھر جیسے ہی موافق اور مطلوبہ ہوا چلنے لگتی وہ افریقا کے ساحل چھوڑ کر اپنے وطن انڈیا کی جانب روانہ ہوتے تھے۔ اس زمانے میں تجارتی سامان میں عاج (ہاتھی دانت) مسالے، سیاہ فام غلام، کپڑا اور کپاس وغیرہ ہوتا تھا۔

انیسویں صدی میں اس معمول میں اہم تبدیلی آئی۔ عرب حاکم سلطان سعید سید 1806ء میں عمان کا حاکم بنا۔ اس نے اپنے دورِ حکومت میں دارالحکومت کو مسقط سے زینز یبار جزیرے پر منتقل کردیا۔ یہ 1832ء کا ذکر ہے۔ زینز یبار آج کل تنزانیہ کا حصہ ہے جبکہ اس زمانے میں سنگاپور اور ہانگ کانگ کی طرح الگ ملک تھا۔ عرب حاکموں کے زینز یبار منتقل ہونے سے عمان کی اہمیت میں کمی آگئی۔ اس کے مقابلے میں زینز یبار اور مشرقی افریقا میں تجارت عروج پانے لگی۔ عمان اور برصغیر میں رہنے والے کئی بلوچ اپنے سلطان کے ساتھ زینز یبار چلے گئے۔ یہ وہی بلوچ تھے جنہوں نے بعد میں آنے والے پرتگالیوں کا مقابلہ کیا تھا۔ آج کل کینیا میں بلوچ رہتے ہیں، وہ انہی بلوچوں کی اولاد ہیں۔ میں ان کا تفصیلی ذکر اپنی کتاب ''یہ جزیرے یہ کنارے'' میں کرچکا ہوں۔

بہرحال میں یہاں یہ بھی لکھتا چلوں کہ شروع میں برصغیر سے افریقا آنے والوں میں زیادہ تعداد مسلمانوں کی تھی۔ آنے والے ہندوؤں میں سندھی ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ دوسری اہم بات یہ کہ اس زمانے میں خشکی کے راستے کئی گجراتی ہندو سیام اور ملایا کی طرف..... دوسری جانب چین اور عربستان کی سمت جا پہنچتے تھے۔ لیکن ہندو سمندر میں سفر کرنے کو Taboo (نجس) سمجھتے تھے۔ لیکن سندھی ہندوؤں کا معاملہ مختلف تھا۔ وہ سادھو بیلہ اور اڈیرولال کے پیروکار تھے۔ ان کے لیے پانی خوف اور نفرت کی علامت نہیں بلکہ پاک اور پوتر حیثیت رکھتا تھا۔ وہ نہ صرف خشکی کے راستے بلکہ سمندر کے ذریعے بھی افریقی ملکوں کے علاوہ دور دراز کے جزیروں تک جا پہنچتے تھے۔

ستر کی دہائی میں جب میرا جہاز لاس پاماس، برمودا اور ٹرینڈاڈ جیسے جزیروں پر پہنچا تو مجھے وہاں سندھی ہندوؤں کی دوسری اور تیسری نسل نظر آئی۔ برمودا جزیرے پر ملنے والی ایک سندھی ہندو فیملی کے متعلق میں آج سے چالیس برس قبل اپنے ایک سفرنامے میں تحریر کرچکا ہوں کہ نوجوان نے اپنے والد سے پوچھا کہ اجرک کیا ہے؟ اس کے والد کی بجائے دادا نے جواب دیا کہ یہ ایک سرخ پھولدار چادر ہوتی ہے جو سندھ میں جاہل مسلمان اوڑھتے ہیں۔

بہرحال وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ برصغیر سے نہ صرف بوہری، خوجہ، کاٹھیاواڑی میمن اور ہندو سندھی کی افریقا آمد ورفت شروع ہوگئی بلکہ بتدریج ہندو، ملباری اور کوکنی وغیرہ بھی وہاں کا رخ کرنے لگے۔ لیکن ہندو برہمنوں نے ہندو عورتوں کو سمندر میں سفر کرنے سے سختی سے منع کردیا تھا۔ اس کے نتیجے میں وہ افریقا میں دو تین سال کمانے کے بعد انڈیا لوٹ آتے تھے۔ جب سید بارگش زینز یبار کا سلطان بنا تو اس نے ہندوؤں کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ اپنی بیویوں کو بھی وہاں لے آئیں۔ اس حد تک کہ جب پہلی ہندو خاتون زینز یبار آنے پر آمادہ ہوئی تو سلطان نے اس کے لیے اپنا ذاتی جہاز روانہ کیا اور اسے انعام کے طور پر 250 شلنگ بھی دیے گئے۔ اس نے ہندو عورتوں کی رہائش کے لیے زینز یبار کا پرانا قلعہ دینے کا بھی وعدہ کیا جس کے پانی کے پائپوں میں چاندی کے نل لگے ہوئے تھے۔ اس دوران میں گجرات کی ہندو عورتوں نے برہمنوں کے خلاف بغاوت کی آواز بلند کی اور وہ کامیاب رہیں۔ پھر وہ اپنے شوہروں کے ساتھ افریقا روانہ ہونے لگیں۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ جہاں انڈیا کے مختلف قومیت اور مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے افریقا پہنچ کر خوب کمایا اور اپنے لیے خوشحالی حاصل کی، وہیں انہوں نے انگریزوں کے سسٹم کو بہتر انداز میں چلانے کے

www.pdfbooksfree.pk

سلسلے میں بھی مدد دی۔ اس کے علاوہ یہ لوگ مقامی باشندوں کی بہتری کا سبب بھی بنے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ چند انڈینز کی عاقبت نا اندیشی اور بے انتہائی کنجوسی کے ساتھ ساتھ احساسِ برتری کے اظہار کے باعث کئی خرابیاں پیدا ہوئیں۔ وہ مقامی لوگوں کو اپنے سے کمتر سمجھنے لگے تھے۔ جس کی وجہ سے مقامی باشندے ان سے نفرت کرنے لگے۔

ہم نے ساٹھ کی دہائی سے افریقا کی مختلف بندرگاہوں میں جانا شروع کیا تھا۔ اس زمانے میں انگریز، پرتگالی اور فرنچ حاکموں نے کئی ملکوں کو آزادی دے دی تھی اور بعض ملکوں کو خود مختیاری ملنے والی تھی۔ بہر حال کینیا، یوگنڈا موزمبیق، سینیگال جیسے ملکوں سے انگریزوں اور یورپین کے نکل جانے کے بعد بھی انڈین وہیں مقیم رہے۔ وہ نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ ملک کا معاشی نظام چلا رہے تھے۔ لیکن بعد میں ہم نے دیکھا کہ ان کے خلاف مقامی لوگوں کی نفرت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ وہ یہ سوچنے لگے تھے کہ انگریزوں اور یورپین سے جان چھوٹی تو اب یہ انڈین حاکم بن کر بیٹھ گئے ہیں۔ پورے ملک کا کاروبار ان کے ہاتھوں میں ہے اور مقامی لوگ بدستور غربت کی چکی میں پس رہے ہیں۔ اس نفرت کو عیدی امین جیسے لیڈروں نے ہوا دی۔ آخر کار عیدی امین نے انڈین لوگوں کو اپنے ملک سے نکال دیا۔

4 اگست 1972ء کو یوگنڈا کے صدر عیدی امین نے ملک میں موجود ہندوستانیوں کو ملک چھوڑنے کا حکم دے دیا۔ یوگنڈا میں مقیم انڈینز میں نوے فی صد گجراتی تھے۔ عیدی امین نے ملک چھوڑنے کے لیے 90 دن کی مہلت یا ڈیڈ لائن دی۔ اس نے تقریر کے دوران یہ حکم سناتے ہوئے کہا تھا۔ ''مجھے خواب میں خدا نے حکم دیا کہ میں اپنے ملک سے انڈینز کو نکال دوں۔''

آخر کار تمام گجراتی یوگنڈا سے نکل گئے۔ کچھ پاکستان اور انڈیا چلے گئے اور کچھ لوگوں نے امریکا، کینیڈا کا رخ کیا۔ بعض لوگ انگلینڈ چلے گئے۔ کیونکہ وہ برٹش پاسپورٹ رکھتے تھے۔ یوگنڈا کی فوج اور مقامی غنڈوں نے ہجرت کر جانے والے انڈینز کی دکانوں اور گھروں میں خوب لوٹ مار کی۔ انڈینز جو کاروبار اور ملازمت کرتے تھے، وہ مقامی لوگوں کے ہاتھ میں ضرور آ گئیں۔ لیکن وہ نہ تو ہنر مند تھے اور نہ انڈینز کی طرح تعلیم یافتہ اور بزنس کے آرٹ سے واقف تھے۔ اس کے نتیجے میں چند ہی برس میں یوگنڈا کی اکانومی اوندھے منہ گر گئی۔ اس کے علاوہ عیدی امین نے بھی ملک کو تباہ کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ آخر کار وہ اپنی جان سعودی عرب فرار ہو گیا۔

گجراتیوں کو دوبارہ یوگنڈا میں آنے کی دعوت دی گئی۔ انہیں کاروبار اور رہائش کے لیے سہولیات کی پیش کی گئی۔ کچھ گجراتی لوٹ کر واپس آ گئے اور بعض نے معذرت کر لی..... لوٹ کر آنے والوں میں میری ڈاکٹر رجنی کے والدین بھی تھے۔

عیدی امین کی پیچیدہ شخصیت اور اس کے خاص طور پر برسوں سے آباد انڈینز کو ملک بدر کرنے کہانی پر کئی فلمیں بنائی اور بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔

انڈینز کو یوگنڈا سے ملک بدر کرنے کی بہترین ''دی لاسٹ کنگ آف اسکاٹ لینڈ'' میں کی گئی ہے ناول پر مبنی فلم 2006ء میں بنی تھی۔ اسی موضو 1991ء میں بننے والی فلم ''مسی پی مسالا'' میں بھی میں انڈینز کے ساتھ ہونے والی زیادتی کو نمایاں ہے۔ شہناز نان جی کے ناول ld of Dandelions میں بھی اس جبری ہجرت کا گیا ہے۔

یوگنڈا میں ہونے والی اس ''ملک بدری'' کے مغرب کے لوگوں کو سب سے پہلے ویسٹ انڈینز میں انڈین ناول نویس وی. ایس. نائپال نے اپنے ناول bend in the River کے ذریعے آگاہ کیا۔

☆☆☆

شاید کچھ لوگوں کی سوچ ہو کہ افریقی طلبا بالکل گزرے اور نالائق ہیں۔ پوسٹ گریجویشن سے پہلے میں بھی یہی سوچ تھی۔ لیکن جب مجھے سویڈین کی یونیورسٹی مالمو'' میں ایم ایس سی کرنے کا موقع ملا تو افریقا کے مختلف ملکوں کے سیاہ فام طلبا کی ذہانت اور سوچ کو دیکھ کر بہت حیرت ہوئی۔ میں نے اس بات کا اپنے اسکینڈے نیویا کے سفرناموں میں بھی کیا ہے۔

ہمارے 200 طلبا کے گروپ میں تقریباً طالب علم براعظم افریقا کے ملکوں سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکچر کے بعد اہم اور پُرمغز سوالات کرتے تھے۔ لیکچر غور سنتے اور امتحانات میں اچھے نمبر حاصل کرتے تھے۔ ان طلباء میں بیس خواتین تھیں جو کمپالا، نیروبی، دارالسلام یونیورسٹیوں سے گریجویشن کر کے آئی تھیں۔

اور آج میں ان یونیورسٹیوں کی سرزمین (

www.pdfbooksfree.pk

افریقا) پہنچ کر عجیب سا محسوس کرر ہا ہوں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ نیروبی کی یونیورسٹیاں ممبئی، کلکتہ اور لاہور کی یونیورسٹیوں کی طرح بہت قدیم نہیں ہیں۔ جب نیروبی جیسا شہر ہی محض ایک سو برس پرانا ہو تو اس شہر کی یونیورسٹیاں کتنی قدیم ہوں گی! کینیا کی سب سے پرانی یونیورسٹی ''دی یونیورسٹی آف نیروبی'' ہے جو 1956ء میں وجود میں آئی اور یونیورسٹی آف افریقا کا ایک حصہ رہی۔ اس کے باقی حصے کمپالا اور دارالسلام میں واقع یونیورسٹیاں تھیں۔ بہر حال اس یونیورسٹی کو 1970ء میں خود مختار حیثیت حاصل ہوئی۔ اس حساب سے جام شورو کی مہران یونیورسٹی اس سے زیادہ قدیم ہے۔ بہر حال اس میں 22000 طلبا تعلیم حاصل کرتے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یونیورسٹی میں سخت ڈسپلن نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ طالب علم وقت کے پابند، معلم اعلیٰ تعلیم یافتہ، تجربہ کار اور قابل نظر آتے ہیں۔

نیروبی کی ایک اور یونیورسٹی ''کینیاتا یونیورسٹی'' ہے جو ''یونیورسٹی آف نیروبی'' کے بعد دوسرے نمبر پر بڑی درس گاہ ہے۔ یہ یونیورسٹی شہر کے مرکزی علاقے سے 20 کلومیٹر دور ''نیروبی، تھیکا'' روڈ پر کاہادا نامی علاقے میں واقع ہے۔ 1965ء میں انگریزوں کے ''ٹیمپلر'' فوجی بیرکس میں کینیاتا کالج نامی ایک ٹیچر ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کھولا گیا۔ اس کے بعد 1985ء میں اس کالج کا نام تبدیل کر کے کینیاتا یونیورسٹی رکھا گیا۔

کینیا کی ایک دوسری یونیورسٹی ''کماتھی یونیورسٹی کالج آف ٹیکنالوجی'' (KUCT) ہے جو نائیری شہر میں موقع ہے۔ یہ درس گاہ بھی خاصی شہرت رکھتی ہے۔ کینیا میں دیگر یونیورسٹیوں اور کالجوں کے علاوہ آغا خان یونیورسٹی بھی ہے۔ آغا خان یونیورسٹیاں دنیا کے تین براعظموں کے آٹھ ملکوں میں موجود ہیں۔ ان میں سب سے بڑی اور قدیم یونیورسٹی کراچی میں ہے۔ دوسرے نمبر پر بڑی یونیورسٹی یہاں کینیا میں واقع ہے۔ آج کل تنزانیا کے شہر اروشا میں بھی ایک آغا خان یونیورسٹی تعمیر کی جارہی ہے۔ آغا خان یونیورسٹی کے میڈیکل کالج اکثر ''Harvard of the East'' کہلاتے ہیں۔

میں جس دن ممباسا کے ''پولی ٹیکنک یونیورسٹی کالج'' پہنچا اس روز کینیا کے تمام کالج، یونیورسٹیاں اور دفاتر بند تھے۔ معلوم ہوا کہ اسی دن بارک اوباما امریکا کے صدر بنے تھے۔ اس لیے کینیا میں اس دن عام تعطیل ہوتی ہے۔ گزشتہ سال بھی اسی تاریخ کو قومی دن قرار دے کر چھٹی منائی گئی تھی اور اس سال بھی یہ دن چھٹی کے طور پر منایا گیا ہے۔ مجھے اس بات پر بہت حیرت ہوئی تھی۔ ہم جیسے کئی ملکوں، جن پر دنیا امریکا کا چمچہ ہونے کا الزام لگاتی ہے، نے امریکا کو خوش کرنے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا؟ لیکن اس دن کینیا میں عام تعطیل انتہا ہے! وہ جس ملک (امریکا) کے صدر ہیں، اگر وہاں چھٹی کی جاتی تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔

اگلے دن ''میٹلرجی'' کے پروفیسر طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ ''ہمارے ملک کو یہ فخر حاصل ہے کہ اوباما ہمارے ملک کے ایک سیاہ فام کے بیٹے ہیں۔''

''خوب!'' میں نے کہا۔ ''گویا اوباما کا اصل وطن کینیا ہے! واقعی، یہ میرے لیے حیرت اور خوشی کی بات ہے کہ کینیا کا ایک سیاہ فام شخص امریکا جیسے امیر اور طاقتور ملک کو چلا رہا ہے۔''

''جناب! اصل بات یہ ہے کہ ہم اسی بات پر مسرور رہتے ہیں کہ اوباما ہمارے ہیں۔'' انہوں نے سرگوشی میں کہا۔ ''امریکا ہمیں بالکل لفٹ نہیں کراتا اور ہم اس کے ساتھ رشتے قائم کیے ہوئے ہیں۔''

پھر انہوں نے ''افریقی انداز'' کا قہقہہ لگاتے ہوئے مزید کہا۔ ''وہ امریکا جیسے ملک کے صدر بن گئے ہیں، اس لیے یہ پورا ملک انہیں اپنا قرار دیتا ہے۔ جبکہ اس سے پہلے ان کے والد بھی ان کی صورت دیکھنا گوارا نہیں کرتے تھے۔''

ان کی یہ باتیں سن کر میں بھی ہنستا رہا۔ دراصل مجھے اس وقت ان باتوں کی حقیقت پر نہیں بلکہ پروفیسر صاحب نے جس اسٹائل میں وہ باتیں کی تھیں، اس پر ہنسی آئی تھی۔ ویسے بھی سیاہ فام لوگوں کی گفتگو کا اپنا ہی ایک منفرد انداز ہے۔ وہ ماتلی یا منگھو پیر کے ہوں، ان کا تعلق مکران کوسٹ یا ممباسا سے ہو۔ خواہ موزمبیق، مشی گان یا مسی سپی، ریاست کے سیاہ فام باسی ہوں...... یہ لوگ غم اور افسوس کی بات بھی اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ ظاہری طور پر مذاق معلوم ہوگا۔

میں ممباسا میں اپنے قیام کے دوران بارک اوباما اور ان کے سگے والدین اور سوتیلے والد کی زندگی کے بارے میں سوچتا رہا...... مجھے پروفیسر صاحب کی باتیں حقیقت پر مبنی معلوم ہوئیں۔ دراصل اگر تعطیل کرنی ہو تو کینیا کی بجائے انڈونیشیا کو کرنی چاہیے جہاں اوباما اپنی سگی والدہ اور سوتیلے والد کے ساتھ خاصا وقت رہے تھے۔ انہوں نے بنیادی تعلیم

بھی وہیں حاصل کی اور تھوڑی بہت ملئی زبان بھی بول لیتے ہیں۔ وہ کینیا میں تو ایک دن بھی نہیں رہے! میں یہاں ان کی زندگی کا مختصر احوال تحریر کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میری طرح قارئین بھی کچھ باتوں پر ضرور چونکیں گے۔

ان ایام میں کینیا میں.. اور افریقا کے دیگر ملکوں میں بھی، لیکن یہاں ہمارا فوکس صرف کینیا ہے۔

ہر سیاسی لیڈر تعلیم حاصل کرنے کے بعد کسی عہدے پر پہنچتے ہی اسی کے مطابق شادی کرتا ہے۔ ہر شخص پہلی شادی اپنے قبیلے کی رسم کے مطابق اپنی برادری میں کرتا ہے پھر تعلیم کے دوران یا ملازمت حاصل کرنے کے بعد دوسری، تیسری چوتھی اور پانچویں شادی کرتا ہے۔ بعض لوگ ایک کو چھوڑ کر دوسری عورت سے شادی رچا لیتے ہے۔ یہ ''رواج'' ہم سے ایک نسل پہلے، خاص طور پر سندھ کے مسلمانوں میں عام نظر آتا تھا۔ ہمارے کئی پیروں، میروں، وڈیروں، بیوروکریٹس، صنعت کاروں اور سیٹھوں کی پہلی شادی کم عمری میں ہوجاتی تھی۔ یہ شادی اپنی ہی برادری میں ہوتی تھی۔ آیندہ چل کر وہ خاندانی بیوی سنگلاخ دیواروں کے عقب میں تنہائی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتی اور ہمارا، ہیرو لاہور، کراچی یا کسی دوسرے بڑے شہر سے ایک تعلیم یافتہ خاتون یا کسی اداکارہ، گلوکارہ سے شادی کرکے اسے گاؤں میں لے آتا۔ جہاں وہ گھر میں بیٹھنے کی بجائے ''شوپیس'' کے طور پر ہر وقت، ہر جگہ شوہر کے ساتھ رہتی تھی۔

یہی ''فیشن'' افریقا میں بھی تھا۔ کینیا کے پہلے صدر جومو کینیاتا نے بھی چار پانچ شادیاں کی تھیں۔ ان میں سے ایک انگریز خاتون بھی تھیں۔ حالانکہ وہ خود اور دیگر افریقین انگریزوں سے سخت نفرت کرتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اپنے ملک کے کالوں پر دھاک بٹھانے کی غرض سے کم از کم ایک انگریز یا یورپین گوری سے شادی کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ خواہ وہ عمر میں بڑی ہی کیوں نہ ہو، دھوبن ہو یا بھنگن ...... بس شرط یہ تھی کہ گوری چمڑی ہو! جومو کینیاتا نے بھی جس انگریز عورت سے شادی کی تھی، وہ پیشے کے لحاظ سے آیا تھی۔ حالانکہ مسٹر جومو اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔

یہ رسم یا اسٹیٹس سمبل ہمارے برصغیر میں بھی ایک عرصے تک قائم رہا۔ یہ بات دیگر ہے کہ اب ہمارا اور افریقا کا نوجوان ایک شادی ہی کو کافی سمجھتا ہے۔ وہ اس کے لیے سوچ سمجھ کر انتخاب کرتا ہے۔ اس کے ذہن میں یہ خیال ہوتا ہے کہ اسے ایک جیون ساتھی کی ضرورت ہے۔ وہ اب عورت کو بھیڑ بکری نہیں سمجھتا اور نہ ہی اسے ''شوپیس'' کے طور پر استعمال کرتا ہے۔

امریکی صدر کے والد نے بھی چار پانچ شادیاں کی تھیں۔ انہوں نے پہلی شادی خاص کم عمری میں اپنے قبیلے کی لڑکی کے ساتھ کی۔ جب وہ تعلیم کے سلسلے میں امریکا گئے تو وہاں ایک گوری (اوباما کی والدہ) کے ساتھ دوسری شادی کی۔ انہوں نے اپنی امریکن بیوی سے یہ بات پوشیدہ رکھی کہ وہ پہلے ہی شادی شدہ ہیں۔ یہ ''راز'' کھلنے پر انہوں نے بتایا کہ ان کی خاندانی بیوی نے دوسری شادی کی اجازت دی تھی۔

پاکستان میں بھی مرد کے ایک کے بعد دوسری شادی کرنے کو Discourage کرنے کے لیے ایوب خان نے قانون نافذ کیا تھا کہ کوئی بھی مرد اپنی پہلی بیوی کی اجازت کے بغیر دوسری شادی نہیں کرسکتا۔ ایوب خان شاید یہ سمجھے تھے کہ اس قانون کے اجرا کے بعد مردوں کے لیے یہ کام خاصا مشکل ہوجائے گا۔ لیکن ہمارے وڈیروں، سیاستدانوں، رئیسوں، بیوروکریٹس کے ''معمولات'' میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ دوسری شادی کرتے رہے۔ پہلی خاندانی بیوی کی کیا مجال کہ وہ اس سلسلے میں ایک لفظ بھی بول سکے۔ میں گزشتہ سطور میں تحریر کرچکا ہوں کہ ایسے لوگوں کے لیے دیہاتی اور خاندانی بیویاں بھیڑ بکریوں سے بھی کم حیثیت رکھتی تھیں۔

لطف کی بات یہ کہ ملائیشیا جیسا ملک، جسے آج آپ یورپ جیسا دیکھتے ہیں اور یہاں یورپ کی طرح جوڑے نظر آتے ہیں، آج کا نوجوان صرف ایک شادی کرتا ہے۔ یعنی دوسری شادی نہایت مجبوری کی حالت میں کی جاتی ہے۔ یعنی پہلی بیوی کے فوت ہونے یا اس سے شدید اختلافات کی صورت میں علیحدگی حاصل کرنے کے بعد لیکن ستر کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں، جب میرا پہلی مرتبہ ملائیشیا کے شہروں میں جانا ہوا تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کہ کئی ملئی سیاست دان، زمیندار، رئیس اور ریٹائرڈ بوڑھے بیوروکریٹس ایک عدد جوان عورت کو بیوی کی حیثیت سے ہمیشہ اپنے ساتھ لیے چلتے ہیں۔ ان کا Combination عجیب لگتا تھا۔ بیوی کم عمر، بیٹی کے برابر...... اور خود بوڑھے۔ اس پر خود کو جوان ظاہر کرنے کے لیے سر پر موجود چند بالوں کو خضاب سے سیاہ کر لیتے تھے۔ ان دنوں میں خضاب کے کلرز بھی سادہ سے ہوتے تھے جو بالوں کو سیاہ کرنے کے ساتھ سر کی جلد کو بھی

www.pdfbooksfree.pk

کالا کردیتے تھے ۔ ان کے چہرے کی جلد پر سلوٹیں اور ہاتھوں پیروں پر رعشہ طاری ہوتا۔ پیری میں جوان بیوی کے ساتھ تیز قدم اٹھاتے ہوئے لڑکھڑانے لگتے تھے لیکن اس بات پر بے حد خوش اور مسرور نظر آتے تھے کہ انہوں نے ایک کم سن لڑکی سے شادی کر کے بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔

گزشتہ صدی میں یہی حال افریقا میں بھی تھا۔ ان میں بارک اوباما کے والد بھی شامل تھے۔

☆☆☆

امریکا کے چوالیسویں موجودہ صدر اوباما کا پورا نام ''بارک حسین اوباما'' ہے۔ دلچسپ بات یہ کہ ان کے والد کا نام بھی یہی ہے۔ باپ بیٹے کی شناخت کے لیے والد ''بارک اوباما اون'' یا بارک اوباما سینئر'' کہلاتے ہیں جبکہ بیٹے ''باراک اوباما نو'' یا ''بارک اوباما جونیئر'' کہلاتے ہیں۔

اوباما سینئر 1936ء میں کینیا کے قصبے ''کنیادھ یانگ'' میں پیدا ہوئے۔ یہ قصبہ وکٹوریا جھیل کے کنارے پر واقع ہے۔ افریقا کی اس خوبصورت اور بڑی جھیل کے کئی مقامی نام ہیں۔ میٹھے پانی کی یہ وسیع و عریض جھیل 70 ہزار کلو میٹر تک پھیلی ہوئی ہے۔ بارش کے علاوہ کئی دریاؤں کا پانی اس جھیل میں پہنچتا ہے۔ اس جھیل سے صرف ایک چھوٹی ندی ''سفید نیل'' (white Nile) نکلتی ہے جو آگے جا کر مصر کے دریائے نیل کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

وکٹوریا جھیل کے چاروں طرف یوگنڈا، تنزانیا اور کینیا آباد ہیں۔ جھیل کے کنارے کنارے سفر کیا جائے تو یہ فاصلہ مجموعی طور پر 5000 کلو میٹر بنتا ہے۔ جھیل کے گرد کئی قدیم تاریخی اور ماڈرن خوبصورت شہر واقع ہیں۔ ان میں زیادہ تر شہر یوگنڈا اور تنزانیا کے ہیں۔ یہ جھیل کینیا کے حصے میں صرف چھ فی صد آتی ہے۔ یہیں پر آباد لوؤ قبیلے میں اوباما کے والد نے جنم لیا۔ ان کے والد یعنی امریکی صدر اوباما کے دادا کی کم از کم تین بیویاں تھیں۔ ان میں دوسری بیوی حبیبہ اکومو نے اوباما سینئر (یعنی امریکی صدر کے والد) کو جنم دیا۔ لیکن اس کی پرورش تیسری بیوی سارہ نے کی۔ کیونکہ حبیبہ، اوباما سینئر کی پیدائش کے بعد جلد ہی شوہر سے روٹھ کر الگ ہوگئی اور پھر اس نے طلاق کا مطالبہ کیا۔

اس دور کے افریقی ادب کا مطالعہ کیجیے تو آپ کو یہ چیز عام نظر آئے گی۔ جھٹ شادی پٹ طلاق! ایک بیوی سے پیدا ہونے والی اولاد کی پرورش دوسری بیوی کرتی ہے۔ کہیں اوباما کی طرح باپ بیٹے کے ایک ہی نام کسی کا باپ فوت ہوگیا تو وہ چچا کا بیٹا بن گیا۔ اس کی ماں بھی چچا کی بیوی بن گئی۔ سوا فریقا آنے والے کسی نئے آدمی کو حیرت ضرور ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی دہریا ہے، کوئی اپنے قبیلے کی رسم کے مطابق کسی شجر کو پوجتا ہے یا کسی جانور کی پرستش کرتا ہے۔ کوئی کسی عیسائی پادری کے ہتھے چڑھ گیا تو وہ فوراً عیسائی بن گیا۔ پھر کچھ عرصے کے بعد دوبارہ دہریا بننے میں بھی دیر نہیں لگتی۔ کسی عرب یا آغا خانی کے پاس ملازمت کرنے سے وہ سنی، شیعہ یا اسماعیلی بن جاتا ہے۔ چھ ماہ بعد دوبارہ عیسائیت اختیار کر لیتا ہے۔ یعنی مختصر عرصے ہی میں حالات اور موڈ کے مطابق بیویاں اور مذہب بدلنا عام سی بات ہے۔

جس وقت اوباما سینئر پیدا ہوئے ان کے والد اون یانگو عیسائی تھے۔ ان کی بیوی حبیبہ مسلمان تھی۔ اون یانگو ایک یورپی کے ہاں باورچی کی حیثیت سے ملازم تھے۔ وہ اس کے ساتھ یورپ، انڈیا اور زینزیبار (زنجبار) میں بھی رہے۔ وہاں مسلمانوں کے ساتھ رہتے ہوئے وہ کیتھولک عیسائی سے مسلمان ہوگئے۔ ان کا بیٹا بارک حسین اوباما سینئر بچپن میں مسلمان تھے پھر دہریا (Atheist) بن گئے۔ وہ 1950ء سے 1953ء تک ماسینو شہر میں واقع عیسائیوں کے ایک بورڈنگ اسکول میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک افریقی قصبے سے تعلق رکھنے کے باوجود وہ ایک ذہین طالب علم تھے۔ ان کے اسکول کے پرانے ریکارڈ بک (رجسٹر) میں اس وقت کے ہیڈ ماسٹر کے ریمارک موجود ہیں جو بارک اوباما سینئر کے بارے میں ہیں۔

"He is very keen, Steady, Trustworthy and friendly. Concentrates, reliable and out going."

اس اسکول سے فارغ ہونے کے بعد جب وہ اٹھارہ برس کے تھے تو قبائلی رسم کے مطابق ''کیزیا آوکو'' نامی ایک خاندان کی لڑکی سے ان کی شادی کرائی گئی۔

اوباما سینئر کو 23 برس کی عمر میں امریکا کی ''یونیورسٹی آف ہوائی'' میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے اسکالرشپ ملی۔ وہ اپنے ایک بیٹے اور حاملہ بیوی کو کینیا میں چھوڑ کر امریکا پہنچ گئے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے مذہب اسلام کو بھی چھوڑ دیا اور دوبارہ دہریا کہلانے لگے۔ امریکا کی ریاست ہوائی کے شہر Maui میں ان کی ملاقات

امریکن لڑکی این ڈنہام سے ہوئی جو اُن کے ساتھ تعلیم حاصل کر رہی تھی۔

2 فروری 1961ء کو دونوں نے شادی کر لی۔ 4 اگست 1961ء کو ان کے ہاں اوباما جونیئر (امریکا کے موجودہ صدر) پیدا ہوئے۔ این کو معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کا شوہر پہلے ہی سے شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ ہے۔ اسے یہ معلومات بہت تاخیر سے حاصل ہوئی۔ بچے کی..... پیدائش کے بعد اس کی پرورش کی خاطر این نے اپنی تعلیم کو خیرباد کہا اور گھر میں رہنے لگی۔ اس نے اپنے شوہر کو تعلیم جاری رکھنے کا موقع دیا۔

ہاورڈ یونیورسٹی میں اوباما سینئر تھ نڈ سینڈ نامی ایک ٹیچر کے عشق میں مبتلا ہوگئے۔ اس طرح انہوں نے تیسری شادی کر لی۔ پھر تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ اسے اپنے ملک کینیا لے آئے۔ انہوں نے ہاورڈ یونیورسٹی سے اکنامکس میں ماسٹر کی ڈگری حاصل کی تھی۔ تیسری بیوی سے دو بچے ڈیوڈ اور مارک پیدا ہوئے۔ ڈیوڈ نوجوانی میں موٹر سائیکل کے ایک حادثے میں ہلاک ہوگیا تھا اور چھوٹا بیٹا مارک نیروبی میں رہتا ہے۔ اس کی تحریر کی ہوئی سوانح حیات نے خاص شہرت پائی ہے۔

اوباما سینئر کی یہ تیسری شادی بھی بمشکل دو تین سال تک قائم رہ سکی۔ بیوی نے شوہر پر تشدد کا الزام لگا کر طلاق حاصل کی تھی۔ اس کے بعد اوباما سینئر نے جائل (Jael) نامی کینیا کی ایک سیاہ فام خاتون سے چوتھی شادی کر لی۔ اس سے جارج اوباما پیدا ہوا۔

1965ء میں امریکا سے واپس آ کر اوباما سینئر کینیا کی وزارت ٹرانسپورٹ اور اس کے بعد وزارت خزانہ میں سینئر اکانومسٹ رہے۔ 1969ء میں کینیا کے سیاسی لیڈر ٹام مبویا کے قتل کے بعد اوباما سینئر کا زوال شروع ہوا۔ کینیا کے پہلے صدر جومو کینیاتا نے اوباما سینئر کے کرتوت کو مدنظر رکھتے ہوئے انہیں نہ صرف ملازمت سے برخاست کیا بلکہ کینیا میں بلیک لسٹ بھی کر دیا۔ ملازمت کے جانے کے بعد ان کا واحد مشغل شراب نوشی رہا۔ اس دوران میں ان کا ایک خطرناک روڈ ایکسیڈنٹ ہوگیا جس کے نتیجے میں انہیں تقریباً ایک سال اسپتال میں رہنا پڑا۔ اس کے بعد 1971ء میں جب وہ اپنے بیٹے (موجودہ امریکی صدر) سے ملنے ہوائی پہنچے تو ان کی ایک ٹانگ بیکار ہو چکی تھی۔ اس بات کا ذکر اوباما جونیئر یعنی آج کے امریکی صدر نے اپنی کتاب ''ڈریمس فرام مائی فادر'' کے صفحہ نمبر 64,71 اور 212,219 پر کیا ہے۔

اوباما سینئر کی باقی زندگی شراب اور غربت کی گرفت میں ایسی آئی کہ وہ اس سے نجات نہ پا سکے۔ ستم ظریفی یہ کہ ان کا ایک اور روڈ ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ اس میں ان کی دوسری ٹانگ بھی ضائع ہوگئی۔ اس کے بعد وہ مکمل محتاجی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوگئے۔ 1982ء میں ان کا تیسرا کار کریش ہوا جس میں وہ مارے گئے۔ اس وقت ان کی عمر 46 برس تھی۔ انہیں ان کے آبائی قصبے نیانگوما میں دفنایا گیا۔

اب اوباما جونیئر، امریکا کے چوالیسویں صدر کی والدہ این کا احوال..... ان کی اور اوباما سینئر کی ملاقات امریکا کی ریاست ہوائی کی یونیورسٹی میں ہوئی تھی۔ ان دونوں کی شادی اور پھر جلد ہی طلاق ہوگئی۔ اس کے بعد این ڈنہام نے امریکا میں زیر تعلیم ایک غیر ملکی طالب علم لولو سوئیتورو کے ساتھ دوسری شادی کر لی۔ اس کا تعلق انڈونیشیا سے تھا۔ 1967ء میں انڈونیشیا کا فوجی لیڈر سوہارتو اقتدار میں آیا تو اس نے ولایت میں زیر تعلیم تمام طلبا کو اپنے وطن لوٹنے کا حکم جاری کر دیا۔ لولو سوئیتورو اپنی بیوی این کے ساتھ جکارتا کے علاقے مینٹینگ میں آ کر آباد ہوا۔ ان کے ساتھ اوباما جونیئر یعنی این کے پہلے شوہر سے ہونے والا بیٹا بھی تھا۔ اس وقت اوباما کی عمر چھ برس تھی۔ وہ دس سال کی عمر تک جکارتا کے بیسو کی پبلک اسکول اور سینٹ فرانسز اسکول سے تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اوباما 1971ء میں اپنے نانا کے پاس ہوائی میں رہنے لگے۔ یہ وہ سال تھا جب ان کے سگے والد پہلی مرتبہ ان سے ملنے ہوائی آئے تھے۔

صدر اوباما اپنے بچپن کی یادداشتوں میں اپنے والد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ اپنے نانا کے ساتھ ہونولولو کے جس محلے میں رہتے تھے، وہاں دور دور تک انہیں اپنے والد جیسا سیاہ فام نظر نہیں آتا تھا۔ وہ مزید لکھتے ہیں۔

"My father was black as pitch, my mother was as milk."

اوباما کی والدہ ان سے ملنے کے لیے ہونولولو آتی رہیں لیکن وہ ملازمت جکارتا میں کرتی تھیں۔ انہوں نے یونیورسٹی آف ہوائی سے انتھراپولوجی میں پی ایچ ڈی کیا تھا اور فورڈ فاؤنڈیشن کی جانب سے جکارتا میں کام کرتی تھیں۔ آخری ایام میں وہ کینسر کا شکار ہوگئیں اور ہونولولو لوٹ آئیں جہاں 1995ء میں ان انتقال ہوگیا۔ ان کی

www.pdfbooksfree.pk

پیدائش کا سال 1942ء ہے۔

اوباما چند برس ہوائی میں گزارنے کے بعد مزید تعلیم کے لیے 1979ء میں لاس اینجلس چلے گئے۔ دو سال کے بعد 1981ء میں انہوں نے کولمبیا یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ یہ وہ یونیورسٹی ہے، جس کا احوال میں اپنے ستر کی دہائی والے سفرنامے میں تحریر کر چکا ہوں کہ وہاں حیدر آباد سندھ کے عبدالرزاق شیخ کی ''شالا مار'' نامی ایک کپڑوں اور آرٹیفشل زیورات کی دکان تھی۔ وہاں کولمبیا یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹس کا ہر وقت رش لگا رہتا تھا۔ ہمارا جہاز جب بھی نیویارک کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوتا تو عبدالرزاق شیخ کی دکان ہمارے لیے گویا ایک قسم کی بیٹھک یا اوطاق بن جاتی تھی۔ یعنی وہ ہمارے ہم وطن لوگوں کی Meeting Place تھی۔

وہاں شالا مار دکان چلانے والے سلیم شیخ، آپا پروین، سپریم کورٹ کے وکیل عبداللطیف انصاری جیسے لوگ ہر وقت نظر آتے تھے۔ ان کے علاوہ ٹنڈو قیصر کے نور احمد نظامانی، جھڈو کے میر مبارک تالپور اور پیر پگارا کے کزن پیر فضل الحق شاہ بھی وہیں قریب ہی رہتے تھے۔ ممکن ہے اوباما بھی آتے ہوں ...... لیکن ہمارے دوستوں میں سے کسے خبر تھی کہ یہ اسٹوڈنٹ آیندہ چل کر اس ملک کے صدر بنیں گے۔ اگر انسان مستقبل کے بارے جان سکتا تو ان کے سگے والد ایسے بیٹے کو خود سے الگ کیوں کرتے۔ باپ نے تو بیٹے کی پیدائش کے وقت اس کی صورت دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی کہ اس کے نقش کس سے ملتے ہیں۔ حالانکہ وہ اسی شہر ہونولولو ہی میں رہتے تھے۔ پھر جب ان کی ٹانگ ٹوٹی، ملازمت بھی چلی گئی اور دارو کے لیے بھی رقم باقی نہ رہی تو ایسے میں انہیں اپنا بیٹا یاد آیا تھا اور وہ نہ جانے کس طرح کرائے کا انتظام کر کے بیٹے سے ملنے نیروبی سے ہوائی پہنچے تھے۔

☆☆☆

محاورے اور کہاوتیں سننے اور انہیں محفوظ کرنے کا شوق مجھے بچپن ہی سے رہا ہے۔ محاوروں کی ایک انگریزی کتاب Proverbs of Far East اور ایک سندھی کتاب ''روٹھی ہے دولہا سے'' تقریباً بیس سال پہلے شائع ہو چکی ہے۔ اول الذکر کتاب یعنی ''مشرق بعید کے محاورے'' میں، میں نے چین، جاپان اور ملائیشیا کے محاورے اور کہاوتیں شامل کی ہیں۔ مجھے ان ملکوں میں سب سے زیادہ رہنے کا موقع ملا۔ دوسری کتاب میں سندھی اور اردو محاورے شامل ہیں۔

کہاوت، ضرب المثل اور محاوروں سے نہ صرف عقل و دانائی کی باتیں معلوم ہوتی ہیں بلکہ کسی بھی ملک میں رائج محاوروں سے وہاں کی قوم، کلچر، سوچ اور حالات کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

''تو گدھی کمہار کی، تجھے رام سے کیا کام۔'' اور ''نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی۔'' جیسے محاورے ہند سندھ کے تو ہو سکتے ہیں، سویڈن، سعودی عرب کے ہرگز نہیں۔ ممکن ہے ''آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا'' جیسی مثل دیگر ملکوں میں بھی پائی جاتی ہوں لیکن ''لیتر کے گھر تیتر، باہر باندھوں کہ بھیتر'' صرف ہمارے برصغیر کے ملکوں ہی میں ہو سکتی ہے۔

اسی طرح یہاں افریقا میں بھی گفتگو کے دوران عام طور پر جو محاورے، کہاوتیں اور ضرب المثل بیان کیے جاتے ہیں، ان میں کئی ایسے ہیں جو نہ صرف ہمارے ملکوں بلکہ مشرقی بعید کے ممالک اور یورپ میں بھی الفاظ کے معمولی سے ردّو بدل کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔ کچھ محاورے ایسے بھی ہیں جن کا تعلق صرف افریقا کے ملکوں اور وہاں کے کلچر سے ہے۔ مثلاً، ہمارے ہاں اور یورپ میں کئی محاورے اور کہاوتیں .... عورت کے خلاف ضرور ہیں...... اس کا یہی ایک سبب ہو سکتا ہے کہ ان محاوروں کو گھڑنے والے مرد حضرات ہیں۔ لیکن جاپان میں اس قسم کے محاورے حد سے زیادہ ہیں۔ کیونکہ وہاں کی عورت زیادہ تر مرد کے زیر اثر ہے۔

ایک جاپانی محاورہ ہے۔ ''سانپ سے زیادہ عورت سے بچنا چاہیے۔''

جاپانیوں کے لیے بدبختی کی علامت بھی عورت اور بیوقوف و خطرناک چیز بھی عورت ہے۔ جس طرح ہمارے ہاں عورت کے حوالے سے ایک عام کہاوت ہے کہ ''عورت کی عقل ایڑی میں ہوتی ہے...... وہ بھی چلنے کے دوران گر جاتی ہے۔'' ظاہر ہے اس میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس بات کے لیے کون سی سائنسی اور عقلی دلیل ہے جو اسے تسلیم کیا جائے؟ بس، اس کا ایک ہی سبب ہے! وہ یہ کہ ہماری سوسائٹی Male Dominated ہے۔

اس کے علاوہ اس قسم کے محاورے اور کہاوتیں تخلیق کرنے، انہیں لکھنے اور شائع کرنے والے مرد ہی ہیں۔ اس حوالے سے جاپانی سوسائٹی ہم سے زیادہ ''مردانہ قوت'' کی حامل ہے۔ وہاں عورت کی زیادہ تذلیل کی جاتی ہے۔ کہتے ہیں۔ ''شادی کے پہلے ہی دن بیوی کو درست کر دینا چاہیے۔'' اور ''گھر کو صاف رکھنے والی بیویاں دوزخ سے

بچ سکتی ہیں۔''

دیکھا آپ نے! یعنی وہ دوزخ سے بچ سکتی ہے۔ یہ نہیں کہا جاتا کہ وہ جنت میں جا سکتی ہے۔ شاید جنت میں صرف جاپانی مرد جائیں گے، جو شراب پیتے ہیں، داشتائیں رکھتے ہیں اور ہر قسم کی بے اعتدالیوں میں مشغول رہتے ہیں۔ ایک اور کہاوت ہے ''وہ عورت وفادار جو دیر تک جاگ کر شوہر کا انتظار کرے......'' ایک اور جاپانی محاورہ یاد آ رہا ہے۔ ''عورت پر ہرگز بھروسا نہ کیا جائے، خواہ اس نے سات بیٹے جن کر دیے ہوں۔'' وغیرہ وغیرہ۔

یہی حال یہاں کے افریقی معاشرے کا ہے! افریقا کا ایسا کون سا ملک ہے جہاں عورت کے خلاف محاورے اور کہاوتیں مشہور نہ ہوں۔ کئی محاورے محض عورت کی تذلیل کے لیے تخلیق کیے گئے ہیں۔ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اب جا کر کچھ سدھار پیدا ہوا ہے۔ کیونکہ نوع بنوع ایجادات نے دنیا کو ایک گلوبل ویلیج کی صورت دے دی ہے۔ کچھ تعلیم نے بھی مثبت اثر پیدا کیا ہے۔ جبکہ ستر کی دہائی اور اس سے پہلے کے برسوں میں جب ہمارا جہاز افریقا کے مشرقی اور مغربی کنارے کی بندرگاہوں میں پہنچتا تھا تو یہاں عورتوں کی حالت دیکھ کر ہمیں اپنے ملک، خاص طور پر سندھ اور بلوچستان کے نظارے یاد آ جاتے تھے۔ افریقا میں عورت کی قدر ایک جانور گدھے اور خچر سے بھی کم نظر آتی تھی۔ اس سلسلے میں بطور طنز میں کہیں لکھ چکا ہوں کہ جب ایک افریقی مرد سے پوچھا گیا۔ ''آپ لوگ اپنی عورتوں سے اتنے بھاری گھاس کے گٹھے اور تین تین پانی کے مٹکے اٹھواتے ہیں۔ کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ آپ ایک ریڑھا رکھ لیں۔ جس پر یہ وزن آسانی سے لے جایا جا سکتا ہے۔''

افریقی کو یہ مشورہ ''وارے'' میں نہ آیا۔ اس نے گویا دلیل دیتے ہوئے جواب دیا۔ ''ریڑھے میں کبھی پہیا خراب ہو جاتا ہے اور کبھی اس کا بیرنگ ٹوٹ جاتا ہے......'' یعنی اس میں خرچ ہی خرچ تھا۔

افریقی مرد جسمانی طاقت اور اخلاق کے حوالے سے خود کو برتر سمجھتے ہیں۔ ان کی نظر میں عورت کی حیثیت جھاڑو اور ٹوٹی ہوئی چپل سے زیادہ نہیں ہے۔ یہاں کی ایک مشہور کہاوت ہے۔ ''عورت، مرد نہیں ہو سکتی۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ مرد خواہ کاہل، سست، غبی، بداخلاق اور کمینہ ہو لیکن اس کے باوجود وہ ایک ایسی مخلوق ہے جس کی برابری عورت ہرگز نہیں کر سکتی۔

مجھے جاپانی یاد آتے ہیں...... ایک عام ٹورسٹ کو شاید محسوس نہ ہوتا ہو۔ لیکن جو شخص میری طرح زیادہ عرصہ جاپانیوں کے ساتھ رہا ہو۔ تو اس سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ جاپانی عورت کی اس کے معاشرے میں، خاص طور پر نصف صدی پہلے تک کیا حالت رہی ہے۔ اس قدر کہ 1950ء تک جاپانی عورت کو قدرتی چشموں کے پانی میں نہانے کی اجازت نہیں تھی۔ اسے اس حد تک منحوس سمجھا جاتا تھا کہ وہ فیوجی پہاڑ جا کر نہیں دیکھ سکتی تھی۔ بہرحال افریقا کے یہ سیاہ فام ان سے بھی چار ہاتھ آگے ہیں۔ اس بات کا احساس ان کے محاوروں ہی سے ہوتا ہے۔ کہتے ہیں۔

''ایسی عورت سے شادی ہرگز نہ کی جائے جس کے پاؤں آپ سے بڑے ہوں۔''

اسی قسم کے چند دیگر محاورے یہاں تحریر کرتا ہوں۔

☆ عورتوں کو منہ (ذہن) نہیں ہوتا۔

☆ داڑھی والا منہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ (یعنی مرد ہی راست گو ہیں۔ ظاہر ہے کسی عورت کی داڑھی نہیں ہوتی)

افریقا میں کئی مرد ایک سے زیادہ بیویاں رکھتے ہیں یا ایک کو چھوڑ کر دوسری شادی کر لیتے ہیں۔ اپنے اس فعل کو درست ثابت کرنے کے لیے کہ کوئی انہیں اس سلسلے میں ٹوکنے کی کوشش نہ کرے... اس کے لیے بھی انہوں نے کئی محاورے تخلیق کر لیے ہیں۔ مثلاً:

☆ ایک بیوی ایک آنکھ کے برابر ہے۔ (یعنی بہتر زندگی کے لیے، بہتر دیکھنے کے لیے ایک سے زیادہ بیویوں کا ہونا ضروری ہے)

☆ ایک بیوی والا صرف ان کا سردار ہو سکتا ہے جو غیر شادی شدہ ہوں۔

☆ خراب بیوی کو سزا دینے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ نئی بیوی لائی جائے۔

☆ جس شخص کی صرف ایک بیوی ہو، اگر وہ بیمار پڑ جائے تو شوہر کمزور ہو جاتا ہے۔ (یعنی ہر مرد کے لیے دو تین بیویاں رکھنا ضروری ہے۔ تاکہ اگر ایک بیمار پڑ جائے تو دوسری، مرد کی خدمت اور اس کے لیے کھانے وغیرہ کا بندوبست کرے)

☆ بغیر مرد کے عورت اس زمین کی طرح ہے جس میں بیج نہ ہو۔

عورت کی پٹائی کرنا... اور اپنے اس فعل کو Justyfy کرنے کے لیے بھی محاورے ہیں۔

☆ اگر آپ اپنی بیوی سے واقعی پیار کرتے ہیں تو

www.pdfbooksfree.pk

اس کی پٹائی بھی کرتے رہیں۔

☆سرکش بیوی جوتوں ہی سے کنٹرول میں رہتی ہے۔

☆خوبصورت بیوی گھر میں بیماریاں لاتی ہے۔

☆ کاہل عورت کام کے سیزن میں حاملہ ہوجاتی ہے۔(یعنی پھٹی کی چُنائی اوراناج کی کٹائی کے دنوں میں وہ ''بے کار'' ہوجاتی ہے)

بہرحال یہاں عورتوں کے خلاف محاوروں کو چھوڑکردیگر افریقی محاورے دیکھتے ہیں۔

☆بِھڑ، بِھڑ کوڈنک نہیں مارتی۔(انسان ہی انسان کو نقصان پہنچاسکتا ہے)

☆ڈوبنے والے جہاز کوکیپٹن کی کیاضرورت۔

☆ٹیڑھی میڑھی ٹانگوں والے کوزرافہ کاشکار کرنے کے لیےنہیں نکلنا چاہیے۔

☆ آپ کے سر پرخواہ کتنی ہی بارش ہوتی رہے، پھر بھی آپ اپنے سر پر کیلا کاشت نہیں کر سکتے۔

☆پیری میں غریب ہونے سے بہتر ہے کہ جوانی میں رہاجائے۔

☆نواوردس میں کوئی خاص فرق نہیں ہے (یہ ایسی مثال ہے، جس طرح ہمارے ہاں معمولی فرق بیان کرنے کے لیے انیس بیس کافرق بتاتے ہیں)

☆ایک انگلی سے جُوں مارنا محال ہے (جس طرح ہمارے ہاں کہاجاتا ہے کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی، جوں کوبھی دوناخنوں کے درمیان ہی کچل کر مارا جاسکتا ہے)

☆مرغیوں کی بددعا سے عقاب پریشان نہیں ہوتے (اسی قسم کا محاورہ ہمارے ہاں بھی موجود ہے۔''کوؤں کے کوسنے سے ڈھور نہیں مرا کرتے)

☆ جوشخص سانڈ کے سینگ کی چوٹ کھاچکا ہو، وہ کالے رنگ کی گائے سے بھی ڈرتا ہے (ہمارے ہاں بھی ایسا ہی محاورہ ہے۔دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک کر پیتا ہے)

☆جس کورٹ کے جج باز ہوں، وہاں سے چڑیا کس طرح باعزت بری ہوسکتی ہے۔

آخر میں عورت کے بارے میں چند مزید افریقی محاورے۔

☆عورت اورآسمان کوآج تک کوئی سمجھ نہیں سکا۔

☆عورت مکئی کا بُھٹا نہیں ہے کہ اسے شناخت کرنے کے لیے محض اس کاغلاف (چھلکا) اتارنا کافی ہو۔

عورت سائے کی طرح ہے۔اس کے پیچھے جائیں تو وہ آگے بڑھتی رہے گی۔اسے چھوڑ کر پلٹ جایئے تو آپ کے پیچھے پیچھے آئے گی۔

☆خالی گھر سے بہتر ہے کہ خراب عورت قبول کرلی جائے۔

☆عورت کمبل کی طرح ہے، جسے اوڑھنے سے گرمی اورچھوڑنے سے سردی محسوس ہوتی ہے۔

☆اگرآپ بچے کے لیے بے چین ہیں توکسی حاملہ عورت سے شادی کریں۔

☆ جھگڑالو بیوی سے بہتر ہے کہ سورج کی گرمی میں سویاجائے۔

☆عورت ہرخرابی کی جڑ ہے۔ہمیں ہماری روح اس کے شر سے بچاسکتی ہے۔

☆☆☆

آج کے دور میں یورپ اورامریکا کے ساتھ افریقا بھی کئی معاملات میں ماڈرن ہوگیا ہے۔جہاں آپ کوجاپانی اورجرمن کاریں نظرآتی ہیں، کمپیوٹراورٹی وی چینل نظرآتے ہیں۔افریقا کے ہرملک میں گوکہ پڑھے لکھے لوگ نظرآتے ہیں لیکن مجموعی طور پر پورا افریقا،گھوٹکی اور جیکب آباد کا منظرپیش کرتا ہے۔دیکھا جائے توان تمام ملکوں میں کینیا خاصی بہترحالت میں ہے۔

افریقا کے شمالی ملک مصر' لیبیا، ٹیونیشیا، الجیریا اور موراکو میڈیٹرینین سمندر کے ملک کہلاتے ہیں۔یورپ کے قریب ہونے، تیل اورٹورازم کے سبب امیر ملک ہیں۔ان کے علاوہ سحارا صحرا کے زیریں حصے والا پورا افریقا آج بھی بدحالی کا شکار ہے۔براعظم افریقا کے انتہائی زیریں حصے میں واقع ملک ''ساؤتھ افریقا'' کو ہم ان میں شامل نہیں کرتے۔کیونکہ یہ ملک آج بھی گوروں کے ہاتھ میں ہےاور دوسرا انگلینڈ کہلاتا ہے دیگر ملک...... اینگولا، نمبیا، زیمبیا، ملاوی، برنڈی، راونڈا، چاڈ، برکانوفاسو......سب کے سب کرپشن، لاقانونیت اور بدامنی کا شکار ہیں۔یہ ناسور ہمارے ہاں، ایشیا کے ملکوں میں بھی ہیں۔لیکن بعض ملک یعنی جاپان، ملائیشیا، سنگاپور، کویت، سعودی عرب وغیرہ یورپ کے ملکوں کی برابری کرتے ہیں۔کوریا، فلپائن، تھائی لینڈ، دبئی، ایران اورانڈیا جیسے ملک انہیں فالو کرتے ہیں۔

ہم یہاں صرف کینیا اور براعظم افریقا کے مشرقی کنارے کے ملکوں کی بات کررہے ہیں۔یہاں صدیوں سے انڈیا، ایران اورعرب ملکوں کی تجارت ہوتی رہی ہے۔

وہاں تجارت اور ملازمت کی غرض سے ہمارے ملکوں کے لوگ جاتے رہے ہیں۔وہاں سے لونگ، چائے اورسیاہ فام غلام ہمارے ہاں پہنچتے تھے۔ان ملکوں کی زبان اور کلچر کا ایک دوسرے پراثر رہا ہے۔

براعظم افریقا کے مشرقی کنارے پرطائرانہ نظر ڈالی جائے تو یہ اتھوپیا اورسومالیہ سے شروع ہوتا ہے۔اتھوپیا، جسے کسی زمانے میں ''ابیسینیا'' بھی کہا جاتا تھا اورعربی زبان میں ''حبش'' کہلاتا تھا۔جس طرح زینز یبار کو''زنجبار'' کہا جاتا تھا۔عرب آج بھی اس ملک کواسی نام سے یاد کرتے ہیں۔اتھوپیا دراصل بحرِاحمر کا ملک ہے۔سرخ سمندر یعنی بحرِاحمر کے ایک طرف سعودی عرب ہے اور دوسری جانب اتھوپیا(حبش) واقع ہے۔حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مقدسہ میں حبش امیر کبیر ملک تھا۔اس کے بادشاہ کی سلطنت یمن تک پھیلی ہوئی تھی۔مکہ کے مسلمان کشتیوں کے ذریعے ہجرت کرکے حبش پہنچے تھے۔حضرت بلال رضی اللہ عنہ کاتعلق اسی ملک سے تھا۔

عربوں کا زیادہ واسطہ حبش کے لوگوں سے رہاجواس زمانے میں ''حبشی'' کہلاتے تھے۔بعد میں جب سوڈان، کینیا، تنزانیا اورافریقا کے دیگرملکوں کے سیاہ فام پہنچے تو وہ بھی حبشی کہلانے لگے۔کیونکہ وہ تمام لوگ حبش سے ہوتے ہوئے سعودی عرب پہنچتے تھے۔جس طرح ملایا(آج کا ملائشیا) میں زمانہ قدیم میں ہرغیرملکی شخص بنگال کے کنارے سے ہوتا ہوا پہنچتا تھا اورانہیں بنگالی کہا جاتا تھا۔پرتگالی بھی خلیج بنگال کے کنارے سے ہوتے ہوئے ملایا پہنچے تھے۔ملئی لوگ انہیں بھی بنگالی کہتے تھے۔لیکن چونکہ وہ گورے تھے اس لیے انہیں ''سفید بنگالی(پوتیج بنگالی) کہا گیا۔سو اسی طرح ہمارے ہاں بھی ہرسیاہ فام افریقی کے لیے لفظ''حبشی''استعمال ہوتا ہے۔

بہرحال آج اس ملک حبش (ایتھوپیا) کی حالت سب سے خراب ہے۔سومالیہ انگریزوں کے راج میں خاصا بہتر اور امیر ملک تھا۔لیکن اب سومالیہ میں بھی سخت بدامنی ہے۔یمن کی طرح یہاں بھی جگہ جگہ اغوا کے واقعات پیش آتے ہیں۔اس سے نیچے، ملاوی، موزمبیق، سوازی لینڈ میں بھی یہی حال ہے۔ان میں یوگنڈا، تنزانیا اور کینیا کو قدرے بہتر قرار دیا جاسکتا ہے۔کیونکہ یہاں انگریزوں کا راج رہا ہے۔یہ تینوں ملک وکٹوریا جھیل کے گرد واقع ہیں۔یہ علاقہ انگریزوں کے دور میں''ایسٹ افریقا'' کہلاتا تھا اور پورا علاقہ سلجھا ہوا سمجھا جاتا تھا۔یوگنڈا کا ستیاناس عیدی امین نے کیا۔تنزانیا کی حالت بھی مقامی سیاستدانوں کے ہاتھوں خراب ہوئی......ان میں صرف کینیا ایسا ملک ہے جو کسی حد تک محفوظ ہے۔یورپین اورامریکن کوافریقا گھومنے کا شوق چراتا ہےتو وہ کینیا کارخ کرتے ہیں۔پھر وہاں سے اِکادُکا فارنر قریبی افریقی ملک بھی چلا جاتا ہے۔

نیروبی اورممباسا، کینیا کے مشہور شہر ہیں۔ان شہروں میں ٹورسٹ کی کثیر تعداد نظرآتی ہے۔نیروبی کی حیثیت اسلام آباد جیسی ہے، یعنی اسے آباد ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔یہ فرق ضرور ہے کہ اسلام آباد کی عمر نصف صدی ہے اور نیروبی کوآباد ہوئے ایک صدی ہوچکی ہے لیکن اس کے مقابلے میں کینیا کے شہر ممباسا اوراس کی بندرگاہ کی حیثیت ہمارے ٹھٹھہ جیسی ہے۔پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے سے بھی صدیوں پہلے ٹھٹھہ موجود تھا۔اسی طرح کینیا کی سرحدوں کے وجود میں آنے اوراس ملک پر یہ نام پڑنے سے صدیوں پہلے ممباسا تھا۔جہاں عربستان، ایران (جو اس زمانے میں ''پرشیا'' کہلاتا تھا) اورانڈیا کے سوداگر چوماسی کی ہواؤں سے فائدہ اٹھا کراپنی کشتیوں کے ذریعے ممباسا پہنچتے تھے۔

ممباسا آج کینیا کا دوسرا بڑا شہر ہے جبکہ صدیوں تک یہ شہر پورے مشرقی افریقا میں دولت، امارت، تجارت، سیاحت اور خوشحالی میں اول نمبر پر رہا ہے۔اس کا موازنہ زینز یبار اور دارالسلام جیسی بندرگاہوں سے کیا جاتا تھا۔بعد میں، بہت بعد میں یوگنڈا کا شہر کمپالا مشہور ہوا۔پھر جب یہاں انگریزوں کا راج قائم ہوا اورانگریز کمپالا کو ریل کے ذریعے ممباسا سے ملانے لگے تو اس وقت یعنی سن 1900ء میں آج کے شہر نیروبی کے مقام پر ریلوے ڈپو، دوتین گودام اور مزدور، افسروں کے لیے چند کوارٹر بنوائے گئے تھے۔یہ گویا مستقبل کے نیروبی کی بنیاد تھی۔موافق اور بہتر آب و ہوا، میٹھے پانی اور ریلوے اسٹیشن کی موجودگی میں یہ شہر ایک سوسال کے اندر جنوبی افریقا کا بہترین اور ماڈرن شہر بن گیا۔ملک کا دارالحکومت ہونے کے علاوہ بین الاقوامی ائرپورٹ بھی اسی شہر (نیروبی) میں ہے۔

اس کے باوجود ممباسا کی حیثیت آج بھی اہم ہے۔کیونکہ ممباسا کو آج بھی نہ صرف کینیا بلکہ اردگرد کے ملکوں میں بڑی بندرگاہ کی وجہ سے اہم تسلیم کیا جاتا ہے۔یوگنڈا جیسے ملکوں کا سامان بھی ممباسا کے راستے پہنچتا ہے کیونکہ افغانستان کی طرح یوگنڈا کی بھی اپنی بندرگاہ نہیں ہے۔

www.pdfbooksfree.pk

1968ء اور 1973ء کے دوران میرا اس بندرگاہ اور مشرقی افریقا کی دیگر بندرگاہوں، زنجبار، دارالسلام، لارینزو مارکس (موجودہ نام موپوتو) بیرا وغیرہ میں اکثر آنا رہا ہے۔ ان ایام میں سوئز کینال بند تھی، اس لیے مجھے جس جہاز پر بھی تعینات کیا گیا، وہ یہاں سے ضرور گزرتا تھا۔ کارگو نہ ہونے کے باوجود ہمیں جہاز کے ایندھن اور عملے کے راشن کے حصول کے لیے ممباسا میں ایک دو دن ٹھہرنا پڑتا تھا۔ ممباسا میں انڈین اور مسلمان دکانداروں کی موجودگی کے سبب ہمیں ہر چیز، یعنی مرچ مسالے، حلال گوشت وغیرہ مل جاتا تھا۔ جہاز کی مرمت کے لیے پورے افریقا میں ایسا کوئی انتظام نہ تھا جیسا جاپان اور یورپ کی بندرگاہوں میں نظر آتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ممباسا کو غنیمت سمجھا جاتا تھا۔ معمولی مرمت کے لیے بھی ہمیں ہفتہ، دس دن ٹھہرنا پڑ جاتا تھا لیکن کام ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد سمندر میں دس پندرہ دن کا سفر کر کے ہم یورپ یا امریکا کی کسی بندرگاہ میں پہنچ جاتے تھے۔

جب ہم جاپان، چین یا یورپ کی بندرگاہوں سے ہوتے ہوئے ممباسا پہنچتے تو ہمیں عجیب احساس ہوتا تھا۔ خاص طور پر آبادی کے خیال سے! اُدھر لوگوں کا ہجوم، گاڑیوں، موٹروں کا شور..... اور یہاں ممباسا میں خاموشی اور سبزہ ہی سبزہ! لوگ، چرند پرند گویا ہر شے فرصت میں نظر آتی۔ دوپہر کے وقت دنیا کے دوسرے ملکوں میں رش اور بھیڑ بھاڑ نظر آتی تھی..... اس کے مقابلے میں ممباسا میں ایک طرح کا سکوت، خاموشی اور سکون! ان ایام میں انگریزوں کے راج سے یہ دستور چلا آرہا تھا کہ دوپہر کے ڈھائی گھنٹے چھٹی ہوتی تھی۔ تاکہ ہر شخص کچھ دیر آرام کر کے اور دن کی گرمی گزار کر کام کا آغاز کرے۔ ہمارے ہاں سندھ میں بھی انگریزوں کا یہ دستور کافی عرصے تک جاری رہا۔ ہمارے زمانے میں پرائمری اسکول دو شفٹوں میں ہوتا تھا۔

آدم شماری کے لحاظ سے ممباسا آج بھی ویسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ آج کل حیدر آباد جتنے بڑے اس شہر کی آبادی آٹھ لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ 1970ء میں اس سے نصف بتائی جاتی تھی۔ سنگاپور اور کوالالمپور کی طرح یہاں ممباسا میں بھی کافی تبدیلی آچکی ہے۔ اس سے پہلے کلنڈنی روڈ (اب یہ سابق صدر کے نام سے حوئی ایونیو کہلاتا ہے) کی دکانیں ایسی انگریزی اسٹائل کی تھیں جیسی کوالالمپور میں باتو روڈ (یہ اب جالان تنکو عبدالرحمان روڈ کہلاتا ہے) اور سنگاپور کی ہائی اسٹریٹ پر واقع تھیں۔ کشادہ، بلند چھت والی ہوادار دکانیں، ان کے آگے چھت والا برآمدہ، اس کے بعد فٹ پاتھ اور پھر گاڑیوں کے چلنے کے لیے سڑک ہوتی تھی۔ ان تینوں شہروں کی دکانوں کے سامنے ان کے سندھی ہندو، گجراتی اور پارسی سیٹھ سفید کوٹ اور ٹوپی پہنے واک کرتے ہوئے آج بھی میرے تصور میں تیر آتے ہیں۔

1960ء سے پہلے تک صدر کراچی کی دکانوں کا بھی یہی حال تھا۔ پھر آبادی میں اضافے، لاریوں، موٹروں اور سیاحوں کی کثرت نے ان سکون کے دنوں کا خاتمہ کر دیا۔ لیکن اسّی کی دہائی کے ابتدائی سالوں تک اس قسم کی دکانیں ویسٹ انڈیز (جنوبی امریکا) کی اطراف برمودہ، ٹرینڈاڈ اور کیوبا میں ضرور موجود تھیں۔ اب وہاں بھی ختم ہوتی جارہی ہیں۔ زمین کی قیمت اس قدر بڑھ چکی ہے کہ بعض شہروں میں ایک فٹ زمین کی قیمت ایک لاکھ روپے تک پہنچ گئی ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ ممبئی، جو انگریزوں کے دور میں بامبے اور بمبئی کہلاتا تھا..... وہاں کے علاقے فورٹ میں آج بھی اس قسم کی کئی دکانیں موجود ہیں۔

اگر آپ کراچی میں اس دور کی یہ دکان دیکھنا چاہتے ہیں تو صدر کے اس علاقے میں چلے جائیے جہاں فوٹو گرافرز، گھڑیوں اور کیمرے کی دکانیں ہیں۔ وہاں پرٹن بیکری نامی ایک تقریباً سو سال پرانی دکان، اسی شکل میں آج بھی موجود ہے۔ یہ دکان ایرانیوں کی ہے۔ ان کی تیار کی جانے والی ڈبل روٹی، پاپے، پیٹیز اور کیک کا ذائقہ اب بھی وہی ہے۔ تقریباً 50 سال سے تو میں ہی دیکھتا چلا آرہا ہوں۔ میں نے 1960ء میں دکان کے مالکوں کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا تو اس وقت وہ بھی میری طرح نوجوان تھے۔ اب میری طرح وہ بھی بوڑھے ہو چکے ہوں گے۔

اگر آپ کا گزر اس دکان کے سامنے سے ہو تو میں مشورہ دوں گا کہ آپ اس کے اندر تک چلے جائیں۔ جہاں کام کرنے والے آٹا گوندتے اور بھٹی میں ڈبل روٹی، بسکٹ وغیرہ تیار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ دکان اتنی بڑی اور کشادہ ہے کہ اس میں سے اردگرد بنی ہوئی دکانوں جیسی کم از کم بارہ تیرہ دکانیں بن سکتی ہیں۔ سو اس قسم کی قدیم دکانیں اور حیدر آباد کی بمبئی بیکری جیسے شاپ ہاؤس ملائیشیا کے کئی شہروں میں کہیں کہیں آج بھی موجود ہیں۔ جہاں سے انگریز راج میں یورپین اور انگریز خریداری کرتے تھے۔

سحر و ساحری

امجد اوسلو

جادو ٹونے کی شروعات نہ جانے کب ہوئی، کس نے تعلیم دی مگر یہ علم دنیا کے ہر خطے میں مروج ہے۔ ایسا کوئی ملک نہیں جہاں فسوں گری نہ ہوتی ہو۔ زمانۂ قدیم میں تو جادوگر ساحری قوت سے ملک و تاج تک حاصل کرلیتے تھے۔ آج، ترقی یافتہ ملک میں بھی جادو ٹونے کا رواج ہے۔ کس ملک میں کس قسم کی ساحری مروج ہے، اسی کا خلاصہ۔

جادو ٹونے پر ایک مختصر سی مگر جامع تحریر

جادو ایک ایسا موضوع ہے جس نے زمانۂ قدیم سے انسان کو اپنی طرف متوجہ کر رکھا ہے۔

جادو یا سحر فریفتہ کرنے کے معنی میں بھی آیا ہے۔ شرع میں سحر حرام ہے لیکن بعض کہتے ہیں کہ اگر اپنے آپ کو سحر یا جادو کے اثر سے بچانے کے لیے سیکھا جائے تو حرام نہیں ہے۔

سحر کے اثر میں اختلاف ہے۔ اکثر علما فرماتے ہیں کہ سحر میں اثر ہے جیسا کہ نظر میں ہے اور صدہا لوگوں نے اس کا مشاہدہ بھی کیا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ سحر کا فی نفسہ تو کوئی اثر نہیں نہ عقل سلیم اس کو تسلیم کرسکتی ہے البتہ قوت واہمہ میں ایک اثر ضرور پیدا ہوتا ہے۔

ہم اس مضمون میں جادو کے اثر انگیز ہونے یا نہ ہونے کا جائزہ نہیں لے رہے اور نہ ہی آپ کو یہ بتانے کی کوشش کررہے ہیں کہ جادو حرام ہے یا نہیں۔ بلکہ اس مضمون میں یہ جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے کہ دنیا کے مختلف ممالک اور مختلف قبائل میں جادو کی رسومات کیا کیا ہوتی ہیں؟

جادو کن کن مسائل کے لیے بروئے کار لاتے ہیں۔

ہم یہاں آپ کو جادو کی دو اقسام کے بارے میں ضرور بتانا چاہیں گے، انہیں آپ جادو کے دو مکتبہ فکر سمجھ لیں۔

1۔ ہومیوپیتھک یا بالمثل جادو
HomeoPathic Magic

2۔ متعدی جادو۔
Contact or Coniagius Magic

بالمثل جادو میں دشمن کا پتلا بنا کر اس کے پتلے کو نقصان پہنچا کر دشمن کو برباد کیا جاتا ہے جبکہ متعدی جادو میں دشمن کے لباس یا اس کے جسم کو چھونے والی اشیا پر جادو کر کے دشمن کو نقصان پہنچایا جاتا ہے۔

یہ دونوں ہی بہت ہولناک اور خطرناک ہیں۔ مثال کے طور پر آپ کسی کے اُترے ہوئے کپڑے حاصل کر کے اسے نقصان پہنچا سکتے ہیں۔

بالمثل جادوگروں کے کہنے کے مطابق اس قسم کی فسوں گری ہر دور میں جاری رہی ہے اور آج بھی جاری ہے۔ جب کسی شخص کو دکھ پہنچانا یا زخمی کرنا یا قتل کرنا مقصود ہو تو ایک پتلا بنا کر اس میں سوئی یا نیزا مارا جاتا ہے تو دشمن کے جسم کے ان ہی مقامات پر تکلیف پہنچتی ہے یا وہ ہلاک ہو جاتا ہے۔

قدیم بھارت، بابل اور مصری معاشروں میں اس قسم کی فسوں کاری عام تھی۔

پیرو کے علاقے میں موم اور آٹے کو ملا کر دشمن کے راستے میں آنے والے چوراہے میں پھینک دیتے ہیں۔ ملایا میں جادوگر دشمن کے کٹے ہوئے ناخن، بال ابرو اور تھوک وغیرہ لے کر شہد کی مکھی کے چھتے کی موم حاصل کر کے اس میں ملا کر دشمن کا پتلا بناتے ہیں اور پھر اس پتلے کو ہلکی آنچ پر سات دنوں تک جھلساتے ہیں۔ سات راتوں تک عمل کرنے کے بعد پتلے کو جلا دیتے ہیں اور دشمن ہلاک ہو جاتا ہے۔

یہ تو تھا موت کا عمل۔ اب زندگی کا عمل ملاحظہ فرمائیں۔

اس قسم کے عمل ولادت اور صاحب اولاد وغیرہ ہونے کے لیے کیے جاتے ہیں۔

سماٹرا کے علاقے میں بانجھ عورت لکڑی کا بت بنا کر اسے اپنی آغوش میں بھرتی ہے اور کچھ منتر کا الاپ کرتے ہوئے یہ خیال کرتی ہے کہ وہ صاحب اولاد ہو جائے گی۔

بورنیو کے علاقے میں بچے کی ولادت کے وقت سہولت کی غرض سے جادوگر کو بلایا جاتا ہے جو وہاں آکر چند منتر دُہراتا ہے۔ اسی دوران ایک دوسرا جادوگر کمرائے ولادت سے باہر نکل کر بالکل زچہ کا روپ دھارتا ہے۔ اس کے پیٹ کے ساتھ وزنی پتھر باندھ دیا جاتا ہے اور وہ اپنے آپ کو دردِ زہ میں مبتلا ظاہر کرتا ہے اور بچے کی ولادت تک یہی انداز اختیار رکھتا ہے۔

جادو کے ذریعے علاج بھی کیا جاتا ہے اور یہ جادو کا مثبت پہلو ہے۔

بالمثل سحر سے بیماروں کا علاج کیا جاتا ہے۔ خاص طور پر یرقان کے مریضوں کا۔ علاج کے دوران مریض کو زرد چیزوں، زرد روشنی، خاص طور پر سورج کی روشنی سے دور رکھا

www.pdfbooksfree.pk

جاتا ہے اور مریض کے کمرے میں سرخ روشنی کا انتظام کیا جاتا ہے، اس مقصد کے لیے سرخ بلب بھی باندھی جاتی ہے۔

اس دوران پنڈت یا پروہت اس پر منتر پڑھتا ہے جس کے الفاظ کچھ یوں ہوا کرتے ہیں ''تمہارا درد دل اور تمہارا یرقان آسمان پر سورج کی طرف لوٹ جائے گا۔ ہم اسے سرخ بلب میں لپیٹ کر باندھ دیں گے۔ ہم تمہارا یرقان پرندوں کو لگا دیں گے۔''

منتر پڑھنے کے دوران پروہت یرقان زدہ مریض کو سرخ بلب کے بال ملا پانی بھی پینے کو دیتا ہے۔ اس کے بعد زردی ختم کرنے کے لیے اس کے سر سے پرندوں کو باندھ کر اس کی چارپائی سے باندھ دیا جاتا ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان تینوں پرندوں کو یرقان ہو جاتا ہے اور مریض صحت مند ہو جاتا ہے۔

آخر یہ سب کیا تھا، یہ کیسی طاقتیں ہیں جو اس طرح مدد کیا کرتی ہیں۔ ان بولوں میں کیا اثر ہے؟ اس عمل میں کیسا راز پنہا ہے؟

جادوگر مارسلیس رسولی کا علاج اس طرح کیا کرتا ہے۔

ساگوان کی جڑ لے کر اس کو درمیان سے چیرتا ہے۔ اس کا ایک سرا مریض کی گردن کے گرد لپیٹ دیتا اور دوسرا سرا آگ کے دھوئیں پر کر دیتا ہے۔

جوں جوں لکڑی سوکھتی جاتی ہے، مریض کی رسولی غائب ہوتی جاتی ہے اور آخر کار بالکل غائب ہو جاتی ہے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ مریض اگر مناسب معاوضہ ادا نہ کرے یا معاوضے سے انکار کر دیتے تو ایسی صورت میں وہ اسی سوکھی جڑ کو پانی میں ڈال دیتا ہے۔ جوں جوں لکڑی پانی کو جذب کرتی ہے، ویسے ویسے مریض کی رسولی اُبھرتی چلی آتی ہے۔

یہ ایسی باتیں ہیں جن کی کوئی عقلی یا سائنسی توجیہہ نہیں کی جا سکتی۔ اس کے باوجود ان میں اثر ہوتا ہے، آخر کیوں؟

شکار کے لیے بھی اسی قسم کے بے شمار ٹوٹکے اور عملیات وغیرہ کیے جاتے ہیں اور ان علاقوں میں یہ رواج برسوں سے چلے آ رہے ہیں۔

کولمبیا کے کسی شکاری کو جال لگانے کے بعد شکار نہ ملے تو وہ ننگا ہو کر کچھ دور تک جاتا ہے اور وہاں سے ٹہلتا ہوا یوں جال کی طرف آتا ہے جیسے اس نے جال کو دیکھا ہی نہ ہو۔

پھر اپنے آپ کو جال میں پھنسا لیتا ہے اور زور سے پکارتا ہے۔ ''ٹیلو۔ یہ کیا ہے، میں خوف زدہ ہوں۔ میں شکار ہو گیا ہوں۔''

ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اس کے بعد جال میں شکار آنا شروع ہو جاتے ہیں۔

ریسرچ کے مطابق جادوگر بیک وقت مثبت (Chase) اور منفی (Taboo) جادو کا سہارا لیتا ہے۔ وہ کسی بھی ایک اصول کو اپنانے کا خطرہ نہیں لیتا۔

عام طور پر جادوگر منفی جادو سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ منفی جادو ہی عملی طور پر کام آتا ہے۔

دونوں میں فرق یہ ہے کہ مثبت فقروں والا جادوگر کہتا ہے۔ ''اس طرح کرو اور وہ اسی طرح ہو جاتا ہے۔''

اور منفی فقروں والا جادوگر کہتا ہے ''یہ کام مت کرو، ورنہ نقصان ہو گا۔''

بہت سے ممالک میں بدشگونیوں یا شگون کی بہت اہمیت ہے۔

دنیا کے تقریباً ہر خطے میں ان کے اپنے رسوم و رواج اور عقائد کے مطابق شگون یا بدشگونیاں مروج ہیں۔ خود ہمارے یہاں بھی ایسے عقائد کی کمی نہیں ہے۔

آئیں کچھ شگون یا بدشگونیوں کا جائزہ لیتے ہیں۔

جزائر شرق الہند میں جب کوئی شخص کسی شکاری سے ملنے اس کے گھر جاتا ہے تو اسے دروازے میں بغیر رُکے سیدھے اندر جانا ہوتا ہے۔ ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اگر کوئی ملاقاتی دروازے میں رُک جائے یا گھوم کے پیچھے کی طرف دیکھے تو شکاری کو شکار نہیں ملتا۔

کالے پانی کے بھارتی جن کا پیشہ عقاب شکار کرنا ہے، جب شکار کے لیے جال لگا دیتے ہیں تو اس کے بعد کسی بھی صورت میں کچھ کھاتے پیتے نہیں ہیں، ان کا عقیدہ ہے کہ کھانے پینے سے عقاب کے پیٹ میں درد شروع ہو جاتا ہے اور وہ جال کی طرف نہیں آتا۔

ملاگاسی کے علاقے میں فوجی کسی بھی جانور کے گردے نہیں کھاتے کیونکہ ان کے ملک میں گردے اور گولی کھانے کے لیے ایک ہی لفظ استعمال کیا جاتا ہے اور وہ لوگ گردے کھانے کے بعد یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے گولی کھائی ہے۔

ان کے دل میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ گردے کھانے کے بعد انہیں لازماً گولی لگے گی۔

لاؤس میں ہاتھی کے شکار سے قبل شکاری اپنی بیوی کو بال کاٹنے یا جسم پر تیل سے لگانے سے منع کر جاتا ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اگر گھر میں عورت اپنے بال کاٹے گی تو ہاتھی جال توڑ کر نکل جائے گا اور اگر وہ اپنے جسم پر تیل لگائے گی تو ہاتھی ان کے ہاتھ سے پھسل جائے گا۔

یہ تو چند ٹوٹکے تھے، اب مختلف قسم کے جادو کے مختلف طریقے ملاحظہ فرمائیں۔ یہ طریقے کم و بیش ہمارے یہاں بھی رائج ہیں۔

اگر کوئی نوجوان رات کے وقت قبرستان میں جا کر وہاں سے قبر کی مٹی لائے اور اس مٹی کو اپنی معشوقہ کے والدین کے سونے کی جگہ پر چھڑک دے تو اس رات اس لڑکی کے والدین مردے کی نیند سوئیں گے۔

گزرے وقتوں میں نقب زن اس قسم کی مٹی سے کام لے کر لوگوں کے گھروں میں سیندھ لگاتے تھے۔ کیونکہ گھر والے مردے کی نیند سو جاتے تھے اور یہ مال دولت لے کر چلتے بنتے تھے۔ ہندو اس مقصد کے لیے چتا کی راکھ استعمال کرتے ہیں۔ جبکہ یورپ میں چور اس مقصد کے لیے پھانسی کی سزا پانے والے انسان کا خشک ہاتھ استعمال کرتے ہیں۔

سرویا اور بلغاریہ میں جادوگر ایسی عورتوں کو جو اپنے خاوند کے ہوتے ہوئے اپنے گھر میں رنگ رلیاں منانا چاہتی ہیں، انہیں ایک خاص قسم کی شراب یا پانی دیتے ہیں۔

عمل یہ ہے کہ لاش کی آنکھوں سے تانبے کے سکے مس کر کے پانی یا شراب میں ڈبو دیتے ہیں اور وہی شراب یا پانی ایسی خواتین اپنے شوہروں کو پلا دیتی ہیں۔ اسے پینے کے بعد بے چارہ شوہر بالکل اندھوں جیسا ہو جاتا ہے۔ وہ سب کچھ دیکھتا ہے لیکن اسے احساس نہیں ہوتا کہ اس کی بیوی کیا کر رہی ہے۔

نہ جانے جادو کی تعلیم انسانوں کو کہاں سے دی گئی اور نت نئے طریقے اسے کیسے معلوم ہوئے۔ انسان جادو جگانے کے لیے جانوروں، پرندوں اور کیڑے مکوڑوں سے بھی کام لیتا آیا ہے۔

مفرور غلام یا لونڈی کو واپس بلانے کے لیے عربی لوگ زمین میں حصار کھینچ کر اس کے درمیان میں ایک کیل گاڑ دیتے ہیں۔ پھر اس کیل کے ساتھ ایک دھاگے سے غلام کی صورت نر بھونرا اور لونڈی کی صورت میں مادہ بھونرا باندھ دیتے ہیں۔

جوں جوں بھونرا چلتا ہے، دھاگا کیل کے ساتھ بل کھاتا چلا جاتا ہے اور اس کی لمبائی کم ہوتی چلی جاتی ہے اور ایک وقت وہ آتا ہے کہ بھونرے کے لیے چلنا ناممکن ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی مفرور غلام یا لونڈی کی واپسی شروع ہو جاتی ہے۔

پرندوں کے حوالے سے ایک اور عقیدہ ہے۔ کوے کے انڈے لگانے سے سفید بال سیاہ ہو جاتے ہیں۔ بالوں میں انڈے لگاتے وقت وہ آدمی اپنے منہ میں تیل بھر لیتا ہے ورنہ اس کے دانت بھی سیاہ ہو جائیں گے اور کبھی سفید نہیں ہوں گے۔

یہ عقیدے یا عملیات آخر کس قسم کے ہوتے ہیں؟

انسان نے ہزاروں لاکھوں اشیا کو دیوتا سمجھا۔ اس کی پوجا کی۔ اس کے ذریعے طاقت حاصل کی یا کسی کو نقصان پہنچایا۔

مٹی، جانور، پرندے، پانی، آگ، درخت، بادل، بجلی، کیڑے مکوڑے، ہڈیاں، سر کے بال، تھوک، کپڑے، ناخن، خدا جانے کتنی ایسی چیزیں ہیں جو اسی انداز سے انسانوں کے کام آتی رہی ہیں یا جادوگر حضرات واہموں کی دنیا تخلیق کر کے انسانوں کو ان سے خوف زدہ کرتے رہے ہیں۔

ان ہزاروں لاکھوں اشیا میں پتھر بھی اپنی جگہ بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

آج بھی ہم انسانوں کی قسمتوں پر پتھروں کے اثر انداز ہونے کی داستانیں پڑھتے ہیں۔ ہندو مذہب میں تو پتھروں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

برہمنوں میں رسم ہے کہ شادی کے موقعے پر دلہن کو ایک پتھر کے اوپر سے گزارا جاتا ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اس طرح شادی کا بندھن پتھر کی طرح مضبوط ہو جاتا ہے۔

قدیم زمانے میں لوگ قیمتی پتھروں کے سحری خواص کے قائل تھے کیونکہ وہ لوگ ان کو بطور تعویذ پہنا کرتے تھے جبکہ بطور زیور ان کا استعمال بہت بعد میں ہوا۔

درختوں جیسی دھاریوں والے پتھروں کو قدیم یونانیوں نے شجر یشب (Agate-Tree) کا نام دیا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اس قسم کے پتھر اگر ہل چلاتے وقت بیل کے دونوں سینگوں پر باندھ دیں تو فصل بھرپور ہوتی ہے۔

www.pdfbooksfree.pk

یہ لوگ متحمل مزاجی اور بردباری حاصل کرنے کے لیے سلیمانی عقیق پہنتے۔ دو بھائیوں میں اتفاق برقرار رکھنے کے لیے دونوں کے گلے میں طاقت ور مقناطیس باندھتے۔

ستارہ شناسی کی بھی بہت اہمیت ہے۔ قدیم ہندو کتب میں لکھا ہے ''شادی کے دن غروبِ آفتاب کے بعد دولہا کو اپنی دلہن کے ساتھ کھلی جگہ یا چھت پر بیٹھ کر قطبی ستارے کے طلوع ہونے کا انتظار کرنا چاہیے۔ اس کے طلوع ہونے پر اپنی بیوی کو قطبی ستارا دکھائے اور ساتھ ہی یہ الفاظ دُہرائے۔ ''تم ہمیشہ سے قائم ہو، اے قائم ودائم، ہماری جوڑی بھی قائم اور دائم رکھ۔'' اس کے بعد اپنی بیوی کی طرف متوجہ ہو کر کہے ''برہمپتی نے تجھے میرے بچوں کو جنم دینے کے لیے عطا کیا ہے۔''

اس کے بعد بیوی کہے ''ہزاروں خزائیں آئیں اور آ کر گزر جائیں۔''

یہ سب کچھ ہمدردانہ جادو یا ہومیو پیتھک جادو کے زمرے میں آتا ہے۔

اب آئیں چھوت دار جادو کی طرف۔

چھوت دار جادو کے اصولوں کے مطابق جسم سے الگ ہونے والا کوئی حصہ یا جسم کو چھو جانے والی چیز کہیں بھی ہو، اس پر کیا جانے والا جادو اس کے استعمال کرنے والے پر اثر انداز ہوتا ہے۔

اس قسم کی کہانیاں پوری دنیا میں مشہور ہیں۔

انسانی جسم کے دانت، بال، ناخن، ناف، آنول، خون، پسینے، کپڑے غرضیکہ ہر شے سے جادو جگایا جاسکتا ہے اور صدیوں سے جادوگر اسی قسم کا عمل کرتے چلے آرہے ہیں۔ ہمارے یہاں بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ بال جھاڑتے وقت اگر لڑکی کے بہت سے بال کنگھی میں آجائیں تو ان بالوں کا گچھا بنا کر اس پر تھتکارتے ہوئے پھینکا جاتا ہے۔

ورنہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان ٹوٹے ہوئے بالوں کے ذریعے لڑکی پر جادو کیا جاسکتا ہے۔

بہت سے گھروں میں اُترے ہوئے پُرانے کپڑے بھی جلا دیے جاتے ہیں کیونکہ ان کے ذریعے بھی جادو کا تصور ممکن ہے۔ سامری جادوگر نے بھی یہی کیا تھا۔ اس نے اس مٹی سے کام لیا تھا جو مٹی حضرت جبریل علیہ السلام کی گھوڑی کے سموں کے نیچے کی تھی۔

سامری کی مختصر کہانی کچھ یوں ہے کہ قوم بنی اسرائیل

یا قبیلہ سامرہ میں سے ایک شخص تھا جس کا نام موسیٰ بن خضر تھا۔ یہ شخص صفت زرگری میں استاد کا درجہ رکھتا تھا اور بت گری میں اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

جس دن فرعون غرق ہوا ہے، حضرت جبریل علیہ السلام ایک گھوڑی پر سوار ہو کر سمندر کے کنارے پھر رہے تھے اور جس جگہ گھوڑی کا سم پڑتا وہ جگہ سبز ہو جاتی۔

یہ شخص حضرت جبریل کو پہچانتا تھا۔ اس نے سموں کی مٹی لے کر اپنے پاس تبرکاً رکھ لی۔ اس کا یہ خیال تھا کہ یہ مٹی بعد میں اس کے کام آئے گی۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر تشریف لے گئے تو بنی اسرائیل نے حضرت ہارون علیہ السلام سے کہا ''ہم لوگ قبطوں سے زیورات لائے تھے، اب ان کا کیا کریں؟''

حضرت ہارون علیہ السلام نے فرمایا کہ ان کو جلا کر خاک میں دفن کردو۔ اس موقعے پر سامری نے کہا ''اگر زیور مجھے ملے تو میں ایک علم عصائے موسیٰ سے اعلیٰ بنا دوں۔''

بنی اسرائیل اس کی باتوں میں آگئے۔ سامری نے زیور کا ایک بچھڑا بنایا اور وہ خاک اس کے پیٹ میں ڈال دی، اس میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ بولنے لگا۔

بعضوں کے نزدیک گوشت و پوست بھی پیدا ہو گیا۔

سامری اور اس کے حواری بولے کہ موسیٰ تلاشِ حق میں پھرتا ہے اور وہ یہاں موجود ہے۔ شاید وہ بھول گیا۔

چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے (سورہ طٰہٰ، ع 4) ''یعنی یہ تمہارا اور موسیٰ کا معبود ہے، سو موسیٰ شاید بھول گیا ہے کہ دوسری جگہ تلاش کو گیا ہے۔''

سامری کے اس جادو سے متاثر ہو کر آٹھ یا بارہ ہزار بنی اسرائیل اس بچھڑے کی پوجا کرنے لگے۔ معالم التنزیل میں رقم ہے کہ سامری حضرت جبریل علیہ السلام کو اس لیے پہچانتا تھا کہ جب سامری پیدا ہوا تو اس کی ماں نے فرعون کے خوف سے اسے دریائے نیل کے کنارے ایک گڑھے میں ڈال دیا تھا۔ تب حضرت جبریل علیہ السلام اس کی پرورش پر مقرر ہوئے۔ ہر روز اس کے پاس تشریف لاتے اور وہ دیکھتا تھا۔

بنی اسرائیل کے اس واقعے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے بددعا دی کہ جب کوئی تجھے چھوئے گا تو تجھے اور چھونے والے دونوں کو بخار ہو جایا کرے گا۔

کہتے ہیں کہ اب تک قبیلۂ سامرہ میں یہ بات ہے کہ

جب کسی غیر کا بدن کسی سے لگ جاتا ہے تو ساری قوم بخار میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

گویا جادو کا اثر ایسا ہوا کرتا ہے کہ پوری کی پوری قوم گمراہ ہو جاتی ہے۔ کیونکہ جادوگر کمزور عقیدے والوں کے سامنے ناممکن کو ممکن کر کے دکھا دیتے ہیں۔ چاہے اس کا اثر وقتی ہی کیوں نہ ہو یعنی جادو ایک مصنوعی کاریگری ہے اور اس کے کاریگر یعنی جادوگر کی مدد منفی طاقتیں کیا کرتی ہیں اور اس کے عمل کو پُراثر بنا دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر یورپ کے کئی ملکوں میں اگر کسی کے نقشِ قدم پر چاقو یا کیل ٹھونک دی جائے تو وہ شخص لنگڑا ہو جاتا ہے۔

یہ عقیدہ زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے۔ فیثاغورث کا قول ہے کہ ''دوسرے شخص کے قدموں کے نشانات میں چاقو یا کیل مت گاڑو۔''

اس قول سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہاں اس قسم کی حرکتیں ہوا کرتی تھیں۔ اس کا یہ بھی کہنا تھا کہ بستر سے اُٹھتے وقت اپنے جسم کے تمام نشانات مٹا دو۔

تاریخ شاہد ہے کہ جادوگری نے ہمیشہ ہی اپنے علم اور سحر پر غرور کیا۔ انہوں نے اولیا اور انبیا کو للکارا۔ خدا کی خدائی میں دخل انداز ہونے کی کوشش ہی نہیں کی بلکہ دعوے کیے۔

بعض اوقات جادوگروں کو ڈھیل بھی دی گئی اور جب وہ انتہا کو پہنچ گئے تو ان کی رسیاں کھینچ لی گئیں۔

جادو اور مذہب میں یہی بنیادی فرق ہے کہ جادو تباہی اور بربادی کا علمبردار ہے اور مذہب امن اور سلامتی کا راستہ دکھاتا ہے۔

پُرانے وقتوں میں (یا شاید آج بھی ہندوؤں کے یہاں یہ سب ہوتا ہو) کسی ایک برہمن شاگرد کو بارش برسانے کی طاقت حاصل کرنی پڑتی تھی اور خاص کلمات ادا کرنے ہوتے تھے۔

یہ کلمات ایک قدیم ہندی کتاب ساما وید میں درج تھے، اس گیت کا نام ''سکواری'' ہے۔ اس عمل کے نڈر طالب علم اپنے ساتھیوں سے الگ ہو کر جنگلوں کی طرف نکل جاتے ہیں۔ اس بن باس کا عرصہ ایک سے بارہ برس تک ہے۔ اس دوران ان لوگوں کو مختلف شرائط کی پابندی کرنی ہوتی ہے مثلاً

1۔ کالے کپڑے پہننا اور کالی اشیا کھانا۔

2۔ دن میں تین دفعہ پانی کو چھونا۔

3۔ بارش کے وقت سائبان یا چھت کے نیچے سے نکل کر بارش میں بیٹھ جانا اور سکواری پڑھنا۔ سکواری پانی کا نغمہ ہے۔

جب بجلی کا کوندا لپکے اس وقت کہنا (یہ سکواری نغمہ کی مانند ہے)

بادل گرجنے پر کہنا ''عظیم دیوتا اس آواز کو پیدا کر رہا ہے۔''

4۔ ندی کے ساحل کو بغیر چھوئے ندی پار نہ کرنا۔

5۔ جب تک اس کی زندگی کو خطرہ نہ ہو سمندری سفر نہیں کرسکتا اور بحری جہاز پر سوار ہوتے وقت وہ پانی کو ضرور چھوئے گا۔

6۔ پانی کو دیکھ کر وہ یہ الفاظ دُہرائے گا ''سکواری کے نغمے کا حسن میرے سامنے ہے۔''

7۔ بن باس مکمل ہونے پر جب اسے اپنے طور پر سکواری کا نغمہ الاپنے کی اجازت ملتی ہے تو اس وقت ایک برتن میں مختلف اقسام کے پودے ڈال کر اسے اپنے دونوں ہاتھ اس میں ڈبونے کو کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس شخص کو پرجانیا کا خطاب مل جاتا ہے۔ اور اس کے قبضے میں بارش برسانے کی قوت آجاتی ہے۔

یہ تو ایک آدمی کی طاقت ہوئی جو بارش برسا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے علاقے ایسے بھی ہیں جہاں بارش کے لیے مختلف جادوئی ٹوٹکے کیے جاتے ہیں۔

مثال کے طور پر روس میں ڈارپٹ (Dorpat) کے علاقے میں جب بارش کی ضرورت ہو تو خشک سالی ختم کرنے کے لیے گاؤں کے تین افراد متبرک جھنڈ میں جا کر صنوبر کے درخت پر چڑھ کر کیتلی بجا کر بادلوں کی گرج، دوسرا ماچس جلا کر بجلی کی چمک اور تیسرا کسی برتن سے چاروں طرف پانی چھڑکتا جاتا ہے۔

یہ لیں بارش کے تینوں لوازمات ہو گئے۔ گرج، چمک اور بارش۔ ممکن ہے کہ اس طرح بارش بھی ہو جاتی ہو۔

وسطی آسٹریلیا کے ڈیری قبیلے میں بارش برسانے کے لیے ایک عجیب وغریب جادوئی عمل کیا جاتا ہے جو کہ تکلیف دہ بھی ہے۔

یہ لوگ بلند آواز میں اپنی خشک سالی اور قحط کا رونا روتے ہوئے اپنے آباواجداد کی ارواح مورا موزا کو پکارتے ہیں۔

مورا موزا کی مدد سے بارش حاصل کرنے کے لیے وہ

www.pdfbooksfree.pk

کھلی جگہ پر 12 فٹ لمبا 8 فٹ چوڑا گڑھا کھود کر اس کے اوپر شہتیر اور ٹہنیوں کی چھت ڈال کر اس کے اوپر مخروطی شکل کی جھونپڑی بنا دیتے ہیں۔

دو جادوگر جن کو مورا موزا کی ارواح کو طلب کرنے کا جادو آتا ہے۔ دونوں جادوگر دونوں بازوؤں کی کہنی کے نچلے حصوں پر بانس کی کھپچیوں کو مار مار کر اپنا خون نکالتے ہیں، اس دوران قبیلے کے افراد جھونپڑی میں سمٹ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اس کے بعد دونوں جادوگروں میں سے ایک اپنا خون بیٹھے ہوئے افراد پر پھینکتا ہے۔ کچھ خون لوگوں کے اوپر گرتا ہے اور باقی اِدھر اُدھر بکھر جاتا ہے۔

یہ خون بارش کی علامت سمجھا جاتا ہے اور لوگوں کو لگنے والا خون بادلوں کی علامت ہوتا ہے۔ اس سارے عمل کے دوران دو بڑے پتھر جھونپڑی کے درمیان بادلوں کی علامت اور بارش کے شگون کے طور پر رکھے جاتے ہیں۔

اس کے بعد دونوں جادوگر ان پتھروں کی میل دور لے جا کر کسی اونچے درخت پر رکھ دیتے ہیں۔ اس دوران قبیلے کے لوگ جپسم کو باریک پیس کر پانی کے جھرنوں میں بھر دیتے ہیں اور ان کی عقیدے کے مطابق جب مورا موزا اسے دیکھتے ہیں تو فوراً بادلوں کو بھیج کر بارش برسا دیتے ہیں۔

سب سے آخر میں قبیلے کے تمام چھوٹے بڑے مرد زانو کے بَل جھک کر جھونپڑی کو اپنے سر سے ٹھوکر مارتے ہوئے دوسری طرف نکل جاتے ہیں۔

یہ عمل اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک جھونپڑی بالکل نہیں گر جاتی۔ اس سارے کام میں ہاتھوں کا استعمال سخت ممنوع ہے۔

نیو کیلی ڈونیا میں بارش برسانے والا جادوگر کالے کپڑے پہن کر قبرستان میں جا کر پُرانی قبر کھود کر مردے کی ہڈیاں نکال کر کسی غار میں چلا جاتا ہے۔

غار میں پہنچ کر جادوگر مردے کی ہڈیوں کو جوڑ کر ڈھانچا تیار کر کے لٹکا دیتا ہے اور ڈھانچے کے قدموں میں Taro نامی سبزی کے پتے بچھا دیتا ہے۔ بعد ازاں جادوگر ڈھانچے کی کھوپڑی پر پانی بہاتا ہے۔ یہ پانی بہتا ہوا تارو کے پتوں پر گرتا ہے اس کے بعد بارش کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔

جس طرح بارش برسانے کے لیے مختلف قسم کے جادو اور ٹوٹکوں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ اسی طرح بارش روکنے کے لیے بھی جادو کا سہارا لیتے ہیں۔

ایک بات اور دیکھنے میں آئی ہے کہ جادو کے عمل میں چاہے دنیا کے کسی بھی حصے میں ہو رہا ہو، اگر جانوروں کی قربانی دینی ہو تو کالے رنگ کے جانوروں کی قربانی دی جاتی ہے۔

کالا بکرا، کالی مرغی، کالا سور، کالی بلّی وغیرہ، ایسا لگتا ہے جیسے کالے رنگ اور شیطانی طاقتوں کے درمیان کوئی گہرا تعلق ہے۔ مثلاً ہمارے یہاں بھی بابا جی حضرات جب صدقے کا مشورہ دیتے ہیں تو کالے رنگ کے جانور کی بات کرتے ہیں۔ اس کے برعکس سفید رنگ پاکیزگی اور تقدس کی علامت ہوا کرتا ہے۔

جادوگروں نے ایک ماورائی دنیا تخلیق کر رکھی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ان کا اختیار کائنات کی ہر چیز پر ہے۔ بادل، بجلی، پتھر، بارش، دریا وغیرہ ان کے کنٹرول میں ہیں یا وہ اپنے جادو کے ذریعے ان کو اپنی مرضی کا پابند کر سکتے ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ گرم اور سرد ہوائیں، سورج اور چاند بھی ان کی مرضی کے مطابق کام کرتے ہیں۔

جادوگروں کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ وہ ہوا کو روک سکتے اور چلا سکتے ہیں۔

بائن ٹائی قبیلے کا کوئی باشندہ اگر چلتی ہوئی ہوا کو روکنا چاہے تو کسی موٹی کھال کو درخت کے ساتھ باندھ کر لٹکا دیتا ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اس طرح ہوا کی قوت اور شدت ختم ہو جاتی ہے۔

یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ طوفانی ہوائیں جنّات ہوتے ہیں جو لوگوں کو اُڑا کر لے جاتے یا ہلاک کر دیتے ہیں۔

یہ ایک بہت بڑا موضوع ہے۔

اس مختصر سے مضمون میں ہم پوری دنیا کے رسوم و رواج اور جادو کے طریقوں کا جائزہ نہیں لے سکتے۔ لیکن کسی حد تک آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ انسان کتنا وہمی اور کتنا کمزور ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی احساس ہو گیا ہوگا کہ خدا نے ہم کو مسلمان گھرانوں میں پیدا کر کے ہم پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہمارے یہاں مذہب کا تصور بہت باوقار ہے۔ ہماری ہر عبادت ہمیں انسان اور وہ بھی مہذب انسان بنانا سکھاتی ہے۔

ہم پتھروں، درختوں اور جانوروں سے نہیں مانگتے بلکہ ربِ کائنات سے مانگتے ہیں اور احترام کے ساتھ۔

تلاش

طارق عزیز

وہ سب نئی دنیا کی تلاش میں نکلے تھے۔ سمندر کے بے کراں سینے پر بہتے بہتے کہاں سے کہاں نکل گئے تھے اور دشمن بھی تاک میں تھا۔ گرم مسالوں کی تلاش میں بھٹک رہے مہم جو کی کتھا۔

اس دور کی روداد جب دنیا کی وسعت کا صحیح اندازہ نہ تھا

آج جس طرح مغرب سے مشرق آنا جانا معمولی سی بات لگتی ہے، یہی سفر بھی کتنا دشوار اور پیچیدہ تھا اس کا اندازہ لگانے کے لیے میگلن کی اس مہم پر غور کریں۔ مہم کے شروع میں وہ سب پُرامید تھے۔ یہی سمجھ رہے تھے کہ ہم بہ آسانی اس بحری مہم کو سر کر کے ایک نئی تاریخ کا آغاز کر دیں گے لیکن ایک کے بعد ایک ناکامی نے ان کے حوصلے توڑ دیے تھے۔ خاص کر اس دن یعنی 2 مئی 1521ء کی صبح جب موسم ابر آلود اور حبس زدہ تھا۔ ہسپانوی مہم جوؤں کے تینوں بحری جہاز آبنائے سیبو میں جنوب کی طرف بڑھ رہے تھے۔ بحری جہازوں پر کُل 122 افراد (117 یورپین ملاح، ایک کاروال ہو کا برازیلین بیٹا اور اندازاً چار مقامی راہنما) سوار تھے۔

جہازوں کے عملے نے جوآؤ لوپس کاروال ہو کو کیپٹن جنرل تسلیم کر لیا تھا۔ وہ میگلن، سیرانو اور ڈورٹے باربوسا کے بعد مہم کا چوتھا قائد تھا۔ میگلن کی ناگہانی موت سے جو خلا پیدا ہو گیا تھا وہ اسے پُر کر سکتا تھا۔ کاروال ہو نے سیبو سے نکلتے وقت اسپینی اوسا کو وکٹوریا اور مارٹن مینڈز کو کون شپ سیون، کا کپتان مقرر کر دیا تھا۔ بحری جہازوں پر ماحول افسردہ تھا۔

www.pdfbooksfree.pk

ملاح چپ چاپ معمول کے کاموں میں مصروف تھے۔ میگلن کی ناگہانی موت کا زخم ابھی تازہ تھا کہ سیرانو سمیت دو درجن سے زیادہ جہازرانوں کی ہلاکت کے واقعہ نے ان کے اعصاب کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ ملاحوں میں مایوسی پھیلی ہوئی تھی۔ پچھلے چار دن میں ہوئے پے در پے واقعات کے بعد اب گرم مصالحوں کے جزائر تک رسائی تو در کنار، سلامتی کے ساتھ وطن واپسی کا خواب بھی چکنا چور ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔

کاروال ہو اور اس کے عملے کو اس وقت بہت سی مشکلات کا سامنا تھا۔ ان کے پاس خوراک اور افرادی قوت کی کمی تھی۔ وہ اپنے بہترین جہازرانوں کے ساتھ ساتھ اکلوتے ماہرِ فلکیات کو بھی کھو چکے تھے۔ وہ فلپائنی جزائر کی بھول بھلیوں میں پھنسے ہوئے تھے اور ملوکا کے جزائر تک رسائی کے راستے کو لے کر الجھن کا شکار تھے۔ وہ جانتے تھے کہ بنا سوچے سمجھے جنوب میں بڑھتے رہنے سے ان کا پرتگالی بحریہ سے سامنا ہونے کا خطرہ بڑھتا جارہا تھا۔ کاروال ہو کے پاس ہسپانوی حکومت کے مہیا کردہ دنیا کے نقشے کے علاوہ میگلن کے ملوکا میں موجود پرتگالی مہم جو دوست فرانسسکو سیراؤ کا بنایا ہوا ایک نقشہ بھی موجود تھا۔ تاہم کرۂ ارض کے مغربی نصف کرے کے بڑے حصے کی دریافت کے بعد اب یہ نقشے بے اثر ہو چکے تھے۔ اُدھر سیبو میں کوئی بھی غیر ملکی تاجر ان کی راہنمائی پر تیار نہیں تھا اور سونے پر سہاگا یہ کہ وہ انریق سے بھی ہاتھ دھو چکے تھے۔ لے دے کے کاروال ہو کے ساتھ چند مقامی مترجم تھے، جن سے اسے کچھ زیادہ کی امید نہیں تھی۔ کاروال ہو کی پہلی ترجیح آبنائے سیبو سے نکل کر جنوب کے کھلے سمندر تک رسائی تھی۔ اس نے ''ٹرینی ڈاڈ'' پر طلب کیے گئے ایک اجلاس میں اپنے ساتھیوں کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا کہ کسی کو بھی مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ بہت جلد ان خونی جزائر کی بھول بھلیوں سے باہر نکل جائیں گے اور خوراک جمع کرنے کے ساتھ ساتھ ایسے مقامی تاجروں کو تلاش کریں گے جو ان کی گرم مصالحوں کے جزائر تک رسائی میں مدد کریں۔ اجلاس کے دوران کچھ فرانسیسی اور جرمن ملاحوں نے ملوکا میں پرتگالیوں کی موجودگی کو بنیاد بناتے ہوئے کاروال ہو کو یہیں سے یورپ واپسی کا مشورہ دیا۔

''دو وجوہات کی بنا پر ایسا ممکن نہیں ہے۔ ایک تو ہمیں بحرالکاہل میں واپسی کے طویل سفر کے لیے کم از کم تین ماہ کی خوراک جمع کرنی ہوگی۔ دوسرا، منزل کے قریب آجانے کے بعد خالی ہاتھ واپس جانے سے ہسپانوی ... ناراض ہوسکتا ہے۔'' کاروال ہو نے جواب ... ''پرتگالیوں کی فکر ہم سب کو ہے۔ اس لیے ہم پوری ... کے بعد ہی ملوکا کی طرف بڑھیں گے۔''

ٹرینی ڈاڈ پر یہ اجلاس جاری تھا کہ موسم کے تیور ... گئے۔ شدید حبس کے بعد مشرق میں بحرالکاہل کی ... سے کالی گھٹائیں گھر آئیں۔ تیز ہوا کے ساتھ بارش ... ہوگئی تھی۔ اسی دوران تیز گرج چمک کے ساتھ بجلی کی ... آڑی ترچھی لکیروں نے ٹرینی ڈاڈ پر نصب بانسوں ... ملاحوں نے لگ بھگ ڈیڑھ سال کے بعد مقدس ... بازی کا نظارہ دیکھا تو ان کے مایوس اور افسردہ چہروں ... امید کی کرنیں پھوٹتی دکھائی دیں۔

☆☆☆

چار مئی 1521ء کی صبح ہسپانوی قافلے نے آب... سیبو کو پار کر کے بحیرہ بوہول تک رسائی حاصل کی۔ ... مزید چند گھنٹوں کے سفر کے بعد انہوں نے جنوب میں ... ایک بڑے جزیرے کا نظارہ کیا۔ یہ منڈاناؤ کا جزیرہ ... قسمت انہیں ایک بار پھر وہیں لے آئی تھی جہاں ... انہوں نے لیماساوا اور پھر سیبو جانے کی منصوبہ بندی ... ماضی کی نسبت اس بار انہوں نے اپنے سابقہ پڑاؤ ... 400 کلومیٹر مغرب میں واقع ایک آباد بندرگاہ کے قریب ... لنگر گرائے۔ جزیرے پر آمد کے دوسرے یا تیسرے دن ... یہاں کے ایک مقامی حکمران راجا کالانوا (Calanoa) ... کاروال ہو اور اس کے ساتھیوں سے ملاقات کی۔ کالانوا ... ہسپانوی مہم جوؤں کے ساتھ رویہ دوستانہ تھا۔ پیگافی ٹا ... راجا کے اصرار پر چند روز اس کے محل میں گزارے۔ محل میں قیام کے دوران پیگافی ٹا نے میگلن کی ہلاکت اور سیبو میں پیش آنے والے خونی واقعات کو گول کرتے ہوئے راجا کو اسپین سے لے کر فلپائن تک کے سفر کی روداد بتائی۔

جزیرے پر دو ہفتے کے قیام کے دوران کاروال ... ہوا اس نتیجے پر پہنچا کہ مغرب میں ایک ہفتے کی مسافت پر واقع پالاوان (Palawan Island) ایک ایسا جزیرہ تھا جہاں سے اسے ملوکا تک رسائی کے لیے اپنے مطلب کے راہنما مل سکتے تھے۔ منڈاناؤ چھوڑنے سے دو دن پہلے مارٹن مینڈز اور چند دیگر جہازرانوں نے کاروال ہو کی توجہ اس جانب مبذول کرائی کہ تین بحری جہازوں کو رواں دواں رکھنے کے لیے ان کے پاس افرادی قوت کی کمی ہے۔ صورتِ حال یہ تھی کہ عام سپاہی اور معمول کے کام کاج کرنے

والے بھی اپنی مہارت کے برخلاف ذمہ داریاں سرانجام دے رہے تھے۔ یوں کسی آڑے وقت میں تین حصوں میں بٹی طاقت سے فائدہ اٹھانا مشکل تھا۔ مارٹن مینڈز نے تجویز پیش کی کہ انہیں آگے بڑھنے سے پہلے تین میں سے ایک بحری جہاز سے نجات حاصل کر لینی چاہیے۔ کاروال ہو نے تینوں بحری جہازوں کا معائنہ کرنے کے بعد کون شپ سیون سے تمام اہم سامان کو ٹرینی ڈاڈ اور وکٹوریا پر منتقل کرنے کا حکم دیا۔

21 مئی 1521ء کی صبح تک تمام کارروائی مکمل کر لی گئی جس کے بعد کاروال ہو کے حکم پر کون شپ سیون کو آگ لگا دی گئی۔ بندرگاہ میں ڈولتا جہاز دھڑا دھڑ جلنے لگا۔ مقامی لوگ بادبانی بحری جہاز سے بلند ہوتی آگ کی لپٹوں کو حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔ ہسپانوی ملاحوں کی اس جہاز سے بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔ وہ اسے جلتا دیکھ کر افسردہ تھے تاہم ان کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ شام تک پورا جہاز جل کر راکھ ہوگیا تھا۔ اب پانی پر ڈولتے لکڑیوں کے انبار سے کالے سیاہ دھوئیں کی لکیریں اوپر اٹھ رہی تھیں۔ لگتا تھا جیسے آگ کے شعلوں نے بھی کون شپ سیون کے اس طرح انجام پر سیاہ ماتمی لباس پہن لیا ہو۔

کاروال ہو نے کون شپ سیون کے ملبے پر آخری نظر ڈالی اور منڈاناؤ سے لنگر اٹھانے کا حکم دیا۔ کچھ ہی دیر میں دونوں بحری جہاز بحیرۂ سولو کے کھلے سمندر میں مغرب کی طرف گامزن تھے۔ شمالاً جنوباً 600 کلومیٹر اور شرقاً غرباً 500 کلومیٹر چوڑے بحیرۂ سولو کے تین اطراف میں فلپائن کے جزائر جبکہ جنوب میں انڈونیشیا کا جزیرہ بورنیو واقع ہے۔ اگلے تین دن تک متواتر آگے بڑھنے کے بعد ہسپانوی قافلے نے بحیرۂ سولو کے وسط میں خطِ استواء سے 9 ڈگری شمال اور 121 ڈگری مشرق کے خط پر واقع کاگیان (Cagayan) کے جزائر کا نظارہ کیا۔ انہوں نے کاگیان میں دو سے تین دن کا مختصر قیام کیا پھر سفر دوبارہ شروع ہوا۔ اس دوران ان کا کھلے سمندر میں بحری قزاقوں سے سامنا ہوگیا۔ کاروال ہو نے قزاقوں کی ایک درجن سے زیادہ کشتیوں کو جارحانہ انداز میں اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر اپنے اوسا کو گولہ باری کا حکم دیا۔ قزاقوں کی ایک کشتی گولہ باری کی زد میں آکر غرق ہوگئی جس کے بعد باقی کی کشتیاں جنوب کی طرف فرار ہوگئیں۔ جون کے آغاز پر ملاحوں نے

آسکر ایوارڈ

یہ ایوارڈ ہر سال امریکی اکیڈمی آف موشن پکچر، آرٹس اینڈ سائنسز کی جانب سے گزشتہ برس میں بننے والی فلموں میں غیر معمولی کارکردگی، تخلیقی اور تکنیکی شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دینے والے فلم ڈائریکٹر، ایکٹر، ایکٹریس، معاون اداکار، اداکارہ، گلوکار، سنیما فوٹوگرافر اور فلم کو دیا جاتا ہے۔ اس سلسلے کا پہلا انعام 1928ء میں بہترین فلم ونگز (Wings) کو دیا گیا۔ بہترین ہدایت کار فرتیک بورزیگ، بہترین اداکار ایمل، جیننگز، بہترین اداکارہ جینٹ گیز اور بہترین سنیما فوٹوگرافر چارلس راشر اور کارل سٹرس کو دیا گیا۔ 1956ء سے غیر ملکی بہترین فلم کو بھی یہ ایوارڈ دیا جارہا ہے۔ کسی بھی فلم میں سب سے زیادہ پوشاک زیب تن کرنے کا ریکارڈ ایلزبتھ ٹیلر کے پاس ہے۔ انہوں نے 1963ء میں فلم قلوپطرہ میں 130000 امریکی ڈالر کے 65 ملبوسات پہنے۔ والٹ ڈزنی (1901-1966ء) نے سب سے زیادہ آسکر ایوارڈ حاصل کیے ان کی تعداد بیس ہے۔ مرکزی کردار کے لیے سب سے زیادہ آسکرز کیتھرائن ہیپرن..... (1970) نے چار مرتبہ حاصل کیے۔ 1996ء میں سب سے زیادہ آسکر ایوارڈ دیئے گئے، اس ضمن میں بریو ہارٹ نے (بہترین فلم) میل گبسن (بہترین ہدایت کار) جان ٹول (بہترین سنیما ٹوگرافر) لون بینڈر اور پرہالبرگ (بہترین ساؤنڈ ایفکٹس ایڈیٹنگ) پیٹر ٹارمٹن، پال پینٹس اور لوئیس برول نے (بہترین میک اپ) کے شعبوں میں یہ ایوارڈز حاصل کیے۔ شرمین عبید چنائے پہلی پاکستانی ہیں جنہوں نے یہ ایوارڈ حاصل کیا۔

مرسلہ: منورہ زاہد، کراچی

بحیرۂ سولو کو پار کر کے پالاوان کے جزیرے کا نظارہ کیا۔ ہسپانوی جہازراں جوآؤ لوپس کاروال ہو نے بطور پہلے یورپین کے پالاوان کے جزیرے میں قدم رکھا۔ اس کے بحری جہازوں نے جزیرے کے وسطی حصے میں ٹھیک اس جگہ پر لنگر گرائے جہاں آج پالاوان کا دارالحکومت پورٹو پرنسس

www.pdfbooksfree.pk

(Puerto Princes)واقع ہے۔اس زمانے میں پورٹو پرنسس اس علاقے کی ایک معروف بندرگاہ تھی۔ یہ مالے کے جزائر، چین اور فلپائن کے درمیان چل رہے تجارتی بحری جہازوں کا ایک اہم پڑاؤ تھی۔کاروال ہونے بندرگاہ میں مقامی ماہی گیروں کی کشتیوں کے ساتھ ساتھ عربوں کے بادبانی اور چینیوں کے درجنوں جنک (Junk)بحری جہازوں کو بھی لنگر انداز دیکھا۔

☆☆☆☆☆

پالاوان کا جزیرہ، فلپائن کے دیگر جزائر کی نسبت مملکت کے جنوب مغرب میں کسی قدر فاصلے پر واقع ایک استوائی جزیرہ ہے۔ جزیرے کی لمبائی 450 کلومیٹر، اوسط چوڑائی 35 کلومیٹر جبکہ کل زمینی رقبہ 11ہزار 8سو مربع کلومیٹر اور موجودہ آبادی 15لاکھ (2010) کے قریب ہے۔پالاوان کے مشرق میں بحیرۂ سولو، مغرب میں بحیرۂ جنوبی چین، شمال میں فلپائن کا سب سے بڑا جزیرہ لوزون اور جنوب میں انڈونیشیا کا جزیرہ بورنیو واقع ہے۔پالاوان کے چاروں اطراف کا ساحل کٹا پھٹا اور پوری ساحلی پٹی اونچے نیچے سرسبز ٹیلوں پر مشتمل ہے۔ جزیرے کے درمیانی حصے میں لمبائی کے رخ پر پھیلا اوسطاً پانچ ہزار فٹ بلند پہاڑی سلسلہ واقع ہے۔ اس سلسلے کا سب سے اونچا پہاڑ Mantalingajan ہے جس کی بلندی 6843 فٹ ہے۔ فلپائن کے دیگر جزائر کی نسبت پالاوان میں بارشیں معمول سے زیادہ ہوتی ہیں۔ جس کی وجہ سے جزیرے کے طول و عرض میں برساتی ندی نالوں اور پہاڑی چشموں کی کثرت ہے۔ یہاں ہر طرف پھیلی ہریالی، خوبصورت مناظر اور خوشگوار موسم کی وجہ سے پالاوان کو استوائی جنت کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔یورپین کی آمد کے وقت جزیرے کی آبادی کا اندازہ ایک لاکھ کے قریب تھا۔اس زمانے میں یہاں فلپائنی، انڈوچائنا اور مالین نسل سے ملتے جلتے قبائل آباد تھے۔ فلپائنی جزائر سے دور ہونے کی وجہ سے مقامی معاشرے پر چینی اور مالین تہذیب کے اثرات نمایاں تھے۔ یہاں کا سب سے بڑا مذہب بدھ مت تھا۔مقامی آبادی کا سب سے بڑا ذریعۂ معاش زراعت اور ماہی گیری تھا۔تاہم جنوبی چین اور بورنیو کی بندرگاہوں کے درمیان اہم پڑاؤ ہونے کی وجہ سے مقامی لوگ بین الاقوامی تجارت کے معاملات کا مکمل ادراک رکھتے تھے۔

☆☆☆

نازیل کے درختوں سے گھرے ایک کچے راستے پر واقع ایک اکلوتا لیکن معروف بازار واقع تھا۔سیبو کی نسبت یہاں بازار میں چینیوں اور عربوں کے ساتھ ساتھ ویت نامی، ہندوستانی تاجروں کی اچھی خاصی تعداد مختلف سرگرمیوں میں مصروف دکھائی دے رہی تھی۔ بیشتر تاجروں کی توجہ کا مرکز وہ دکانیں تھیں جہاں چین سے لایا گیا ریشم، بورنیو کی کانوں اور پالاوان میں پیدا ہونے والا چاول اور جہاز رانی سے متعلق سامان فروخت ہو رہا تھا۔ مقامی دکانداروں کے لیے فرق ملاحوں سے لین دین کوئی انوکھی بات نہیں تھی، تاہم وہ چمڑی والے یورپین کو پہلی بار اپنے درمیان دیکھ رہے تھے۔ کاروال ہو کے ساتھیوں کو بازار میں گھومتا پھرتا دیکھ کر وہاں موجود بعض عرب تاجروں نے انہیں مشورہ دیا کہ جنوبی جزائر (انڈونیشیا) جانے سے پہلے یہاں فروخت ہو رہے چاول کی خریداری ضرور کریں جو انتہائی سستا اور خوش ذائقہ ہے۔ پالاوانی لوگوں کا سب سے دل پسند مشغلہ مرغ بازی تھا۔ شوقین لوگ لڑائی کے لیے تیار مرغوں کی خریداری کے دوران ان کی تیز دھار نوکیلی چونچ، بڑے ہوئے پنجے اور سوئے کی طرح نوکیلے ناخنوں کی تراش خراش کو جانچ رہے تھے۔ یورپین نے وہاں اکثر کھلی جگہوں پر مرغوں کی لڑائی کے مقابلے ہوتے دیکھے۔ وہ یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ مقامیوں کے ساتھ ساتھ وہاں موجود عرب اور ہندوستانی تاجر بھی اپنی پسند کے مرغوں پر بڑھ چڑھ کر شرط لگا رہے تھے۔ جہاز رانی کا سامان فروخت کرنے والی دکانوں کے قریب غلاموں کا بازار بھی لگا ہوا تھا۔ وہاں مختلف عمروں کے مضبوط جسموں والے مالین غلام، غیر ملکی جہازرانوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے آوازیں لگا رہے تھے۔ ان غلاموں کو انتہائی قلیل معاوضے پر طویل مدت اور بعض شرائط کے ساتھ پوری زندگی کے لیے بھی خریدا جا سکتا تھا۔ کاروال ہو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا جب بعض غلاموں نے اسے عربی کے ساتھ ساتھ پرتگیزی میں مخاطب کرتے ہوئے اپنی خدمات پیش کیں۔

کاروال ہونے پالاوان میں تین ہفتے کا قیام کیا۔ اس دوران اس نے یہاں سے کئی من خشک چاول کے ساتھ ساتھ چند مقامی غلاموں کی خریداری بھی کی۔ اس نے یہاں موجود غیر ملکیوں سے جنوبی جزائر کے بارے میں معلومات اکٹھی کیں، لوگوں نے بتایا کہ ملوکا کے جزائر وہاں

سے جنوب مشرق میں قریب ایک ماہ کی دوری پر واقع ہیں۔ بعض عرب تاجروں نے کاروال ہو کو مشورہ دیا کہ وہ براہ راست ملوکا جانے کی بجائے پالاوان کے جنوب میں محض چند دن کی مسافت پر واقع بورنیو چلا جائے۔ یہ ایک بڑا جزیرہ ہے جس کے شمال مغربی حصے میں واقع برونائی اس علاقے کی سب سے دولت مند اور ترقی یافتہ ریاست ہے۔ عربوں نے انکشاف کیا کہ سونے چاندی اور گرم مصالحوں کی دولت سے مالا مال برونائی وہ جگہ ہے جس پر ابھی تک پرتگالیوں کے حریف پرتگالیوں کی نظر نہیں پڑی ہے۔ پگافی ٹا کے مطابق عربوں کے ساتھ بات چیت کے بعد ہسپانوی ملاح اپنی منزل تو لے کر الجھن کا شکار ہو گئے۔ جو آن سباسٹین ایل کانو سمیت کچھ لوگوں کی رائے میں انہیں ملوکا کے جزائر کو ہی فوکس کرنا چاہیے تھا۔ تاہم کاروال ہو اور اسپینی اوسانے اپنے ساتھیوں کو قائل کر لیا کہ انہیں ملوکا کا طویل سفر اختیار کرنے کی بجائے پہلے قریب ہی واقع برونائی چلنا چاہیے۔ منزل کا تعین ہو جانے کے بعد کاروال ہونے تین عرب ملاحوں کو دھمکی سے ٹرینی ڈاڈ پر بلا کر گرفتار کر لیا۔ اس نے انہیں مجبور کیا کہ وہ برونائی تک اُن کی راہنمائی کریں۔

☆☆☆

21جون 1521ء کے دن کاروال ہو کے دونوں بحری جہازوں نے پالاوان سے لنگر اٹھائے اور بحیرۂ سولو میں جنوب کی طرف بڑھنے لگے۔ آنے والے تین دن تک انہیں اپنے مغرب میں لمبائی کے رخ پر پھیلا پالاوان کا جزیرہ دکھائی دیتا رہا۔ اس دوران موسم ابر آلود رہا اور ہوا موافق نہ ہونے کی وجہ سے ان کے بحری جہاز قریب 5 کلومیٹر فی گھنٹا (تقریباً 2.6 ناٹ) کی سست رفتار سے آگے بڑھتے رہے۔ 25 جون کے دن کاروال ہونے عربوں کے مشورے پر جہازوں کا رخ جنوب کی بجائے جنوب مغرب کی طرف کر دیا۔ وہ درجنوں چھوٹے بڑے سرسبز جزائر کی بغل سے ہو کر آبنائے بالاباک (Balabac Strait) کی حدود میں داخل ہوئے۔ اگلے چند گھنٹوں کے دوران انہوں نے پچاس کلومیٹر لمبی اور اتنی ہی چوڑی آبنائے کو پار کر لیا۔ اب وہ بحیرۂ جنوبی چین (South China Sea) کی حدود میں تھے۔ جہاں انہیں جنوب میں واقع ایک بہت بڑے جزیرے کے خدوخال صاف دکھائی دے رہے تھے۔ پوری مہم کے دوران انہیں دکھائی دیا یہ سب سے بڑا جزیرہ تھا۔ یہ انڈونیشیا کا جزیرہ بورنیو تھا۔

عین خطِ استواء پر واقع بورنیو کا جزیرہ، نیوگنی کے بعد مالے کے جزائر کا دوسرا بڑا جبکہ گرین لینڈ اور نیوگنی کے بعد دنیا کا تیسرا سب سے بڑا جزیرہ ہے۔ بورنیو کا کل زمینی رقبہ 7لاکھ 51ہزار 1سو مربع کلومیٹر ہے۔اس رقبے کا 73 فیصد جنوبی حصہ انڈونیشیا، 16.2 فیصد شمال مشرقی حصہ ملائیشیا اور 0.8 فیصد شمالی حصہ برونائی کی ریاست پر مشتمل ہے۔آج (2010) میں جزیرے کی کل آبادی ڈیڑھ کروڑ جبکہ یورپین کی آمد کے وقت آبادی کا اندازہ بیس لاکھ کے قریب تھا۔بورنیو کے شمال میں بحیرہ سولو، جنوب میں بحیرہ جاوا، مشرق میں آبنائے ماکاسار اور مغرب میں بحیرہ جنوبی چین واقع ہے۔بورنیو ایک پہاڑی جزیرہ ہے جس کا 50 فیصد شمالی اور کچھ وسطی حصہ بلند پہاڑی سلسلوں جبکہ باقی کا جنوبی حصہ گھنے استوائی درختوں سے اٹے اونچے نیچے ٹیلوں پر مشتمل ہے۔شمالی حصے میں ملائیشیا کی حدود میں واقع ماؤنٹ کینابالو (Kinabalu) جزیرے کا بلند ترین پہاڑ ہے جس کی بلندی 13455 فٹ ہے۔بورنیو کے جزیرے پر سیکڑوں برساتی ندی نالے اور دریا بہتے ہیں۔ یہاں بہنے والے اہم دریاؤں میں انڈونیشیا کی حدود میں بہنے والا دریائے بریٹو (Barito) لمبائی 890 کلومیٹر، ماہاکان (Mahakan) لمبائی 800 کلومیٹر اور ملائیشیا کی حدود میں بہنے والا 600 کلومیٹر لمبا دریائے راجنگ (Rajang) نمایاں ہیں۔استوائی جزیرہ ہونے کی وجہ سے بورنیو کی آب و ہوا گرم مرطوب ہے۔ یہاں کا اوسط سالانہ درجہ حرارت 26 ڈگری سینٹی گریڈ اور بارشوں کی اوسط 4064 ملی میٹر (160 انچ) سالانہ ہے۔

بورنیو کی ایک اہم خصوصیت جزیرے کے شمالی پہاڑی حصے میں پائی جانے والی سیکڑوں میٹر گہری اور کئی کئی کلومیٹر لمبی قدرتی غاریں ہیں۔ لاکھوں چمگادڑوں اور انواع واقسام کے حشرات کا مسکن یہ غاریں پچھلے ہزاروں سالوں سے انسان کے لیے معمابنی ہوئی ہیں۔کوئی نہیں جانتا کہ ان وسیع و عریض قدرتی گڑھوں میں قدرت کے کیا کیا اسرار چھپے ہوئے ہیں؟ یہاں واقع بعض غاروں کے اندر 10 ہزار سال پرانے انسانی ہتھیلی کے نشان بنے پائے گئے ہیں۔ ماہرین آثار قدیمہ کے مطابق آرٹ کے یہ ہزاروں سال پرانے نمونے قدیم بورنیائی باشندوں کی ایک رسم کی یاد دلاتے ہیں۔ پرانے لوگ شکار پر قابو پانے کے بعد اپنے ہاتھ کو غار کی چٹانی دیوار پر رکھتے کے بعد منہ میں بھرا رنگ ایک زوردار پھونک کے ساتھ ہتھیلی پر پھینکتے تھے جس سے بطور فتح کی علامت ان کی ہتھیلی کا نشان دیوار پر چھپ جاتا تھا۔ ماہرین حیاتیات کے مطابق بورنیو ایک ایسا جزیرہ ہے جہاں کرۂ ارض کے دیگر برساتی علاقوں کی نسبت سب سے زیادہ نایاب اقسام کی جنگلی حیات پائی جاتی ہے۔

www.pdfbooksfree.pk

☆☆☆

یورپین کی آمد کے وقت بورنیو کا جنوبی اور وسطی حصہ سلطنت آف ملاکا اور شمالی مغربی ساحلی علاقہ برونائی کی ریاست پر مشتمل تھا۔ اس زمانے میں برونائی پر ایک ہندو راجا سری پادا (Sripada) کی حکومت تھی۔ راجا سری پادا علاقے کا بااثر اور طاقتور ترین حکمران تھا۔ وہ مالے کے جزائر میں شامل گنتی کے ان چند حکمرانوں میں سے ایک تھا جس کی فوج آتشی توپوں سے لیس تھی۔ ان توپوں کے علاوہ راجا کی طاقت کا مظہر اس کی فوج میں شامل ایک ہزار سے زیادہ ہاتھی بھی تھے۔ یہ دیوہیکل ہاتھی پوری طرح تربیت یافتہ اور سر سے پاؤں تک لوہا پہنے ہوئے تھے۔ ہسپانوی مہم جوؤں کی آمد تک برونائی میں پرتگالیوں کے قدم نہیں پہنچے تھے۔ تاہم مقامی اور عرب تاجروں کے ذریعہ سے کنگڈم آف ملاکا میں پرتگالیوں کی سرگرمیوں کی خبریں راجا سری پادا تک برابر پہنچ رہی تھیں۔ عربوں نے راجا کو بتایا تھا کہ پرتگال نہ صرف یورپ بلکہ دنیا کا سب سے طاقتور اور دولت مند ملک تھا۔ انہوں نے راجا کو خبردار کیا کہ بورنیو کے جنوب مغرب میں موجود جس جس ریاست نے پرتگالیوں سے دشمنی مول لی تھی ان کے حکمرانوں کو اپنے اقتدار سے محروم ہونا پڑا تھا۔

بورنیو کا نظارہ کر لینے کے بعد ہسپانوی بحری جہاز اگلے چار دن جزیرے کے مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے جنوب کی طرف بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ 29 جون 1521ء کے دن کاروال ہو..... کی قیادت میں دونوں بحری جہازوں نے ٹھیک اس مقام پر لنگر گرائے جہاں آج برونائی کا دارالحکومت بندر سری بیگوان (Bandar Seri Begawan) واقع ہے۔ پالاوان کی بندرگاہ پورٹو پرنس سے یہاں تک انہوں نے قریب ایک ہزار کلومیٹر کا سفر طے کر لیا تھا اور اب وہ برونائی میں قدم رکھنے کو بے تاب تھے۔ بندر سری بیگوان اور اس کے قرب و جوار کا علاقہ ان کی توقع سے کہیں زیادہ آباد اور پُررونق تھا۔ یہاں مقامیوں، چینیوں اور عربوں کے بحری جہازوں کے ساتھ ساتھ برونائی کی شاہی بحریہ کے کئی درجن جنگی جہاز بھی لنگر انداز تھے۔ مقامی بحریہ کے یہ جنگی جہاز، چینیوں کے جنک بحری جہازوں کی ترقی یافتہ شکل تھے۔ گو کہ یہ ٹرینی ڈاڈ کے مقابلے میں کسی قدر چھوٹے تھے تاہم ہسپانوی مہم جو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ بعض جنگی جہازوں پر آتشی گولہ داغنے والی توپیں بھی نصب تھیں۔ کاروال ہو اور اس کے ساتھیوں کے قدم رکھتے ہی مقامی حکام نے ان کا پُرجوش استقبال کیا۔ وہاں قطار در قطار کھڑے سدھائے ہوئے ہاتھیوں کے دستے نے اپنی سونڈیں اٹھا کر سفید فاموں کو برونائی میں خوش آمدید کہا۔ یورپین کے لیے ہاتھی ایک بالکل نیا جانور تھا۔ وہ ایک کمزور سے مہاوت کے سامنے اس دیوہیکل جانور کو فرمانبرداری سے سونڈ ہلاتے دیکھ کر حیران تھے۔ بندرگاہ پر حکام اور کاروال ہو کے درمیان خیر مقدمی جملوں کا تبادلہ ہوا جس کے بعد حکام نے انہیں راجا سری پادا کے محل جانے کی دعوت دی۔ کاروال ہو نے اپنی جگہ اسپینی اوسا، ایل کانو، فی ٹا، اپنے برازیلین بیٹے اور دو سپاہیوں کے ساتھ ایک پالاوانی ترجمان کو شاہی محل روانہ کر دیا۔

پیگافی ٹا کے مطابق ان کے وفد کو براہِ راست محل لے جانے سے پہلے شہر کی سیر کرائی گئی۔ ہسپانویوں نے محسوس کیا کہ بحرالکاہل کو پار کرنے کے بعد سے لے کر اب تک وہ جس جس ریاست میں گئے تھے، برونائی ان سب کی نسبت ایک دولت مند اور ترقی یافتہ ریاست تھی۔ مقامیوں کا رہن سہن اور لباس ان کی خوشحالی کا آئینہ دار تھا۔ شہر کی سڑکیں کشادہ اور صاف ستھری تھیں۔ وہاں جگہ جگہ ہاتھیوں سے بار برداری کے کام لیے جا رہے تھے۔ مرکزی بازار سے جڑے کئی چھوٹے چھوٹے بازار بھی تھے۔ اُن بازاروں میں چہل پہل تھی اور چھوٹی بڑی دکانیں ایک ترتیب کے ساتھ موجود تھیں۔ یہاں چین سے درآمد کیا گیا ریشمی کپڑا اور مغربی ایشیا سے لائے گئے منقش غالیچے اور قالین بھی دستیاب تھے۔ یہاں انہوں نے سونے چاندی کے جواہرات کے ساتھ ساتھ ہاتھی دانت سے بنی مورتیاں، ہار اور دیگر قیمتی اشیا بھی فروخت ہوتے دیکھیں۔ یورپین یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ یہاں کاغذ قلم کا رواج بھی تھا۔ انہیں بعض دکاندار لین دین کا حساب کتاب ایک کاغذ پر درج کرتے دکھائی دیے۔ بازار میں تازہ استوائی پھلوں اور سبزیوں کے ساتھ ساتھ لونگ اور کالی مرچ کے ڈھیر لگے دیکھ کر ملاحوں کی خوشی کا ٹھکانا نہیں رہا۔ اسپینی اوسا نے چند سکوں کے عوض کچھ لونگ خریدی۔ اس نے پایا کہ یہ لونگ خوشبو اور ذائقے میں اپنی مثال آپ تھیں۔ غرض یہ کہ شہر کی سیر کے دوران ہسپانویوں پر یہ واضح ہو گیا کہ اس بار ان کا واسطہ ایک مہذب اور ترقی یافتہ ایشیائی قوم سے پڑا تھا۔ انہیں یہاں جو بھی قدم اٹھانا تھا سوچ سمجھ کر اٹھانا تھا۔ یہاں گرم مصالحوں کی فراوانی دیکھ کر وہ سوچ رہے تھے کہ اگر راجا سری پادا کے ساتھ ان کی ملاقات کامیاب ہو جاتی ہے تو انہیں ملوکا جانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ برونائی کی حکومت سے تجارتی معاہدہ کر کے یہیں سے لونگ خرید کر واپس یورپ روانہ ہو سکتے تھے۔

چند گھنٹوں کے سیر سپاٹے کے بعد ہسپانوی وفد برونائی کے راجا سری پادا کے عالیشان محل پہنچا۔ چونے پتھر کی سانچے میں ڈھلی چٹانی سلوں سے بنا وسیع و عریض شاہی محل کسی طور بھی یورپین بادشاہوں کی رہائش گاہوں سے کم نہیں تھا۔ محل میں اونچی چھت والی طویل راہداریوں اور برآمدوں کے اطراف میں لاتعداد کمرے بنے ہوئے تھے۔ چھتیں اور دروازے محراب دار تھے۔ مرکزی دروازے سے لے کر محل کے ہر ہر حصے میں دبیز قالین بچھے ہوئے تھے۔ کھلے برآمدوں پر ریشمی پردے جبکہ کمروں کے دروازوں پر موتیوں کی جھالریں لٹک رہی تھیں۔ اسپینی اوسا اور اس کے ساتھی ایک طویل سجی سجائی راہداری سے گزر کر ہاتھی کے قد کے برابر ایک دروازے پر پہنچے۔ دروازے پر موجود باوردی دربانوں نے معزز مہمانوں کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ یہ ایک بڑا ہال کمرا تھا جس کی سجاوٹ دیکھ کر اسپینی اوسا اور اس کے ساتھیوں کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ انہیں لگا جیسے وہ سونے کی کان میں آ گئے ہوں۔ راجا کا تخت خالص سونے سے ڈھلا ہوا تھا۔ در و دیوار پر لگی تمام آرائشی اشیا سونے کی تھیں۔ حتیٰ کہ راجا کا زرق برق ریشمی لباس بھی سونے کے تاروں سے سلا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ راجا قیمتی لباس پہنے تخت پر گاؤ تکیوں کے سہارے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے سونے کا تاج پہن رکھا تھا جس کے ماتھے پر مرغی کے انڈے کے برابر دو بڑے جگمگاتے ہیرے دمک رہے تھے۔ راجا کے تخت کے سامنے دونوں اطراف میں رکھی درجنوں کرسیوں پر اس کے درباری بیٹھے ہوئے تھے۔ دربار میں مقامیوں کے ساتھ ساتھ چینی، عرب اور ہندوستانی عمائدین نمایاں تھے۔ بعض مقامیوں نے سر پر پیلے رنگ کی بڑی بڑی پگڑیاں بھی پہنی ہوئی تھیں۔ اسپینی اوسا نے پایا کہ راجا سری پادا کے دربار میں دو ایسی چیزیں بھی موجود تھیں جو اس وقت سوائے یورپ کے کہیں دستیاب نہیں تھیں۔ ان میں سے ایک چینی کے منقش ظروف تھے جو بادشاہ کے تخت کے قریب قرینے سے رکھے تھے۔ دوسرے وہ دھوپ کے چشمے تھے جنہیں بعض درباریوں نے آنکھوں پر لگا رکھا تھا۔ دربار میں ان دونوں چیزوں کی

اندازِ بیاں اور......

ہمارے ہاں کھانوں کو چٹ پٹا اور لذیذ بنانے کے لیے جتنے مصالحے بلکہ گرم مصالحے استعمال ہوتے ہیں دنیا میں کہیں اور نہیں ہوتے۔ اس کے ساتھ برصغیر میں روٹی بھی کئی قسموں کی ہوتی ہے۔ تندوری روٹی، نان، تافتان، روغنی نان، پراٹھے اور پھلکے۔

ہمارے ہاں سے جو پاکستانی حج پر جاتے ہیں۔ ان میں سے کئی لوگ توے ساتھ لے جاتے ہیں کہ ہاتھ کی پکی ہوئی روٹی کے بغیر ان کا گزارہ نہیں ہوتا۔ ایسی ہی فیملی کا ذکر ہے، جس کے افراد پھلکوں کے عادی تھے لیکن توا ساتھ لے جانا بھول گئے۔ وہاں جا کر پہلی فکر یہ ہوئی کہ توے کا بندوبست کیا جائے، دو تین پھرتیلے آدمی توے کی خرید پر مامور کیے گئے۔ انہوں نے پہلے توے کی عربی معلوم کرنے کی کوشش کی مگر مایوسی ہوئی۔ بازار میں جا کر ہاتھ کے اشارے سے گول گول چیز خریدنے کی خواہش ظاہر کی جس پر روٹی پکائی جا سکے۔ ان اشاروں کنایوں سے مخاطب یہ سمجھے کہ شاید انہیں روٹی درکار ہے۔ کسی نے تندور کی راہ دکھائی اور روٹی کی عربی بتائی۔ ''خبز'' لیکن انہیں ''خبز'' نہیں خبز بنانے کے لیے توے کی تلاش تھی۔ تھک ہار کر انہوں نے برتنوں کی دکان ڈھونڈنا شروع کی کہ وہاں توے پر نظر پڑی تو خرید لیں گے۔ خاصی جدوجہد کے بعد ایک دکان پر توا نظر آیا تو خرید لیا۔ چلتے ہوئے دکاندار سے ٹوٹی پھوٹی عربی زبان میں پوچھا۔ ''اسے عربی زبان میں کیا کہتے ہیں؟''

جواب ملا ''توا''

(ابن انشاء کی کتاب سے اقتباس)

مرسلہ: رانا محمد شاہد

www.pdfbooksfree.pk

موجودگی اس بات کا ثبوت تھا کہ راجا کا یورپین سے براہِ راست نہیں تو بلواسطہ تعلق ضرور تھا۔ اسپینی اوسا نے آگے بڑھ کر راجا کو تعظیم دی۔ اس نے چینی کی ایک صراحی، چند گلاس اور کپڑے کے دو ریشمی تھان راجا کی خدمت میں بطور نذر پیش کیے۔ اسپینی اوسا نے اپنے مترجم کے ذریعے راجا سے بات چیت کی۔ اس نے جوآؤ زیٹو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ان کے کپتان نے اپنے بیٹے کو بادشاہ کی خدمت میں تحائف دے کر روانہ کیا ہے۔ راجا نے غور سے ننھے جوآؤ زیٹو کی طرف دیکھا اور اسپینی اوسا سے برونائی آنے کا مقصد دریافت کیا۔ اسپینی اوسا نے راجا کے درباریوں پر نظر ڈالتے ہوئے بہ آواز بلند کہا کہ وہ لوگ اسپین کے بادشاہ چارلس اول کی طرف سے برونائی کے لیے دوستی کا پیغام لے کر آئے ہیں۔

پیگافی ٹا کے مطابق جیسے ہی ان کے مترجم نے تعارفی جملے دہرائے راجا اور اس کے دائیں بائیں کھڑے چند معزز درباری چونک سے گئے۔ راجا نے پہلے ہسپانوی مہم جوؤں اور پھر اپنے دائیں طرف ہاتھ باندھے کھڑے ایک فوجی افسر کی طرف دیکھا۔ افسر لپک کر راجا کے قریب گیا۔ اس نے کچھ دیر تک راجا کے سر سے سر جوڑ کر کھسر پھسر کرنے کے بعد اسپینی اوسا سے پوچھا کہ وہ پرتگال کے بارے میں کیا جانتا ہے؟ اس اچانک سوال پر اسپینی اوسا اور ایل کانو دونوں ہی چونک گئے۔ اسپینی اوسا کے دماغ نے تیزی سے سوچنا شروع کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ برونائی کے راجا کو کنگڈم آف ملاکا میں پرتگالی بیڑے کی سرگرمیوں کا مکمل علم تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ راجا نے پرتگالیوں سے کوئی تجارتی معاہدہ کر رکھا ہو۔

اسپینی اوسا نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور راجا کو بتایا کہ پرتگال، اسپین کے مقابلے میں ایک چھوٹا ملک ہے اور اس کی فوج کی ہسپانوی فوج کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اسپینی اوسا کا جواب سن کر راجا نے کچھ دیر تک اپنے مشیروں سے بات چیت کی جس کے بعد ایک فوجی افسر نے ہسپانوی وفد کو اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ کچھ ہی دیر میں وہ لوگ ایک چھوٹے لیکن آراستہ کمرے میں موجود تھے۔ فوجی افسر نے اسپینی اوسا اور اس کے ساتھیوں کو وہیں انتظار کرنے کی ہدایت کی اور پیگافی ٹا سمیت باقی کے لوگوں کو لے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ کمرے میں کئی گھنٹے تک بھوکے پیاسے اکیلے رہنے کے بعد اسپینی اوسا کو اندازہ ہوگیا کہ ان کے ساتھ کوئی انہونی ہو چکی تھی۔

اسپینی اوسا نہیں جانتا تھا کہ برونائی کے راجا سعید اور اس کے حکام نے عربوں کے توسط سے پرتگال اور کی باہمی چپقلش کے قصے سن رکھے تھے۔ وہ جانتے پرتگال رقبے کے لحاظ سے اسپین سے کم لیکن یورپ سے بڑی فوجی قوت تھی۔ راجا اور اس کے حکام بیڑے کے ہی انتظار میں تھے۔ درحقیقت انہو ہسپانوی مہم جوؤں کا پرتگالی تاجر سمجھ کر استقبال بھرے دربار میں اسپینی اوسا کے منہ سے سچ سن کر حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ راجا نے اپنے فوجی مشیرو باز پرس کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ پرتگالیوں کی آمد اُن کے حریفوں کی برونائی آمد اُس کی ریاست کے نیک شگون نہیں تھا۔

☆☆☆

پیگافی ٹا نے بندرگاہ واپس پہنچ کر کاروال ہو کو بتا راجا نے ان کے باقی ساتھیوں کو یرغمال بنالیا ہے۔ وہ ہے کہ اگر ہم اپنے گرفتار ساتھیوں کی سلامتی چاہتے وہاں سے فوراً روانہ ہوجائیں۔ برونائی میں پُرجوش اس کے بعد کاروال ہو کو راجا سری پادا سے اس سلوک کی تو میں تھی۔ وہ راجا کے رویے پر الجھن کا شکار تھا۔ کچھ کی سوچ بچار کے بعد کاروال ہو اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ تجربہ کار ساتھیوں بشمول اپنے حقیقی بیٹے کو برونائی میں چھوڑ کر نہیں جاسکتا تھا۔ اس نے اپنے عملے کو بحری جہازوں تک محدود رہنے کی ہدایت کرتے ہوئے فی الحال دیکھو اور انتظار کرو کی حکمتِ عملی اپنانے کا فیصلہ کیا۔ یہ رات خیریت گزر گئی تاہم اگلی صبح ملاحوں نے دیکھا کہ مقامی بحریہ جنگ جہازوں نے انہیں گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ کچھ دور پر سو سے زیادہ سدھائے ہوئے ہاتھی بھی کھڑے جھوم رہے تھے۔ ہاتھیوں پر مسلح تیر انداز بیٹھے تھے جبکہ ان کے آگے قطار در قطار آتشی گولہ پھینکنے والی توپیں بھی کھڑی تھیں۔ کاروال ہو کو یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ یہاں دوبدو مقابلے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جہاں تک انداز وں اور جنگ بحری جہازوں کا سوال تھا تو انہیں سنبھالا جاسکتا تھا لیکن اصل مسئلہ خشکی پر موجود ان 62 توپوں کا تھا جن کی تعداد ہسپانوی بحری جہازوں پر موجود توپوں سے دو گنا زیادہ تھی۔ مقامیوں کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ کچھ کر دکھانے کے موڈ میں تھے۔

کاروال ہو نے فوری طور پر اپنے بحری جہازوں پر جھنڈا لہرانے کا حکم دیا۔ اس دوران ایک جنگ جہاز دھیرے دھیرے آگے بڑھتا ہوا ٹرینی ڈاڈ کے قریب آگیا۔ جنگ کے کھلے حصے میں کھڑے ایک مقامی فوجی افسر نے برونائی کی بحریہ کے سپہ سالار کے طور پر اپنا تعارف کرواتے ہوئے کاروال ہو سے مطالبہ کیا کہ وہ فوری طور پر برونائی کی حدود سے باہر چلا جائے۔ کاروال ہو نے اپنے ترجمان کے ذریعے مقامی سپہ سالار سے درخواست کی کہ اسے اپنے بحری جہازوں کی مرمت کے لیے تھوڑی سی مہلت دی جائے۔ اس نے شراب کے نشے میں دھت مقامی سپہ سالار کو اس رعایت کے بدلے کچھ تحائف دینے کی پیش کش کی۔

کاروال ہو کی پیش کش سن کر فوجی افسر کی رال ٹپکنے لگی۔ اس نے ترنگ میں آکر کہا کہ وہ راجا سری پادا کا قریبی رشتے دار ہے اور اس ناتے وہ کسی طور راجا سے کم تر رتبے کا نہیں ہے۔ یہ انکشاف سن کر کاروال ہو کی آنکھیں چمک اٹھیں اس نے خوشامدانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے راجا کے رشتے دار کو شیشے میں اتارنا شروع کردیا۔ کچھ ہی دیر میں صورتِ حال یہ بنی کہ مقامی سپہ سالار اپنے پانچ ساتھیوں کے ساتھ ٹرینی ڈاڈ کے ایک تہ خانے میں موجود تھا۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور منہ سے مغلظات کا طوفان جاری تھا۔ کاروال ہو نے نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا لیکن اس نے انہیں دھمکانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ کاروال ہو نے ایک طویل سانس لی۔ اپنی بغل میں اڑسا ہوا پستول نکالا اور مقامی سپہ سالار کے قریب فرش پر بیٹھے اس کے ایک ساتھی کو گولی ماردی۔ فرش پر تڑپتے اپنے ساتھی کا حشر دیکھ کر مقامی سپہ سالار کی چلتی زبان رک گئی اس نے تھوک نگل کر کاروال ہو کی طرف دیکھا اور مزید انکشاف کیا کہ اس کا تعلق فلپائن کے جزیرے لوزون کی فوج سے ہے۔ لوزون کا بادشاہ اور وہ راجا سری پادا ایک دوسرے کے قریبی رشتے دار ہیں۔ اس نے کاروال ہو کو مشورہ دیا کہ وہ ان کی گرفتاری کی اطلاع مقامی حکام تک پہنچا دے تو راجا اس کے بدلے ان کے یورپین ساتھیوں کو رہا کردے گا۔

کاروال نے مقامی سپہ سالار کے مشورے پر عمل کیا۔ اگلی صبح اس نے یہ دیکھ کر سکون کی سانس لی کہ نہ صرف بندرگاہ میں کھڑے ہاتھی اور ان کے آگے قطار در قطار رکھی توپیں وہاں سے ہٹالی گئی تھیں بلکہ ان کے بحری جہازوں کو گھیرے میں لیے جنگ بھی وہاں سے غائب تھے۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کے ہاتھ ترُپ کا پتا لگ چکا تھا۔ اب کاروال ہو اور مقامی حکام کے درمیان بات چیت کا آغاز ہوا۔ کاروال ہو نے مطالبہ کیا کہ مقامی یرغمالیوں کے بدلے نہ صرف اس کے ساتھیوں کو رہا کیا جائے بلکہ تین خوبصورت عورتوں کو بھی ان کے حوالے کیا جائے۔ اپنے کپتان کے منہ سے عورتوں کا مطالبہ اس کے جہازرانوں کو ناگوار گزرا۔ انہیں مہم کے دوران میگلن کی دی گئی وہ ہدایت اچھی طرح یاد تھی جس میں اُس نے بحری جہازوں پر سیکس کو ممنوع قرار دیا تھا۔ آنے والے دنوں میں ہسپانوی ملاحوں اور برونائی کے حکام کے درمیان ایک دوسرے کے یرغمالیوں کو رہا کرنے سے متعلق بات چیت کسی نتیجے تک نہ پہنچی۔

جولائی 1521ء کے پہلے عشرے کے دوران کاروال ہو نے کچھ سونے کے سکوں اور خوراک کے بدلے ایک مقامی کو رہا کردیا۔ اس دوران کاروال ہو اپنے ساتھیوں کے دباؤ پر عورتوں کی حوالگی کے مطالبے سے دستبردار ہوگیا تھا۔ وہ حیران تھا کہ راجا اس کے ساتھیوں کو رہا کرنے میں اتنی سستی سے کام کیوں لے رہا تھا؟ جولائی کے آخر میں اس کا صبر جواب دے گیا۔ اس نے راجا سری پادا کو پیغام بھجوایا کہ اگر اگلے دو دن کے اندر اندر اس کے ساتھی رہا نہ ہوئے تو وہ ایک ایک کر کے تمام یرغمالیوں کو قتل کردے گا۔ یہ دھمکی کام کر گئی۔ اسپینی اوسا اور ایل کانو کو بندرگاہ پہنچا دیا گیا اور کچھ ہی دیر میں دونوں طرف کے یرغمالیوں کا تبادلہ عمل میں آگیا۔ کاروال ہو نے غور کیا۔ اسے اپنا بیٹا کہیں دکھائی نہ دیا۔ وہ لپک کر اپنے ساتھیوں کے قریب پہنچا اور ان سے جوآؤ زیٹو کے بارے میں سوال کیا۔

''انہوں نے دونوں ہسپانوی سپاہیوں اور...... جوآؤ زیٹو کو...... گرفتاری کے فوراً بعد...... قتل کردیا تھا۔'' ایل کانو نے رک رک کر جواب دیا۔

جوآؤ زیٹو کی ہلاکت کی خبر سن کر ماحول افسردہ سا ہوگیا۔ کاروال ہو گہرے صدمے میں تھا۔ وہ اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھامے افسردہ سا ایک طرف بیٹھ گیا۔ مارٹن مینڈز کے بار بار یاد دلانے پر کہ انہیں یہاں سے روانہ ہوجانا چاہیے، کاروال ہو نے سر اٹھایا اور کہا کہ وہ برونائی آمد کے غلط فیصلے کی ذمّے داری قبول کرتے ہوئے مہم کے معاملات سے الگ ہوتا ہے۔ وہ لوگ لنگر اٹھادیں اور کھلے سمندر میں پہنچ کر اپنے نئے قائد کا انتخاب کرلیں۔

(جاری ہے)

www.pdfbooksfree.pk

سراب

راوی : شہباز ملک

تحریر: کاشف زبیر

قسط: 71

وہ پیدایشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری نہیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو ،مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب..... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر اسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

www.pdfbooksfree.pk

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

بابا کا اصرار تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج بھیج دیا جائے جبکہ میں آرمی میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ سویرا جو میرے دل کا حصہ تھی وہ میرے مقدر بنا دی گئی اور میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ میں نے کاروبار شروع کیا۔ ایک روز مری سے واپس آتے ہوئے نادر علی کا ہم ... ہو گیا پھر یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں ... دوست۔ پھر تو ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئی تھیں۔ میں دوبارہ وطن لوٹا تو فتح خان سے ٹکراؤ ہو ... اس کے آدمیوں کو شکست دے کر میں اندرون ملک آ گیا۔ آتے وقت میرے ہاتھ حکومت چین کا ایک بریف کیس آ گیا۔ جو شہلا کے ہاتھ ... گیا۔ شہلا کو راضی کیا کہ وہ مجھے بینک کے لاکر تک پہنچا دے تاکہ میں چائنیز بریف کیس حاصل کر لوں۔ ہم بینک میں سیف سے بریف کیس ... چکے تھے کہ شہلا نے فتح خان کے آدمیوں کو بلا لیا تھا۔ وہ مجھے یرغمال بنا کر فتح خان کے گھر میں لے آئی۔ فتح خان نے مجھے مجبور کر دیا کہ ... حاصل کرنے کے لیے مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کر کے دینے ہوں گے، میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ فتح خان، برٹ شا کو ... پاگل ہو چکا تھا۔ پھر اس نے میری طرف سے میل کر کے ایمن کو بھی بلوا لیا۔ فتح خان کے آدمیوں پر فائرنگ شروع ہو گئی۔ برٹ شا نے ... پستول سے فتح خان کو نشانے پر لیا تھا کہ اس کے آدمی نے برٹ شا کو گولی مار دی۔ مرتے وقت برٹ شا بڑبڑایا ”نارتھ...... ہکسٹ“ دم توڑ ... برٹ شا کی آواز صرف میں نے سنی تھی، تھوڑی دیر میں اندازہ ہو گیا کہ فتح خان نے اندازہ لگا لیا ہے کہ اس پوری کارروائی میں میرا ہاتھ ہے ... مائیک سے اعلان ہوا کہ جو بھی ہے، وہ ہاتھ اٹھا کر باہر آ جائے۔ وہ راجا صاحب کے آدمی تھے۔ وہاں سے میں محل میں آیا۔ وہاں ایمن بھی ... تھی۔ اگلے دن ہم پنڈی جانے کے لیے نکلے۔ راستے میں فتح خان نے گھیر کر بے بس کر دیا اور ایمن کو خودکش جیکٹ پہنا دی جسے اتارنے کی کو ... کی جاتی تو دھماکا ہو جاتا۔ ہم عبداللہ کی کوٹھی میں اطلاع ملی کہ شہلا کا فون آیا تھا۔ میں نے اسے کال کر کے بریف کیس مانگا۔ اس نے بریف ... دینے کے لیے ویران جگہ مقرر کی۔ ہم وہاں پہنچے اور بریف کیس لے کر چلے تو مجھے شک ہوا اور میں نے بریف کیس ڈھلان پر رکھ دیا۔ وہ دم ... سے پھٹ گیا۔ ہم واپس ہو رہے تھے کہ وسیم کا فون آیا کہ سویرا کو فتح خان نے حویلی پہنچا دیا ہے۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر ... بم پھینک کر مجھے بے ہوش کر دیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کے تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل بھا ... جیپ تک پہنچا تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ کرنل زروسکی نے ہم دونوں کو پکڑ لیا۔ وہ مجھے پھر سے انڈین آرمی کی تحو ... میں دینا چاہتا تھا۔ میں نے کرنل کو زخمی کر کے بساط اپنے حق میں کر لی۔ زخمی فتح خان اور زروسکی کو لے کر چلا۔ راستے میں فتح خان کو اتار دیا۔ کچھ ... دور جانے کے بعد ایک کوٹھی نظر آئی جو ایک ملیٹری آفیسر کی تھی۔ میں نے اسے حالات بتا کر مدد طلب کی آفیسر زروسکی کو ملیٹری پولیس کے حوالے کرنے چلا گیا تھا کہ کوٹھی پر حملہ ہو گیا۔ میں نے حملہ پسپا کیا۔ مجھے اعلیٰ جنس والے ساتھ لے گئے۔ انہی لوگوں نے مجھے پنڈی پہنچانے کا انتظام کر دیا۔ میں دوستوں کے درمیان آ کر ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی کہ ایک کوٹھی میں بم دھماکا۔ کوٹھی نادر علی کی تھی جسے کسی نے تباہ کیا تھا۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ مجھے شہلا کی تلاش تھی۔ اس لیے نادر کی کوٹھی کی جانب توجہ دی تبھی خبر ملی کہ شہلا کسی صابر نا ... شخص سے ملنے جا رہی ہے۔ میں دوستوں کے ساتھ اس کی تلاش میں نکل پڑا۔ کچھ کے ذمے کام یہ لگایا کہ وہ صابر کو پکڑ لیں۔ صابر تو پکڑ میں آ گیا مگر شہلا نکل گئی۔ صابر نے بتایا کہ شہلا کالی کوٹھی میں ملے گی۔ ہم وہاں پہنچے تو شہلا آخری سانسیں لے رہی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ مونا وغیرہ کو حویلی بھیج دیا جائے۔ ہیلی کاپٹر ہائر کیا۔ جیسے ہی چوپر بلند ہوا اس پر فائرنگ شروع ہو گئی جو ایک ریموٹ کنٹرول گن سے کی جا رہی تھی۔ یہ کام فاضلی کا تھا، ہم نے اسے اغوا کر لیا، اسے تہ خانے میں قید کر کے باہر نکلے۔ مجھے خیال آیا کہ ایک دو جگہیں مزید ہونی چاہیے جہاں ہم ٹھہر سکیں۔ اخبار میں ایک اشتہار نظروں سے گزرا جس میں فرنشڈ مکان کرائے پر دینے کی بات کی گئی تھی۔ ہم پتے پر جا پہنچے۔ مکان پسند آیا اور اسے دس لاکھ ایڈوانس دے کر لے لی۔ مگر اگلے دن سے مکان مالک اشفاق احمد نظر نہیں آیا۔ اس کی نگرانی کے لیے عبداللہ نے ایک آدمی کو لگا دیا۔ پھر خود بھی رات میں وہاں پہنچا۔ تبھی اندر سے ایک آدمی بھاگتا ہوا نکلا تھا کہ افنان احمد نے اس پر فائر کر دیا پھر اسے گھسیٹتا ہوا اندر لے گیا۔ دبے قدموں میں بھی اندر آ گیا۔ ایک کمرے میں تہ خانہ نظر آیا میں اندر جھانک رہا تھا کہ تاریکی میں ایک شعلہ چمکا۔ شعلہ لائٹر کا تھا۔ مالک مکان افنان احمد نے مجھ پر گولی چلائی۔ کافی دیر کی کشمکش کے بعد میں نے اسے پکڑ لیا اور گاڑی میں ڈال کر حویلی کے لیے نکل پڑا۔ فاضلی قید میں تھا اور وسیم اسے ہیروئن کا انجکشن لگا کر عادی بنا رہا تھا۔ افنان احمد نے بتایا کہ وہ کسی بڑے آدمی کو پکڑتا ہے اور اس کے گھر پر قبضہ کر کے دس بیس لاکھ کی جعل سازی کر لیتا ہے۔ میں عبداللہ سے ملنے جا رہا تھا کہ ڈی ایس پی اکرم چشتی نے مجھے گرفتار کیا اور بے پناہ تشدد کے بعد مرشد کے ہاں پہنچا دیا۔ میں نے مرشد کو یرغمال بنا کر وہاں سے نکلنا چاہا تھا کہ فاضلی نمودار ہوا اور اس نے میرے سر پر وار کر دیا۔ چوٹ کی وجہ سے میرا سر گھوم رہا تھا۔ مجھے جو عقل سے عاری بنانے کا انجکشن لگا تھا وہ بے اثر ثابت ہوا مگر میں نے عقل سے عاری بنے رہنے کی اداکاری شروع کر دی۔ فاضلی نے مجھے اور ایک لیڈی ڈاکٹر کو قید کر لیا تاکہ وہ مجھ پر نظر رکھ سکے۔ میں وہاں سے فرار ہونے لگا تو لیڈی ڈاکٹر ماری گئی۔ میں نے فاضلی کو زخمی کر دیا مگر وہ ہوش میں آتے ہی مجھے جیپ سے کچلنے کی کوشش کرنے لگا۔

اب آگے پڑھیں

بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جیپ کا طاقتور انجن غرایا۔ اس نے پہلے نومی کی لاش کو روندا اور پھر وہ جیپ میری طرف کسی خون آشام درندے کی طرح لپکی۔ میں ذرا ترچھا ہوا کہ تصادم کی شدت کم کر سکوں۔ مجھے بس اتنی ہی مہلت ملی تھی۔ اس کے باوجود جیپ کی ٹکر نے مجھے معمولی کھلونے کی طرح ہوا میں اچھال دیا اور میں اُڑ کر عقب میں موجود ایک درخت کے تنے سے کمر کے بل ٹکرایا تھا اور میری کمر میں شدید تکلیف کے ساتھ ایک چمک سی اٹھی جو ذہن تک گئی تھی۔ یہ ایسی تکلیف تھی جیسے کسی نے میری کمر سے بجلی کا ننگا تار لگا دیا ہو۔ درخت سے ٹکرا کر میں نیچے گرا اور پھر الٹ کر درخت کے پیچھے چلا گیا۔ یہی وجہ تھی کہ میں جیپ اور درخت کے درمیان آنے سے بچ گیا۔ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ میں درخت کے پیچھے کس طرح چلا گیا تھا۔ جیپ آ کر درخت کے تنے سے ٹکرائی اور تصادم سے اس کا بونٹ اوپر اٹھ گیا تھا۔

یہ پیپل کا مضبوط تنے والا درخت تھا ورنہ کوئی عام درخت ہوتا تو یقیناً گر جاتا۔ جیپ بہت قوت سے ٹکرائی تھی کیونکہ فاضلی مسلسل ایکسی لیٹر دے رہا تھا اور جیپ نے جس رفتار سے مجھے ٹکر ماری تھی وہ اس سے زیادہ رفتار سے آ کر درخت سے ٹکرائی تھی۔ دھماکا یقیناً شدید تھا لیکن مجھے دھماکا سننے کا ہوش کہاں تھا؟ میرے اپنے ہوش اُڑے ہوئے تھے۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن مجھ سے اٹھا نہیں گیا تھا۔ ریڑھ کی ہڈی پر لگنے والی چوٹ نے فی الحال مجھے ناکارہ کر دیا تھا۔ میں رینگ کر پیچھے ہٹنے لگا۔ اس درخت کے پیچھے کئی اور درخت تھے اور جیپ آنے کی گنجائش نہیں تھی۔ فاضلی نے جس طرح مجھ پر جیپ چڑھائی تھی صاف لگ رہا تھا وہ میرے خاتمے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے اس بات کی پروا بھی نہیں کی تھی کہ کچھ فاصلے پر درخت تھا اور جیپ اس سے ٹکراتی تو اسے بھی نقصان ہو سکتا تھا۔

میں پیچھے سرک رہا تھا کہ وہ جیپ سے اترا اور اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا چاقو تھا اسی سے اس نے نومی کا گلا کاٹا تھا۔ صاف ظاہر تھا انجکشن نے جس طرح مجھ پر اثر نہیں کیا تھا اسی طرح فاضلی پر بھی بے اثر رہا تھا اور اس نے میری ترکیب مجھ پر آزمائی تھی۔ وہ شرافت سے ظاہر کرتا رہا کہ اپنی شخصیت کھو بیٹھا ہے اور جب میں نے اسے جیپ کے عقبی حصے میں بند کیا تو اس نے کہیں چھپا ہوا یہ چاقو نکال لیا پہلے اپنی بندشیں کاٹیں اور پھر باہر نکل کر نومی کا گلا کاٹ دیا۔ میں پوری طرح جیپ کی تلاشی نہیں لے سکا تھا۔ فاضلی نے اسی کا فائدہ اٹھایا تھا۔ درخت اور جیپ کے تصادم میں اسے بھی چوٹ آئی تھی اور اس کے سر سے بہنے والا خون اس کے چہرے پر پھیل کر اسے خوفناک بنا رہا تھا۔ اس نے بھیڑیے کی طرح دانت نکالے۔

”شہباز تمہارا آخری وقت آ گیا ہے۔“

”ممکن ہے۔“ میں نے بدستور پیچھے سرکتے ہوئے جواب دیا۔ ”لیکن میں نے بہت سے لوگوں کے منہ سے آخری جملہ یہی سنا ہے اور اس کے بعد وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔“

”لیکن میں تمہیں مار کر مروں گا۔“ اس نے کہا اور میری طرف بڑھتا رہا۔ حالت اس کی بھی اچھی نہیں تھی کیونکہ وہ ڈگمگاتے قدموں سے آگے آ رہا تھا۔ میں بدستور پیچھے سرک رہا تھا۔ میں درخت سے ٹکرا کر گرا تو پستول نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ تصادم کے بعد میرے پاؤں سن ہو گئے تھے لیکن کچھ دیر بعد وہ حرکت کرنے لگے تھے۔ اس سے میرا یہ خدشہ دور ہو گیا کہ میری ریڑھ کی ہڈی کو کوئی ناقابل تلافی نقصان ہو گیا ہے۔ مگر ابھی میں اس قابل نہیں ہوا تھا کہ پیروں پر کھڑا ہو سکوں۔

”تم نے بیچاری نومی کو بھی مار دیا۔“ میں نے اس کی توجہ ہٹانے کے لیے کہا۔ ”وہ بے گناہ تھی۔“

”اسے مرنا ہی تھا وہ ہمارے خلاف گواہ تھی لیکن میں نے سوچا اسے تمہارے ساتھ ہی ماروں گا۔“

جیپ نے درخت سے ٹکرانے سے پہلے نومی کے بے جان جسم کو بھی روندا تھا۔ اسے تو فرق نہیں پڑا کیونکہ وہ میرے سامنے ہی دم توڑ چکی تھی البتہ اس کی لاش کی حالت بری ہو گئی ہو گی۔ میں زمین پر سرک رہا تھا اور فاضلی سست قدموں سے میری طرف بڑھا آ رہا تھا۔ چند لمحوں میں وہ میرے پاس آ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں موجود چاقو زیادہ بڑا نہیں تھا اس کا بلیڈ مشکل سے چار انچ چوڑا تھا لیکن یہ دونوں طرف سے ریزر جیسی دھار والا چاقو تھا اور مشاق ہاتھوں میں نہایت مہلک ہتھیار کی حیثیت رکھتا تھا۔ میں اپنا دفاع کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ فاضلی نے خود پر قابو پا لیا تھا اور اس کی سانپ جیسی تیز آنکھیں مجھ پر مرکوز تھیں۔ وہ یقیناً سوچ رہا تھا کہ کس زاویے سے حملہ کرے کہ مجھے مدافعت کا موقع نہ ملے۔ اسے دھوکے میں رکھنے کے لیے میں اپنی حالت کچھ زیادہ ہی خراب کر کے پیش کر رہا

www.pdfbooksfree.pk

تھا۔میری آنکھیں نیم وا تھیں اور سر یوں اٹھا تھا جیسے میرے لیے یہ چھوٹا سا کام بھی آسان نہ ہو۔مگر فاضلی جیسے عیار آدمی کو دھوکا دینا آسان نہیں تھا۔اس نے پہلے بھی دھوکا نہیں کھایا تھا جب مرشد بھی مطمئن ہو گیا تھا کہ میں واقعی اپنے ہوش کھو بیٹھا ہوں۔

''شہباز تم مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔'' فاضلی نے اچانک کہا۔وہ رک گیا تھا۔''میرا خیال ہے تم اتنے کمزور نہیں ہو جتنا خود کو ظاہر کر رہے ہو۔''

میں چاہ رہا تھا کہ وہ میرے پاس آئے اور اس کے خبیث ذہن میں خیال نہ آئے کہ کیبن میں اس کے ساتھیوں کے ہتھیار موجود ہیں۔مگر ایسا لگ رہا تھا کہ میری یہ دعا قبول نہیں ہوئی تھی۔کیونکہ فاضلی رک گیا تھا اور سوچ رہا تھا۔''کیا....سوچ رہے ہو مرشد کی ناجائز اولاد۔'' میں نے اسے اکسانے کے لیے گالی دی۔''آؤ مجھے قتل کرو۔''

اس کا موڈ آف ہو گیا۔''بکواس مت کرو۔''

''تمہارے نام نہاد باپ کو تمہاری اصل ولدیت کا علم ہے؟''

''اسی نے مجھے بتایا تھا۔وہ بچپن سے مجھ سے خار کھاتا تھا، مجھے بلاوجہ مارتا تھا، نفرت کا اظہار کرتا تھا۔ایک دن جب میں جوان ہو گیا تھا تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تب اس نے بتایا کہ میں اصل میں مرشد کی اولاد ہوں۔''

''پھر تم نے کیا کیا؟''

''میں نے اس ذلیل شخص کو قتل کر دیا جو بے غیرت تھا۔''

''حالانکہ تمہیں مرشد کو قتل کرنا چاہیے تھا۔''

''میں اسے بھی قتل کروں گا لیکن ابھی نہیں۔جب میں اس کی ساری طاقت اور دولت حاصل کر لوں گا تب اسے قتل کروں گا۔''

''یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔'' میں نے کہا۔''جو شخص اپنے سگے بھائی کی پروا نہ کرے وہ اپنی ناجائز اولاد کی پروا کیوں کرنے لگا۔''

''اسے ابھی میرے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہے۔''

مجھے فاضلی کی بات پر ہنسی آئی۔وہ مرشد جیسے عیار آدمی کو اتنا انجان سمجھ رہا تھا اسے معلوم نہیں تھا کہ مرشد خود بے خبر بن کر اسے بے وقوف بنا رہا ہے۔لیکن میں نے فاضلی کو بتایا نہیں اس کے بجائے میں نے کہا۔''تمہاری حالت بتا رہی ہے کہ انجکشن نے تم پر بھی اثر نہیں کیا ہے؟''

''میرا خیال ہے یہ سیٹ کسی وجہ سے بیکار ہو گیا شاید مرشد نے اسے رکھنے میں احتیاط نہیں کی اور دوا ... ہو گئی۔''

''تم نے میری ٹوپی میرے سر رکھ دی اور کارآمد ... رہے۔'' میں نے کہا۔''اب انتظار کس بات کا ہے۔''

فاضلی عیاری سے مسکرایا۔''میرا خیال ہے اس ... میں بھی تمہارے نزدیک آنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔''

''مجھے افسوس ہے میں اب تک تمہیں بہادر سمجھتا تھا۔''

''میں بزدل ہی بھلا۔'' اس نے جواب دیا اور کیبن کی طرف جانے لگا۔اس کا ارادہ یقیناً وہاں سے گن لا کر مجھے دور سے شوٹ کرنے کا تھا۔اس حالت میں بھی وہ میرے پاس آنے کو تیار نہیں تھا جب کہ اس کے ... میں چاقو تھا اور میں قطعی نہتا تھا۔جیسے ہی وہ نظروں سے اوجھل ہوا میں حرکت میں آ گیا۔اتنی دیر میں میرا جسم ... حد تک میرے قابو میں آ گیا تھا۔مگر میں خاصی مشکل سے کھڑا ہو سکا تھا، ریڑھ کی ہڈی اور کمر میں خوفناک قسم کی لہریں اٹھ رہی تھیں اور کھڑے ہونے پر ایک لمحے کے لیے وہی بجلی والی چمک ہوئی جو دماغ تک گئی تھی۔... تلاش کرنے میں وقت کا ضائع ہوتا اس لیے میں تیزی سے کیبن سے دور جانے لگا۔میری عافیت اسی میں تھی کہ فاضلی سے ممکن حد تک دور رہوں۔درختوں کا یہ ... زیادہ بڑا نہیں تھا۔

اب تک میں تنوں اور شاخوں کا سہارا لے کر چل رہا تھا لیکن جھنڈ سے باہر آ کر جب مجھے اپنے بل بوتے پر چلنا پڑا تب مجھے صحیح معنوں میں تکلیف کا سامنا کرنا پڑا تھا۔حالات اور مصائب نے مجھے غیر معمولی قوتِ برداشت نہ دی ہوتی تو اس وقت میری چیخیں نکل رہی ہوتیں۔ذرا آگے جھاڑیاں تھیں ایک بار میں ان میں گھس جاتا تو فاضلی کے لیے مجھے تلاش کرنا آسان نہ رہتا۔اس لیے میں تکلیف کو نظر انداز کر کے ہر ممکن تیزی سے چل رہا تھا۔فاضلی کسی لمحے بھی واپس آ سکتا تھا اور مجھے جھنڈ میں نہ پا کر زخمی بھیڑیے کی طرح میری تلاش میں نکل کھڑا ہوتا۔اب اس میں شبہ نہیں تھا کہ وہ مجھے قتل کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا اور دیکھتے ہی گولی مار دیتا۔میری طرف سے ہر ممکن تیزی کے باوجود فاضلی اس وقت نمودار ہوا جب میں جھاڑیوں میں داخل ہو رہا تھا اس نے مجھے دیکھتے ہی شاٹ گن سے فائر کیا اور گولی نہ جانے کہاں گئی۔درمیان میں کوئی دو سو گز کا فاصلہ آ گیا تھا اس لیے شاٹ گن غیر مؤثر تھی۔

اس کے اگلے فائر سے پہلے میں جھاڑیوں میں داخل ہو گیا تھا۔مگر اب یہ حصار میرے لیے اتنا کارآمد نہیں رہا تھا کیونکہ فاضلی نے دیکھ لیا تھا کہ میں کہاں ہوں اور وہ سیدھا یہیں آتا اگر میں اس کی لاعلمی میں جھاڑیوں تک آ جاتا تو اسے وسیع رقبے پر پھیلی جھاڑیاں کھنگالنا پڑتیں اور میری بچت کا امکان بڑھ جاتا لیکن اب وہ سیدھا یہیں آتا اور میرے پاس چانس کم رہ گیا تھا۔مجھے جلد از جلد کوئی جگہ تلاش کرنی تھی جہاں میں کچھ دیر کے لیے پناہ لے سکوں۔اس حالت میں میرے لیے مزید بھاگ دوڑ محال ہوتی جا رہی تھی۔میں جھاڑیوں میں کوئی ایسی جگہ دیکھ رہا تھا جہاں میں چھپ سکوں اور فاضلی کو شک بھی نہ ہو۔ایک چھوٹی اور کم اونچی جھاڑی کے پاس سے گزرتے ہوئے میرا پاؤں کسی گڑھے میں گیا اور میں گرتے گرتے بچا تھا۔میں نے جھک کر دیکھا۔جھاڑی ایک گڑھے کی تہ میں اگی ہوئی تھی اور یہی وجہ تھی کہ اس کی اونچائی کم لگ رہی تھی۔جانوروں نے اس کے پتے چر لیے تھے اس لیے اس کا حجم بھی کم تھا اور یہ بظاہر یہ چھوٹی جھاڑی لگ رہی تھی۔لیکن گڑھا پوری طرح چھپ گیا تھا اور جب تک بالکل جھک کر نہ دیکھا جائے گڑھا نظر نہیں آتا۔

مجھے یہ جگہ مناسب لگی اور میں کوشش کر کے اس گڑھے میں داخل ہو گیا جس کی تہ سے جھاڑی اگی تھی۔یہاں جگہ بہت کم تھی مجھے اپنا جسم کمان کی طرح رکھنا پڑا تب کہیں جا کر میں گڑھے میں پورا آیا تھا۔لیکن بیٹھنے کی وجہ سے تکلیف بڑھ گئی تھی اس لیے میں یوں لیٹ گیا جیسے آدمی سردی لگنے پر نیند کے دوران کروٹ لے کر اور گھٹنے سکیڑ کر سینے سے لگا لیتا ہے۔اس پوزیشن میں مجھے آرام ملا تھا اور میں نسبتاً آسانی سے گڑھے میں سما گیا تھا۔میری کوشش تھی کہ میری کسی حرکت سے جھاڑی نہ ہلے۔فاضلی یقیناً جھاڑیوں میں آ چکا تھا اور مجھے تلاش کر رہا ہو گا۔جب میں اسے نظر نہیں آتا تو وہ سمجھ جاتا کہ میں کہیں چھپ گیا ہوں اور یہ سوچ کر وہ مجھے جھاڑیوں میں تلاش کرتا۔کچھ دیر بعد اس کے قدموں کی آواز آنے لگی اور پھر اس کی آواز آئی۔

''شہباز مجھے معلوم ہے تم یہیں کہیں چھپے ہوئے ہو۔''

میں نے جواب میں دل ہی دل میں کہا۔''اللہ تمہیں عقل سے محروم کرے اور گمراہی اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔''

''میں جلد تمہیں تلاش کر لوں گا اور کتے کی موت مار دوں گا۔'' فاضلی بولا۔وہ جھاڑیاں ہٹا ہٹا کر دیکھ رہا تھا اور رفتہ رفتہ اس جھاڑی کے پاس آتا جا رہا تھا جس کے نیچے میں موجود تھا۔''کاش کہ میں نے اس زہریلے ناگ کو زندہ پکڑنے کے بجائے اسی وقت اس کا سر کچل دیا ہوتا۔'' میں نے سوچا لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ زندگی اور موت کا فیصلہ تو اللہ کرتا ہے اگر فاضلی کی موت آ گئی ہوتی تو وہ یقیناً میرے ہاتھ سے مارا جا چکا ہوتا لیکن ابھی اس کی موت کا وقت نہیں آیا تھا۔فاضلی نزدیک آتا جا رہا تھا اور وہ جس طرح ایک ایک جھاڑی کو ٹٹول رہا تھا مجھے قطعی خوش فہمی نہیں تھی کہ وہ اس جھاڑی کو دیکھے بغیر چھوڑ دے گا۔اس نے میری حالت دیکھ لی تھی اور جان گیا تھا کہ اس حالت میں، میں زیادہ دور نہیں جا سکتا تھا جب کہ میں پہلے ہی اپنی ہمت سے بڑھ کر چل چکا تھا اس لیے لازمی کہیں آس پاس ہی چھپا ہوں گا۔اس لیے وہ سکون سے ایک ایک جھاڑی ٹٹول رہا تھا اس یقین کے ساتھ کہ جلد یا بدیر وہ مجھ تک پہنچ جائے گا۔مگر قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔

فاضلی اس جھاڑی کے اتنے پاس آ گیا تھا کہ اس کے جوتے بھی دکھائی دے رہے تھے۔وہ شاٹ گن کی نال سے جھاڑیاں ٹٹول رہا تھا پھر وہ جھاڑی کے پاس آ کھڑا ہوا میں نے سانس بھی روک لیا تھا۔وہ شاٹ گن کی نال سے پتے ہٹا رہا تھا اور کسی بھی لمحے کوئی شاخ ہٹاتا اور اسے میرا دیدار نصیب ہو جاتا۔اس کے بعد وہ مارے خوشی کے فائر کرنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہ کرتا۔مگر اس سے پہلے کہ وہ جھاڑی ہٹاتا کسی کے للکارنے کی آواز آئی۔''اوئے یہاں کیا کر رہا ہے؟''

میرا دل ڈوب گیا۔کیا فاضلی کے مزید کچھ آدمی آ گئے تھے۔مگر فاضلی کا ردِعمل بالکل مختلف تھا۔اس نے بھڑک کر بولنے والے پر فائر کر دیا۔شاٹ گن اتنے قریب سے چلی کہ اس کے بارود کا دھواں مجھ تک آیا تھا۔کوئی چلایا اور جواب میں بیک وقت کئی گولیاں چلیں اور فاضلی لڑکھڑا کر نیچے گرا۔کوئی گولی اسے لگی تھی کیونکہ اس کی کراہ میں اذیت شامل تھی۔میں نے ذرا سا اوپر کر کے دیکھا تو فاضلی میرے بالکل سامنے زمین پر چت پڑا تھا اور اس کے سینے سے رہ رہ کر خون ابل رہا تھا۔گولی کسی قدر دائیں طرف لگی تھی اور یقیناً پھیپھڑوں میں گھس گئی تھی۔فاضلی نے سر گھمایا اور غالباً مجھے بالکل سامنے پا کر دم بخود رہ گیا تھا۔میں مسکرایا اور

www.pdfbooksfree.pk

آہستہ سے کہا۔

''میں نے کیا کہا تھا، میں نے کئی افراد کے منہ سے اپنی موت کی پیشگوئی سنی ہے اور وہ خود فوت ہو گئے شاید تم بھی ان میں شامل ہونے والے ہو۔''

فاضلی نے کوشش کر کے شاٹ گن اٹھانا چاہی لیکن اسی لمحے کسی نے اس کے ہاتھ پر لات ماری اور شاٹ گن دور جا گری۔ میں نے پھر سے خود کو سکیڑ لیا، مزید دبک گیا اس پر گولی چلانے والے آن پہنچے تھے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کون تھے۔ ان کی تعداد پیروں سے تین لگ رہی تھی۔ وہ ایک دوسرے کو الزام دے رہے تھے۔ ''تجھے کس نے کہا تھا گولی چلانے کو۔'' کوئی بولا۔

''تو کیا اسے پھول مارتا، حرامی نے بھی تو گولی چلائی تھی۔'' دوسرا بولا۔ ''بس مولا نے بچت کی۔''

''بچت کی اولاد، چودھری صاحب کو کیا جواب دے گا۔'' تیسرے نے کہا۔ ''ہم یہاں زمین دیکھتے ہیں بندے مارنے کے لیے نہیں ہیں۔''

''بکواس کیے جا رہے ہو، پہلے اس نے گولی چلائی تھی۔'' دوسرا بھنا گیا۔ ''چودھری صاحب نے یہ تو نہیں کہا ہے کہ کوئی گولی مارے تو بھی تم کچھ نہ کرو۔''

فاضلی ہاتھ کے اشارے سے ان لوگوں کو متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا غالباً وہ انہیں میرے بارے میں بتانا چاہتا تھا لیکن وہ آپس کی بحث میں الجھے ہوئے تھے۔ بالآخر فاضلی کا حوصلہ جواب دے گیا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ اچانک پہلے والے نے تشویش سے کہا۔ ''اوئے مجھے یہ بندہ جانا پہچانا لگ رہا ہے۔''

اب تیسرے کو یاد آ گیا۔ ''یہ تو مرشد بادشاہ کا آدمی ہے۔ ہاں یاد آ گیا فاضلی نام ہے اس کا....''

''مارے گئے۔'' پہلا کراہا۔ ''اب کیا جواب دیں گے اس کے بارے میں؟''

''اسے اٹھاؤ۔'' گولی چلانے والا پریشان ہو گیا۔ ''یہ مر گیا تو اور مصیبت آئے گی۔''

''مصیبت کے پُتر گولی چلانے سے پہلے سوچنا تھا۔'' تیسرا بولا۔ ان میں ایک مختصر سا جھگڑا ہوا جس میں ایک دوسرے کی ماں بہنوں کو بے تکلفی سے گھسیٹا گیا اور بالآخر مفاہمت ہو گئی۔ تینوں کو احساس تھا کہ انہوں نے مرشد کے خاص آدمی پر گولی چلا کر کتنی بڑی غلطی کی تھی اور وہ مر جاتا تو یہ غلطی نہایت سنگین ہو جاتی اور عین ممکن ہے انہیں اس کا تاوان اپنی جان کی صورت میں دینا پڑتا۔ اس لیے انہوں نے جل کر فاضلی کو اٹھایا اور وہاں سے رخصت ہو گئے۔ رخ کیبن سے مخالف سمت میں تھا۔ ان کی باتوں سے لگ تھا کہ وہ کسی چودھری کے کارندے تھے اور اس کی زمین حفاظت کے لیے یہاں موجود تھے۔ دوسرے ان کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ مرشد اور فاضلی سے واقف تھے اور مطلب تھا کہ میں مرشد کے علاقے میں ہی تھا۔ اس صورت میں میرا جلد از جلد یہاں سے دور نکل جانا لازمی تھا۔

جیسے ہی وہ فاضلی سمیت جھاڑیوں سے نکلے میں گڑھے سے نکل آیا۔ اتنی دیر آرام کرنے کے بعد میری حالت پہلے سے خاصی بہتر ہو گئی تھی۔ میں جھاڑیوں کی آڑ تک جھک کر چلتا رہا اگرچہ یہ پوز تکلیف دہ تھا لیکن کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ ممکن تھا کہ چودھری کے مزید کارندے تفتیش کے لیے اس طرف آ نکلتے اور میں ان کی نظروں میں آ جاتا۔ یہ تو واضح تھا کہ وہ فاضلی کی جانب کیے جانے والے فائر کی آواز سن کر آئے تھے۔ میں جھاڑیوں اور درختوں کے درمیان والا میدان تیزی سے طے کیا کیونکہ اسی میں مجھے دیکھ لیے جانے کا سب سے زیادہ خطرہ تھا لیکن خیریت رہی کسی طرف سے للکار سنائی نہیں دی۔ درختوں میں داخل ہو کر میں نے چند منٹ آرام کیا پھر جیپ کی طرف بڑھا۔ اگر وہ چلنے کے قابل تھی تو میں اس میں یہاں سے نکل سکتا تھا۔

مگر جیپ کی حالت دیکھ کر لگ رہا تھا کہ وہ چلنے کے قابل نہیں ہے۔ ٹکر سے ریڈی ایٹر ٹوٹ گیا تھا اور پانی بہہ چکا تھا۔ اس حالت میں اگر جیپ کا انجن اسٹارٹ بھی ہو جاتا تو چند منٹ سے زیادہ نہیں چل سکتا تھا اس کے بعد وہ سیز ہو جاتا۔ میں ذرا آگے آیا تو زمین پر پڑا پستول مل گیا۔ میری نظر نہیں پڑی تھی، وہ دھوپ میں چمکا تو مجھے پتا چلا۔ میں جھک کر اسے اٹھایا اور پھر جیپ کی طرف آیا۔ پچھلی نشست پر کھانے پینے کا سامان موجود تھا جو جھٹکے کی وجہ سے سیٹ سے نیچے گر گیا تھا۔ پانی کی بوتل محفوظ تھی اس کا ڈھکن بند تھا۔ اس لیے پانی بہہ جانے سے بچ گیا۔ میں نے ڈھکن کھول کر چند بڑے گھونٹ لیے تو میری حالت میں نمایاں بہتری آئی۔ کھانے کی باسکٹ بھی گر گئی تھی لیکن اس میں چیزیں محفوظ تھیں۔ میں نے باسکٹ اور پانی کی بوتل اٹھائی اور کیبن کی طرف آیا۔ میں نے جان بوجھ کر نوری کی لاش کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔

کیبن میں آ کر شازی کے دوسرے ساتھی کے جسم سے جیکٹ اور اس کے جوتے اتارے۔ مجھے ان دونوں چیزوں کی ضرورت تھی۔ موسم معتدل ہو گیا تھا لیکن مجھے سامان رکھنے کے لیے جیکٹ کی ضرورت تھی میرے لباس میں جیبیں نہیں تھیں اور جوتے میری ضرورت تھے، ننگے پاؤں میں زیادہ دور نہیں جا سکتا تھا۔ جیکٹ پہن کر میں نے جیبوں میں کھانے پینے کی چیزیں اور شاٹ گن کے اضافی بلٹ بھر لیے۔ پستول کے دو فاضل میگزین بھی ساتھ رکھ لیے تھے۔ پانی کی بوتل نصف ہو چکی تھی لیکن اب بھی اس میں ساڑھے تین لیٹرز کے قریب پانی موجود تھا۔ میں نے مزید پانی پیا کیونکہ میں بوتل ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ نہ جانے مجھے کتنی دیر بھٹکنا پڑے اس دوران میں یہی پانی میرے کام آتا۔ دونوں کے لباس سے میں نے رقم بھی نکال لی تھی نہیں اس کی ضرورت نہیں تھی۔ فسوس کہ ان میں سے کسی کے پاس موبائل فون نہیں تھا ورنہ وہ میرے کام آتا۔ ایک شاٹ گن فاضلی لے گیا تھا دوسری میں نے اٹھالی۔

باہر آیا تو نہ چاہتے ہوئے بھی میری نظر نوری کی لاش پر پڑ گئی۔ جیپ کے پہیوں نے اس کا جسم روند دیا تھا اور وہ کسی تڑی مڑی گڑیا کی طرح پڑی ہوئی تھی۔ میں نے اس کی مغفرت کی دعا کی اور وہاں سے چل پڑا۔ اس سے زیادہ میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ سورج کی پوزیشن سے میں نے مشرق کا تعین کیا۔ مغرب کی طرف پہاڑ تھے اور مشرق کی طرف مجھے کوئی نہ کوئی آبادی مل جاتی۔ اگر میں مرشد کے علاقے میں تھا تب بھی مجھے مشرقی کا ہی رخ کرنا تھا۔ میری حالت پہلے سے خاصی بہتر ہو گئی تھی لیکن کچھ دیر چلنے کے بعد کمر میں تکلیف شروع ہو جاتی اور مجھے رکنا پڑتا تھا۔ اپریل کا آغاز تھا اس لیے دھوپ میں شدت آ گئی تھی اور مجھے بار بار پیاس لگ رہی تھی۔ یہ اتنے عرصے تک پانی سے محرومی کا قدرتی نتیجہ بھی تھا اس لیے میں ہر پانچ چھ منٹ بعد ایک گھونٹ پانی پی رہا تھا اس سے میرے جسم میں پانی کی کمی رفتہ رفتہ دور ہو رہی تھی۔ ایک گھنٹے بعد میں نے ڈبل روٹی کا ایک توس کھایا۔ باسی ہونے سے اس کا ذائقہ کسی قدر بدلا تھا مگر مجھے ٹھیک لگا۔

جب دوبارہ روانہ ہوا تو دس منٹ بعد ایک کچی سڑک مل گئی۔ میں نے اس کچے راستے سے جان بوجھ کر اجتناب کیا تھا جس سے گزر کر فاضلی اور اس کے ساتھی کیبن تک آتے جاتے تھے۔ اگر فاضلی ہوش میں آ جاتا اور میرے بارے میں انکشاف کر دیتا تو چودھری کے آدمی یقیناً اسی طرف میری تلاش کرتے اس لیے میں ویران جگہوں سے گزرتا رہا۔ البتہ اس راستے پر آ کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ میں اس جگہ سے پانچ چھ کلومیٹرز دور نکل آیا تھا اور عین ممکن تھا کہ یہ وہ کچا راستہ نہ ہو۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور کچے راستے پر چل پڑا لیکن میں نے کان کھلے رکھے تھے اگر مجھے کسی گاڑی کی آواز سنائی دیتی تو میں راستہ چھوڑ کر نزدیکی جگہ پناہ لیتا جہاں گزرنے والوں کی نظر مجھے نہ دیکھ پاتی۔ لیکن خاصی دیر گزر جانے کے باوجود کوئی گاڑی تو کیا کوئی پیدل بندہ بھی نہیں ملا اور نہ ہی کسی آبادی کے آثار دکھائی دیے تھے۔

شام کے چار بج رہے تھے اور اب سورج مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ میں نے شازی کی کلائی سے گھڑی اتار لی تھی۔ اس سے وقت دیکھنے کی آسانی ہو گئی تھی۔ ساڑھے چھ بجے تک سورج غروب ہو جاتا اور تاریکی چھا جاتی اگر میں اس وقت تک کسی آبادی تک پہنچنے میں ناکام رہتا تو رات مجھے اسی ویرانے میں گزارنی پڑتی۔ لیکن مجھے اس کی زیادہ فکر نہیں تھی کیونکہ میرے پاس کھانا پانی تو تھا۔ میں آرام سے کل کا دن بھی گزار سکتا تھا۔ پانچ بجے ایک جگہ رک کر میں نے قبل از وقت ڈنر کیا کیونکہ اندھیرا چھانے کے بعد یہ کام ذرا مشکل ہو جاتا اور اس کا بھی امکان تھا کہ کھانے کی چیزیں خراب ہو سکتی ہیں۔ ویسے بھی کئی دن بھوکے رہنے کے بعد مجھے رہ رہ کر بھوک لگ رہی تھی اور مسلسل چلنے سے کھائی جانے والی چیزیں فوراً ہی ہضم بھی ہو رہی تھیں۔ سورج غروب ہونے کے بعد میں نے تقریباً تمام چیزیں ختم کر دی تھیں اور اب میرے پاس صرف پانی رہ گیا تھا۔ یہ بھی اب دو لیٹر رہ گیا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کمر کی تکلیف کم ہو گئی تھی مگر اب بھی چلتے ہوئے جھٹکا لگتا تو کمر میں چمک سی اٹھتی تھی۔ مجھے فاضلی کا خیال آیا۔ گولی اس کے سینے میں لگی تھی اور اس وقت وہ چند منٹ کا مہمان نظر آ رہا تھا لیکن اس کا بھی امکان تھا کہ فوری طبی امداد ملنے سے وہ بچ جائے۔ اس نے مجھے مارنے کی پوری کوشش کی تھی۔ بلکہ آخری لمحے تو وہ دیوانہ ہو گیا تھا۔ جیسے اپنی زندگی کی قیمت پر مجھے مار دینا چاہتا ہو۔ مگر ہوا یہ کہ قدرت نے میرے بجائے اس کا نام مرنے والوں میں شامل کر رکھا تھا۔ اس وقت جب بہ ظاہر وہ پوری طرح با اختیار تھا اور موت مجھ سے صرف ایک جنبش کے

www.pdfbooksfree.pk

فاصلے پر رہ گئی تھی تو اچانک تقدیر نے پلٹا کھایا۔ شاید فاضلی نے بھی نہیں سوچا ہوگا کہ گولی میرے جسم میں اترنے کے بجائے اس کے سینے میں اتر جائے گی۔ اس گولی نے اسے مجبور کر دیا ورنہ اس نے ہار نہیں مانی تھی اور آخری وقت میں بھی مجھے مارنے کی کوشش کی۔ وہ بھول گیا کہ مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہے۔

تاریکی چھانے کے بعد میں نے سفر کی رفتار سست کر دی تھی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ آج چاند کی سولہ یا سترہ تاریخ ہے اور کچھ دیر میں چاند طلوع ہو جائے گا تب میں زیادہ آسانی سے سفر کر سکوں گا اس لیے میں ایک جگہ رک گیا۔ جھاڑیوں اور گھاس میں رکنے کے بجائے میں نے ایک صاف جگہ منتخب کی جہاں سانپ یا کسی زہریلے کیڑے کے پائے جانے کے امکانات کم تھے۔ کئی گھنٹے کے مسلسل سفر نے مجھے تھکا دیا تھا اس لیے لیٹا تو پتا نہیں چلا کہ کب آنکھ لگ گئی۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ کوئی میرے پاس ہے کوئی بول رہا تھا۔ میرا ذہن چوکنا ہو گیا۔ جاگتے ہی مجھے اپنے پاس دو افراد کی موجودگی کا احساس ہوا لیکن میں نے حرکت سے گریز کیا پھر ایک سہمی ہوئی نسوانی آواز آئی۔ ''اماں اسے زندہ اے کہ مر گیا۔''

''چپ کر کم بختے۔'' دوسری عورت نے جو آواز سے عمر رسیدہ لگ رہی تھی اسے جھڑک دیا۔

''اماں دیکھ تو۔''

''نہ کوئی چکر نہ ہو، کوئی مار کر ڈال گیا ہو پولیس ہمیں پکڑ لے۔''

اتنی دیر میں مجھے پہلی بار کسی انسان سے واسطہ پڑا تھا۔ میں اچانک اٹھا تو دونوں عورتوں کی چیخ نکل گئی۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ''ڈرو نہیں، میں سورہا تھا۔ مسافر ہوں تھک گیا تو ادھر آنکھ لگ گئی۔''

''کہاں سے آرہا ہے۔'' بوڑھی عورت نے پوچھا۔

چاند نکل آیا تھا اور اس کی روشنی میں وہ دونوں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ جوان لڑکی یا عورت خود چاند سے کم نہیں تھی، وہ بوڑھی عورت کے پیچھے دبکی اپنی فسوں خیز آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

''مجھے راولپنڈی جانا ہے۔ یہاں پاس کوئی آبادی ہے جہاں سے مجھے پنڈی جانے کے لیے سواری مل جائے۔'' میں نے کہا۔

''پاس ہمارا گاؤں ہے۔'' لڑکی نے جرأت کر کے کہا۔ ''وہاں سے تانگا مل جائے گا۔''

''گاؤں کہاں ہے؟''

''اس ٹیلے کے پیچھے۔'' لڑکی نے جواب دیا۔ بوڑھی عورت خاموش تھی اور اسے لڑکی کا بولنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے کسی قدر سخت لہجے میں کہا۔ ''بس اب گھر چل....''

دونوں ٹیلے کی طرف چل پڑیں ان کے ہاتھوں میں مٹی کے لوٹے تھے اور وہ رفع حاجت کے لیے یہاں آئی تھیں جیسا کہ گاؤں کا رواج ہے۔ عورتیں رات کے ابتدائی پہر میں باہر جاتی ہیں۔ لیکن اب یہ رواج بہت ہی دور دراز اور پسماندہ دیہات میں رہ گیا تھا۔ میں نے عورتوں کے پیچھے جانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ شکر ہے انہوں نے شاٹ گن نہیں دیکھی تھی وہ زمین پر پڑی تھی اور ان کی نظر اس پر نہیں گئی۔ ان کے جانے کے بعد میں نے شاٹ گن اٹھائی۔ جب میں دوسری طرف سے ٹیلے کے پیچھے گاؤں کے پاس پہنچا تو میرا اندازہ درست ثابت ہوا، یہ چھوٹا سا گاؤں تھا جس میں تقریباً سارے مکان غریب غربا کے تھے۔ گھروں کی تعداد سو سے بھی کم تھی اور ہاں بجلی بھی نہیں تھی باقی سہولتوں کا حال سوچا جا سکتا تھا۔ باڑوں کی کثرت بتا رہی تھی کہ یہ لوگ چرواہے تھے اور مویشی پالتے تھے۔ میں نے گاؤں سے باہر جانے والے راستے کا جائزہ لیا اور شاٹ گن ایک جگہ چھپا دی۔ گاؤں کی واحد دکان کھلی ہوئی تھی۔ لالٹین کی روشنی میں چند افراد بنچوں پر بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے مجھے دیکھ کر سب خاموش ہو گئے، میں حلیے اور انداز سے گاؤں یا آس پاس کا نہیں لگ رہا تھا۔ اس خاموشی کو میں نے توڑا۔ ''السلام علیکم۔''

ان الفاظ نے خوف اور اجنبیت کی دیواریں گرا دیں اور وہ سب اٹھ کر گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملانے لگے۔ مجھے بیٹھنے کی دعوت دی گئی اور دکاندار نے عقب میں موجود مکان کی طرف بچے کو دوڑایا کہ چائے لے کر آئے۔ چائے کے لفظ نے میرے اندر زندگی بھر دی تھی۔ انہوں نے کنویں کا تازہ اور مٹی کی خوشبو والا پانی پیش کیا جسے میں بلا تکلف پی گیا۔ حالانکہ میرے پاس منرل واٹر موجود تھا۔ پانی پی کر میں نے اپنا تعارف کرایا اور ظاہر ہے غلط کرایا تھا۔ ''شکاری ہوں، راولپنڈی سے آیا ہوں اور یہاں ایک جگہ راستہ بھول گیا پھر گاڑی بھی خراب ہو گئی۔ اب مجھے راولپنڈی واپس جانا ہے اور میں کئی گھنٹے سے اس علاقے میں بھٹک رہا ہوں لیکن راستہ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔''

ان حضرات نے پہلے پوچھا کہ میں شکار کے لیے کہاں گیا تھا میں نے مرشد کی درگاہ والی جگہ کے نزدیک ایک جگہ کا نام لیا۔ ایک آدمی چمک کر بولا۔ ''میں سمجھ گیا جی.... آپ کی گڈی کہاں ہے؟''

''یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم، شہر جاؤں گا تو مدد لے کر آؤں گا۔ میرا تو سامان بھی گاڑی میں بند پڑا ہے۔ بس کھانے پینے کا سامان لے کر چلا تھا۔''

انہوں نے ایک کچے نقشے کی مدد سے سمجھایا کہ میں پنڈی سے کوئی پندرہ میل دور تھا اور مجھے یہاں سے پنڈی لے جانے کے لیے تانگا مل سکتا تھا لیکن وہ مجھے نزدیکی سڑک تک لے جاتا جہاں رات کو بھی ٹریفک چلتا ہے اور مجھے پنڈی جانے کے لیے کوئی نہ کوئی گاڑی مل جاتی۔ تانگے والے کو بلایا گیا۔ درحقیقت یہ ریڑھا تھا جس پر روز صبح و شام دودھ رکھ کر شہر لے جایا جاتا تھا۔ اسے تانگا کہنا ایسا ہی تھا جیسے کسی کمرشل یک اپ کو کار کہنا، مگر یہ تانگے سے یوں بہتر تھا کہ اس میں جھٹکے کم لگتے۔ تانگے والے سے پہلے جائے آگئی جو خاص دیہاتی طرز کی تھی۔ دودھ میں چند دانے چائے کی پتی کے پکا کر اسے چائے قرار دیتے ہیں۔ میں چائے پی کر روانہ ہونے کو تیار تھا۔ اس نے چائے کا سُرور بخشا ہو یا نہ لیکن مجھے تازہ دم ضرور کر دیا تھا۔ خوش قسمتی سے دکان والے کے پاس پینا ڈول بھی تھی۔ میں نے اس سے ایک پتا لے لیا اور دو گولیاں اسی وقت کھالیں۔ دکاندار میری مہمان نوازی پر آمادہ تھا لیکن میں نے منع کر دیا۔

''دوستو، تم لوگوں نے جتنی خاطر کر دی ہے وہی بہت ہے۔ میرے گھر والے پیچھے پریشان ہوں گے اور بیوی نے تو اعلان بھی کر دیا ہوگا کہ میں کسی کے ساتھ بھاگ گیا ہوں شکار کا تو بہانہ ہے۔''

وہ مسکرانے لگے تھے بہرحال اس جھوٹ کی وجہ سے مجھے جانے کی اجازت مل گئی۔ ریڑھا ایکسپریس سواری تھی اور اس پر دودھ کے فولادی ڈرم جاتے تھے لیکن میں ڈرم نہیں انسان تھا اس لیے ریڑھے کی ناہموار سطح پر میرے لیے تکلیف کے بے شمار اسباب تھے۔ اس کا حل یہ نکالا گیا کہ دکان والے نے گھر سے ایک روئی کا گدا منگوا کر اس پر بچھا دیا اور میں آرام سے بیٹھ گیا۔ ان لوگوں کے خلوص اور مہمان نوازی نے مجھے متاثر کیا تھا لیکن میں نے غلطی سے بھی ایسا کوئی سوال نہیں کیا جو بعد میں میری نشان دہی کا باعث بن جاتا۔ میں تو یہاں سے جا رہا تھا لیکن یہ معصوم لوگ فاضلی یا چودھری کے عتاب کا نشانہ بن سکتے تھے۔ اب وہ پورے یقین سے کہہ سکتے تھے کہ ادھر آنے والا تو اصل میں شکاری تھا۔ اسی وجہ سے میں نے شاٹ گن اٹھانے کا ارادہ بھی ترک کر دیا۔ ریڑھے والا بعد میں بتاتا کہ شکاری بابو نے راستے سے ایک شاٹ گن بھی اٹھائی تھی تو میرا کردار مشکوک ہو جاتا۔ راستہ کچا تھا مگر گدے کی وجہ سے آسانی سے طے ہو گیا۔ میں باقاعدہ لیٹ کر سفر کرتا رہا۔

آدھے گھنٹے بعد ریڑھے والے نے مجھے ایک پکی سڑک کے کنارے اتارا۔ رات کے دس بج رہے تھے اور سڑک ویران تھی لیکن ریڑھے کے مالک نے مجھے یقین دلایا کہ یہاں سے وقفے وقفے سے بسیں گزرتی تھیں۔ دوسری ٹریفک بھی چلتی رہتی تھی۔ وہ ہاتھ ملا کر جانے لگا تو میں نے زبردستی اسے دو سو روپے تھما دیے۔ وہ بہت خوش ہو کر اور بار بار سلام کرتا گیا تھا۔ یہی دو سو روپے میں اتنی طویل مسافت پر کسی ٹیکسی والے کو پیش کرتا تو اس کا منہ سیدھا نہیں ہوتا۔ آدھے گھنٹے بعد تو نہیں لیکن پون گھنٹے بعد ایک بس نمودار ہوئی جو پنڈی کی طرف جا رہی تھی۔ رات کے اس وقت بھی یہ مسافروں اور ان کے اسباب سے لبالب بھری ہوئی تھی۔ مگر رکنے پر پتا چلا کہ بس برات لے کر واپس جا رہی ہے۔ مجھے چھت پر موجود برات کے ساتھ بیٹھنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ دولہا بھی وہیں موجود تھا اور دلہن نیچے زنانہ کمپارٹ میں تھی۔ برات پنڈی سے بھی آگے کہیں واپس جا رہی تھی۔ یہ شہر میں داخل نہیں ہوئی لیکن مجھے شہر کے پاس اتار دیا۔ آدھے گھنٹے بعد میں ایک ٹیکسی میں پنڈی کی طرف جا رہا تھا۔ راجا بازار میں ساری رات کھلے رہنے والے ایک ہوٹل کے فون سے میں نے عبداللہ کو کال کی۔

''شہباز صاحب....'' اس نے بے یقینی سے کہا۔

''یار اب تک تو تم لوگوں کو عادی ہو جانا چاہیے میں ایسے ہی غائب ہو کر ایسے ہی واپس آجاتا ہوں۔ ہاں جب دنیا میں نہ رہا تو پھر واپسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔''

''اللہ نہ کرے۔'' اس نے جلدی سے کہا۔ ''یہ بتائیں کہ آپ کہاں سے بات کر رہے ہیں؟''

''لائن محفوظ ہے؟''

''ہاں آپ اس کی فکر نہ کریں۔''

میں نے عبداللہ کو ہوٹل کے بارے میں بتایا۔ جب تک وہ یا اس کے آدمی آتے میں نے ڈنر کر لینا مناسب سمجھا۔ حلیے سے قطع نظر میرے پاس مالِ غنیمت کی خاصی رقم

www.pdfbooksfree.pk

تھی اس لیے میں نے ویٹر کی مشکوک نظروں کی بالکل پروا نہیں کی البتہ طے کرلیا کہ اس بدتمیز ویٹر کو ٹپ ہرگز نہیں دوں گا۔ جب میں ڈنر سے فارغ ہوکر کافی پی رہا تھا تو ایک سیاہ وین آکر ہوٹل کے دوسری طرف رکی۔ میں چوکنا ہوگیا لیکن جب وین سے عبداللہ دو افراد کے ساتھ اترا تو میرے تنے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ عبداللہ اپنے آدمیوں کو باہر چھوڑ کر اندر آیا اس نے اندر آتے ہی مجھے دیکھ لیا تھا۔ اس لیے سیدھا میرے پاس آیا اس نے بلاتمہید کہا۔ ''شہباز صاحب فوراً چلیں، حالات ٹھیک نہیں ہیں آپ کا اس طرح منظرِعام پر ہونا ٹھیک نہیں ہے۔''

میں پہلے ہی بل ادا کرچکا تھا اس لیے فوری روانگی میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ عبداللہ کا لہجہ بتا رہا تھا کہ حالات واقعی گمبھیر ہیں۔ لیکن میں نے سوال جواب کسی جگہ پہنچنے تک کے لیے ملتوی کردیے۔ سیاہ وین میں مزید تین افراد تھے۔ ایک ڈرائیور اور دو مسلح افراد موجود تھے۔ گویا عبداللہ پانچ افراد کے ساتھ آیا تھا لیکن سیاہ وین چلی تو مزید دو گاڑیاں اور حرکت میں آئیں۔ ان میں سے ایک وین کے پیچھے آگئی اور ایک آگے نکل گئی۔ میں نے عبداللہ کی طرف دیکھا تو اس نے سر کی جنبش سے تصدیق کی کہ یہ اس کے آدمی تھے۔ گویا وہ پوری تیاری کے ساتھ آیا تھا۔ اگر کوئی مداخلت کرتا تو اسے بھرپور جواب دیا جاسکتا تھا۔ لیکن سیاہ وین کا رخ عبداللہ کی کوٹھی کی طرف نہیں تھا۔ اس لیے میں نے پہلا سوال ضروری سمجھا۔ ''ہم کہاں جارہے ہیں؟''

''پنڈی میں ایک جگہ ہے۔'' عبداللہ نے جواب دیا۔ ''اسلام آباد میں ہتھیاروں کے ساتھ نقل وحرکت مشکل ہوگئی ہے۔''

میں چونکا۔ ''تم نے کوٹھی چھوڑ دی ہے، سعدیہ اور مونا کہاں ہیں؟''

عبداللہ مسکرایا۔ ''وہ سفیر صاحب کے ساتھ حویلی جا چکی ہیں۔ بیتو اور مانی بھی وہیں ہیں۔''

''یہ کب گئے؟''

''تین دن ہوگئے ہیں۔''

''وسیم اور دوسرے لوگ؟''

''سب اپنی اپنی جگہوں پر ہیں اور خیریت سے ہیں۔''

میں نے سکون کا سانس لیا۔ ورنہ اسیری کے دنوں میں مجھے سب سے زیادہ یہی خیال پریشان کرتا تھا کہ میرے ساتھی جذباتی ہوکر کوئی ایسا قدم نہ اٹھالیں کہ خود انہیں

نقصان پہنچ جائے۔ مگر انہوں نے عقل مندی کا ثبوت دیا تھا۔ اس دوران میں انہوں نے کرنے والا کام کرلیا تھا یعنی مونا اور سعدیہ کو حویلی پہنچا دیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ عبداللہ نے چار مزید تربیت یافتہ آدمی بھی وہاں بھیج دیے تھے جب کہ چھ ایجنسی گارڈز پہلے ہی تھے۔ مانی حویلی کی الیکٹرانک سیکورٹی کرنے گیا تھا۔ تمام آلات اس نے میرے ساتھ مل کر پہلے ہی حاصل کرلیے تھے۔ وہ لوگ یہاں زیادہ محفوظ تھے۔ عبداللہ سے موبائل لے کر میں نے حویلی کال کی اور جب تک ہم اپنے ٹھکانے پر پہنچے میری تقریباً سب سے بات ہوگئی تھی۔ صرف سویرا رہ گئی تھی اور میں چاہنے کے باوجود کسی سے نہیں کہہ سکا تھا کہ اس سے میری بات کرا دے۔ پھر یہاں وین میں بھی سب موجود تھے اس لیے سویرا سے بات میں نے بعد کے لیے ملتوی کردی۔

نیا ٹھکانا فیض آباد کے پاس ایک کوٹھی تھی۔ یہ جگہ مری روڈ سے زیادہ دور نہیں تھی۔ کوٹھی زیادہ بڑی نہیں تھی لیکن اس کی دو خوبیاں تھیں، ایک تو اس کے دونوں طرف گلی تھی اور طویل ڈرائیو وے ایک گیٹ سے دوسرے گیٹ تک تھا۔ آنے جانے کے لیے کوئی بھی گیٹ استعمال کیا جاسکتا تھا۔ دوسرے اس کے دائیں بائیں کوئی مکان نہیں تھا اس لیے یہ آبادی میں ہوتے ہوئے بھی آبادی سے الگ تھی۔ میں اندر آیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ کوٹھی باہر سے خالی اور خاموش لگ رہی تھی لیکن اندر سے پوری طرح آباد تھی۔ وہ اس طرح کہ عبداللہ کی کوٹھی والے تقریباً تمام افراد یہاں نظر آرہے تھے۔ میں نے عبداللہ کی طرف دیکھا۔ ''لگتا ہے تم نے مستقل ٹھکانا بنالیا ہے؟''

''ایسا ہی سمجھ لیں۔ میں کچھ عرصے سے چکر میں تھا کہ کوئی مناسب جگہ ملے جسے دشمنوں سے چھپ کر حاصل کیا جاسکے۔ اتفاق سے یہ کوٹھی بک رہی تھی مالک باہر جارہا تھا۔ میں نے سامنے آئے بغیر ایک وکیل کے توسط سے خرید لی۔ پھر اسی وکیل کی مدد سے یہاں کام کراتا رہا اور جب ہمیں ضرورت پڑی تو یہاں منتقل ہوگئے۔ یہ پہلی کوٹھی کی طرح بڑی اور پُرآسائش تو نہیں ہے لیکن سیکورٹی کے لحاظ سے اچھی ہے۔''

پہلی منزل تو صرف نشست گاہ، ملازموں اور دوسرے کاموں کے لیے مخصوص تھی، دوسری منزل پر رہائشی کمرے تھے۔ نیچے آٹھ کمرے تھے تو اوپر بھی آٹھ کمرے تھے اور ان میں سے پانچ مکمل بیڈ رومز تھے باقی کو بھی اس مقصد کے لیے استعمال کیا جاسکتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک بڑا سالاؤنج تھا۔ عبداللہ نے اوپر آتے ہوئے کافی کا کہہ دیا تھا پھر اس نے مجھے ایک بیڈ روم دکھایا۔ ''یہ آپ کے لیے ہے، یہاں آپ کا سامان بھی آگیا ہے اگر چاہیں تو باتھ لے کر فریش کرلیں۔''

خود میرا دل بھی یہی چاہ رہا تھا اس لیے میں تولیا لے کر باتھ روم میں چلا گیا۔ موسم رات کو سرد ہوجاتا تھا اس لیے گرم پانی مزہ دے گیا۔ پھر میں نے کمر کی بھی سکائی کی جس میں اب بھی درد باقی تھا۔ دس منٹ بعد میں باتھ روم سے نکلا تو جیسے گزشتہ دنوں کے مصائب بھی پانی کے ساتھ بہا آیا تھا اور بالکل ہلکا پھلکا ہورہا تھا۔ ایک آرام دہ۔ ٹراؤزر اور ٹی شرٹ پہن کر میں لاؤنج میں آیا تو کافی اور کچھ چیزیں آچکی تھیں۔ عبداللہ نے کہا۔ ''وسیم صاحب بھی روانہ ہوچکے ہیں وہ دس پندرہ منٹ میں یہاں پہنچ جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے سند باد جہازی کے نئے سفرنامے کی تفصیل اس وقت تک کے لیے ملتوی کی جاتی ہے۔''

عبداللہ مسکرانے لگا۔ ''یہ آپ نے ٹھیک فرمایا۔ اچانک ہی کسی نئے سفر پر لے جائے جاتے ہیں اور واپسی کے بعد حیرت انگیز کہانیاں سناتے ہیں۔''

''راجا صاحب کیسے ہیں؟''

''ٹھیک ہیں درمیان میں ان کی طبیعت خراب ہوئی تھی لیکن اب بہتر ہے۔ وہ آپ کے بارے میں روز ہی پوچھتے ہیں۔''

''اللہ ان کو صحت دے۔'' میں نے کہا اور نادر کے بارے میں پوچھا۔

''وہ بدستور سرکاری تحویل میں ہے۔'' عبداللہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''اس نے کچھ انکشافات بھی کیے ہیں۔''

''کیسے انکشافات؟''

''ایک تو یہ کہ مرشد کے ڈیرے یعنی نام نہاد درگاہ پر غیرملکی آکر رکتے ہیں اور اپنے حلیے اور ڈیل ڈول سے وہ کسی خاص شعبے سے متعلق لگتے ہیں۔''

''کمانڈوز ٹائپ؟''

''آپ نے درست کہا۔ جب وہ آتے ہیں اور عام طور سے گروپ کی صورت میں آتے ہیں تو درگاہ کو عارضی طور پر عام لوگوں کے لیے بند کردیا جاتا ہے۔''

''یہ نادر کا مشاہدہ ہے یا وہ اس بارے میں کچھ جانتا ہے؟''

''میرا خیال ہے وہ جانتا ہے لیکن بتا نہیں رہا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اسے یہ بات اس کے ایک آدمی نے بتائی ہے جو درگاہ میں ہوتا ہے اور نادر کا وفادار ہے۔''

میں سوچ میں پڑ گیا تھا۔ عبداللہ غور سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ''آپ کا کیا خیال ہے مرشد نے ہمارے خلاف باہر سے کرائے کے گوریلے منگوائے ہیں؟''

''نہیں اسے ان کی ضرورت نہیں ہے اس کے پاس ایسے آدمیوں کی کمی نہیں ہے جو اس کے ایک اشارے پر جان قربان کردیں۔ یہ کوئی اور ہی چکر لگتا ہے۔ یہ بتاؤ کہ میری غیر موجودگی میں تم لوگوں نے مرشد کے خلاف کوئی قدم تو نہیں اٹھایا؟''

''اس بارے میں آپ کو وسیم صاحب ہی بتائیں گے۔''

اِدھر عبداللہ نے یہ جملہ کہا اور اُدھر وسیم نے اندر قدم رکھا۔ ''میرا ذکر ہورہا تھا۔'' اس نے کہا اور مجھ سے بغل گیر ہوگیا۔ ''شکر ہے آپ کو صحیح سلامت دیکھ رہا ہوں۔''

''لیکن اس سے یہ مت سمجھنا کہ دشمنوں نے کوئی کسر چھوڑ دی تھی۔ بس یہ سمجھ لو کہ اللہ کی مہربانی ہے کہ اس وقت تم لوگوں کے سامنے ٹھیک ٹھاک کھڑا ہوں۔''

''ہم نے جو ویڈیو میں دیکھا تھا وہی بتانے کو کافی تھا۔'' کہتے ہوئے وسیم کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔ ''لیکن مرشد کو اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑے گا۔''

''شکر ہے تم لوگوں نے کوئی اندھا قدم نہیں اٹھایا۔''

''نہیں، قدم تو اٹھایا تھا۔'' وسیم معنی خیز انداز میں بولا۔ ''مرشد، مرشد ہاؤس کے لان میں چہل قدمی کررہا تھا کہ ایک گولی نے اس کے کلاہ کے اٹھے ہوئے حصے میں سوراخ کردیا تھا۔''

''اتنا سچا نشانہ؟''

وسیم نے سر ہلایا۔ ''میں نے خود لگایا تھا۔ مرشد ہاؤس سے کوئی سات سو گز کی دوری پر ایک چھ منزلہ فلیٹ کمپلکس ہے اس کی چھت سے نشانہ لیا تھا۔''

''یہ کب کی بات ہے؟''

''ایک ہفتہ ہوگیا ہے جب آپ کو غائب ہوئے دوسرا دن تھا اور اس کے بعد ہی ہمیں ویڈیو ملی تھی۔''

''اس وقت میں اکرم چشتی کے عتاب سے گزر رہا تھا۔ اس حرامزادے نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔''

''عنقریب وہ ہمارے پاس ہوگا اور تب ہم بھی کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے۔'' وسیم نے کہا۔ ''اس واقعے کے بعد

www.pdfbooksfree.pk

مرشد دہل گیا تھا اس نے فون پر ہم سے وعدہ کیا کہ آپ کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔"

"مرشد اور اس کا وعدہ۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "تم شیطان کے وعدے پر اعتبار کر سکتے ہو مرشد کے وعدے پر نہیں۔"

"کیا اس نے پھر کچھ کیا تھا؟"

"کچھ نہیں .... بس یوں سمجھ لو اس نے مجھ سے ہمیشہ کے لیے جان چھڑانے کا پلان بنالیا تھا وہ تو قدرت کو منظور نہیں تھا ورنہ اس وقت میں تمہارے پاس کسی پانچ سالہ بچے کی طرح موجود ہوتا۔ اپنی شخصیت اور ماضی سب بھول چکا ہوتا۔"

میں نے انہیں کسی قدر تفصیل سے بتایا کہ مجھ پر کیا گزری تھی۔ جب میں فاضلی کی واپسی تک پہنچا تو وسیم نے کہا۔ "وہ نہایت شاطر آدمی ہے اس نے نہ جانے کیسے فیصل کوشٹے میں اتار لیا اور اس کی مدد سے فرار ہوگیا۔"

"اس نے فیصل کو دس لاکھ روپے کا لالچ دیا تھا اور جب وہ خطرے کی حدود سے نکلا تو اس نے سب سے پہلے اس غدار کا کام تمام کیا تھا۔"

"ہمیں اس کی لاش مل گئی تھی۔ وہ اچھا آدمی تھا... دجانے کیسے فاضلی کے چکر میں آگیا۔" وسیم نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "اس کے بھائی آکر اس کی لاش لے گئے تھے۔"

میں نے داستان آگے شروع کی۔ شخصیت اور یادداشت ختم کرنے والے انجکشن کا سن کر وسیم نے پھر مداخلت کی۔ "مجھے معلوم ہے، کوئی جاپانی کمپنی نے چند سال پہلے بنائے تھے کہ وہ مجرم جو کسی صورت نہیں سدھر سکتے.... اور وہ جیل میں بھی سکون سے نہیں رہتے ان کو یہ انجکشن لگا کر مسئلہ ہی ختم کر دیا جائے۔ جاپان میں سزائے موت پر پابندی ہے لیکن جب انسانی حقوق کی تنظیموں نے شور کیا تو اس انجکشن کو بہتر قرار دے دیا مگر سنا تھا کہ یہ چوری چھپے بک رہے ہیں۔"

"تم بھی کچھ انجکشن منگواؤ۔" میں نے مشورہ دیا۔ "ہم اپنے دشمنوں پر آزما سکتے ہیں۔"

"یہ کام مجھ پر چھوڑ دیں۔" عبداللہ نے کہا۔

داستان سمیٹتے ہوئے بھی صبح کے تین بج گئے تھے۔ آخر میں فاضلی کے شدید زخمی ہونے کا سن کر وسیم پُرجوش ہوگیا۔ "اگر وہ مرا نہیں ہے تو کسی اسپتال میں ہوگا وہیں اس کا کام تمام کر دیتے ہیں۔"

میں نے اس سے اختلاف نہیں کیا کیونکہ میرے ساتھی متفق ہو گئے تھے کہ اب دشمن کو اس کے سکوں میں ادائیگی کی جائے اور انہا کی پالیسی کو بالائے طاق رکھ دیا جائے کیونکہ دشمن اسے مانتا ہی نہیں ہے۔ عبداللہ نے تائید کی۔ "اگر ایسا ہے تو ایک دشمن سے تو جان چھوٹے گی۔"

"اب مجھے صحیح معنوں میں اندازہ ہوا ہے کہ فاضلی کس قدر خطرناک شخص ہے۔" وسیم نے کہا۔ "اس شخص کو پہلی فرصت میں اس دنیا سے رخصت کر دینا چاہیے۔"

"اس کے عزائم تو اپنے حقیقی باپ کے لیے بھی خطرناک ہیں، وہ مرشد کا بھی صفایا کرنا چاہتا ہے لیکن اس سے پہلے وہ اس کی جگہ حاصل کرلے گا۔" میں نے کہا۔ "یہ اچھا ہوا کہ فیصل نے اسے حویلی سے یوں نکالا کہ وہ اس کی لوکیشن نہیں دیکھ سکا ورنہ ہمیں بہت بڑا نقصان اٹھانا پڑتا۔"

وسیم نے سر ہلایا۔ "اسی وجہ سے میں نے فیصل کا قصور معاف کر دیا اور اس کے گھر والوں کو دس لاکھ روپے بھیجے ہیں۔ اب سانپ زخمی ہے اور اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ صحت یاب ہو کر ڈسنے کے قابل ہو جائے اس کا سر ہمیشہ کے لیے کچل دینا ہی بہتر ہوگا۔"

"میں ابھی اپنے آدمیوں کو لگاتا ہوں وہ شہر کے تمام اسپتالوں میں اسے دیکھیں۔" عبداللہ کھڑا ہوگیا۔ "شہباز صاحب آپ آرام کریں۔ اگر کمر میں تکلیف زیادہ ہے تو ڈاکٹر بھی آسکتا ہے۔"

"نہیں اب تو معمولی سی رہ گئی ہے۔" میں نے انکار کر دیا۔ "اگر تکلیف بڑھ گئی تو صبح کسی ڈاکٹر کو دکھا لوں گا لیکن یہاں کسی کو بلانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں کمرے میں آیا اور سونے سے پہلے ایک گلاس گرم دودھ کے ساتھ دو پین کلر گولیاں لیں اور پھر جو غافل ہو کر سویا تو اگلے دن دوپہر میں جا کر آنکھ کھلی تھی۔ اتنی طویل نیند کی وجہ سے جسم ٹوٹ رہا تھا اور پیٹ میں خوفناک قسم کی بھوک انگڑائیاں لے رہی تھی۔ میں نے انٹرکام پر کچن سے رابطہ کر کے کھانے کا پوچھا۔ دوسری طرف سے بتایا گیا کہ کھانا آدھے گھنٹے میں تیار ہو جائے گا۔ اس دوران میں میں نے غسل کر لینا مناسب سمجھا۔ گرم پانی نے میری ساری کسلمندی دور کر دی تھی اور میں تیار ہو کر نیچے آیا تو عبداللہ بھی اسی وقت باہر سے آیا تھا۔ کھانا لگ گیا تھا۔ اس میں پلاؤ کے ساتھ ساتھ شامی کباب تھے اور سیخ بوٹی کے ساتھ تلی چپاتیاں تھیں۔ یہ سب یہیں بنا تھا۔ عبداللہ کوٹھی سے باورچی کو بھی لے آیا تھا۔ میں نے عبداللہ سے فاضلی کا

پوچھا۔ اس نے جواب دیا۔

"اس کا پتا نہیں چلا ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ کسی اسپتال میں ہوا تو اصل نام سے نہیں ہوگا اس لیے میں نے گولی کے زخم کے حوالے سے معلوم کرایا۔ میرے آدمی ایجنسی کے سادہ لباس نمائندے بن کر پوچھ گچھ کر رہے تھے۔ لیکن ایسا لگ رہا ہے کہ یا تو فاضلی کو کسی عام سے کلینک یا اسپتال میں داخل کرایا گیا ہے یا پھر اس کا گھر میں علاج ہو رہا ہے یا پھر...."

"وہ دنیا سے گزر چکا ہے۔" میں نے عبداللہ کا جملہ مکمل کیا۔ "لیکن فاضلی جیسے ڈھیٹ اتنی آسانی سے دنیا سے نہیں جاتے ہیں۔ مجھے یقین ہے وہ بچ گیا ہوگا۔"

"میری بھی یہی خواہش ہے وہ بچ جائے اور ہم میں سے کسی کے ہاتھ مارا جائے۔" عبداللہ نے تائید کی۔ "وسیم صاحب کل روکنے کے باوجود واپس چلے گئے تھے۔"

"اس کا اپنی جگہ ہونا ضروری ہے۔ وہ ہماری اصل فورس ہے اور اسے صرف ضرورت کے وقت ہی منظرِ عام پر آنا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "یہاں کتنے آدمی ہیں؟"

"اگر آپ کی مراد لڑنے والوں سے ہے تو ایسے سات افراد ہیں آٹھواں آپ مجھے شمار کرلیں۔"

"گویا مجھ سمیت نو افراد ہیں؟"

"جی باقی تین نوکر ہیں گھر کے کام کرتے ہیں۔ ایک باورچی ہے۔ ایک نگران ہے اور ایک چوکیدار ہے۔"

"یہ علاقہ کیسا ہے؟"

"یہاں سب اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ لیکن ہم بھی احتیاط کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ کوٹھی سے باہر جاتے وقت مسلح نظر نہ آئیں۔ اس طرح کوٹھی کے کھلے حصوں میں بھی کم آتے جاتے ہیں۔"

"یہ اچھی پالیسی ہے جتنا لوگوں کی نظروں میں کم آئیں گے وہ اتنا ہی کم ہمارے بارے میں سوچیں گے۔"

"گاڑیاں میں نے ساری بدل دی ہیں۔ یہاں والی فروخت کرنے کے بعد ساری گاڑیاں باہر سے منگوائی ہیں۔ وہ بھی ایک ایک دو دو کر کے۔ دو لاہور کی گاڑیاں ہیں اور ایک گوجرانوالہ کی اور ایک نوشہرہ کی گاڑی ہے۔"

"یہ بھی اچھا ہوا سوائے کمیونیکیشن ڈیوائس کے تقریباً ساری گاڑیاں دشمنوں کی نظروں میں آچکی تھیں اور شاید ہمیں ان کی مدد سے تلاش کرلیا جاتا ہوگا۔"

"یہی سوچ کر میں نے ایک روٹین پالیسی سوچ لی ہے۔ ایک مہینے بعد ان کی جگہ چار دوسری گاڑیاں آجائیں گی۔ اس کے لیے میں نے وہیں کے آٹو ایجنٹس سے بات کی ہے۔ وہ گاڑیاں آئیں گی تو انہیں یہیں فروخت کر دیا جائے گا۔ اس میں کچھ رقم لگے گی لیکن ہمیں تحفظ حاصل ہو جائے گا۔"

"کوشش کرنا کہ گاڑیاں زیادہ پرانی نہ ہوں اور اپنے کام میں بہترین ہوں۔" میں نے کہا۔ "ایاز کہاں ہے؟"

"اس کی ماں کی طبیعت خراب تھی وہ گھر گیا ہوا ہے۔"

ماں سے مراد ایاز کی خالہ تھی جس نے اس کی پرورش کی تھی۔ "ایاز مخلص آدمی ہے لیکن اب اس پر گھر اور بیوی کا بوجھ آگیا ہے۔"

"میں نے اس سے ایک دو بار اس سلسلے میں بات کی ہے لیکن وہ ہمارا ساتھ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہے۔"

"یہ بھی ہے۔" میں نے گہری سانس لی۔ "اللہ نے ایسے مخلص ساتھی دیے ہیں جو ہر قدم پر میرے ساتھ ہوتے ہیں اور کبھی چھوڑ کر جانے کے لیے تیار نہیں ہوتے ہیں۔"

مرشد، فاضلی، اکرم چشتی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے دشمن ہونے کے باوجود میں اسی وجہ سے آج بھی زندہ اور آزاد تھا کہ اللہ نے مجھے اتنے ہی مخلص دوست بھی دیے تھے جتنے خطرناک اور سفاک میرے دشمن تھے۔ کھانے کے بعد میں نے ایاز سے رابطہ کیا وہ میری آواز سن کر خوش ہوگیا۔ "مجھے وسیم صاحب سے اطلاع مل گئی تھی کہ آپ واپس آگئے ہیں۔ میں آج روانہ ہو جاؤں گا۔"

"نہیں تم ابھی وہیں رکو۔ تمہاری والدہ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"پہلے سے بہتر ہے، لیکن آپ آنے سے کیوں منع کر رہے ہیں؟"

"ابھی تمہاری اتنی ضرورت نہیں ہے، تمہیں معلوم ہوگا کہ عبداللہ والی کوٹھی چھوڑ دی ہے۔ اکثر لوگ میری حویلی جا چکے ہیں۔ وسیم کا سیٹ اپ الگ ہے اور ہم ایک نئی جگہ منتقل... ہوئے ہیں۔ میں کل رات آیا ہوں اور ابھی کچھ دن حالات کا جائزہ لینا ہے جیسے ہی آگے کا کوئی فیصلہ ہوا تم بھی آجانا لیکن فی الحال تم اپنی والدہ کی خدمت کرو اور شاہین کو وقت دو۔"

"یہ کہیں آپ مجھے آرام تو نہیں دے رہے ہیں؟" اس نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

"نہیں یار، سچ کہہ رہا ہوں یہاں واقعی فی الحال امن ہے۔ جب کوئی معرکہ ہوگا تب دیکھا جائے گا۔"

www.pdfbooksfree.pk

''ٹھیک ہے میں کچھ دن اور رک جاتا ہوں۔''

''نہیں تم تاحکم ثانی گھر پر رہو گے اور رابطے میں بھی محتاط رہو کیونکہ دشمن ہمارا خاتمہ چاہتا ہے۔ اگر ذرا سا بھی خطرہ محسوس کرو تو گھر والوں کو کہیں اور منتقل کر دینا۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے بادل ناخواستہ کہا۔ ''لیکن جیسے ہی میری ضرورت ہو آپ لازمی مجھے بلائیں گے۔''

''دشمنوں سے گھرے انسان کو اللہ کے بعد سب سے زیادہ ضرورت جاں نثار دوستوں کی ہوتی ہے۔ تمہارے پاس رقم ہے؟''

''ہاں عبداللہ نے آتے وقت مجھے پچاس ہزار دیے تھے۔''

''اگر مزید ضرورت ہو تو بلاتکلف کہہ دینا۔''

ایاز سے بات کر کے مجھے صابر کا خیال آیا۔ اسے روانہ ہوئے سات دن ہو چکے تھے۔ میں نے جس دن صابر کو مظفر آباد جانے کے لیے چھوڑا تھا اسی دن اکرم چشتی کے اسکواڈ نے مجھے اٹھا لیا تھا اور آج اس واقعے کو آٹھواں دن تھا۔ مجھے اس کی لڑکی شازیہ کا خیال آیا اس کے بارے میں عبداللہ سے پوچھا نہیں تھا۔ کھانے کے بعد عبداللہ کہیں چلا گیا تھا میں نے ایک ملازم سے پوچھا تو اس نے بتایا۔ ''وہ باہر نکلے ہیں جناب۔''

ملازم کوٹھی سے آیا تھا۔ ''تمہیں یاد ہے کچھ دن پہلے ایک نئی لڑکی آئی تھی وہ اب کہاں ہے؟''

''وہ جی سعدیہ بی بی اور مونا بی بی کے ساتھ چلی گئی تھی۔'' ملازم نے جواب دیا۔ یعنی وہ حویلی چلی گئی تھی اور عبداللہ اس کا ذکر کرنا بھول گیا تھا۔ میرے پاس موبائل نہیں تھا ورنہ میں عبداللہ سے کال کر کے صابر کے رابطے کے بارے میں پوچھتا۔ اسے ایک مخصوص اخبار میں کلاسیفائیڈ میں اشتہار دینا تھا۔ یہاں فون نہیں تھا اور میں سویرا سے بات کرنا چاہ رہا تھا مجھے معلوم تھا وہ کتنی شدت سے میری کال کی منتظر ہو گی۔ عبداللہ کی واپسی تک مجھے انتظار کرنا تھا۔ وقت گزاری کے لیے میں آج کا اخبار لے کر اوپر آ گیا اور ملازم سے کہہ دیا کہ عبداللہ کے آتے ہی وہ اسے میرا پیغام دے دے۔ اخبار میں کوئی خاص خبر نہیں تھی سوائے اس کے کہ آنے والے الیکشنز میں سیاسی پارٹیوں اور سیاست دانوں نے ابھی سے جوڑ توڑ شروع کر دیا تھا۔ ایک چھوٹی سی خبر مرشد کے بارے میں تھی اس نے جو نئی پارٹی جوائن کی تھی اس کی طرف سے ایک جلسے میں خطاب کرتے ہوئے اس نے فکر انگیز انکشافات کیے تھے۔ یہ وہی فکر انگیز انکشافات ہیں جو ہمارے سیاست دان ملک کے قیام سے لے کر آج تک کرتے آئے ہیں۔ مثلاً ملک خطرے میں ہے۔ اندرونی اور بیرونی سازشیں جاری ہیں، ملک ایک نئے خطرے کی طرف بڑھ رہا ہے اور ان سب باتوں کا لب لباب یہ ہوتا ہے کہ نئی قیادت لائی جائے۔

مرشد نئی پارٹی میں زیادہ سرگرم تھا اور یقیناً وہ آنے والے الیکشن میں کوئی بڑا عہدہ حاصل کرنے کے چکر میں تھا۔ اس کی نظر کسی اہم وزارت پر لگی ہو گی۔ ایم این اے اور ایم پی اے بننا اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ بلکہ اس کے اپنے علاقے میں ایک قومی اسمبلی اور دو صوبائی اسمبلی کی نشستیں پکی تھیں۔ پارٹی کے لیے یہ بھی کشش انگیز چیز تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر مرشد آنے والا انتخاب جیت جاتا ہے اور حکومت میں کوئی اہم عہدہ بھی حاصل کر لیتا ہے تو اس کی فرعونیت مزید بڑھ جائے گی اس سے پہلے اسے روکنا لازمی تھا۔ اس وقت وہ پھنسا ہوا تھا۔ نادر غائب تھا۔ اس کا دستِ راست اور ناجائز بیٹا فاضلی اگر مرا نہیں تھا تب بھی شدید زخمی ضرور ہوا تھا۔ اس کے سارے پلان ناکام رہے تھے اور وسیم نے اس کے کلے میں سوراخ کر کے اسے عملی طور پر سمجھا دیا تھا کہ اب اس کے مقابل کتنے طاقتور ہو چکے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مجھے جسمانی نقصان پہنچاتے ہوئے ڈر رہا تھا۔

مجھے لگ رہا تھا کہ میں رفتہ رفتہ اس فیصلے کی طرف جا رہا تھا جو میں کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر میرے دشمن مجھے اسی طرف دھکیل رہے تھے۔ انہوں نے میرے باعزت جینے کی کوئی راہ نہیں چھوڑی تھی اور عملاً بتا دیا تھا کہ جب تک ان کا وجود باقی ہے مجھے چین سے رہنا نصیب نہیں ہو گا۔ مرشد کے اشارے پر پولیس پہلے سے زیادہ سرگرمی سے میرے پیچھے لگ چکی تھی۔ امکان یہی تھا کہ اب میں پولیس کے ہاتھ لگا تو مجھے پولیس مقابلے میں مار کر دیا جائے گا۔ اس طرح براہِ راست مرشد پر الزام بھی نہیں آئے گا۔ مرشد اور اکرم چشتی جیسے لوگوں نے مجھے مجبور کر دیا تھا کہ میں انہیں انہی کے سکوں میں ادائیگی کروں۔ سب سے پہلے مجھے اکرم چشتی سے نمٹنا تھا۔ یہ خبیث صفت شخص میرا ذاتی دشمن نہیں تھا لیکن شاہ سے زیادہ شاہ کا وفادار بننے کے لیے اس نے حد کر دی تھی۔ عبداللہ کچھ دیر سے آیا تھا اور خاصا پُرجوش لگ رہا تھا۔ اس نے آتے ہی کہا۔ ''میرے آدمیوں نے پتا لگا لیا

ہے کہ فاضلی مرشد ہاؤس میں موجود ہے۔ گزشتہ رات اس کا کسی نامعلوم اسپتال میں آپریشن ہوا اور پھر صبح اسے ایمبولینس میں مرشد ہاؤس منتقل کر دیا گیا۔''

''اس کا مطلب ہے وہ بچ گیا ہے۔''

''میں نے کہا تھا نا کہ وہ بچ جائے تاکہ ہم اسے جہنم رسید کر سکیں۔'' عبداللہ خوش تھا۔ ''اب آپ دیکھیے گا۔''

''اسے چھوڑو وہ ابھی ایک دو ہفتے باہر نہیں آ سکتا.... مجھے اکرم چشتی کے بارے میں معلوم کر کے بتاؤ۔''

''اس کے بارے میں جو معلوم کرنا ہے مجھ سے پوچھ لیں؟''

''وہ آج کل کہاں ہوتا ہے اور اس کی رہائش کہاں ہے؟''

''وہ خود انویسٹی گیشن آفس میں ہوتا ہے ڈی آئی جی انویسٹی گیشن کے ساتھ اور رہائش اس کی سیٹلائیٹ ٹاؤن میں ہے۔''

''اس کا پتا اور ڈیوٹی کے اوقات مجھے بتا دو۔''

''آپ کا کیا ارادہ ہے جناب؟''

''اسے اٹھا کر حویلی پہنچانا ہے۔''

عبداللہ ہچکچایا۔ ''جناب اس سے اچھا یہ نہیں ہے کہ اس کا قصہ ہی پاک کر دیا جائے۔''

''نہیں فی الحال میں اس کا خاتمہ نہیں چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اسے مارنے سے مرشد کو کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ ایک اکرم چشتی چلا جائے گا تو پولیس میں اس جیسے لوگوں کی کوئی کمی نہیں ہے جو مرشد کے ایک اشارے پر دُم ہلانے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ اکرم چشتی کو زندہ رہنا چاہیے لیکن ساتھ ہی مرشد کے لیے تنبیہ بن جانا چاہیے۔''

''آپ کے ذہن میں کوئی خیال ہے؟''

''ہاں پہلے اسے اٹھا کر حویلی پہنچانا ہے۔''

عبداللہ فکرمند ہو گیا۔ ''اس کے گھر سے حویلی خاصے فاصلے پر ہے اور ایک پولیس والے کا اغوا دونوں شہروں کی پولیس کو فوری حرکت میں لے آئے گا۔''

''مجھے ایک سیل فون کی ضرورت ہے، میرا خیال ہے وسیم کو بلوا لیتے ہیں اور پھر اس پر بات کرتے ہیں۔''

عبداللہ نے مجھے میرا ہی سیل فون دیا جو میں نے اکرم چشتی کے ہاتھ لگنے سے پہلے عبداللہ کے آدمی کو دے دیا تھا۔ میں نے وسیم کو کال کی۔ ''یہاں آ جاؤ یار ایک ضروری مہم درپیش ہے تیاری کے ساتھ آنا ممکن ہے واپسی میں ایک پارسل لے جانا پڑے۔''

''میں سمجھ گیا جناب۔'' وسیم کی پُرجوش آواز آئی۔ ''میں ایک گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں۔''

کچھ عرصے پہلے تک وسیم خود بھی خاصا محتاط تھا لیکن اب اس میں بھی تبدیلی آئی تھی اور اس نے سمجھ لیا تھا کہ دشمن اس طرح باز نہیں آئے گا۔ اس کے مقابلے میں عبداللہ محتاط تھا کیونکہ بنیادی طور پر وہ مار دھاڑ والا آدمی نہیں تھا وہ منتظم تھا اس لیے ہر کام احتیاط سے کرتا تھا۔ دشمن کو معاف کرنے کا وہ بھی قائل نہیں تھا لیکن ساتھ ہی وہ بلاوجہ پنگا لینے کا مخالف تھا۔ میں نے عبداللہ سے کہا۔ ''میرا خیال ہے ہم وسیم سے کہیں باہر ملتے ہیں۔''

''جیسا آپ کہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ میں نے وسیم سے رابطہ کر کے ایک جگہ طے کی اور عبداللہ کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ میں نے بہت عرصے سے شیو نہیں بنائی تھی پہلے فرنچ تھی اب شیو بڑھنے سے وہ باقاعدہ داڑھی کی شکل اختیار کر گئی تھی اور مرشد کے آدمی مجھے اسی حلیے میں دیکھتے رہے تھے اس لیے میں نے کلین شیو کی اور پھر سر پر خود موٹی مشین پھیر لی۔ مشین باتھ روم میں موجود تھی۔ باریک بالوں کی وجہ سے میرا حلیہ خاصا بدل گیا۔ پھر میں نے موٹے فریم والی عینک لگائی جس میں زیرو کے ڈارک شیشے تھے۔ پھر عبداللہ نے مہیا کی تھی۔ اس نے میرا معائنہ کیا اور بولا۔ ''اب آپ تقریباً ستر فیصد بدل گئے ہیں۔''

''لیکن دشمن پھر بھی پہچان جاتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''البتہ پولیس والے دھوکا کھا جائیں گے۔''

ہم ایک کرولا کار میں باہر نکلے اس کے شیشے بھی کسی قدر تاریک تھے۔ اس لیے قریب سے دیکھے بغیر کوئی اندر والوں کو نہیں جان سکتا تھا۔ میں نے وسیم کو ایک پارک کا پتا بتایا تھا۔ وسیم وین کے ساتھ ایک ڈبا نما جیپ بھی لایا تھا یہ پرانی لیکن طاقتور انجن والی ملٹری ماڈل جیپ تھی۔ جس کے پچھلے حصے میں مقامی ساختہ فولاد کا بنا ہوا ڈبا لگایا گیا تھا۔ وسیم وین کے پچھلے حصے میں ہمارا منتظر تھا۔ سلام دعا کے بعد میں نے اکرم چشتی کا معاملہ اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے سر ہلایا۔ ''اس سے بسم اللہ کرنا نہایت مناسب رہے گا۔ میرا تو خون کھول رہا ہے جب سے اس کی خباثت کا پتا چلا ہے۔''

''جب مجھ پر گزر رہی تھی تو میں نے بھی بہت سارے ارادے باندھے تھے لیکن اب مجھے صرف انتقام کے لیے اسے اٹھانا یا مار دینا مناسب نہیں لگ رہا ہے، ہم

www.pdfbooksfree.pk

اس سے کثیر المقاصد فائدے حاصل کریں گے اور پھر اس کا فیصلہ کریں گے کہ کیا کرنا ہے اس لیے فی الحال اسے یوں اٹھانا ہے کہ اس کے ساتھ سوئی بیوی کو بھی پتا نہ چلے۔"

وسیم مسکرایا۔ "میں پوری تیاری کے ساتھ آیا ہوں۔"

"سب سے پہلے ہمیں اس کے گھر کا معائنہ کرنا ہے۔"

"اس کے لیے یہ وین نہایت موزوں رہے گی۔" وسیم نے کہا۔ "ہم کسی کی نظروں میں آئے بغیر گھر کا معائنہ کر سکتے ہیں۔"

"بس تو ہمیں یہ کام کر لینا چاہیے۔" میں نے سر ہلایا۔ ہم نے اپنی کرولا اسی پارک کے ساتھ چھوڑ دی۔ وسیم کے ساتھ آئی دوسری گاڑی اور اس میں سوار افراد بھی وہیں رک گئے اور ہم وین میں اکرم چشتی کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ سیٹلائیٹ ٹاؤن یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا اور اس کا شمار پنڈی کی پرانی پوش آبادی میں ہوتا ہے۔ یہاں خاندانی رئیس رہتے ہیں اور ایک زمانے میں سچ مچ خاندانی ہی ہوتے تھے اب تو ہر دولت مند خاندانی ہو جاتا ہے۔ اکرم چشتی کا گھر نسبتاً چھوٹے پلاٹوں والے علاقے میں تھا۔ اس کے باوجود اس کا گھر باہر سے کسی کوٹھی کا منظر پیش کرتا تھا۔ حیرت انگیز طور پر ایک ڈی ایس پی کے گھر پر پولیس گارڈ لگی تھی اور دو پولیس والے خود کار رائفلیں اٹھائے گیٹ کے سامنے کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ ہتھیار خطرناک تھے لیکن پولیس روایتی تھی۔ ان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ ضرورت پڑنے پر رائفلیں اٹھا کر فائر کرنے کا سوچنے میں بھی ان کو ایک دو منٹ لگ سکتے ہیں۔ ہم وین میں بڑی اسکرین پر یہ منظر نہایت وضاحت سے دیکھ رہے تھے۔ کیمرا نہ صرف کوٹھی کا منظر دکھا رہا تھا بلکہ اسے ریکارڈ بھی کر رہا تھا۔ ڈرائیور نے جان بوجھ کر وین کی رفتار نہایت سست کر دی۔ یہ دو طرفہ گلی تھی جس میں ایک طرف سے داخل ہو کر دوسری طرف سے نکلا جا سکتا تھا۔ اگر یک طرفہ گلی ہوتی تو ہمیں مشکل ہو جاتی۔ پلٹ کر واپس آنا پڑتا۔ ہم گلی سے نکلے اور وین ایک طرف روک کر کیمرے کی بنائی ویڈیو دیکھی۔ وسیم نے اسے ذرا سلو موشن میں کر دیا تھا۔ یہ دو منزلہ کوٹھی تھی جس کے سامنے والے حصے میں خاصا بڑا کار پورچ تھا اور اس وقت بھی وہاں ایک نیلی ہنڈا کار کھڑی تھی۔ عبداللہ نے کہا۔ "اکرم چشتی گھر پر نہیں ہے کیونکہ وہ سرمئی رنگ کی وٹز استعمال کرتا ہے یہ نئی کار ہے۔"

"حالانکہ اس کی تنخواہ موٹر سائیکل سے اوپر جانے کی اجازت نہیں دیتی ہوگی۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "یہ کوٹھی بھی اس کی حرام کمائی سے بنی ہوگی اور اس کی بیوی یا کسی قریبی عزیز کے نام پر ہوگی۔"

"اکرم چشتی کی دو بیویاں ہیں۔" عبداللہ نے انکشافات کا سلسلہ جاری رکھا۔ "ایک کسی گاؤں میں ہوتی ہے وہ اس کی خاندانی بیوی ہے دوسری شہری اور ماڈرن ہے۔ لیکن نام نہاد ہی ماڈرن کہہ سکتے ہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ وہ ایسی ہے جیسے بھینس کے مقابلے میں گائے ہوتی ہے۔ پہلی بیوی سے نامعلوم تعداد میں بچے ہیں لیکن اس بیوی سے اکرم چشتی کی تین اولادیں ہیں۔"

"اس کے علاوہ بھی وہ دوسری جگہوں پر منہ مارتا ہو گا۔" وسیم نے لقمہ دیا تو عبداللہ ہنسا۔

"تو حرام کس لیے کماتا ہے؟"

"حالات ٹھیک نہیں لگ رہے ہیں۔" وسیم نے تشویش سے کہا۔ "اکرم چشتی نے اپنے گھر کی سیکورٹی سخت کی ہوئی ہے۔ پلان ایسا ہو جس میں ناکامی کا خطرہ ایک فیصد سے بھی کم ہو۔"

"کوٹھی شاید نصف کنال رقبے پر ہے۔ سامنے مکانیت کم ہے کیونکہ کورڈ کار پورچ ہے لیکن اوپر والی عمارت زیادہ بڑی ہے اور میرے خیال میں بیڈ رومز اوپر ہی ہوں گے۔" میں نے کوٹھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وسیم نے کوٹھی کا منظر پوز کر دیا تھا۔ "زینے سامنے دکھائی دے رہے ہیں، یہ اوپر کورڈ ٹیرس میں نکلتے ہوں گے۔"

ٹیرس کو فولادی گرل کی مدد سے بند کر دیا گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ زینوں کے آخر میں کوئی دروازہ ہوگا۔ وسیم نے کہا۔ "اگر یہ دروازہ کسی طرح سے کھلوا لیا جائے تو اس کے بعد کا کام آسان ہو جائے گا۔"

"سوال یہ ہے کہ اکرم چشتی یا کوئی اور دروازہ کھولے گا ہی کیوں؟"

وسیم عبداللہ کے سوال پر سوچ میں پڑ گیا۔ "اگر ان دونوں پولیس والوں میں سے کوئی کسی وجہ سے اکرم چشتی سے بات کرنا چاہے تو.....؟"

"وہ کائیاں آدمی ہے، میرا خیال ہے پولیس والوں کی تمام ضروریات کوٹھی کے بیرونی حصے میں پوری ہو جاتی ہوں گی اور انہیں کوٹھی کے اندر جانے کی اجازت نہیں ہوگی۔ اس لیے اگر رات کسی وقت کوئی پولیس والا اوپر کا دروازہ کھلوانے کی کوشش کرے گا تو اکرم چشتی جیسا شخص لازمی

چوکس ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔

"یہ بھی ممکن ہے اندر اور باہر سیکورٹی کیمرے لگے ہوں۔ یہ آج کل بہت عام ہو گئے ہیں۔" عبداللہ نے خیال پیش کیا۔ "اس صورت میں اکرم چشتی پہلے سے ہوشیار ہو جائے گا۔"

"براہِ راست کارروائی کیسی رہے گی؟" وسیم نے پوچھا۔

"اس کے بجائے اسے راستے میں اٹھا لینا زیادہ مناسب ہوگا۔" میں نے کہا۔ "گھر میں گھسنے سے دوسرے مسائل پیدا ہوں گے۔ ممکن ہے شور کی وجہ سے غیر متعلقہ لوگ بھی جمع ہو سکتے ہیں جیسے اکرم چشتی کے بیوی بچے، اس صورت میں راستے میں کارروائی بہترین آپشن ہے۔"

"اس کی دن کی ڈیوٹی ہوتی ہے نائن ٹو فائیو۔" عبداللہ نے کہا۔ "لیکن واپسی کا کچھ پتا نہیں ہوتا ہے۔"

"البتہ دفتر کے لیے نکلنے کا وقت تقریباً طے شدہ ہو گا۔ نو یا دس بجے تک وہ گھر سے نکل جاتا ہوگا۔" وسیم بولا۔ "یہی وقت بہترین ہوگا۔"

"بس کل صبح اسے اٹھا لو۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "اکرم چشتی کے نہ ہونے سے پولیس کی میرے خلاف جاری مہم کمزور پڑ جائے گی۔"

"میں اپنا ریکی اسکواڈ بلوا لیتا ہوں۔" وسیم نے کہا۔ "ہم کل صبح سورج نکلنے سے پہلے یہاں پہنچ جائیں گے۔"

"میں بھی آؤں گا۔" میں نے کہا۔ "لیکن اکرم چشتی کے گھر کی نگرانی ابھی سے شروع ہو جانی چاہیے۔"

"میں دو افراد ابھی لگا دیتا ہوں وہ گھر اور اکرم چشتی کی نقل و حرکت پر نظر رکھیں گے۔"

وسیم نے حویلی رابطہ کر کے بائیک سوار بلوا لیے۔ یہ اپنے کام کے ماہر تھے۔ اکرم چشتی کے گھر والی گلی دونوں طرف کھلتی تھی۔ اس لیے دو افراد ضروری تھی۔ ہم گلی سے نکل کر اس سڑک پر آ گئے جہاں اندازے کے مطابق اکرم چشتی دفتر سے آتے ہوئے گزرتا تھا۔ وین ایک طرف پارک کر دی۔ وسیم نے اس کے کیمرے سامنے سے آنے والی ٹریفک پر مرکوز کر دیے تھے۔ اب ہم ہر گاڑی کے ڈرائیور کو دیکھ سکتے تھے۔ ہمیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ اکرم چشتی کی وٹز خاصی تیزی سے گزری تھی لیکن کیمرے نے اس کے منحوس چہرے کو ریکارڈ کر لیا تھا۔ تشویشناک بات یہ تھی کہ اس کے ساتھ ایک پولیس والا اور بھی بیٹھا تھا۔ یعنی وہ کسی وقت بھی اکیلا نہیں ہوتا تھا سفر میں اپنے ساتھ ایک گارڈ رکھتا تھا۔

"اس کے ٹھاٹ دیکھو ایک گارڈ ساتھ بھی رکھتا ہے۔" وسیم نے کہا۔ "خیر کوئی مسئلہ نہیں ہے گھر کے باہر سب سے نمٹا جا سکتا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "اب فرض کر لیں کہ یہ کل صبح جب دفتر جانے کے لیے نکلے گا تو اسے گھیرنے کے لیے سب سے موزوں جگہ کون سی ہو سکتی ہے۔"

"یہ ابھی دیکھ لیتے ہیں۔" وسیم نے کہا اور ڈرائیور سے پولیس ہیڈ کوارٹر کی طرف چلنے کو کہا لیکن آدھے گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد کوئی ایسی جگہ نہیں ملی جو سنسان ہو اور ہم وہاں آرام سے کارروائی کر سکیں۔ اتفاق سے یہ بہت مصروف رہنے والی سڑک تھی جو سیٹلائیٹ ٹاؤن سے پولیس ہیڈ کوارٹر کی طرف جاتی تھی۔ کسی کارروائی کی صورت میں درجنوں گواہ بن جاتے۔

"اس طرح کام نہیں بنے گا۔ اس میں پھنسنے کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔" میں نے کہا۔

"اکرم چشتی کے گھر کی طرف آنے والی ذیلی سڑک کے بارے میں کیا خیال ہے۔" عبداللہ نے اچانک کہا۔ "وہاں سناٹا ہوتا ہے، بڑے پلاٹوں والا رہائشی علاقہ ہے اس لیے لوگ بھی کم نظر آتے ہیں۔"

عبداللہ کا خیال اچھا تھا۔ کم سے کم ہائی وے کے مقابلے میں یہاں خطرہ بہت کم تھا۔ پلاننگ وسیم کا کام تھا اس لیے جگہ کا انتخاب ہونے کے بعد یہ اس پر چھوڑ دیا گیا۔ اس دوران میں اس کے آدمی پہنچ گئے تھے۔ وسیم نے انہیں ذمے داری سمجھائی اور ہمیں واپس پارک کی طرف چھوڑنے روانہ ہو گیا۔ میں نے راستے میں مشورہ دیا۔ "اس کام میں وین مت استعمال کرنا، میرا مطلب ہے بہ ظاہر وین دور رہے اور اکرم چشتی کو کسی دوسری گاڑی میں لے جانا۔"

"یہ ٹھیک ہے وین کا ہر بار نظر آنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔" وسیم بولا۔ "میں نے ایک اسپرے گن لے لی ہے اور ہمارے پاس کچا پینٹ بھی ہے۔ اس کا رنگ آدھے گھنٹے میں بدلا جا سکتا ہے اور رنگ کو صرف دس منٹ میں واٹر پریشر گن سے اتارا جا سکتا ہے۔"

"تب اس کا رنگ بدل دو، اس کا سیاہ رنگ متوجہ کرتا ہے۔"

ہمیں پارک کے پاس چھوڑ کر وسیم واپس روانہ ہو گیا۔ وسیم واپس روانہ ہوا تو ہم بھی چل پڑے۔ میں نے

www.pdfbooksfree.pk

عبداللہ سے شازیہ اور صابر کے بارے میں پوچھا۔ ''شازیہ سعدیہ بی بی سے اٹیچ ہوگئی تھی اور پھر میں اسے یہاں کہاں رکھتا اس لیے میں نے اسے بھی حویلی بھیج دیا۔ دوسرے مجھے ایک شبہ ہورہا تھا۔''

میں چونکا۔ ''شازیہ کے بارے میں؟''

''جی میرا خیال ہے وہ پریگننٹ ہوگئی ہے۔''

''میرے خدا، یہ اس بے چاری کے لیے ایک اور دھچکا ہوگا۔''

عبداللہ نے سر ہلایا۔ ''وہ بہت مظلوم ہے، باپ کے کیے کی سزا اسے بھگتنا پڑی۔ میں نے وسیم کی توسط سے سعدیہ کو پیغام دے دیا ہے کہ وہ اس مسئلے کا کچھ حل نکالیں۔ یہ خواتین کا شعبہ ہے۔''

''وہاں ماں جی دیکھ لیں گی۔'' میں نے کہا۔ ''یہ تو خود نا تجربے کار ہیں یہ کیا دیکھیں گی۔ اگر یہ مسئلہ یہیں ہوگیا تھا تو اسے یہیں کسی ڈاکٹر کو دکھا دینا چاہیے تھا۔''

''اس کا وقت نہیں تھا ان لوگوں کی روانگی ہونے والی تھی جب اس کی طبیعت خراب ہوئی اور وہ اسی حالت میں گئی تھی۔ میرے آدمیوں نے بتایا کہ راستے میں بھی اس کی طبیعت خراب رہی تھی۔''

''تم نے کس طرح انہیں روانہ کیا تھا۔''

''میں نے ہیلی کاپٹر کا رسک لینے کے بجائے انہیں سڑک سے بھیجنے کا فیصلہ کیا اور ہمارے تقریباً سارے آدمی پوری طرح مسلح ہوکر انہیں چھوڑنے گئے تھے۔ راستے میں وہ ہر صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تیار تھے۔''

میں مسکرایا۔ ''گویا تم نے ڈنکے کی چوٹ پر کام کیا؟''

''نہیں ایسا تو نہیں ہے ہر ممکن احتیاطی تدبیر بھی کرلی تھی۔ اس کے بعد انہیں روانہ کیا تھا۔''

''صابر کی طرف سے کوئی پیغام ملا؟''

''نہیں میں باقاعدگی سے اخبار چیک کر رہا ہوں۔ ابھی تک اس کی طرف سے کوئی اشتہار نہیں آیا ہے۔''

''میں نے اسے ایک مہینے کی مہلت دی تھی اور اس میں سے آٹھ دن گزر چکے ہیں۔''

''شہباز صاحب یہ کام بہت مشکل ہے اگر قسمت نے یاوری کی تو صابر کامیاب ہوسکے گا۔''

میں نے گہری سانس لی۔ ''میرا بھی یہی خیال ہے۔ لیکن میں نے اسے پوری طرح دہشت زدہ کردیا تھا کہ وہ ناکام رہا تو میں اس کی لڑکی کو مرشد کے حوالے کردوں گا۔''

عبداللہ نے میری طرف دیکھا۔ ''سچ مچ؟''

''یار میں ایسا کرسکتا ہوں، وہ معصوم بچی ہے میں کسی جانور کو بھی مرشد کے حوالے نہ کروں۔ اگر صابر ناکام رہا تب بھی اس کی بچی اس کے سپرد کردوں گا۔ چینی بریف کیس اہم ہے لیکن یہ ہمارے اولین مقاصد میں نہیں آتا ہے۔''

عبداللہ نے سر ہلایا۔ ''ہمارا اولین نشانہ مرشد ہے اس سے جان چھوٹ جائے تو باقی افراد کی اتنی اہمیت نہیں ہے۔''

''تم ایسا کرو کہیں سے وہ انجکشن حاصل کرو جو مرشد نے مجھے لگایا تھا۔ لیکن اس کام میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے کوئی ماہر بھی ساتھ ہو۔ مرشد کے ساتھ کسی نے ہاتھ کردیا اور اسے ناکارہ ہوجانے والے انجکشن تھما دیے تھے۔''

''میں کوشش کرتا ہوں۔'' عبداللہ نے کہا۔ ''اس کے لیے سب سے موزوں شخص نادر رہے گا۔ وہ پہلے ہی آدھا مر چکا ہے لیکن اس کا شیطانی دماغ زندہ ہے وہ ناکارہ ہوجائے تو ہمیں اس کا خون اپنے سر لینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

''صرف نادر نہیں بلکہ شاید کسی بھی دشمن کا خون سر لینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

''مگر مرشد، فاضلی اور فتح خان جیسے لوگ سزائے موت کے پوری طرح مستحق ہیں۔''

''یہ بھی ٹھیک ہے لیکن ان کی موت ہمارے لیے مسائل بھی کھڑی کرسکتی ہے اس لیے ہمیں ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا ہوگا۔ مرشد ایک بہت بڑی جاگیر، گدی اور بے شمار دولت کا مالک ہے اس کے بعد جو ان چیزوں کا مالک بنے گا اسے ہم سے دشمنی بھی وراثت میں ملے گی اس لیے اگر مرشد ناکارہ ہوجائے اور زندہ رہے تو یہ سب کسی دوسرے کو نہیں ملے گا اور جب دولت و گدی نہیں ملے گی تو کسی کو ہم سے دشمنی کرنے کی ضرورت بھی باقی نہیں رہے گی۔''

عبداللہ نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ''یہ تو آپ نے بہت دور کی سوچی ہے۔ ہم میں سے کسی کے دماغ میں یہ بات نہیں آئی ہے۔''

عبداللہ اور میرے دوسرے ساتھی ذہین تھے لیکن وہ فیلڈ میں کام کرنے والے لوگ تھے۔ ان کے ذہن محدود پلاننگ کے ماہر تھے کہ اپنا ٹاسک کیسے حاصل کرنا ہے۔ مگر مستقبل کے بارے میں سوچنا ان کے لیے مشکل کام تھا۔ دوسری بے شمار ذمے داریوں کی وجہ سے ان کے پاس وقت بھی نہیں ہوتا تھا جب کہ دشمنوں کی مہربانی سے مجھے سوچنے

اور آئندہ کا لائحہ عمل طے کرنے کا بہت موقع ملتا تھا۔ میں نے عبداللہ سے کہا۔ ''کیونکہ مجھے سوچنے کے لیے وقت ملتا ہے۔ اس سے بہت ساری چیزیں سمجھ میں آجاتی ہیں۔''

عبداللہ ہچکچایا۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں جناب، لیکن مرشد اور فتح خان جیسے لوگوں کو زندہ چھوڑنے کو دل نہیں مانتا ہے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو، دل تو میرا بھی نہیں چاہتا ہے لیکن یہ انسانوں میں فرق کی بات بھی ہے۔ مرشد اور فتح خان جیسے لوگ ہماری سطح پر نہیں آسکتے۔۔۔ اسی طرح ہم ان کی سطح پر نہیں جاسکتے۔۔۔۔۔ ہم میں بنیادی فرق ہمیشہ رہے گا۔ اگر تقدیر نے ان کی موت ہمارے ہاتھ سے لکھی ہے تو یہ الگ بات ہے لیکن ہمیں صرف جوشِ انتقام میں ان کی موت کا فیصلہ نہیں کرلینا چاہیے۔''

عبداللہ نے سر جھٹکا۔ ''شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''انسانی معاملات میں آخری چیز موت ہوتی ہے اور اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرتے ہوئے ہمیشہ سوچو کیونکہ اس کے دوررس اثرات ہوتے ہیں۔''

ہم کوٹھی میں داخل ہوئے تو رات ہوچکی تھی۔ ملازم جسے سب صوفی کہتے تھے اور وہی ایک طرح سے ملازمون کا انچارج تھا ہمارے آتے ہی رات کا کھانا تیار ہونے کی خبر دی۔ عبداللہ نے میری طرف دیکھا تو میں نے کہا۔ ''آدھے گھنٹے بعد لگا دینا اور یہ بتاؤ یہاں کوئی کمپیوٹر اور انٹرنیٹ ہے۔''

''آپ کا لیپ ٹاپ ہے اور انٹرنیٹ کے لیے میں نے براڈ بینڈ کی درخواست دے دی ہے شاید ایک دو دن میں لگ جائے گا۔''

''مانی نے بڑی زبردست سروس لی ہوئی ہے۔''

''آپ کہیں تو اس کا بندوبست کرلیتے ہیں؟''

''نہیں اتنی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے کہا اور اوپر آگیا۔ کمرے میں آتے ہی سویرا کا نمبر ملایا۔ حویلی میں سورج ڈوبتے ہی رات کا کھانا کھالیا جاتا ہے۔ مجھے امید تھی کہ سویرا فارغ ہوگی۔ مگر بیل جاتی رہی اور اس نے کال ریسیو نہیں کی۔ شاید وہ کچن میں تھی اور موبائل کمرے میں پڑا ہوا تھا۔ میں نے اس کے نمبر پر میسج کردیا۔ چند منٹ بعد ہی سویرا کے نمبر سے کال آئی۔

''شہباز۔۔۔!'' اس نے بے تابی اور سانس میں بھر کر میرا نام لیا۔

''سویرا۔''

''آپ کہاں تھے، میں کب سے انتظار کر رہی تھی۔'' اس نے شکوہ کیا۔ ''بار بار کمرے کی طرف آتی تھی۔''

''دوسرے لوگوں سے میں نے کسی اور نمبر سے بات کی تھی میرا موبائل میرے ایک ساتھی کے پاس تھا اور اب ملا ہے۔''

''آپ کیسے ہیں، میں ہر روز پانچ وقت کی نماز کے بعد آپ کے لیے دعا کرتی ہوں۔''

''سویرا مجھے دنیا میں کسی چیز کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی تمہاری دعاؤں کی ہے۔''

''وہ تو میرا رُواں رُواں کرتا ہے۔'' وہ بولی اور پھر چہک کر کہا۔ ''اللہ اتنی رونق ہوگئی ہے حویلی میں، سارا سناٹا ختم ہوگیا ہے۔ شہباز یہ لڑکی شازیہ کون ہے؟''

''میرے ایک دشمن کی بیٹی ہے اور میرے دوسرے دشمن کی بدسلوکی کا شکار ہوئی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

میں نے سویرا کو مختصراً شازیہ کے بارے میں بتایا۔ سویرا حیران رہ گئی۔ ''اس بے چاری کے ساتھ اتنا برا ہوا ہے، مجھے مونا نے کچھ بتایا تو تھا۔ وہ تو امید سے ہے۔'' سویرا کی آواز جھینپ گئی تھی۔

''اس مسئلے کا کوئی حل نکالنا ہوگا۔ تم ماں جی سے بات کرو اور اسے کسی لیڈی ڈاکٹر کو دکھاؤ۔''

''آپ کا مطلب ہے۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔ مسئلہ ختم کردیا جائے۔'' سویرا نے اٹک اٹک کر کہا۔

''بالکل اس کے سوا اور کیا راستہ ہے، دوسری صورت میں اس لڑکی کی رہی سہی زندگی بھی تباہ ہوجائے گی اسے کون قبول کرے گا؟''

''ٹھیک ہے میں ماں جی سے بات کرتی ہوں۔'' سویرا نے کہا۔ اس سے کچھ دیر بات کرکے میں نیچے آیا تو کھانا لگ رہا تھا۔ کھانے کے بعد میں نے وسیم کو کال کرکے اکرم چشتی کے بارے میں رپورٹ لی۔ وہ گھر آنے کے کچھ دیر بعد ہی گھر سے نکل گیا تھا اور اس نے مری روڈ کی ایک نئی اسکیم کا رخ کیا تھا وہاں وہ ایک مکان میں موجود تھا۔ مکان پانچ چھ مرلے کا تھا اور بہ ظاہر عام سا لگ رہا تھا۔ میں نے وسیم سے کہا۔ ''یہ جگہ کیسی ہے؟''

''میرے آدمی کے مطابق ویران ہے نئی اسکیم ہے اور بہت کم آبادی ہے گھر بھی دور دور بنے ہوئے ہیں۔''

''اکرم کے ساتھ اس کا گارڈ بھی ہے؟''

www.pdfbooksfree.pk

''بالکل ہے جناب۔'' وہ اس وقت بھی مکان کے باہر گاڑی میں موجود ہے۔''

''اگر یہ کوئی باقاعدہ اسکیم ہے تو یہاں کوئی چوکیداری سسٹم بھی ہوگا اپنے آدمی سے کہو چوکیدار کو تلاش کرے اور اس سے معلومات حاصل کرے لیکن اسے شک کا موقع نہ دے۔''

''وہ شک تو کرے گا۔'' وسیم نے جواب دیا۔ ''لیکن اس کا طریقہ ہے۔ رقم اس کا منہ بند کردے گی اور رقم کے ساتھ دھمکی اسے خاموش رہنے پر مجبور کرے گی۔''

''اپنے آدمی سے کہو یہ کام کر گزرے، وہاں کتنے لوگ ہیں؟''

''دونوں ہیں۔''

''ٹھیک ہے ایک آدمی مکان اور اکرم چشتی کی نگرانی کرے اور دوسرا چوکیدار کو تلاش کرے۔''

''کیا خیال ہے یہیں اکرم چشتی کو نہ چھاپ لیا جائے؟''

''نہیں کوئی کچا کام نہیں کرنا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''نہ جانے اس مکان میں کون ہے اور پھر وہی بات ہوگی معاملہ فوراً کھل جائے گا اور اکرم چشتی کو حویلی تک لے جانے میں مشکل پیش آسکتی ہے۔ دوسرے مکان میں موجود افراد گواہ بن جائیں گے۔''

''میں ہدایت کرتا ہوں۔'' وسیم نے کہا اور کال کاٹ دی۔ میں کمرے میں آیا کیونکہ صبح سویرے اٹھنا تھا اس لیے میں نے کھانا کم کھایا تھا۔ کچھ دیر بعد غسل کر کے ایک گلاس دودھ لیا اور سو گیا۔ موبائل میں پانچ کا الارم لگالیا تھا۔ میری تھکن خاصی حد تک اتر گئی تھی لیکن میں نے محسوس کیا کہ میں پوری طرح فٹ نہیں ہوں۔ مجھے اس میں ایک دو دن اور لگتے۔ الارم بجا تو میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا اور نیچے آیا جہاں عبداللہ اور اس کے آدمی تیار تھے۔ میں نے کافی کا کہہ کر عبداللہ سے رپورٹ لی۔ اس نے بتایا۔

''اکرم چشتی اس مکان سے گیارہ بجے نکلا اور واپس اپنی کوٹھی پر آگیا تھا۔ چوکیدار سے جو معلومات حاصل ہوئیں ان کے مطابق اس گھر میں ایک عورت اور ایک مرد رہتے ہیں لیکن ان کا کردار نہایت مشکوک ہے کیونکہ تقریباً روز ہی نئی شکلوں والے افراد یہاں آتے ہیں اور اکثر لوگ رات کو رک جاتے ہیں۔ کیونکہ آبادی زیادہ نہیں ہے اور جو ہیں وہ بھی خود میں مگن ہوتے ہیں اس لیے عام لوگوں کو ان کے کردار کے بارے میں زیادہ علم نہیں ہے لیکن چوکیداروں سے اس قسم کی چیزیں نہیں چھپ سکتی ہیں۔

''یعنی قصہ مختصر ہے کہ اکرم چشتی یہاں عیاشی کے لیے جاتا ہے۔''

''اس جیسے آدمی سے اسی کردار کی توقع کی جاسکتی ہے۔''

''روانگی کب ہے؟''

''دس منٹ میں۔''

میں تیار تھا عبداللہ نے ایک بریٹا اور اس کے دو عدد فاضل میگزین میرے سپرد کیے۔ کافی پیتے ہوئے میں نے ان کا معائنہ کیا اور مطمئن ہو کر اپنی جیکٹ میں رکھ لیا۔ موسم بہت سرد نہیں تھا لیکن جیکٹ پہننے کی گنجائش تھی۔ ساڑھے پانچ بجے ہم روانہ ہوئے تو صبح کی روشنی نمودار ہو رہی تھی۔ وسیم اور اس کے ساتھی اکرم چشتی کے گھر کے پاس پہنچ چکے تھے۔ اس کے آدمیوں نے دور سے کوٹھی کا جائزہ لیا تھا۔ وہاں تاریکی تھی اور کوٹھی کے باہر ایک گارڈ موجود تھا دوسرا یقیناً اندر آرام کر رہا تھا جیسی روح ویسے فرشتے تھے۔ اکرم چشتی جیسے کرپٹ پولیس افسر کے محافظ بھی اس کی طرح حرام خور تھے۔ ہمارے وہاں پہنچنے تک روشنی ہوگئی تھی لیکن ابھی سورج نہیں نکلا تھا۔ وین کے ساتھ وسیم وہی ڈبا نما جیپ بھی لایا تھا۔ اکرم چشتی کو اسی میں ڈال کر لے جانا تھا۔ اس کے علاوہ تین بائک سوار تھے۔ مجموعی طور پر وسیم کے ساتھ سات افراد تھے اور عبداللہ جو اصل میں بیک اپ میں تھا وہ پانچ مسلح آدمی ساتھ لایا تھا۔ اس کا کام کسی ہنگامی صورتِ حال میں مداخلت کرنا تھا۔ ہمارے ساتھ دو گاڑیاں تھیں۔ ایک میں' میں اور عبداللہ تھے اور دوسری گاڑی میں اس کے پانچ آدمی تھے۔ وسیم نے وین پر نہ صرف کلر کرلیا تھا بلکہ اسے دور کھڑا کیا تھا۔ وین کی وجہ سے تمام لوگ آپس میں ریڈیو سے ایک دوسرے سے منسلک تھے۔ میں نے ہیڈ سیٹ لگایا اور وسیم سے پوزیشن پوچھی۔ ''تمام لوگ اپنی جگہوں پر ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''پلان کیا ہے؟''

''جیسے ہی اکرم چشتی گھر سے نکلے گا۔ بائک سوار اس کا پیچھا کریں گے اور خاموش پستول سے گاڑی کا ٹائر برسٹ کردیں گے۔ آگے سے جیپ کار کا راستہ روکے گی۔''

''اکرم چشتی اتنی آسانی سے قابو میں نہیں آئے گا وہ مزاحمت کرے گا۔''

''اس کے لیے ہمارے آدمی تیار ہوں گے۔ ان کے پاس بے ہوش کرنے والی ڈارٹ گن ہوگی۔''

''بے ہوشی کی دوا کچھ دیر سے اثر کرتی ہے۔''

''اگر زیادہ مزاحمت کی تو میں نے اپنے آدمیوں کو ہدایت کردی ہے وہ جان لیے بغیر گولی چلا سکتے ہیں۔'' وسیم نے کہا۔ ''ویسے اس قسم کے کاموں میں خطرہ تو ہوتا ہے۔''

گلی کے دونوں سروں پر وسیم کے آدمی موجود تھے اور وہ کوٹھی پر مکمل نظر رکھے ہوئے تھے۔ سات بجے ان میں سے ایک نے اطلاع دی۔ ''جناب اندر سے ایک گاڑی نکلی ہے۔''

''کون سی گاڑی ہے؟''

''نیلی ہنڈا ہے جناب۔''

کار گلی کے کونے پر پہنچی تو ایک بائک اس کے پیچھے لگ گئی۔ بائک سوار نے اطلاع دی۔ ''کار میں کوئی ملازم ہے۔ اس کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔''

''شاید یہ کسی عارضی کام سے نکلا ہوگا۔'' وسیم نے کہا۔ ''اس کے پیچھے لگے رہو اور جب ریڈیو کی حد سے نکل جاؤ تو موبائل پر رابطہ کرنا۔''

دس منٹ بعد اطلاع ملی کہ ملازم ایک معروف حلوائی سے حلوہ پوری اور دوسرا سامان لے رہا تھا۔ یہ کام کر کے وہ ساڑھے سات بجے تک واپس کوٹھی پہنچ گیا گویا وہاں ناشتے کی تیاری تھی۔ صبح ہوتے ہی دوسرا گارڈ بھی ڈیوٹی پر واپس آگیا تھا۔ دن اور رات کے الگ الگ محافظ ہوتے لیکن فی الحال ان کی تبدیلی کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ آٹھ بجے ان کے لیے بھی اندر سے ناشتا آگیا تھا۔ ہم صبر سے انتظار کر رہے تھے کہ اکرم چشتی دفتر جانے کے لیے باہر نکلے تو ہم اپنی کارروائی کریں۔ سب اپنی اپنی جگہ مستعد تھے۔ تمام گاڑیوں اور بائکس کی نمبر پلیٹس بدلی ہوئی تھیں۔ جو لوگ اکرم چشتی اور اس کے گارڈ کے سامنے آتے ان کے چہرے چھپے ہوتے اس لیے بعد میں کوئی ثبوت باقی نہیں رہتا۔ ساڑھے آٹھ بجے کے قریب گیٹ پر موجود گارڈ مستعد ہوگئے اور اپنی رائفلیں سنبھال کر کھڑے ہوگئے۔

''میرا خیال ہے اکرم چشتی باہر آنے والا ہے۔'' وسیم نے کہا۔

سب چوکنّے ہوگئے۔ چند منٹ بعد وٹز باہر آئی اور اس نے گلی کے اس سرے کا رخ کیا جہاں ہم موجود تھے۔ وسیم کے آدمی لمحہ بہ لمحہ خبردار کر رہے تھے۔ ایک منٹ بعد کار گلی کے سرے پر نمودار ہوئی اور بڑی سڑک کی طرف جانے

www.pdfbooksfree.pk

لگی فوراً ہی تینوں بائیک والے اس کے پیچھے نمودار ہوئے تھے۔ میں عبداللہ کے ساتھ دور تھا اور صرف رواں کمنٹری پر گزارہ کررہا تھا پھر وسیم نے بتایا۔ ''اسے روک لیا ہے۔''

یہ سنتے ہی عبداللہ نے گاڑی اسٹارٹ کرکے آگے بڑھادی اور جب تک ہم اس جگہ پہنچے اکرم چشتی اور اس کا محافظ بے ہوش کیے جاچکے تھے۔ انہیں حرکت کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ جیپ نے راستہ روکا تھا اور اس سے پہلے کہ اکرم چشتی یا اس کا گارڈ ہوشیار ہوتے انہیں ڈارٹ گن کی مدد سے بے ہوش کیا جاچکا تھا۔ اکرم چشتی کو نہایت پھرتی سے جیپ کے فولادی بکس میں منتقل کردیا گیا تھا اور اس پر ایسی بوریاں ڈال دی گئی تھیں جن میں کچی روئی بھری ہوئی تھی۔ اب کوئی گاڑی روک کر چیک بھی کرتا تو اسے روئی کی بوریاں ہی ملتیں۔ ہم وہاں نہیں رکے تھے بلکہ یوں دیکھتے ہوئے گزرے جیسے عام لوگ ہوں۔ وین اپنی جگہ موجود تھی اور بائیک والے آگے نکل گئے تھے۔ جیپ روانہ ہوئی اور اکرم چشتی کی کاربے ہوش گارڈ کے ساتھ رہ گئی تھی۔ وہ پنکچر کھڑی تھی اور اس کے دروازے بند تھے۔ اتفاق سے کسی نے بھی یہ سین ہوتے نہیں دیکھا تھا اس لیے اب جب تک کوئی خاص طور سے کار کے پاس جاکر نہ دیکھتا اسے بے ہوش گارڈ کا بھی پتا نہیں چلتا۔

''کمال کردیا۔'' میں نے ریڈیو پر کہا۔ ''اتنی صفائی سے کام کیا ہے۔''

''ڈارٹ گن صرف دو منٹ میں بے ہوش کردیتی ہے اور آدمی کو تین چار گھنٹے سے پہلے ہوش نہیں آتا۔'' وسیم نے کہا۔ ''وین پیچھے رہے گی میں خود جیپ میں آگیا ہوں۔''

''اچھا میں تو تمہیں وین میں سمجھ رہا ہوں۔'' میں نے کہا اور عبداللہ کی طرف دیکھا۔ ''میرا خیال ہے تم اپنے باقی آدمیوں کو واپس بھیج دو ہم وسیم کے ساتھ چل رہے ہیں۔''

عبداللہ موبائل پر اپنے آدمیوں سے رابطہ کرنے لگا جو دوسری گاڑی میں تھے۔ اس گاڑی میں صرف میں اور عبداللہ تھے۔ جیپ میں وسیم اور اس کے ساتھ ڈرائیور تھا۔ باقی تین بائیک سوار تھے۔ مجھے اکرم چشتی کے پکڑے جانے کی خوشی تھی۔ اس شخص سے اپنا حساب برابر کرنا تھا۔ ابھی میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ اس کا کیا کرنا ہے۔ ممکن ہے اس کے لیے سزائے موت تجویز کی جاتی۔ لیکن ایک بات میں نے سوچ لی تھی۔ اس سانپ کو اب زہر اور دانت کے ساتھ نہیں چھوڑنا ہے۔ اگر اسے زندہ رہا بھی کیا تو ناکارہ کرکے رہا کریں گے اور اس سے پہلے حویلی کے تہ خانے میں اسے کچھ یادگار وقت گزارنا تھا جسے وہ مرتے دم تک نہ فراموش کرسکے۔ عبداللہ نے اپنے آدمی واپس بھجوا دیے تھے اور اب خاموشی سے ڈرائیو کررہا تھا۔ وین کہیں آس پاس تھی لیکن اس کا موصلاتی سسٹم بند کردیا گیا تھا اس لیے ہم آپس میں بات نہیں کرسکتے تھے۔ میں نے ہیڈ سیٹ اتار دیا۔ میرے موبائل کی بیل بجی وسیم کال کررہا تھا۔ میں نے کال ریسیو کی۔

''کیا ہوا وسیم؟''

''کوئی گڑبڑ ہے جناب! اس سڑک پر آگے پولیس نے ناکا لگا رکھا ہے۔ گاڑیوں کی تلاشی لی جارہی ہے۔''

ابھی ہم دور تھے۔ میں نے عبداللہ سے گاڑی سڑک سے ہٹانے کو کہا اور وہ اسے گھما کر سروس روڈ پر لے آیا۔ مزید آگے جاکر ہم ٹریفک کے ہجوم میں پھنس سکتے تھے۔ میں نے کہا۔ ''وسیم یہ ناممکن ہے کہ پولیس اتنی جلدی حرکت میں آجائے، انہیں اکرم چشتی کی تلاش نہیں ہے۔ یہ کوئی اور چکر ہے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن ہم بھی اس چکر کی لپیٹ میں آسکتے ہیں۔ ہم آگے آچکے ہیں اور واپسی کی گنجائش نہیں ہے۔''

صورتِ حال اچانک تشویشناک ہوگئی تھی۔ اکرم چشتی جتنی آسانی سے ہمارے ہاتھ لگا تھا اس سے لگ رہا تھا کہ اب کوئی مشکل نہیں ہے لیکن مشکل اچانک ہی سامنے آئی تھی۔ یہ سڑک پنڈی شہر کے اندر تھی اور یہاں اس طرح چیکنگ کا مطلب تھا پولیس کوئی بڑی سرگرمی کررہی تھی۔ پچھلے کچھ عرصے سے جڑواں شہروں کے حالات ٹھیک نہیں رہے تھے۔ تواتر سے دہشت گردی کی وارداتوں نے پولیس اور انتظامیہ کو چوکنا کردیا تھا اور ممکن ہے یہ تلاشی بھی اسی سلسلے میں لی جارہی ہو۔ میں نے وسیم سے کہا۔ ''دائیں بائیں نکلنے کی گنجائش نہیں ہے؟''

''ہے لیکن گرین بیلٹ ہے اسے روند کر نکلے تو پولیس فوراً پیچھے آئے گی، ناکے پر دو موبائل موجود ہیں۔''

''تلاشی کس طرح سے لی جارہی ہے صرف کاغذات دیکھ رہے ہیں یا عملی تلاشی بھی لے رہے ہیں۔''

''عملی تلاشی لی جارہی ہے۔ تین تین کی قطاروں میں گاڑیاں لگی ہیں۔ ان کی ڈکیاں تک کھلوا کر دیکھ رہے ہیں۔''

''کسی بھی طرح سے وہاں سے نکلو۔'' میں نے کہا۔ ''ایک بار ناکے کے پاس پہنچ گئے تو گلوخلاصی مشکل ہوجائے گی۔''

''ہم دائیں طرف ہیں۔ دوسری والی سڑک پر نکل کر واپس آئیں گے۔ اس پر ٹریفک بہت کم ہے۔''

عبداللہ سن رہا تھا اس نے کہا۔ ''وسیم صاحب سے کہیں واپس آتے ہوئے بائیں طرف سڑک نکل رہی ہے اس پر آجائیں۔ یہ سیدھی جی ٹی روڈ پر نکلے گی۔''

''جی ٹی روڈ پر پولیس مستعد ہوگی۔'' وسیم نے کہا۔

''آپ نکلیں تو جناب اس کے بعد دیکھتے ہیں۔'' عبداللہ نے کہا۔

''یہیں نہ پھنس جائیں۔''

حویلی اٹک سے پہلے جی ٹی روڈ اور پشاور جانے والی موٹروے کے درمیان ایک عام سی شاہراہ کے قریب تھی۔ یہ علاقہ زیادہ آباد بھی نہیں تھا اور اس سڑک پر بھی زیادہ رش نہیں ہوتا تھا لیکن اب اس تک پہنچنا مشکل لگ رہا تھا۔ ہم پنڈی میں ہی پھنس گئے تھے۔ وسیم نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''ہم گرین بیلٹ کراس کرکے دوسری طرف آگئے ہیں۔''

''گڈ تمہارے ساتھی بھی ہیں؟''

''ہاں وہ تینوں بھی پیچھے آئے ہیں۔''

''پولیس موبائل؟''

''ان کا نہیں پتا، وہ خاصی پیچھے ہیں۔''

''اپنے آدمیوں کو حکم دو کہ اگر موبائلز پیچھے آنے کی کوشش کریں تو ان کے ٹائر برسٹ کردیں۔''

''میں پہلے ہی ان سے کہہ چکا ہوں۔'' وسیم نے بتایا۔ ''لیکن ابھی تک کوئی موبائل پیچھے آتی نظر نہیں آرہی ہے البتہ لوگوں نے بہت گالیاں دی ہوں گی جن سے جیپ ٹکراتے ٹکراتے بچی۔''

''ان کی فکر مت کرو۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''وہ بے چارے حق بہ جانب ہیں گالیاں دینے میں۔''

میں اور عبداللہ سروس روڈ پر تھے اور اسی پر واپسی کے لیے چل پڑے۔ عبداللہ نے مشورہ دیا۔ ''جب تک پولیس حرکت ہے آپ کا باہر نکلنا خطرے سے خالی نہیں ہے اس لیے ہم واپس چلتے ہیں۔ حویلی بعد میں جاسکتے ہیں۔''

میں نے اس کی بات پر غور کیا اور پھر خود کو اتفاق پر مجبور پایا۔ پولیس جس طرح سے ناکا لگا کر کھڑی تھی اس سے صاف ظاہر تھا کہ کوئی بڑی گڑبڑ تھی اور شاید دہشت گردی کا معاملہ تھا ورنہ عام مجرموں کے لیے پولیس اور انتظامیہ اس طرح مستعد نہیں ہوتی ہے۔ میں نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے ہم پنڈی سے نکلنے کی کوشش نہیں کریں گے لیکن جب تک وسیم بہ حفاظت نہیں نکل جاتا ہے ہم یہیں رہیں گے۔''

''میرا خیال ہے وسیم صاحب کو جی ٹی روڈ کے بجائے پشاور جانے والی موٹروے پکڑنی چاہیے اس پر رش کم ہوتا ہے اور وہاں ناکے کا امکان بھی کم ہوگا۔ بس راستہ ذرا طویل ہوجائے گا۔''

میں نے وسیم کو کال کرکے موٹروے سے جانے کا مشورہ دیا۔ وہ جی ٹی روڈ تک پہنچ گیا تھا۔ اسے اٹک خورد سے پہلے جانا تھا۔ حویلی جی ٹی روڈ اور موٹروے کے درمیان کے علاقے میں تھی۔ وسیم کے تینوں بائیک سوار اس کے ساتھ تھے۔ جیسے جیسے سورج بلند ہورہا تھا دن گرم ہوتا جارہا تھا۔ یہ غیر متوقع گرمی تھی کیونکہ اپریل کے آغاز میں بھی راولپنڈی اسلام آباد کا موسم خوشگوار ہی ہوتا ہے۔ عبداللہ نے گاڑی ایک چھوٹے سے ریستوران کے سامنے روک لی اور ہم اندر چلے آئے۔ یہاں ایک دور.... کی میز سنبھال کر ناشتے کا آرڈر کیا۔ عبداللہ نے ناشتا کرلیا تھا لیکن میں نے صرف ایک کافی لی تھی اور اب مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ عبداللہ نے اپنے لیے چائے منگوائی تھی۔ جب تک میں ناشتا کرتا رہا وہ وقفے وقفے سے وسیم کو کال کرکے اپ ڈیٹ لیتا رہا۔ وسیم موٹروے تک پہنچ گیا تھا۔ جب تک میں ناشتے سے فارغ ہوا وسیم اکرم چشتی سمیت پنڈی کی حدود سے نکل چکا تھا۔

''میرا خیال ہے اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔'' عبداللہ نے سکون کا سانس لیا۔ ''یہ اکرم چشتی سچ مچ نہایت منحوس آدمی ہے۔ کتنی آسانی سے ہاتھ آگیا اور کیسی مشکل میں پڑتے پڑتے بچے ہیں۔ اگر وسیم صاحب ذرا اور آگے نکل جاتے تو پھر واپسی کا امکان باقی نہ رہتا۔''

''یہ بہتر ہوا کیونکہ جی ٹی روڈ پر ناکے کا امکان تھا اگر وسیم یہاں نہ پھنستا تو وہاں پھنس جاتا اب وہ موٹروے سے نکل گیا ہے۔''

حویلی اچھی جگہ ہے لیکن دور بہت ہے ہمیں کہیں آس پاس بھی کوئی ایسا ہی ٹھکانا تلاش کرنا چاہیے۔''

''اس کے برعکس ان لوگوں کا دور رہنا ہی ٹھیک ہے شہر میں دشمنوں کی نظروں میں آنے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ جیسے راجا صاحب والی کوٹھی سے تمام دشمن واقف ہو گئے تھے اور بالآخر میں وہیں سے نکلنے کے بعد دشمن کے ہتھے چڑھا۔ اس سارے کھیل میں اہمیت وقت اور فاصلوں کی نہیں راز داری کی ہے۔ حویلی دور دراز ہے اس لیے

www.pdfbooksfree.pk

ہمارے دشمن اس تک رسائی نہیں رکھتے ہیں جب کہ پنڈی اور اسلام آباد یا آس پاس ہمارے جتنے ٹھکانے تھے بالآخر دشمن ان تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔‘‘

’’ہاں یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔‘‘

’’اب یہ ہو سکتا ہے کہ ہم متبادل ٹھکانے بنائیں اور یہ کام تم کر رہے ہو۔ یہ کوٹھی لے لی ہے۔ اسی طرح ہم نے فارم ہاؤس لیا تھا اور خاصے عرصے تک اسے استعمال کرتے رہے۔ جب خطرہ محسوس ہوا تو اسے چھوڑ دیا۔ اب ہمیں فارم ہاؤس جیسے کرائے کے ٹھکانے تلاش کرتے رہنے چاہئیں۔‘‘

ہم ریستوران سے نکلے تو وسیم موٹر وے پر خاصا آگے نکل چکا تھا اور اب وہ حویلی کے قریب تھا۔ مگر حویلی کے لیے اسے بہت آگے جا کر واپسی کا راستہ ملتا کیونکہ پاس کوئی انٹر چینج نہیں تھا۔ میں اور عبداللہ واپس کوٹھی پہنچ گئے۔ اکرم چشتی کا یوں ہاتھ آنا ہماری بڑی کامیابی تھی اور اب میں مرشد سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔ خوش قسمتی سے جب ہم واپس آئے تو کوٹھی پر پی ٹی سی ایل کی ٹیم آئی تھی اور وہ انٹرنیٹ کے لیے براڈ بینڈ کنکشن کر رہے تھے۔ اس کوٹھی میں ٹیلی فون کا کنکشن پہلے سے موجود تھا لیکن فون کاٹ دیا گیا تھا انہوں نے اسی فون کو بحال کیا اور پھر لائن کو براڈ بینڈ کر دیا۔ چند گھنٹوں بعد انہوں نے انٹرنیٹ آن کر دیا تھا۔ وہ وائی فائی روٹر لگا گئے تھے۔ اس سے لیپ ٹاپ سے بغیر کوئی تار لگائے انٹرنیٹ استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اس وقت براڈ بینڈ آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا اور اسپیڈ بھی اتنی نہیں تھی لیکن جتنی تھی وہ کام کرنے کے لیے کافی تھی۔ میں نے مانی کا بنایا ہوا انٹرنیٹ کال کا اکاؤنٹ کھولا اور مرشد ہاؤس کا نمبر ملایا۔ نمبر سیکریٹری نے اٹھایا۔

’’مرشد سے بات کراؤ۔‘‘ میں نے کہا۔

’’شہباز صاحب؟‘‘ سیکریٹری نے میری آواز پہچان لی تھی۔

’’مجھے کوئی موبائل نمبر دو جس پر مرشد سے بات ہو سکے۔‘‘ میں نے اس کا سوال نظر انداز کر کے کہا۔

’’ایک منٹ۔‘‘ اس نے کہا اور پھر مرشد سے بات کی اور کچھ دیر بعد مجھے ایک نمبر نوٹ کرا دیا۔ ’’مرشد صاحب اس پر ملیں گے شہباز صاحب۔‘‘

’’میں شہباز نہیں ہوں۔‘‘ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں نے کال کرنے والے سافٹ ویئر کا وائس چینجر آن کیا تا کہ مرشد تک میری آواز بدلی ہوئی جائے اور وہ اس کال کو ریکارڈ کر کے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے۔ ملایا۔ مرشد نے فوراً کال ریسیو کی۔

’’شہباز.....‘‘

’’میں کون ہوں تم اچھی طرح جانتے ہو اس لینے کی ضرورت نہیں ہے۔‘‘ میں نے اس کی بات کاٹ

وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے کہا۔ ’’تم جو ہوا اس میں قصور فاضلی کا تھا۔‘‘

’’تب فاضلی کو میرے حوالے کر دو۔‘‘

’’اسے اس کے کیے کی سزا مل چکی ہے۔‘‘ مرشد نے چالاکی سے جواب دیا۔ ’’وہ شدید زخمی ہے اور اب نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی جان بچتی ہے یا نہیں۔‘‘

’’مرشد تم حسب عادت جھوٹ بول رہے ہو اس کی حالت اتنی ہی خراب ہے تو اسے اسپتال میں کے بجائے مرشد ہاؤس کیوں منتقل کر دیا گیا ہے۔‘‘

’’یہاں بھی بہترین ڈاکٹر تمام انتظامات کے اس کا علاج کر رہے ہیں۔ اسپتال میں تم لوگوں کی طرف سے اس کی جان کو خطرہ تھا۔‘‘

’’ایسی کوئی بات نہیں ہے۔‘‘ میں نے چالاکی سے جواب دیا۔ ’’اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو تم ہفتہ پہلے مرحوم ہو چکے ہوتے۔ مرشد اب بھی وقت سنبھل جاؤ اور اس حقیقت کو تسلیم کر لو کہ تمہاری بقا بھی جیو اور جینے دو میں ہے۔ ہم پہلے کی طرح کمزور نہیں رہے ہیں۔ اہمیت تین چیزوں کی ہوتی ہے۔ دولت، طاقت انہیں استعمال کرنے کا حوصلہ، یہ تینوں چیزیں ہمارے پاس موجود ہیں۔ اس لیے تم اس وقت سے ڈرو جب ہم تمہاری سطح پر آنے کا فیصلہ کر لیں اور وہ وقت زیادہ دور بھی نہیں ہے۔ جو گولی تمہارے گلے میں سوراخ کرتی گزری تھی بار وہ تمہاری کھوپڑی میں سوراخ کرے گی۔‘‘

’’میں ایسی دھمکیوں سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔‘‘ اس نے حوصلے سے جواب دیا۔

’’مجھے معلوم ہے تم دھمکیوں سے ڈرنے والے نہیں ہو۔ مگر تم نے کبھی یہ سوچنے کی زحمت کی ہے کہ اس دنیا کے تمام رنگ و بو اور تمام عیش تمہارے وجود کے دم سے ہیں۔ اگر تم نہ رہے تو یہ سب بیکار ہو جائے گا۔ تم نے جو جمع کیا ہے اس پر دوسرے عیش کر رہے ہوں گے۔‘‘

’’تم چاہتے ہو کہ میں اپنی جمع کی ہوئی دولت پر صبر کروں۔‘‘ اس نے طنز کیا۔ ’’تم میرے اتنے ہمدرد ہو رہے ہو کیونکہ تم سے میری کوئی براہِ راست دشمنی نہیں ہے۔‘‘

’’ہاں کیونکہ تم سے میری کوئی براہِ راست دشمنی نہیں ہے۔ نادر نے جو کیا تھا وہ اس کے سامنے آ رہا ہے۔ قدرت نے اسے خود سزا دے دی ہے۔ میرا اس سے مزید الجھنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اس لیے اب معاملہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تم میرا پیچھا چھوڑ دو تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ جلد یا بدیر تمہیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ دو طاقتوروں کے درمیان پُرامن بقائے باہمی ہی بہترین پالیسی ہے۔‘‘

’’نادر تمہارے پاس ہے؟‘‘

’’فرض کرو وہ میرے پاس ہے تب بھی میں نے تمہارا دردِ سر ہی کم کیا ہے ورنہ تم اچھی طرح جانتے ہو وہ تمہارے خاندان کے ان لوگوں کی گود میں جانے کے لیے تڑپ رہا تھا جو اس گدی پر اب تمہارا وجود مزید برداشت کرنے کو تیار نہیں ہیں۔‘‘

مرشد نے میرے الفاظ کو تولا اور کہا۔ ’’اگر نادر تمہارے پاس ہے تو میں تم سے سودا کرنے کے لیے تیار ہوں تم اسے میرے حوالے کر دو اور میں تم سے دشمنی ختم کر دوں گا۔‘‘

’’ٹھیک ہے تم اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر پہلے میرے خلاف تمام مقدمات ختم کرا دو اور جب پولیس سے میرا پیچھا چھوٹ جائے گا تو میں نادر کو تمہارے حوالے کر دوں گا۔‘‘

’’مقدمات کو بنایا جا سکتا ہے لیکن تم جانتے ہو انہیں ختم کرانا آسان نہیں ہے۔‘‘

’’بالکل آسان ہے‘ پولیس جس طرح تمہارے اشارے پر ناچ رہی ہے۔ وہ ’’نئے شواہد‘‘ کی روشنی میں عدالت سے میرے خلاف کیسز واپس لینے کی استدعا کرے گی اور کیس چند ہفتوں میں واپس ہو سکتے ہیں۔ اس سارے پروسیس میں کس طرح تیزی لائی جاتی ہے یہ بات تم اچھی طرح جانتے ہو۔ تمہارے پاس اچھا موقع ہے ایک مہینے میں تم یہ کام کر سکتے ہو۔ اس کے بعد میں نادر کو تمہارے حوالے کر دوں گا اور تم سکون سے اپنی الیکشن مہم چلا سکتے ہو۔‘‘

وہ انجان بن گیا۔ ’’کون سی الیکشن مہم؟‘‘

’’جس کے لیے تم دن رات ایک کر رہے ہو۔ لیکن اگر تمہیں کچھ دھچکے اور لگے یا تمہارے مزید کچھ کرتوت سامنے آ گئے تو ممکن ہے پارٹی تمہیں ٹکٹ دینے سے انکار کر دے اور تم کٹی پتنگ بن کر رہ جاؤ۔‘‘

’’ایسا نہیں ہو سکتا۔‘‘ اس نے اپنے مخصوص تکبر بھرے لہجے میں کہا۔ ’’اگر پارٹی نے مجھے ٹکٹ نہ بھی دیا تب بھی یہ سیٹ میری ہی ہے۔‘‘

’’ہو سکتا ہے کہ تم اپنی حیثیت میں جیت جاؤ لیکن تم اچھی طرح جانتے ہو آزاد امیدواروں کو وہ حیثیت نہیں ملتی ہے جو پارٹی کے لوگوں کو ملتی ہے۔ ورنہ تم پارٹی جوائن نہ کرتے۔ بہر حال میرے کہنے کا مقصد ہے کہ اب تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں رہا ہے۔ ان چند مہینوں کے اندر معاملات کو سلجھا سکتے ہو ورنہ اس کے بعد وقت تمہارے ہاتھ سے بھی نکل جائے جیسے ابھی ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے۔‘‘

مرشد خاموش ہو کر سوچنے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میری بات اسے قابلِ غور لگی تھی۔ اس سے پہلے بھی کئی بار میری اس سے اس موضوع پر طویل گفتگو ہو چکی تھی لیکن مرشد کی طرف سے ہمیشہ بد نیتی کے ساتھ بات ہوتی تھی۔ وہ زبان سے رام رام کر رہا ہوتا تھا لیکن اس کی بغل میں ہمیشہ چھری ہوتی تھی۔ اس لیے مجھے کوئی خاص خوش فہمی نہیں تھی کہ وہ شرافت سے معاملات سدھارنے کی کوشش کرے گا۔ وہ کتے کی ایسی دم تھی جو روزِ اول سے ٹیڑھی تھی اور سو برس نلکی میں رکھنے کے باوجود اس کا سیدھے ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ وہ صرف انتہائی مجبوری کے عالم میں صلح قبول کر سکتا تھا اور فی الحال وہ مجبور ہو رہا تھا اس لیے میری کوشش تھی کہ اس سے فائدہ اٹھا کر میں کم سے کم اپنے مقدمات ختم کروا لوں۔ دوسری طرف وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ یہی مقدمات میرے گلے کا پھندا تھے اور انہی کی وجہ سے میں عام زندگی گزارنے سے قاصر تھا۔ اس لیے وہ آسانی سے راضی نہیں ہوتا۔ اس لیے جب اس نے خاصی دیر بعد اقرار کیا تو میں حیرت سے اچھل پڑا تھا۔ اس نے کہا۔

’’ٹھیک ہے شہباز، میں تیار ہوں۔ میں کل اپنے وکیل کو تمہارے وکیل سے ملنے کی ہدایت کرتا ہوں۔ وہ دونوں مل کر قانونی معاملہ دیکھ لیں گے۔ لیکن اب ہمارے درمیان جنگ بندی ہو جانی چاہیے۔‘‘

’’بالکل، میں بھی اپنا بہت وقت اور اپنا ایک بھائی اس دشمنی کی نظر کر چکا ہوں۔ میرے دوست اپنی معمول کی زندگیوں سے دور ہیں۔‘‘

’’دوسرے تم نادر کو فوراً میرے حوالے کر دو گے۔‘‘

’’یہ ممکن نہیں ہے۔‘‘ میں نے انکار کر دیا۔ ’’تم پہلے مقدمات ختم کروا دو یا کم سے کم انہیں ختم کرانے کی پوزیشن میں لے آؤ اس کے بعد ہی نادر تمہارے حوالے کیا جا سکتا ہے۔‘‘

www.pdfbooksfree.pk

"دیکھو وہ بیمار آدمی ہے اور اسے مستقل علاج کی ضرورت ہے۔" مرشد نے چالاکی سے کہا۔

"جبھی تم نے اسے بے یارومددگار اور لاوارث چھوڑ دیا تھا؟" وہ بڑی مشکل سے اپنا علاج کرا رہا تھا۔" میں نے طنز کیا۔ "وہ میرا دشمن ہے لیکن تم فکر مت کرو ہم اس کی اچھی ہی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔"

"اچھا ایسا کرو جب ہمارے وکیل آپس میں مل کر ایک فریم ورک بنالیں تب تم نادر کو آزاد کر دینا۔"

"مرشد وہ میرے پاس بالکل محفوظ اور آرام سے ہے یقین کرو اسے سوئی چبھنے جتنی تکلیف بھی نہیں ہوتی ہے۔ آخر تم اسے واپس لینے کے لیے اتنے بے قرار کیوں ہو؟"

"میرے کچھ خاندانی مسائل ہیں جن کی وجہ سے نادر کی جلد از جلد واپسی لازمی ہے ورنہ مجھے بڑا نقصان بھی ہو سکتا ہے۔"

غالباً مرشد کے منہ سے پریشانی میں یہ بات نکل گئی تھی۔ نادر کی گم شدگی اس کے خاندان میں مسائل میں اضافہ کر رہی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ اس گم شدگی کو مرشد کے کھاتے میں ڈال کر اس پر دباؤ ڈالا جا رہا تھا۔ یہ اچھی خبر تھی اس سے مرشد مجبور ہوتا کہ جلد از جلد مجھ سے صلح کر لے۔ صلح کے لیے میں نے اسے بتا دیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ میں نے جواب دیا۔ "مجھے تمہارے خاندانی مسائل سے کچھ لینا دینا نہیں ہے میں تمہیں صلح کے لیے اپنی شرط بتا چکا ہوں، میں تم سے کوئی گارنٹی نہیں مانگ رہا اور سچی بات ہے مجھے تمہاری کسی گارنٹی پر اعتبار بھی نہیں ہوگا اس لیے میں صرف ایک شرط رکھ رہا ہوں، میرے کیسز ختم کرا دو۔ اب میں تم سے کل رابطہ کروں گا اگر تمہارے وکیل نے ندیم بھٹی سے رابطہ کیا تو..."

"میری بات سنو...." مرشد نے کہنا چاہا لیکن میں نے کال کاٹ دی اور ہیڈ فون اتار دیا اور موبائل سے وسیم کا نمبر ملایا۔

"کیا صورتِ حال ہے؟"

"پارسل پہنچ گیا ہے جناب۔" وسیم نے چہک کر کہا۔ "ہم نے حساب کتاب کی تیاری بھی شروع کر دی ہے۔"

"اچھا۔" میں نے دلچسپی سے کہا۔ "کیا ہو رہا ہے اس کے ساتھ؟"

"خالص پولیس اسٹائل میں اسے الٹا لٹکایا ہے اور مرچوں کی دھونی دینے کی تیاری ہے۔"

"گڈ بس اتنا خیال رکھنا کہ یہ بدبخت دم گھٹ کر نہ مر جائے۔"

"آپ فکر نہ کریں جناب، اسے پتا چلے گا کہ ہم کچھ کم نہیں ہیں۔" وسیم نے جواب دیا، وہ بہت خوش تھا۔ "میری درخواست ہے کہ اسے دو دن کے لیے میرے سپرد کریں اس کے بعد ہی کوئی بات کرے گا۔"

"وہ اب بھی تمہارے سپرد ہے اور تمہیں اس کے ساتھ مناسب سلوک کرنے کے لیے کسی سے اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔"

"بس تو آپ دو دن بعد اسے دیکھیے گا آپ بھی اش اش کر اٹھیں گے۔"

مجھے لگ رہا تھا کہ اکرم چشتی کی شامت قریب تھی اس نے ساری عمر میں جو کیا تھا شاید وہ اسے دو دن میں بھگتنے پڑے۔ لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ میں انسانیت اور کسی بھی اچھی صفت سے عاری اس شخص سے اپنے ساتھیوں کا موازنہ کر رہا ہوں۔ وہ کسی بھی سطح پر چلے جائیں اکرم چشتی کی سطح پر نہیں پہنچ سکتے تھے۔ تھانوں میں عام پولیس والے سولہ سترہ سال یا اس سے بھی کم عمر کے افراد کے ساتھ جو بہیمانہ سلوک کرتے ہیں اس کی خبریں آئے دن اخبارات اور ٹی وی پر آتی رہتی ہیں۔ تھانوں میں لوگ تفتیش کے آگے ہار مان کر جان بھی دے دیتے ہیں کیونکہ ان کے پاس بتانے کے لیے سچ کے سوا کچھ نہیں ہوتا ہے۔ وہ اپنے بیچ پڑھے رہتے ہیں جو عقل مند ہوتے ہیں وہ جھوٹا الزام تسلیم کر کے کھال اور جان بچا لیتے ہیں اور اس کے بعد جب معاملہ عدالت میں جاتا ہے تو وہ عام طور سے بری ہو جاتے ہیں۔ وسیم اور اس کے ساتھی اکرم چشتی کے ساتھ وہ سلوک نہیں کر سکتے تھے جو وہ دوسروں کے ساتھ روا رکھتا تھا۔

بہر حال اکرم چشتی کو زندگی میں پہلی بار یہ ضرور چل جاتا کہ تشدد کیا چیز ہوتی ہے خاص طور پر جب آپ پر کیا جا رہا ہو۔ وسیم سے بات کر کے مجھے ایمن کا خیال آیا بہت دنوں سے اس سے بھی رابطہ نہیں تھا۔ فتح خان کی پہنائی بارودی جیکٹ سے نجات حاصل کرنے کے بعد وہ واپس انگلینڈ چلی گئی تھی۔ میرے موبائل میں اس کا نمبر محفوظ تھا لیکن میں نے اسے انٹرنیٹ کی مدد سے کال کی۔ اس نے کال ریسیو کی اور بوجھل لہجے میں ہیلو کہا۔

"ایمن کیسی ہو؟"

"شہباز۔" وہ چونک کر بولی۔ "تم کہاں ہو؟ میں تم سے رابطہ کرنا چاہ رہی تھی لیکن تمہارا نمبر بند جا رہا تھا

میں نے ای میل بھی کی ہے۔"

"میں حسبِ معمول غائب تھا کل واپس آیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تمہیں کیا ہوا تمہارا لہجہ بدلا ہوا ہے۔"

"شہباز میں بہت تکلیف میں ہوں۔" ایمن کہتے ہوئے رو دی تھی۔ "میں اس وقت بھی اسپتال میں ہوں اور ڈاکٹر بھی میری تکلیف کم نہیں کر پا رہے ہیں۔"

"کیا ہوا ہے.... کوئی حادثہ ہوا ہے؟"

"میری زندگی میں ڈیوڈ شا سے بڑا حادثہ اور کیا ہوگا۔" اس نے خود کو سنبھال کر تلخ لہجے میں کہا۔ "وہ کل مجھ سے ملنے آیا تھا۔"

"ایمن کیا اس نے کچھ کیا ہے؟"

"ہاں یہ اسی کا کیا دھرا ہے۔ لیکن شہباز میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے اس نے کیا کیا ہے۔ میرے بائیں بازو میں بہت درد ہو رہا ہے جیسے کسی نے میرا بازو آگ میں ڈال دیا ہے اور مستقل جل رہا ہے۔ تکلیف کی شدت میں ایک لمحے کو بھی کمی نہیں آئی ہے۔" وہ پھر رونے لگی۔

میں نے جہاں تک ایمن کو دیکھا تھا وہ بہت حوصلے والی لڑکی تھی۔ جب فتح خان نے اسے بارودی جیکٹ پہنائی تب بھی اس نے بہت حوصلے سے اس صورتِ حال کا سامنا کیا تھا ورنہ جسم سے لگی موت کا احساس اچھے اچھوں کے حواس اڑا دیتا ہے۔ مگر اس وقت وہ بچوں کی طرح رو رہی تھی۔ میں نے بہ مشکل اسے چپ کرایا اور تسلی دے کر اصل کہانی سنی جو اس نے سسکیوں اور ہچکیوں کے درمیان سنائی تھی۔

گزشتہ روز ایمن شام کے وقت لندن میں واقع اپنے فلیٹ میں پہنچی تو اس نے وہاں غیر متوقع طور پر ڈیوڈ شا کو فلیٹ کی نشست گاہ میں موجود پایا۔ اسے دیکھ کر ایمن مشتعل ہو گئی تھی۔ "تم اندر کیسے آئے، تم نے ٹریس پاس کیا ہے۔"

"آرام سے لڑکی۔" ڈیوڈ شا نے اسے گھور کر دیکھا۔ "میں نے کسی چیز کو نہیں چھیڑا ہے اور میں تم سے بات کرنے آیا ہوں۔"

ڈیوڈ شا کے گھورتے ہی ایمن کو لگا جیسے اس کے اندر اٹھتے غصے پر کسی نے برف کا ڈھیر الٹ دیا ہو اور وہ لمحوں میں بالکل ٹھنڈی پڑ گئی۔ بلکہ اسے ڈیوڈ شا سے خوف بھی محسوس ہونے لگا تھا جو شخص چوروں کی طرح لاک کھول کر اندر آئے اس کے ارادے اچھے نہیں ہو سکتے تھے۔ کیا وہ اسے مارنے آیا تھا؟ یہ سوچ کر اس کا جسم مزید سرد پڑ گیا کیونکہ آس پاس کے فلیٹ خالی تھے اور یہاں زیادہ تر بوڑھے لوگ رہتے تھے جن سے کسی مدد کی توقع محال تھی اگر وہ مدد کے لیے چلاتی تو شاید کوئی سننے والا بھی نہ ہوتا۔ ڈیوڈ شا نے اس کی کیفیت بھانپ لی اور اس بار نرمی سے بولا۔ "ڈرو مت میں تمہیں کوئی نقصان پہنچانے نہیں آیا ہوں اگر تم میری بات مانو گی تو آنے والی مشکل سے بچ جاؤ گی۔"

"کیسی مشکل؟" ایمن نے ہمت کر کے پوچھا۔ "کیا تم مجھے دھمکی دے رہے ہو۔"

ڈیوڈ شا نے اس کا سوال نظر انداز کر کے کہا۔ "تم نے میرے خلاف عدالت میں کیس فائل کرنے کی تیاری کر لی ہے، میں چاہتا ہوں تم ایسا نہ کرو اس کے بدلے تم مجھ سے جو چاہے مانگ لو۔"

"مجھے اپنے باپ کی جاگیر اور خطاب واپس چاہیے۔" ایمن نے کہا۔

"وہ تمہیں کسی صورت نہیں مل سکتا چاہے تم اس کے لیے عدالت میں ہی کیوں نہ چلی جاؤ۔ لیکن میں عدالت کے چکروں میں نہیں پڑنا چاہتا کیونکہ ان دنوں میں اپنی زندگی کے اہم ترین کام میں مصروف ہوں۔ اس لیے تمہارے پاس آیا ہوں۔ تم چاہو تو مجھ سے نقد رقم یا جاگیر لے سکتی ہو۔"

ایمن کا حوصلہ لوٹ آیا۔ اس نے انکار کر دیا۔ "مجھے بھیک نہیں اپنا حق چاہیے۔"

"تمہارا کوئی حق نہیں ہے۔" ڈیوڈ شا کا لہجہ دوبارہ سرد ہو گیا۔ "میں صرف اس خیال سے چلا آیا کہ میرا تم سے ایک رشتہ بھی ہے لیکن تم ایک ہٹ دھرم اور ضدی لڑکی ہو اس لیے اب سزا بھگتو گی۔" یہ کہہ کر ڈیوڈ شا ایمن کی طرف بڑھا۔ وہ خوف زدہ ہو گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ڈیوڈ شا اس پر حملہ کرنے والا ہے۔ لیکن پاس آ کر ڈیوڈ شا نے نرمی سے ایمن کا بایاں بازو پکڑا۔ اس نے بازو ایک لمحے کے لیے پکڑا تھا اور پھر چھوڑ دیا۔ اس وقت ایمن نے محسوس کیا کہ کسی سرد سی چیز نے اسے چھو دیا ہو۔ ڈیوڈ شا پیچھے ہٹا اور دروازے کے پاس جا کر اس نے اپنا ہیٹ اور کوٹ اٹھا کر پہنے پھر ایمن کی طرف دیکھا۔ "اگر تمہیں میری پیش کش کا خیال آئے تو میرے گھر کال کر لینا میرا نمبر تمہیں معلوم ہوگا۔"

ایمن نے منہ سے جواب نہیں دیا لیکن دل ہی دل میں اس نے ڈیوڈ شا کی پیش کش پر تھوکا تھا۔ اس کے جاتے ہی ایمن نے دروازہ بند کر کے تمام زنجیریں اور حفاظتی لاک بند کر دیے تھے۔ اس وقت اسے کچھ محسوس نہیں ہوا تھا البتہ رات تک اسے بازو میں جہاں ڈیوڈ شا نے چھوا تھا لحاتی

www.pdfbooksfree.pk

سوزش ہونے لگی۔ یہ سوزش بس ایک دو لمحے کے لیے ہوتی تھی اور پھر وہ نارمل ہو جاتی۔ ایمن نے زیادہ توجہ نہیں دی تھی کیونکہ بازو پر بہ ظاہر کوئی نشان بھی نہیں تھا۔ وہ رات سکون سے سوگئی لیکن صبح چار بجے اس کی آنکھ تکلیف سے کھلی، اسے لگا جیسے اس کے بازو پر کوئی گرم چیز گری ہو۔ وہ بوکھلا کر اٹھی اور اپنا بازو چیک کیا وہ بالکل نارمل تھا مگر تکلیف شدت کی تھی اور ٹھیک اسی جگہ ہو رہی تھی جہاں ڈیوڈ شا نے اس کا بازو پکڑا تھا۔ اسے خیال آیا کہ یہ ڈیوڈ شا کی حرکت تھی وہ اس کے بازو کے ساتھ کچھ کر کے گیا تھا اور تب ہی اس نے جاتے ہوئے معنی خیز انداز میں اسے پیشکش کی تھی۔

تکلیف اتنی شدید تھی کہ ایمن نے ایمر جنسی کو کال کر دی اور کچھ دیر میں ایمبولینس مع ڈاکٹر کے وہاں آ چکی تھی۔ ڈاکٹر نے ایمن کے بازو کا معائنہ کیا لیکن اس کی سمجھ میں بھی نہیں آیا کہ یہ کیا چکر ہو سکتا ہے۔ اس نے بہتر سمجھا کہ ایمن کو اسپتال لے جائے جہاں اس کا زیادہ بہتر معائنہ ہو سکتا تھا۔ اسپتال میں چند گھنٹوں کے اندر اس کے بازو کے بے شمار ٹیسٹ ہو گئے تھے۔ اس کا بلڈ اور یورین ٹیسٹ بھی لیا گیا تھا۔ بازو کا ایم آئی آر ہوا مگر نتیجہ صفر نکلا۔ کہیں کوئی خرابی یا ایسی علامت نہیں تھی جو اس تکلیف کی وضاحت کر سکتی مگر ایمن کی حالت دیکھ کر ڈاکٹر اسے غلط بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ اس کا رنگ تکلیف سے پیلا پڑ گیا تھا اور چہرے سے ہی وہ برسوں کی بیمار لگنے لگی تھی۔ جب کسی طرح بھی کچھ سامنے نہیں آیا اور تکلیف میں بھی کمی نہیں ہوئی تو ڈاکٹروں نے اسے مارفین کا انجکشن دے کر سلا دیا۔ مگر تکلیف کی شدت سے وہ کچھ دیر بعد ہی ہوش میں آ گئی تھی۔ دوسرا انجکشن بھی بے اثر رہا تو ڈاکٹروں نے مزید انجکشن لگانے سے گریز کیا۔ تکلیف کے ان لمحوں میں ایمن کو میرا خیال آیا اور اس نے اپنے اسمارٹ فون سے مجھے کال کرنے کی کوشش کے ساتھ ای میل بھی کی۔ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتی تھی۔

"میری خوش قسمتی کہ تم نے خود رابطہ کر لیا۔" اس نے اپنی کہانی کے آخر میں کہا۔ "پلیز شہباز کچھ کرو۔ میں مر رہی ہوں۔"

"حوصلہ رکھو میرا خیال ہے یہ ڈیوڈ شا کی شرارت ہے۔ اس کا مقصد تمہیں عدالت میں جانے سے باز رکھنا ہے۔ مجھے یقین ہے اس کے پاس اس تکلیف کا توڑ بھی ہوگا۔"

"لیکن میں اس ذلیل شخص سے بھیک نہیں مانگنا چاہتی۔"

"اسے بھیک مانگنا نہیں حکمتِ عملی کہتے ہیں ر... کرو میں اس سے بات کرتا ہوں۔"

"شہباز میں اسے چھوڑوں گی نہیں، اسے عدالت ضرور لے جاؤں گی۔" اس نے ضدی لہجے میں کہا۔

"دیکھو ابھی تم مشکل میں ہو اس لیے ضد مت لو اور صبر سے اس وقت کا انتظار کرو جب ڈیوڈ شا ... ہو جائے اور پھر تم اپنا کام کر سکو۔ میں نے تمہیں پہلے خبردار کیا تھا وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔ وہ صرف ... لحاظ سے خطرناک نہیں ہے بلکہ اس کے پاس کچھ ایسے ... ہیں جن کی مدد سے وہ کسی کو اس کی مرضی کے خلاف کر... کے لیے مجبور کر سکتا ہے۔ کسی کو ضرر پہنچا سکتا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے اس نے میرے خلاف بھی ایسا ہی کیا ہے؟"

"اس کا امکان ہے ورنہ تم خود سوچو کہ ڈاکٹر ... نارمل قرار دے رہے ہیں اور تم کہہ رہی ہو کہ تمہیں شدید تکلیف ہے۔"

"میں بھی اور ڈاکٹر بھی حیران ہیں یہ کیسی تکلیف ... جس کی کوئی وجہ سامنے نہیں آ رہی ہے۔"

"اسی لیے میں کہہ رہا ہوں کہ مجھے ڈیوڈ شا سے بات کرنے دو۔"

"تم اس سے کیا کہو گے؟"

"دیکھو ابھی کچھ سوچا نہیں ہے لیکن تمہاری تکلیف ختم کرانا اصل مقصد ہے۔"

"وہ تم سے اپنی شرائط منوائے گا۔" ایمن نے خدشہ ظاہر کیا۔

"وہ پہلے بھی کئی بار مجھ سے اپنی شرائط منوا چکا ہے۔ میں نے بے پروائی سے کہا۔ "اس لیے تم اس کی فکر مت کرو۔"

"ٹھیک ہے تم اس سے بات کر کے دیکھ لو۔" ایمن نے بے دلی سے کہا۔ "مجھے نہیں خیال کہ وہ اتنی آسانی سے مانے گا۔"

"میں بات کرتا ہوں۔" میں نے ایمن کو تسلی دی اور کال کاٹ کر ڈیوڈ شا کے گھر کا نمبر ملایا۔ کال اس کے بٹلر نے ریسیو کی اور مشینی لہجے میں بولا۔

"ہواز دس۔"

"شہباز احمد۔" میں نے جواب دیا۔ "مجھے ڈیوڈ شا سے بات کرنی ہے فوراً۔"

بٹلر کو میرا لہجہ اچھا نہیں لگا اس لیے اس نے روکھے

لہجے میں کہا۔ "میں مسٹر شا کو مطلع کرتا ہوں۔"

تقریباً دو منٹ بعد ڈیوڈ شا کی مخصوص سرد آواز ابھری۔ "شہباز، تم اس معاملے سے الگ رہو۔"

"تمہیں کیا پتا کہ میں نے کس معاملے میں کال کی ہے؟"

"مجھے معلوم ہے تم نے ایمن کے سلسلے میں کال کی ہے۔ اس ضدی لڑکی کو اپنی ضد کی سزا بھگتنی ہوگی۔"

"ڈیوڈ شا تم بھول رہے ہو وہ تمہارے خاندان سے ہے اس لیے اس میں ضد تو آئے گی۔ بہرحال تمہارا اندازہ درست ہے میں نے ایمن کے سلسلے میں کال کی ہے۔"

"میں نے کہا نا میں اس سلسلے میں تم سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا اس سے کہو اگر وہ اپنی تکلیف ختم کرانا چاہتی ہے تو خود مجھ سے بات کرے۔"

"وہ تمہیں کال نہیں کرے گی چاہے وہ تکلیف سے مر کیوں نہ جائے۔ وہ تو مجھے بھی کال کرنے سے روک رہی تھی۔ حالانکہ وہ بہت تکلیف میں ہے۔ تم نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے؟"

"یہ ایک خاص زہر ہے جو جلد کے ٹشوز میں سرایت کر کے بارہ سے سولہ گھنٹے بعد شدید سوزش اور جلن کا باعث بنتا ہے۔ اس کا کوئی توڑ نہیں ہے اور اسے جلد میں تلاش بھی نہیں کیا جا سکتا......" ڈیوڈ شا نے صاف گوئی سے بتا دیا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ کوئی دوسرا ایمن کی تکلیف کو دور نہیں کر سکتا۔

"زہر.... وہ مر بھی سکتی ہے؟" میں نے تشویش سے پوچھا۔

"نہیں اس سے کوئی مرتا نہیں ہے۔ یہ زہر اصل میں اعصابی خلیوں کو وہ پیغام دینے پر مجبور کرتا ہے جو وہ تکلیف کی صورت میں دیتے ہیں۔ ہوتا کچھ نہیں ہے مگر دماغ کو ایسا پیغام مل رہا ہوتا ہے کہ جسم کے مذکورہ حصے میں بے پناہ تکلیف ہے۔ اگر وہ تکلیف برداشت کر سکتی ہے تو دس سے بارہ دن میں زہر کا اثر ختم ہو جائے گا۔"

"اس کا کوئی توڑ بھی ہوگا۔" میں نے سوال کیا کیونکہ ڈیوڈ شا خود ہی مجھے زہر کے بارے میں تفصیل سے بتا رہا تھا۔

"توڑ ہے اور اگر ایمن مجھ سے بات کرے اور کیس کو عدالت میں نہ لے جانے کا وعدہ کرے تو میں توڑ بتا سکتا ہوں۔"

"اس کی طرف سے یہ وعدہ میں کرتا ہوں وہ کیس عدالت میں لے کر نہیں جائے گی۔" میں نے کہا۔ "تم جانتے ہو میں وعدہ خلافی کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔"

"میں تمہیں جانتا ہوں لیکن یہ معاملہ میرے اور ایمن کے درمیان میں ہے اس لیے تم اس میں دخل دینے سے گریز کرو۔"

"ڈیوڈ شا میرے بہت سارے معاملات ایسے تھے جن میں تمہیں دخل نہیں دینا چاہیے تھا لیکن تم نے دخل دیا۔ ابھی بھارتیوں کے ساتھ تمہارا جو معاہدہ ہوا ہے میں اس کے بارے میں بھی جانتا ہوں لیکن میں نے تم سے کوئی شکایت نہیں کی ہے۔ اس لیے اگر تم چاہتے ہو کہ ہمارے درمیان آگے بھی اسی طرح کا تعلق رہے تو تمہیں میری دخل اندازی قبول کرنا ہوگی ورنہ تم آیندہ مجھ سے کچھ منوانے کی پوزیشن میں نہیں رہو گے۔ تم نے مرشد کے بارے میں جو گارنٹی دی تھی وہ اس نے مسترد کر دی اس لیے میں بھی اب تمہارے لیے کچھ کرنے کا پابند نہیں ہوں۔"

"مرشد۔" ڈیوڈ شا نے غالباً دانت پیسے۔ "اس نے اچھا نہیں کیا ہے۔"

"وہ پہلے بھی اچھا نہیں کرتا رہا ہے اس لیے آیندہ بھی نہیں کرے گا۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "تمہیں یہ خوش فہمی کیوں ہو گئی کہ وہ تمہارے ساتھ اچھا کرے گا؟"

"میں ڈیوڈ شا ہوں۔"

"تم شاید خود کو بہت کچھ سمجھنے لگے ہو لیکن ڈیوڈ شا تم ایک انسان ہو اور موت کے سامنے اتنے ہی کمزور ہو جتنا ایک انسان ہوتا ہے۔" میں نے اس کی حقیقت بیان کی۔

"تم کیا چاہتے ہو؟" وہ جھنجلا گیا۔

"ایمن کا بازو ٹھیک کر دو۔"

"جب تک وہ مجھ سے بات نہیں کرے گی یہ ممکن نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے یہ تم چچا بھتیجی کا معاملہ ہے اس لیے میں اس میں دخل نہیں دے رہا لیکن ڈیوڈ شا اس بات کو یاد رکھنا کہ میں نے تم سے ایک درخواست کی تھی اور تم نے اسے مسترد کر دیا۔"

وہ نرم پڑ گیا۔ "میں نے مسترد نہیں کیا ہے۔ میں نے اپنی شرط بتا دی ہے۔"

"وہ نہیں مانے گی چاہے یہ تکلیف اس کی جان کیوں نہ لے لے اور وہ مر گئی تو ہمارے درمیان ہمیشہ کے لیے ایک دراڑ آ جائے گی۔"

"تم اس کی اتنی حمایت کیوں کر رہے ہو۔" ڈیوڈ شا کے لہجے میں شک آ گیا۔ "کیا تم اسے پسند کرتے ہو؟"

"ان معنوں میں نہیں جو تمہارے ذہن میں ہے۔ وہ

www.pdfbooksfree.pk

میری بہت اچھی دوست ہے اور ایک بار اس نے میری جان بچائی تھی۔"

"جان تو تم نے بھی اس کی بچائی ہے۔"

"یہ میرا اور اس کا حساب ہے۔ تم اپنی بات کرو۔ ڈیوڈ شا میں جانتا ہوں تم مجھ سے کیا چاہتے ہو اور میں نے بھی تمہیں انکار نہیں کیا ہے۔ لیکن اس کے بدلے تمہیں میرے لیے بھی کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔"

"یعنی اگر میں ایمن کو ٹھیک کر دوں تو تم میرے لیے کام کرو گے۔"

"نہیں میرے اندر کوئی ناقابلِ مزاحمت انکار نہیں آئے گا۔ تم جو چاہتے ہو اس کی اتنی معمولی قیمت لگا کر اپنے مقصد کی توہین مت کرو۔"

ڈیوڈ شا نے چند لمحے سوچا اور پھر گہری سانس لی۔ "ٹھیک ہے۔ شہباز تم ان چند لوگوں میں سے ہو جو مجھ سے کوئی بات منوا سکتے ہیں لیکن یاد رکھنا اس کی ایک حد ہوگی۔"

"تو تم ایمن کی تکلیف ختم کر دو گے؟"

"ہاں چند گھنٹوں بعد اسپتال والوں کو کوریئر سے ایک انجکشن ملے گا اور وہ اسے ایمن کے بازو میں لگا دیں۔ چند منٹ کے اندر اس کی تکلیف ختم ہو جائے گی۔"

"اسپتال والے آسانی سے راضی نہیں ہوں گے اور ان کے علم میں آئی تو بات آگے تک جائے گی۔"

"ٹھیک ہے میرا آدمی براہِ راست ایمن کے پاس آئے گا وہ اپنا نام پیٹرک بتائے گا اور پھر میرا حوالہ دے گا۔ انجکشن اس کے پاس ہوگا ایمن لگوا لے گی۔"

"دیکھو وہ بھی اتنی آسانی سے نہیں مانے گی اس کے ذہن میں بھی شک ہوگا کہ کہیں اس بہانے اسے زہر نہ دے دیا جائے۔"

"جہنم میں جاؤ تم سب۔" اس نے چڑ کر کہا۔ "کیا میں اس وقت اسے زہر نہیں دے سکتا تھا جب اس کے پاس آیا تھا۔"

"ہاں یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" میں نے قائل ہو کر کہا۔ "ٹھیک ہے تم اپنا آدمی ایمن کے پاس بھیج دو میں اس سے بات کرتا ہوں۔"

"پولیس کو خبردار کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اگر میرے آدمی نے وہاں نگرانی محسوس کی تو وہ خاموشی سے واپس چلا جائے گا اور ایمن کو زہر کا اثر ختم ہونے تک یہ تکلیف بھگتنا ہوگی۔ اگر وہ اس وقت تک زندہ رہی یا اس کا ذہنی توازن درست رہا۔ یہ تکلیف اسے پاگل بھی کر سکتی ہے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہوگی اور میرے خیال میں تم جیسے آدمی کو پولیس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"یہ پاکستان نہیں برطانیہ ہے۔" اس نے خشک لہجے میں کہا اور فون رکھ دیا۔ میں شرمندہ ہو گیا وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ اپنی حکومت کا کتنا ہی اہم آدمی صحیح لیکن وہ کوئی قانون شکنی کرتے ہوئے پکڑا جاتا تو اسے عدالت کا سامنا کرنا پڑتا۔ لیکن یہ میری غلط فہمی بھی ہو سکتی تھی۔ ساری دنیا میں سازش کاریوں اور قانون شکنی کی جو روایات انگریز چھوڑ کر گئے تھے وہ بالآخر انگلینڈ تک بھی پہنچ گئی ہیں۔ انہوں نے جو کانٹے دنیا میں بوئے تھے اس کی فصل خود ان کے ہاں بھی اگ رہی ہے۔ میں خیالوں سے چونکا مجھے ایمن کو بھی بتانا تھا میں نے اسے کال ملائی تو اس کا نمبر انگیج جا رہا تھا۔ وقفہ غنیمت جان کر میں نیچے آیا اور صوفی سے کافی کا کہا۔

"صاحب اب تو لنچ کا وقت ہو رہا ہے۔"

"ابھی بھوک نہیں ہے تم کافی اوپر بھجوا دو۔ نو شوگر نو کریم۔"

میں اوپر آیا اور ایمن کا نمبر دوبارہ ملایا۔ اس بار بیل جا رہی تھی اس نے کال ریسیو کی۔ "میری ایک فرینڈ کا فون آیا تھا۔" اس نے میری آواز سن کر کہا۔ "اس لیے تمہیں انگیج ملا ہوگا بہت باتونی ہے بڑی مشکل سے جان چھڑائی ہے میں نے۔"

"میری ڈیوڈ شا سے بات ہو گئی ہے۔ اس کا ایک آدمی اسپتال آئے گا اور تمہیں ایک انجکشن لگائے گا بازو میں۔"

"میں کوئی انجکشن نہیں لگواؤں گی۔" حسبِ توقع اس نے صاف انکار کر دیا۔ "مجھے اس شخص پر ایک فیصد اعتبار بھی نہیں ہے۔ وہ مجھے مار دینا چاہتا ہے۔"

"اگر وہ تمہیں زہر دینا چاہتا تو تمہارے گھر میں دے سکتا تھا کسی کو پتا بھی نہیں چلتا اور تم دنیا سے گزر جاتیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ اس زہر کا توڑ ہوگا جو اس نے تمہارے ہاتھ پر لگایا ہے۔ انجکشن کے بغیر اثر ختم ہونے میں دس بارہ دن لگ سکتے ہیں کیا تم اتنے دن یہ تکلیف برداشت کر سکتی ہو؟"

"نہیں۔" اس کی آواز لرز گئی۔ "میں تو ابھی سے مر رہی ہوں۔"

"تو بس ہمت کرو اور انجکشن لگوا لو۔ وہ آدمی خاموشی سے آئے گا اپنا نام پیٹرک بتائے گا اور ڈیوڈ شا کا حوالہ دے گا۔ اس انجکشن سے چند منٹ کے اندر تمہاری تکلیف ختم ہو جائے گی۔"

بڑی مشکل سے ایمن اس کے لیے راضی ہوئی تھی لیکن اس نے شرط رکھی کہ جب وہ آدمی آئے گا تو وہ مجھے کال کرے گی اور میری کال کے دوران ہی انجکشن لگوائے گی۔ میں نے اسے اپنا موبائل نمبر دے دیا۔ صوفی خود کافی لے آیا تھا۔ لیپ ٹاپ بند کر کے میں نے کافی لی۔ حالات بڑی تیزی سے بدل رہے تھے کبھی ایسا لگتا کہ معاملات سمٹ رہے ہیں اور کبھی ایسا ہوتا کہ جیسے مزید پھیلتے جا رہے تھے۔ اصل مسئلہ میرے کیسز کا تھا وہ حل ہو جاتا تو پھر میں مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ کر سکتا تھا۔ کیسز سے مجھے ندیم کا خیال آیا اور میں نے انٹرنیٹ سے اس کا نمبر لیا۔ براہِ راست ملانے میں خطرہ تھا۔ ممکن ہے اس کا نمبر انڈر آبزرویشن ہو۔ اب تو پولیس بھی سرگرمی سے مجھے تلاش کر رہی تھی۔ ندیم نے کال ریسیو کی۔ "ہیلو کون؟"

"ندیم میں بات کر رہا ہوں۔" میں نے نام لیے بغیر کہا۔

"میں کون؟ اس طرح تو نیک بیبیاں اپنے شوہر کے لیے بولتی ہیں نام لیے بغیر...." ندیم نے کہا تو مجھے خیال آیا میں نے وائس چینجر آن کیا ہوا تھا اسے آف کر کے دوبارہ کہا۔

"ابے میں ہوں تیرا مجازی باپ۔ اتنی جلدی تو لوگ باپ کو نہیں بھولتے ہیں۔"

وہ ہنسا۔ "اب بولا نا تو اپنی اصل خچر جیسی آواز میں پہلے تو زکام زدہ گدھے جیسی آواز آ رہی تھی۔"

"بکواس بند کر، یہ بتا کہ یہ نمبر محفوظ ہے۔"

"ہاں بہت سارے موبائلوں میں محفوظ ہے۔"

"ندیم سنجیدہ ہو جا۔" میں نے جھنجلا کر کہا۔ "آج تجھے کامیڈی سوجھ رہی ہے۔"

"ہاں یار محفوظ ہے میں نے کروایا ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "تو کھل کر بات کر سکتا ہے۔"

میں نے اسے اپنے اور مرشد کے درمیان ہونے والی گفتگو سے آگاہ کیا اور پھر اس کی رائے پوچھی۔ "تو نے ٹھیک بات کی ہے، اگر مرشد چاہے اور پولیس پر ٹھیک طریقے سے دباؤ ڈالے تو معاملہ ختم ہو سکتا ہے۔ ایک مہینا تو نہیں لیکن دو سے تین مہینے میں تیرے سارے کیس غیر موثر ..... اور نئے شواہد کی روشنی میں عدالت سے خارج ہو سکتے ہیں۔"

"اس کے لیے میرا عدالت میں حاضر ہونا ضروری تو نہیں ہوگا؟"

"نہیں وہ تو اگر میں تیری بریت کی درخواست کروں تب ایسا ہونا ضروری ہوگا۔ لیکن یہ مرشد بڑی حرامی چیز ہے۔ تجھے یقین ہے وہ واقعی کیسز ختم کرانے میں سنجیدہ ہے؟"

"یہ کہنا تو اتنا ہی مشکل ہے جتنا کتے کی دم کے بارے میں یقین سے کہنا کہ وہ سیدھی ہو سکتی ہے۔ بہرحال اس کی گوٹ پھنسی ہے اور ممکن ہے وہ سچ مچ مان جائے۔ اس کا وکیل کل کسی وقت تجھ سے رابطہ کرے گا۔ اس سے پتا چلے گا کہ اس کی اصل نیت کیا ہے۔"

"اگر اس کے وکیل نے رابطہ کر لیا تو اس کا مطلب ہوگا کہ مرشد واقعی سنجیدہ ہے۔" ندیم نے کہا۔ "فقیر والا کیس تو ختم ہو گیا ہے۔ اب تجھ پر اصل کیس نادر علی پر حملے کا ہے۔

آکسیجن

ایک بے رنگ، بے بو اور بے ذائقہ گیس جو انسانی اور حیوانی زندگی کے لیے بے حد ضروری ہے۔ سانس کے ذریعے سے آکسیجن ہمارے پھیپھڑوں میں جا کر خون کو صاف کرتی ہے اور پھر رگ رگ میں پھیل جاتی ہے۔ پھیپھڑوں کے اندر فاسد مادّوں کو جلا دیتی ہے۔ اس لیے سانس جب باہر خارج ہوتا ہے تو اس میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار ہوتی ہے۔ اس کے باعث اس کی کثیر مقدار فضا میں موجود رہتی ہے۔ تمام کرۂ ہوائی کا تقریباً 1/5 حصہ آکسیجن ہے۔ پانی میں بھی 1/3 حصہ آکسیجن ہوتی ہے، اور بھی کئی چیزوں کے ساتھ اس کے مرکبات ملتے ہیں۔ آکسیجن میں جلانے کی خاصیت پائی جاتی ہے۔ اسے ہائیڈروجن کے ساتھ ملا کر ایک گرم شعلہ پیدا کرتے ہیں جسے آکسی ہائیڈروجن شعلہ کہتے ہیں۔ یہ شعلہ دھاتوں کو پگھلا کر جوڑنے کے کام آتا ہے۔ اسی طرح ایسی ٹی لین گیس (acety Lene) کے ساتھ ملا کر ایسا شعلہ تیار کیا جاتا ہے، جس کا درجہ حرارت چار ہزار درجے سینٹی گریڈ تک ہوتا ہے۔ یہ شعلہ سخت دھاتوں کو کاٹنے اور لوہے کو پگھلا کر جوڑنے کے کام آتا ہے۔

مرسلہ: نور العین، سکھر

www.pdfbooksfree.pk

دوسرا کیس مرشد کی کوٹھی کی تباہی کا تھا جس میں سات ملازمین سمیت چار پولیس اہلکار بھی اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ مگر اس کیس میں جان نہیں ہے مسئلہ وہی ہے۔ اسے دہشت گردی ایکٹ کے تحت درج کیا ہے اور پولیس اوپر سے دباؤ کی وجہ سے سرگرم ہے کہ ایک بار تو اس کے شکنجے میں آ جائے۔ عدالت میں اصل کیس نادر والا ہی ہے۔"

"ایف آئی آر مرشد نے خود درج کرائی ہے؟"

"نہیں اس کے ایک ملازم نے، بہ قول اس کے اس وقت کوٹھی کے پاس موجود تھا اور اس نے تجھے اور تیرے ساتھیوں کو کوٹھی پر حملہ کرتے اور اسے آگ لگاتے دیکھا تھا۔ وہ چشمِ دید گواہ بھی ہے۔"

"وہ جھوٹا ہے وہاں موجود ہر فرد مارا گیا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے لیکن بھائی یہاں تو جھوٹ سچ ہوتا اور جو سچ ہوتا ہے اسے جھوٹ قرار دیا جاتا ہے۔" ندیم نے کہا۔ "بہر حال تو فکر نہ کر میں یہ معاملہ دیکھ لوں گا۔"

کافی پی کر مجھے بھوک لگنے لگی تھی، میں نیچے آیا اور باورچی کو کھانا لگانے کو کہا۔ عبداللہ حسبِ معمول غائب تھا۔ میں نے اکیلے کھانا کھایا اور پھر اوپر آ گیا۔ اب مجھے ایمن کی کال کا انتظار تھا۔ اسی انتظار میں بیڈ پر لیٹے لیٹے کسی وقت آنکھ لگ گئی۔ پھر موبائل کی بیل سے آنکھ کھلی تو شام ہو چکی تھی۔ نمبر ایمن کا تھا۔ میں نے جلدی سے کال ریسیو کی۔ میری آواز سنتے ہی وہ مرتعش لہجے میں بولی۔ "شہباز وہ آ گیا ہے۔"

"اپنا نام کیا بتایا ہے؟"

"پیٹرک اور ڈیوڈ شا کا حوالہ بھی دیا ہے۔" ایمن بولی۔

"اس سے میری بات کراؤ۔"

کچھ دیر بعد فون پر ایک اکھڑ آواز آئی۔ "کیا بات ہے؟"

"تمہیں ڈیوڈ شا نے بھیجا ہے۔"

"ہاں مجھے اس عورت کو ایک انجکشن دینا ہے۔"

"میری بات غور سے سنو اگر اس انجکشن میں کوئی گڑبڑ ہے تو یقین رکھو تم اس اسپتال سے زندہ باہر نہیں جا سکو گے۔"

"کیا بکواس ہے۔" اس نے بگڑ کر کہا۔

"اسپتال سے باہر ایک اسنائپر موجود ہے اور اگر تم نے میری اجازت کے بغیر یہاں سے جانے کی کوشش کی تو باہر نکلتے ہی وہ تمہاری کھوپڑی اُڑا دے۔" میں نے اس کی بات نظر انداز کر کے غلط بیانی کی۔

"اچھا اسے کیسے پتا چلے گا کہ میں ہی وہ شخص ہو[ں]"

"کیونکہ وہ یہاں چھپے ایک کیمرے کی ویڈیو [...] ہے اور اس نے تمہیں اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔" میں نے [...] بیانی کا سلسلہ جاری رکھا۔ "اس لیے جو کرنا ہے سوچ سمجھ [...] اور تم اسی وقت یہاں سے واپس جا سکو گے جب ایمن [...] ہاتھ کا درد ٹھیک ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ کچھ ہوا تو [...] تمہیں نتائج سے آگاہ کر چکا ہوں۔"

"مجھے دھمکیاں مت دو۔" اس نے بد مزگی [...] کہا۔ "یہ زہر کا توڑ ہے۔"

"ٹھیک ہے سیل فون ایمن کو دو۔" میں نے کہا تو [...] نے موبائل ایمن کو واپس کر دیا۔ "ایمن تم انجکشن لگوالو۔"

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"کچھ نہیں ہوگا، ڈرو مت۔"

ایمن نے اسے انجکشن لگانے کی اجازت دے دی [...] لمحے بعد اس کی سسکی سنائی دی۔ "اس نے انجکشن لگا دیا ہے۔"

"کیسا محسوس ہو رہا ہے؟"

"پتا نہیں لیکن تکلیف کم ہو رہی ہے۔"

پیٹرک کی ہلکی سی آواز آئی۔ "فکر مت کرو صرف تم[...] منٹ میں تمہاری تکلیف مکمل طور پر ختم ہو جائے گی۔"

واقعی ایسا ہی ہوا تھا۔ تین منٹ بعد ایمن [...] کہا۔ "شہباز میری تکلیف بالکل ختم ہو گئی ہے۔ یقین [...] نہیں آ رہا ہے کہ چند منٹ پہلے میں مر رہی تھی۔"

"ڈیوڈ شا نے بھی یہی کہا تھا۔"

پیٹرک کی آواز آئی۔ "تمہارا کام ہو گیا ہے کیا اب مجھے جانے کی اجازت ہے۔"

"یہ جانے کو کہہ رہا ہے۔" ایمن بولی۔

"نہیں اس سے کہو ابھی پندرہ منٹ اور رکے، میں [...] انجکشن کے بارے میں مکمل اطمینان چاہتا ہوں۔"

ایمن نے اسے پندرہ منٹ رکنے کے لیے کہا تو وہ بگڑ گیا۔ "میں خطرہ مول لے کر اندر آیا ہوں سب سے چھپ کر اور کوئی ڈاکٹر یا اسپتال کا کوئی آدمی آ گیا تو میں مشکل میں [...] جاؤں گا۔"

"تم فکر مت کرو میں تمہیں اپنا ملاقاتی قرار دوں گی۔" ایمن نے ہوشیاری سے اس کا اعتراض مسترد کر دیا۔ "صرف پندرہ منٹ کی تو بات ہے۔"

"ٹھیک ہے لیکن اس کے بعد میں یہاں نہیں رکوں گا۔" اس نے غرا کر کہا۔ ایمن اٹھ بیٹھی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا۔

"شہباز ڈیوڈ شا نے زہر کیسے میرے بازو میں داخل کیا ہوگا؟"

"میں بتاتا ہوں۔" پیٹرک بولا۔ "یہ چھونے سے بھی جلد میں سرایت کر جاتا ہے اسے کوئی بھی ہاتھ میں لے کر لگا سکتا ہے۔"

"لیکن پھر اسے بھی اس کی تکلیف کا سامنا کرنا پڑے گا۔" ایمن نے کہا تو پیٹرک نے جواب دیا۔

"جس کے پاس یہ انجکشن ہے اسے کسی تکلیف کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔"

میں نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے ڈیوڈ شا نے زہر اپنے ہاتھ پر لگا رکھا تھا جب اس نے تمہارا بازو پکڑا تو زہر تمہاری جِلد میں سرایت کر گیا اور بارہ گھنٹے بعد اس نے اثر کیا۔"

پندرہ منٹ پورے ہوتے ہی پیٹرک کھڑا ہو گیا۔ "اب میں جا رہا ہوں۔"

اس کے جانے کے بعد ایمن نے کہا۔ "شہباز اب میں بالکل ٹھیک ہوں، حیرت کی بات یہ ہے کہ انجکشن کا نشان بھی نہیں آیا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے تمہاری کھال موٹی ہے ورنہ مرمریں جلد پر تو چھونے سے بھی نشان آ جاتا ہے۔"

"جی نہیں ایسی نہیں ہے میری جِلد۔" اس نے خفگی سے کہا۔ "کیا تم نے مجھے دیکھا اور چھوا نہیں ہے۔"

"ہاں خوش قسمتی سے یہ دونوں کام کیے ہیں۔"

"تب ایسا کیوں کہہ رہے ہو؟"

"مذاق کر رہا تھا۔ مجھے خوشی ہے تمہاری تکلیف ختم ہو گئی۔"

"شہباز یہ تمہارا مجھ پر ایک اور احسان ہے۔" اس نے جذباتی لہجے میں کہا اور کیونکہ میں اس سے کوئی چار پانچ ہزار میل کے فاصلے پر تھا اس لیے اس نے فون کے ساتھ ایک پُرشور حرکت کی۔ میں نے بوکھلا کر کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے تم میری دوست ہو اور دوستی میں احسان نہیں ہوتا ہے۔"

"پھر بھی میں اسے احسان ہی کہوں گی، کاش کہ تم میرے سامنے ہوتے۔" اس نے مزید جذباتی ہو کر کہا اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میں اس کے سامنے نہیں تھا ورنہ وہ نہ جانے کیا کر گزرتی۔ وہ ایک کھلی ہوئی اور بے باک تہذیب کی پروردہ تھی۔ مجھے یاد ہے پہلی بار جب میں نے فتح خان کی خونخوار محبوبہ شینا سے اسے بچایا تھا تو اس نے میرا منہ چوم لیا تھا حالانکہ وہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ یہ کام اس نے بِنا کسی جھجک یا شرم کے کیا تھا کیونکہ اس کی تہذیب میں یہ شکریے کا ایک انداز تھا۔ اس کے پیچھے جنس کا کوئی جذبہ کارفرما نہیں تھا۔ مگر اس وقت اس کا انداز بڑا خطرناک تھا۔ اس لیے میں نے موضوع بدل دیا۔

"ایمن اب تمہیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے، پہلی بات تو یہ کہ میں نے ڈیوڈ شا سے وعدہ کیا ہے کہ تم اس کے خلاف عدالت میں نہیں جاؤ گی۔"

"صرف تمہاری خاطر میں یہ بات مان لیتی ہوں۔" اس نے سرد آہ بھر کر کہا۔

"دوسرے یہ کہ تم ڈیوڈ شا سے دور رہو گی۔ اپنے فلیٹ کے لاک چینج کراؤ اور وہاں کوئی الارم یا خفیہ کیمرا لگاؤ جو آنے جانے والوں کو ریکارڈ کر سکے۔"

"یہ اچھا مشورہ ہے میں ایسا ہی کروں گی۔"

"اور ہو سکے تو کچھ دن کے لیے ملک سے باہر چلی جاؤ۔"

وہ ہنسی۔ "یہ بھی ہو جائے گا کیونکہ سائبیریا میں ایک ڈاکومینٹری بنانی ہے ہم پندرہ اپریل کو روانہ ہو رہے ہیں اور تقریباً ایک مہینے بعد واپسی ہوگی۔"

"یہ تمہاری ڈاکومینٹری ہے؟"

"نہیں یہ ایک ساتھی کی ہے میں کو پروڈیوسر اور میزبان ہوں۔"

"ٹھیک ہے اس بہانے تم یہاں سے چلی جاؤ۔"

"کیا تم میرے لیے خطرہ محسوس کر رہے ہو؟"

"ہاں مجھے محسوس ہوا کہ ڈیوڈ شا بلاوجہ حرکت میں نہیں آیا ہے۔ بہ ظاہر اس نے تمہیں شکار کیا ہے لیکن درحقیقت اس نے مجھ سے رابطہ کیا ہے۔ ورنہ وہ اتنی آسانی سے تمہاری تکلیف ختم کرنے پر آمادہ نہ ہوتا۔"

"کیا اسے معلوم تھا کہ تم اس سے رابطہ کرو گے؟"

"ہاں اسے معلوم ہے کہ تکلیف کا شکار ہونے کے بعد تم مجھ سے رابطہ کرو گی اور میں اس سے بات کروں گا۔"

"یعنی اس نے مجھے چارے کی جگہ استعمال کیا ہے۔" وہ خفا ہو گئی۔

"اسے شکار کی زبان میں گارا بھی کہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "شیر کو شکار کرنے کے لیے کوئی بکری یا دوسرا جانور کہیں باندھ دیا جاتا ہے جب شیر اسے مار کر کھانے آتا

www.pdfbooksfree.pk

ہے تو مچان پر بیٹھا شکاری اسے شکار کر لیتا ہے۔"

"یعنی میں بکری ہوں، تم شیر ہو اور ڈیوڈ شا شکاری ہے۔"

"تقریباً ایسا ہی سمجھو بس ذرا سا فرق ہے کہ میں تمہارا شکار کرنے نہیں آیا بلکہ ہمدردی میں آیا اور ڈیوڈ شا کا مقصد پورا ہو گیا۔"

"وہ آخر تم سے چاہتا کیا ہے؟"

"اس کے دماغ میں وہی سودا سمایا ہوا ہے جو تمہارے دادا کے دماغ میں سمایا تھا یعنی وادی تک جانے کا اور وہاں کے عجائبات حاصل کرنے کا نیز وادی کی دریافت کا سہرا اپنے سر باندھنے کا۔ اس کے علاوہ بھی ڈیوڈ شا کے کچھ مقاصد ہوں تو مجھے ان کا علم نہیں ہے۔"

"تم نے سب تو بتا دیا۔"

"ڈیوڈ شا ولیم شا کے مقابلے میں مختلف سوچ کا مالک ہے۔ ولیم شا کی سوچ نو آبادیاتی تھی۔ لیکن ڈیوڈ شا کی سوچ سازشی ہے۔ ولیم شا سپاہی تھا اور ڈیوڈ شا ایک ایجنٹ ہے جو ملکوں میں انتشار برپا کرتا ہے اور قوموں کے خلاف سازشیں کرتا ہے۔ اس لحاظ سے وہ کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ ابھی تم بھگت چکی ہے۔"

"تم کہہ رہے تھے کہ وہ جادو بھی جانتا ہے۔"

"ہاں وہ اس معاملے میں بھی دخل رکھتا ہے لیکن تم پر اس نے زہر آزمایا تھا۔"

"وہ تمہیں اس وادی تک لے جانا چاہتا ہے؟"

"ہاں کیونکہ بہ قول اس کے اور راجا عمر دراز کے وادی میں داخلے کی کنجی میں ہوں جو مجھے وہاں لے جائے گا اسے وادی میں داخل ہونے کا راستہ مل جائے گا اور اگر مجھے نہ لے جایا گیا تو وہ ناکام ہو جائیں گے۔"

"شہباز یہ تو میرے لیے بھی ایک اچھا ٹاپک ہے اگر میں اس وادی کو دنیا کے سامنے لے آؤں تو میں ایک دن مشہور ہو جاؤں گی۔"

"یہ اتنا آسان نہیں ہے۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ میں اسے مخالفت یا موافقت کا کوئی تاثر دینا نہیں چاہتا تھا۔ "تم نے سوچا نہیں یہ اتنا ہی آسان ہوتا تو ڈیوڈ شا جیسا بے انداز وسائل رکھنے والا شخص اب تک وادی اور اس کے عجائبات کو دنیا کے سامنے نہ لا چکا ہوتا۔"

"ممکن ہے اس کی کچھ مجبوریاں ہوں۔"

"ہو سکتا ہے لیکن ایمن اس وادی کی طرف جانا... موت کے منہ میں جانے کے مترادف ہے۔ راستہ نہایت [دشوار] گزار ہے۔ وادی تک فضا سے رسائی بھی ممکن نہیں کیونکہ وہاں کا موسم ناقابلِ اعتبار ہے۔ ہیلی کاپٹر [اس] پر نہیں جا سکتا ہے اور طیارے کے وہاں اترنے کی گنجائش نہیں ہے۔"

"یعنی صرف زمینی راستے سے وہاں جایا جا[سکتا] ہے؟"

"بالکل اور اسے تم کے ٹو یا ماؤنٹ ایورسٹ سر کر[نے] کے برابر دشوار سمجھو بلکہ نانگا پربت جتنا دشوار۔"

"تم مجھے ڈرانے کی کوشش کر رہے ہو؟" اس [کے] لہجے میں شک تھا۔

"نہیں حقیقت بیان کر رہا ہوں، راجا عمر دراز [کا] اس... وادی کی طرف جا چکا ہے اور میں نے اس کی [زبانی] وادی کی کہانی سنی ہے۔"

"وہ بھی تو وہاں جانا چاہتا ہے۔"

"ہاں لیکن اس کی عمر بہت ہو گئی ہے اور وہ بیمار [بھی] ہے۔" میں نے جواب دیا۔ میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ ایمن کو راجا کی اصل بیماری کے بارے میں بتاؤں۔ "[اس] کی طرف سے اب کسی کوشش کا کوئی امکان نہیں ہے۔"

"مجھے شک ہے۔" ایمن نے صاف گوئی [سے] کہا۔ "میں نے راجا عمر دراز کو دیکھا ہے اور وہ انتہائی مستقل مزاج اور اپنی ضد پر اڑا رہنے والا شخص ہے اگر اسے معلوم [ہو] کہ اس کی زندگی بس چند گھنٹوں کی رہ گئی ہے تب بھی وہ وادی کی طرف جانے کی خواہش سے باز نہیں آئے گا۔"

میں نے دل میں تسلیم کیا کہ وہ درست کہہ رہی تھی۔ کینسر کے موذی مرض میں مبتلا راجا عمر دراز ابھی بھی اسی فکر میں تھا کہ کسی طرح میں مان جاؤں اور وہ مجھے لے کر وادی کی طرف روانہ ہو جائے۔ اس کے لیے وہ میری ہر طرح کی مدد کے ساتھ نہایت صبر و سکون سے اس وقت کا انتظار کر رہا تھا جب میں اپنے مسائل پر قابو پالوں۔ اس نے ایک بار بھی مجھ پر اپنے احسان جتانے یا ان کا صلہ چاہنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کے برعکس اس کے انداز میں مجھے اپنے لیے غرض کے بجائے خلوص نظر آتا تھا۔ میں نے ایمن سے بحث کرنے سے گریز کیا۔ "یہ بتاؤ پاکستان آنے کا ارادہ ہے؟"

"نہیں آج کل وہاں حالات غیر ملکیوں خاص طور سے سفید فاموں کے لیے اچھے نہیں ہیں۔ کچھ ڈاکومینٹری پروگرام تھا لیکن وہ بھی ملتوی کر دیا گیا ہے۔"

"حالات واقعی اچھے نہیں ہیں۔ مگر یہ تم لوگوں کی ہی مہربانی ہے۔"

"کیا مطلب؟" وہ چمک کر بولی۔

"مطلب یہ کہ پہلے انگریز یہاں مسائل چھوڑ گئے اور اس کے بعد رہی سہی کسر امریکا اور روس کی آپس کی جنگ نے پوری کر دی۔ اب امریکا خود براہِ راست یہاں موجود ہے لیکن حالات سدھرنے کے بجائے مزید خراب ہوتے جا رہے ہیں۔"

"یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن تم لوگوں کو خود بھی اپنی بہتری کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔"

"کاش کہ جو اخلاقیات تمہارے معاشرے میں نظر آتی ہے جہاں کوئی اخبار فٹ پاتھ سے رقم رکھے بغیر نہیں اٹھاتا ہے اور آدھی رات کو اکیلا ڈرائیور بھی سگنل پر رک جاتا ہے۔ یہی اخلاقیات تم لوگوں کی بین الاقوامی سیاست میں نظر آتی تو آج دنیا جنت ہوتی۔"

ایمن نے برا مان کر کہا۔ "تم لوگ سارا الزام مغرب ہی کو کیوں دیتے ہو۔"

"کیونکہ طاقتور مغرب ہے اور یہ اس کی ذمے داری ہے کہ کمزور ممالک کو ترقی میں مدد دے نہ کہ ان کے خلاف سازشیں کرے اور پولیس افسر کے بجائے ڈاکو کا کردار ادا کرے۔ ہم کمزور ہیں اپنا دفاع نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ایسا کریں تو اسے دہشت گردی کا نام دیا جاتا ہے۔ اپنے ملک میں ایک کرپٹ وزیر برداشت نہ کرنے والے ممالک ہمارے ہاں کرپٹ ترین حکومتوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ تیسری دنیا کے کرپشن سے لوٹے گئے کھربوں ڈالرز کہاں محفوظ ہیں؟ ہر بادشاہ، ہر آمر اور ہر نام نہاد جمہوریت پسند اپنے ملک سے بھاگ کر کہاں پناہ حاصل کرتا ہے۔"

"او کے.... او کے۔" اس نے ہتھیار ڈال دیے۔

"یہ بین الاقوامی سیاست ہے جس سے میرا یا تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"مس ایمن شا، تعلق تو عراق کی عوام کا صدام کے جرائم سے بھی نہیں تھا۔ انہوں نے اسے منتخب نہیں کیا تھا اس کے باوجود انہیں گزشتہ دس سال سے اس بات کی سزا بھگتنا پڑ رہی ہے۔ اس کے برعکس مغرب کے تم جیسے لوگ جو اپنے سیاست دانوں کو اس طرح منتخب کرتے ہو جیسے ہم جوتے یا کپڑے منتخب کرتے ہیں تو تم لوگ ان کے کیے سے کیسے بری الذمہ ہو سکتے ہو؟"

وہ زبردستی ہنسی۔ "کیا ہو گیا ہے تمہیں.... آج تم مختلف لگ رہے ہو۔"

میں نے گہری سانس لے کر اپنے اعصاب کا بوجھ کم کیا۔ "سوری.... میرے مسائل اور میرے ملک کے مسائل بڑھ رہے ہیں اور بہ ظاہر دونوں کا کوئی حل نظر نہیں آ رہا ہے۔ شاید اسی لیے میں فرسٹریٹ ہو رہا ہوں۔ ایمن ایک بات میں پوری سنجیدگی اور خلوص سے کہہ رہا ہوں اگر مغرب والوں نے اسی طرح اپنی حکومتوں کو بین الاقوامی معاملات میں کھلی چھوٹ دے رکھی تو وہ دن دور نہیں ہے جب ان کی دنیا میں لگائی آگ خود ان کے گھر کا رخ کرے گی اور اس وقت تم لوگ کسی کو الزام نہیں دے سکو گے۔"

"سچی بات ہے میں اور دوسرے بہت سارے لوگ اس بات کو محسوس کرتے ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے ہم بعض معاملات میں تم لوگوں سے بھی زیادہ بے بس ہیں۔ تمہارے پاس عمل کرنے کی دوسری راہیں ہوتی ہیں لیکن ہمارے پاس اس کے سوا کوئی راہ نہیں ہے جو پہلے سے طے کر دی گئی ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہو ہم وہ خوش قسمت ملت ہیں جس میں کوئی کام غلط ہو رہا ہو تو کچھ نہ کچھ لوگ اٹھ کر اسے غلط ضرور کہتے ہیں اور اسے روکنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔"

"شکر ہے تم سمجھ گئے۔ ہم اس چیز سے محروم ہیں۔ ہم جانتے ہوئے بھی غلط کو غلط نہیں کہہ سکتے اور اپنے دائرے سے ہٹ کر اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔" ایمن نے کہا۔ "اب میں ڈاکٹر سے بات کرنے جا رہی ہوں کہ میں ٹھیک ہوں اور وہ مجھے ڈسچارج کر دیں۔"

"میرا خیال ہے ٹھیک ہونے پر بھی تمہارے ٹیسٹ لیے جائیں گے کہ تم بیٹھے بٹھائے ٹھیک کیسے ہو گئیں۔"

"میرا بھی خیال ہے اپنا خیال رکھنا بائے۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ مجھے افسوس ہونے لگا کہ میں نے ذرا سخت لہجے میں بات کی تھی۔ بہر حال اب تو کر دی تھی۔ میں نے لیپ ٹاپ آن کر کے ڈیوڈ شا کو کال کی۔ کال بٹلر نے ریسیو کی اور مجھے رکھائی سے اطلاع دی کہ مسٹر ڈیوڈ شا گھر سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے میں پوچھتا کہ وہ کب تشریف لائیں گے اس بدتمیز نے فون رکھ دیا۔ میں نے دل ہی دل میں اسے سنائیں کہ تم اور تمہارا آقا دونوں جہنم میں جائیں' میں تو اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ اگرچہ وہ اس کا مستحق نہیں تھا۔ شام ہو چکی تھی کچھ دیر بعد عبداللہ نے دستک دی اور اندر آیا۔ وہ چائے لے آیا تھا۔

www.pdfbooksfree.pk

"تم نے کیوں زحمت کی ملازم سے بھجوا دیتے۔"

"زحمت کیسی جناب، آپ کی خدمت کر کے خوشی ملتی ہے۔" اس نے ٹرے میرے سامنے رکھی جس میں تازہ سموسے بھی تھے۔ "جناب ایسے سموسے پورے ملک میں کہیں نہیں ملتے ہیں۔"

"یہ تو ہے۔" میں نے کہا اور سموسوں سے انصاف کرنے لگا۔ "تم کیا سموسے لینے گئے تھے؟"

"نہیں جناب، کام سے نکلا تھا راستے میں یہ بھی نظر آ گئے تو لیتا آیا۔"

"کام کیا تھا؟"

"راجا صاحب نے کوٹھی فروخت کرنے کا حکم دیا ہے۔"

میں چونک گیا۔ "کوٹھی فروخت کرنے کا حکم دیا ہے، لیکن کیوں؟"

"میں ایک ملازم ہوں راجا صاحب سے کسی فیصلے کی وجہ کیسے معلوم کر سکتا ہوں؟" اس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

"میرا مطلب ہے کہ راجا صاحب کوٹھی اس لیے فروخت کر رہے ہیں کہ وہ دشمن کی نظر میں آ چکی ہے یا کوئی اور وجہ ہو سکتی ہے؟"

"میرا خیال ہے یہی وجہ ہے ویسے اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟" عبداللہ نے پوچھا۔

"کل صبح حویلی کی طرف جانے کا ارادہ ہے۔ میں اکرم چشتی سے ملاقات کے لیے بے چین ہوں اور پھر نادر سے بھی بات کرنی ہے۔"

"آپ کے سامنے جانے سے حقیقت کھل جائے گی۔"

"حقیقت کھل چکی ہے۔" میں نے کہا۔ "میں نے مرشد کو بتا دیا ہے کہ اس کا بھائی میرے پاس ہے اور وہ نادر کی واپسی کے لیے سمجھوتا کرنے کو تیار ہو گیا ہے۔"

"واقعی؟" عبداللہ حیران ہوا۔

میں نے اسے تفصیل سے اپنی اور مرشد کے درمیان ہونے والی گفتگو سنائی پھر بر سبیل تذکرہ ایمن اور ڈیوڈ شا کے بارے میں بھی بتایا۔ عبداللہ نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ "جناب اگر آپ کے خلاف کیس ختم ہو جائیں تو سمجھ لیں آپ آدھی بازی جیت لیں گے۔"

"یہ سوچ کر میں نے نادر کی تحویل کا اقرار کر لیا ہے اب میں نادر سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں بھی چل سکتا ہوں؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں کیوں نہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم صبح سویرے چلیں گے جب لوگ دفتروں اور کام پر جانے کے لیے نکلتے ہیں۔"

"اس وقت رش زیادہ ہوتا ہے۔" عبداللہ مسکرایا۔ "کسی ایک آدمی یا گاڑی پر توجہ دینا مشکل ہوتا ہے۔"

"ہاں اس وقت پولیس یا ٹریفک والے بھی گاڑیاں کم روکتے ہیں کیونکہ ہر شخص کو جانے کی جلدی ہوتی ہے۔"

"یہی ٹائم ہے ہمارے شہر سے نکلنے کا ورنہ مجھے یقین ہے پولیس اب بھی مستعد ہو گی۔ کل کچھ دہشت گردوں کی شہر میں موجودگی کی اطلاع ملی تھی اس وجہ سے پولیس کل سے آج چوکس تھی۔"

میں دوپہر میں سو لیا تھا اس لیے رات کے کھانے کے بعد ٹیرس میں چہل قدمی کرتا رہا۔ بارش کی ہلکی سی پھواروں کے ساتھ یخ ہوا کے جھونکے بھی آ رہے تھے لیکن اس وقت برے نہیں لگ رہے تھے۔ کیونکہ میں نے شال لے لی تھی۔ اگر عام لباس کے ساتھ باہر آتا تو ہوا کے جھونکے اتنے اچھے نہیں لگتے۔ جب نیند کا خیال آیا تو اندر آ گیا اور گرم پانی سے نہانے کے بعد سونے کے لیے لیٹ گیا۔ گزشتہ دنوں جو ذہنی و جسمانی سختیاں برداشت کی تھیں اب ان کے اثرات تقریباً ختم ہو چکے تھے۔ مسلسل آرام اور بہترین خوراک نے میری ذہنی و جسمانی توانائیاں بحال کر دی تھیں۔ اب میں کسی بھی مہم جوئی کے لیے بالکل تیار تھا۔ صبح میری آنکھ خود بہ خود سورج نکلنے سے پہلے کھل گئی۔ واش روم سے فارغ ہو کر نیچے آیا تو عبداللہ بھی تیار موجود تھا۔ میں نے اکثر اسے جاگتے ہوئے اور چاق و چوبند ہی دیکھا تھا۔ آرام کرتے کم پایا تھا اور وہ بھی مختصر وقت کے لیے۔ وہ عام طور سے رات دیر تک جاگتا تھا اور صبح جلدی اٹھ جاتا تھا۔ عبداللہ نے پوچھا۔ "آپ تیار ہیں؟"

"بالکل.... ناشتا کرتے ہی نکلتے ہیں۔"

لیکن ناشتے کے دوران ہی عبداللہ کو اسٹیٹ ایجنٹ کی کال آ گئی۔ "ہیلو.... موجود ہوں.... کس وقت.... اچھا ٹھیک ہے۔" اس نے کال کے بعد میری طرف دیکھا۔ "مسئلہ ہو گیا ہے جناب... کوٹھی کا ایک خریدار اب سے دو گھنٹے بعد کوٹھی دیکھنے آ رہا ہے میرا وہاں موجود ہونا ضروری ہے۔"

"کوئی بات نہیں تم چلے جاؤ، میں ابھی روانہ ہوتا ہوں تم بعد میں آ جانا۔"

"یہ ٹھیک رہے گا آپ کون سی گاڑی میں جانا پسند

کریں گے۔"

"یہاں مجھے کوئی بانک نظر نہیں آ رہی ہے اس لیے کوئی کار لے جاتا ہوں۔"

"ایسا کریں آپ منی جیپ لے جائیں طویل فاصلوں کے لیے اچھی گاڑی ہے، اس کا پک اپ بھی زیادہ ہے۔"

ناشتے کے بعد میں نے وسیم سے رابطہ کیا۔ "میں آ رہا ہوں حالات کیسے ہیں؟"

"بہترین ہیں۔ اپنے ڈی ایس پی صاحب اس وقت کو کوس رہے ہیں جب وہ پیدا ہوئے اور پھر پولیس میں بھرتی ہوئے۔"

"ابھی تو مقاماتِ آہ و فغاں اور آئیں گے بس ذرا مجھے آنے دو۔" میں نے ہنس کر کہا اور فون بند کر دیا۔ عبداللہ رک گیا تھا۔ اسے کچھ دیر بعد جانا تھا اس لیے میں نکل گیا۔ احتیاط کے طور پر میں نے بڑے سائز کا سن گلاس لگا لیا تھا اور ہلکی جیکٹ کے کالر اوپر کر لیے تھے اس سے میں خاصا مختلف دکھائی دے رہا تھا۔ بارش کے بعد دھوپ نکل آئی تھی اور سڑکوں پر ٹریفک کا ہجوم تھا۔ میں نے جی ٹی روڈ کا راستہ اختیار کیا اور اس وقت سکون کا سانس لیا جب کسی پولیس والے کی صورت دیکھے بغیر پنڈی شہر کی حدود سے باہر نکل گیا۔ اب میرا رخ پشاور کی طرف تھا۔ ترنول سے گزرنے کے بعد میں مختلف چھوٹے شہروں سے گزرتا رہا پھر اس لنک سڑک پر آ گیا جو حویلی کی طرف جاتی تھی۔ اس پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد میں حویلی کے سامنے تھا۔ گاڑی میں بھی کیمرے کی مدد سے مجھے دیکھ لیا گیا تھا اس لیے عقبی گیٹ کھل گیا۔ یہاں بارش کچھ زیادہ ہوئی تھی کیونکہ جا بہ جا کچے میں پانی جمع تھا اور حویلی کا عقبی صحن کیچڑ کیچڑ ہو رہا تھا۔ میں کیچڑ سے بمشکل بچتا ہوا اندر آیا۔ وسیم نظر نہیں آیا میں نے اس کے بارے میں پوچھا۔ ایک آدمی نے بتایا۔

"وہ نیچے تہ خانے میں ہیں۔"

یعنی وہ اکرم چشتی کے ساتھ تھا۔ میں نیچے تہ خانے میں آیا تو اس کے در و دیوار پر سیلن آئی تھی۔ یہ بارش کا اثر تھا۔ اکرم چشتی سچ مچ ایک جگہ الٹا لٹکا ہوا تھا اور اس کے گلے میں موجود سیاہ ڈوری والا موٹا چاندی کا منقش تعویذ اس کے سینے سے ٹکرا رہا تھا۔ ڈوری کا حلقہ اتنا بڑا نہیں تھا کہ اس کے سر سے گزر جاتا۔ ایک انڈرویئر کے علاوہ کوئی لباس اس کے جسم پر نہیں تھا۔ مستقل الٹا لٹکے رہنے سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس کی پشت پر سیاہ لکیروں کا ایک جال بنا ہوا تھا۔ ظاہر ہے اس کی ہنٹر سے مرمت ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ اس کے جسم پر اور کوئی زخم نہیں تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے گڑگڑا کر کچھ کہا لیکن اس کی ٹوٹی پھوٹی زبان میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ وسیم اس کی پشت پر موجود تھا اس نے عقب سے لات ماری۔

"ٹھیک سے بول.... اپنی مادری زبان میں.... باپ تو تیرا کوئی دوغلی نسل کا کتا ہو گا ہی۔" درمیان میں وسیم نے خالص پولیس اسٹائل کی گالیاں فٹ کی تھیں۔ میں نے مسکرا کر کہا۔

"لگتا ہے تم بھی پولیس میں بھرتی ہونے کے خواہش مند ہو۔"

"اگر ہوا تو صرف اس کے لیے ہوں گا۔" وسیم نے ایک لات اور رسید کی۔ اکرم چشتی تڑپ کر رہ گیا تھا۔ میں نے افسوس سے سر ہلایا۔

"ڈی ایس پی کی خاطر تواضع صرف لاتوں سے.... یہ لاتوں کے بھوت بھی نہیں ہیں، ان کو منانے کے لیے کسی اور چیز کی ضرورت ہے۔"

"کس چیز کی جناب آپ حکم کریں۔" وسیم نے کہا۔

"یہاں بجلی کا کوئی تار ہے؟"

یہ سن کر ہی اکرم چشتی تڑپ گیا تھا۔ اس نے پھر غوں غاں کر کے فریاد کی۔ وسیم سمجھ گیا اور تار کا بندوبست کرنے چلا گیا۔ میں اکرم چشتی کے پاس بیٹھ گیا۔ "صبر کرو اتنی جلدی کیا ہے کرنٹ کھانے کی، یاد ہے تم نے میرے ساتھ کیا کیا تھا۔ مجھے یقین ہے صرف میرے ساتھ ہی نہیں لاتعداد بے گناہوں کے ساتھ تم نے اس سے زیادہ بہیمانہ سلوک کیا ہو گا۔ مجھے کسی سے ذاتی انتقام لینا اچھا نہیں لگتا ہے لیکن ہم تمہیں احساس دلانا چاہتے ہیں کہ جب تم بے بس لوگوں پر تشدد کرتے ہو تو ان پر کیا گزرتی ہے۔"

اکرم چشتی کا موٹا تعویذ اس کے منہ سے ٹکرا رہا تھا اور اس وجہ سے کبھی اسے بولنے میں دشواری پیش آ رہی تھی لیکن اس نے کسی طرح سر ہلا کر کہا۔ "شہباز خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔"

"یہ معافی ہی ہے ورنہ اگر تمہاری موت کا فیصلہ ہو چکا ہوتا تو تمہیں یہاں لانے کی زحمت ہی نہ کی جاتی اور اس وقت تمہاری لاش مردہ خانے میں پڑی ہوتی۔ جو ڈارٹ گن چلا سکتے ہیں ان کے لیے ایک گولی چلانا کون سا مسئلہ تھا۔ مگر تمہیں اپنے اعمال کی کچھ نہ کچھ سزا تو بھگتنا ہو گی۔"

www.pdfbooksfree.pk

’’وسیم ایک وولٹیج اسٹیبلائزر اور تار لے آیا۔ اس کی مدد سے کرنٹ کو کنٹرول کیا جا سکتا تھا اور اسے جان لیوا سطح سے نیچا رکھا جا سکتا تھا۔ اس نے تار کا ننگا حصہ اکرم چشتی کی دونوں رانوں کے درمیان ایک نہایت حساس مقام سے باندھا۔ وہ تڑپ رہا تھا اور مزاحمت کے ساتھ ساتھ التجائیں بھی کر رہا تھا لیکن وسیم نے اس کی فریادوں پر دھیان دیے بغیر اپنا کام کیا اور تار کا دوسرا حصہ اسٹیبلائزر کے ساکٹ میں لگا دیا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور میں نے جیلر کی طرح سر سے اشارہ کیا جو جلاد کو اجازت دیتا ہے اور وسیم نے بٹن آن کر دیا۔ کرنٹ لگتے ہی اکرم چشتی نے ایسی چیخ ماری کہ میں بھی اچھل پڑا تھا۔ اس چیخ کے بعد وہ الٹے لٹکے لٹکے یوں تھرتھرانے لگا جیسے کسی قسم کا کوئی رقص کر رہا ہو۔ اس کا چہرہ انتہائی سرخ ہو گیا اور یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا سر پھٹ جائے گا۔ آدھے منٹ بعد میں نے کرنٹ بند کرنے کو کہا تو اکرم چشتی کی حالت غیر ہو گئی تھی اس کی زبان منہ سے نکل آئی تھی اور آنکھیں حلقوں میں گردش کر رہی تھیں۔ تہ خانے میں خنکی کے باوجود پسینا پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ جب اس کی حالت ذرا سدھری تو وسیم نے مجھ سے پوچھے بغیر سوئچ آن کر دیا اس بار اکرم چشتی کٹے بکرے کی طرح چلّایا تھا۔

وقفے وقفے سے ایسے چار دور چلے تو اس کی ہمت جواب دے گئی اور اس نے بے ہوشی میں عافیت سمجھی تھی۔ وہ جھولنے لگا تھا اس کی زبان دانتوں کے درمیان آ کر کٹ گئی تھی اور گوشت جلنے جیسی بو آ رہی تھی۔ میری طبیعت متلانے لگی اور میں اس جگہ سے ہٹ گیا۔ وسیم نے تار اتار دیا اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ اکرم چشتی کو کھول کر اس کے پیروں میں کڑا ڈال دیں۔ ہم اوپر آئے تو وسیم نے کہا۔ ’’فرعون صفت شخص ہے، ہوش میں آنے کے بعد ہمیں دھمکیاں دے رہا تھا لیکن جب اسے الٹا لٹکا کر پہلی دھونی دی تو دماغ ٹھکانے پر آ گیا اور منت سماجت پر اتر آیا تھا۔‘‘

’’میرا خیال ہے اتنا کافی ہے۔‘‘ میں نے کہا۔

وسیم نے میری طرف عجیب نظروں سے دیکھا۔ ’’شہباز صاحب ابھی تو چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے ہیں۔ آپ نے دو دن کی اجازت دی تھی۔‘‘

’’نہیں یار، میں کسی انسان پر چاہے وہ اکرم چشتی ہی کیوں نہ ہو اس حد تک تشدد نہیں کر سکتا۔ اسے سزا دینی ہے تو براہِ راست دے دو۔‘‘

’’آپ کے خیال میں اسے کیا سزا دینی چاہیے؟‘‘

’’شیر کے دانت اور پنجے نکال دو تو وہ بیکار ہو جاتا ہے پھر اس کی بے پناہ طاقت بھی کسی کام کی نہیں رہتی ہے۔‘‘

’’اس کی طاقت ہے اس کی نوکری اور ہم اس کی نوکری کس طرح چھین سکتے ہیں۔‘‘

’’ہم اس کی نوکری نہیں چھین سکتے لیکن اگر اسے نوکری کے قابل ہی نہ چھوڑیں تو....؟‘‘ میرا لہجہ معنی خیز ہو گیا وسیم نے چونک کر مجھے دیکھا۔

’’آپ کا مطلب ہے اسے فزیکلی طور پر ملازمت کے قابل نہ چھوڑا جائے۔‘‘

’’بالکل۔‘‘

وسیم سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے کہا۔ ’’کس طرح؟ کیا اسے اندھا، گونگا اور بہرا کر دیا جائے۔‘‘

’’ہاں یہ کام زیادہ مشکل نہیں ہے۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’چپکنے والے کسی سلوشن کی ایک ٹیوب کام کر دے گی۔ اس کے بعد اکرم چشتی کسی کام کا نہیں رہے گا۔‘‘

یہ موضوع ایسا تھا کہ اس پر بات کرتے ہوئے میں اور وسیم دونوں ہی سنجیدہ تھے۔ ہم ایک انسان کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ وہ انسان ہمارا جانی دشمن تھا اور اس کا بس چلتا تو ہمیں دنیا سے مٹا دیتا۔ اس کے باوجود ہم اسے جان سے مارنا نہیں چاہتے تھے لیکن اسے چھوڑ بھی نہیں سکتے تھے۔ اسے بے ضرر بنانے کا یہ عمل اس کے ساتھ ہمارے لیے بھی تکلیف دہ تھا لیکن یہ ناگزیر تھا۔ میری تجویز کے بعد اصولی طور پر فیصلہ ہو گیا تھا کہ اکرم چشتی کے ساتھ کیا کرنا ہے۔ اب اس فیصلے پر عمل درآمد وسیم کی ذمے داری تھی۔ مزید گفتگو کے لیے میں نے دوسرے موضوع کا انتخاب کیا۔ ’’تم نے اپنے آدمیوں کی اسکروٹنی کی۔‘‘

’’ممکن حد تک.....دو افراد مجھے ذرا ہلکے محسوس ہوتے ہیں۔ ایک تو فیصل کا ساتھی ہے۔‘‘

’’ان پر نظر رکھو اور جب اس ٹھکانے کو چھوڑنے کا وقت آئے تو انہیں چلتا کرنا۔‘‘

’’میں نے یہی سوچا ہے۔‘‘ وسیم نے سر ہلایا، اسی لمحے کوئی باہر چلّایا اور جو لفظ میری سمجھ میں آیا تھا وہ پولیس تھا۔ میں اور وسیم بے ساختہ کھڑے ہو گئے۔ وسیم کا ایک آدمی نمودار ہوا۔ اس نے تیزی سے کہا۔

’’جناب پولیس.....اس نے چاروں طرف سے حویلی کو گھیر لیا ہے۔‘‘

جاری ہے

قارئین

بیت بازی

ناز اختر ناز.........حیدر آباد

وابستہ سنگِ در دوراں ہی نہیں ہیں
اک موم کی مورت بھی مکین ہے مرے دل میں

جوریہ ابراہیم.........سرگودھا

وہ ہاتھ آنکھوں پہ رکھ لوں تو ٹھنڈ پڑ جائے
اگرچہ لاکھ رمِ شعلہ صفا دیکھوں

نعمان صفدر رضوی.........ملتان

روح پابند سلاسل تھی نگاہیں خاموش
ابن آدم سے خدا اس کا خفا ہو جیسے

نیاز حیدر.........فیصل آباد

رنگ اور نسل کے باعث نہ کھلیں گے مقتل
آتشِ افروز نہ اقوام کا خرمن ہوگا

اختر عثمان.........سرگودھا

متاعِ درد لٹ گئی پرائے مال کی طرح
لبوں پہ آہ رہ گئی فقط سوال کی طرح

فہد ندیم.........فیصل آباد

میری آنکھوں میں بیکسی تو نہ تھی
آپ دامن یوں ہی چھڑانے لگے

ریاض اختر.........چنوٹ

میٹھی باتوں سے ادا جاگتی ہے
نرم آنکھوں میں سنورتے ہیں خیال

رانا محمد.........کندیاں

میرے چاہنے والے مجھ کو بھول گئے تو کیا
موسم ہو تبدیل تو پتے جھڑنے لگتے ہیں

(نادیہ گبول کراچی کا جواب)

سلیم کامریڈ.........کھاٹاں

ابھی تک بے کفن سی ہے میری وحشت کی عریانی
یہ کس امید پر گھر کو بے امان کر لیا میں نے

(میمونہ عباسی کا جواب)

مجاہد علی ایس بی.........ڈگری

کب کسی کا درد اپناتے ہیں لوگ
رخ ہوا کا دیکھ کر اکثر بدل جاتے ہیں لوگ

(سلیم کامریڈ کھاٹاں کا جواب)

سید اسرار علی.........لاہور

یہاں ہے کون جو آ کر مری گواہی دے
میں شہرِ سنگ میں لب کھولنے سے ڈرتی ہوں

اظہار ارتضٰی.........منڈی بہاوالدین

یہ وحشتوں کا سورج جھلسا نہ دے زمیں کو
کتنی تپش ہے اس میں جلنے لگا ہے سایا

(زاہد جمال سکرنڈ کا جواب)

تنویر رفیق.........کراچی

اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں
وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں

(ناز اختر ناز حیدر آباد کا جواب)

محمد عقیل چٹھہ.........حافظ آباد

یہ اچانک جو اجالا سا ہوا جاتا ہے
دل نے چپکے سے تیرا نام پکارا ہوگا

نیناں قیصرانی.........کوٹ قیصرانی

نہ جانے کس عمر میں جائے گی یہ عادت اپنی
روٹھنا اس سے مگر اوروں سے جلتے رہنا

(ابتہال سلیم حیدر آباد کا جواب)

عبدالحکیم.........لاہور

یہ معجزہ بھی محبت کبھی دکھائے مجھے
کہ سنگ تجھ پر گرے اور زخم آئے مجھے

محمد سعید.....ہالہ نیو

یہ مصلحتِ وقت ہے خاموش ہیں ورنہ
ہے کون جو حالات سے بیزار نہیں ہے

(سید اسرار علی لاہور کا جواب)

عاشق حسین.........چنوٹ

وہ کلی کہاں چلی بے کلی کی چھاؤں میں
سادگی نے چھو لیا دامنِ حیات کو

ریحانہ افتخار ملک.........شیخوپورہ

وہ چال ہو کہ بدن ہو کمان جیسی کشش
قدم سے گھات ادا سے ادا نکلتی ہے

www.pdfbooksfree.pk

(نسرین رانا فیصل آباد کا جواب)

میمونہ عباسی.....حیدر آباد
مجھ سے بچھڑ کے تو بھی تو روئے گا عمر بھر
یہ سوچ لے کہ میں بھی تری خواہشوں میں ہوں

نازش سحر.....کراچی
میں کہ پھولوں کو چنتا رہا رات بھر
ایک انسان شبنم میں بھیگا ہوا

اصغر بنگش.....ڈی آئی خان
مذہب والوں کو یہ حسرت کب دنیا سے کفر مٹے گا
میں تو بس اتنا سوچ رہا ہوں کب انسان انسان بنے گا

اسماعیل رند.....ملتان
مجھے درد دل وہاں لے گیا
جہاں در کھلے تھے طلسمات کے

نوشین ملک.....سکھر
میں اسے ڈھونڈنے یادوں کی کھلی سڑکوں پر
خشک پتوں کی طرح روز بکھر جاتا ہوں

(عبدالرحمان ساہیوال کا جواب)

حمیرا کریم.....پشاور
جب یہ طے ہے کہ یہاں کوئی نہیں آئے گا
کس کی خاطر در و دیوار سنوارے جائیں

(نادیہ گبول کراچی کا جواب)

نازش سحر.....کراچی
اترتا جا رہا ہے آج سورج
سمندر سرخ تر ہونے لگا ہے

عباس ملتانی.....ملتان
آئینہ جب مجھ سے آنکھ ملاتا ہے
آئینے پر عکس کی حیرت کھلتی ہے

(راحت خان ڈی جی خان کا جواب)

مدیحہ سلطان.....سکرنڈ
لگتا ہے کئی راتوں کا جاگا تھا مصور
تصویر کی آنکھوں سے تھکن جھانک رہی تھی

فہیم الرحمن.....میانوالی
لکھ کر ہمارا نام زمیں پر مٹا دیا
ان کا تھا کھیل خاک میں ہم کو ملا دیا

(تسنیم ضیاء کراچی کا جواب)

نوازش کریم.....پشاور
اشکوں سے ہماری ہے منور نئی دنیا
شبنم کو ضیا دی تو کرن ہم نے بنایا

نازنین ناز.....زاہدان (ایران)
آخرِ شب وہ ستاروں کی سرکتی ہوئی چھاؤں
میں وہیں بیٹھ گیا رات جہاں گزری

علی شاہ.....گلگت
اے غم، انیس دل، یہ تیری دلنوازیاں
ہم کو تری خوشی کے لیے مسکرانا تھا

قندیل احمد.....منڈی بہاالدین
آنسوؤں کی جھڑی ہے آنکھوں میں
ہم نے پایا ہے نصیب بادل کا

مجاہد علی.....ڈگری
اب جس کے جی میں آئے وہی پائے روشنی
ہم نے تو اپنا دل جلا کے سرعام رکھ دیا

(مہناز اسد کامونکی کا جواب)

تنویر رفیق.....لانڈھی کراچی
وعدہ وہ کر گیا تھا کہ آؤں گا خواب میں
آیا ضرور مگر تھا نقاب میں

(تنویر آصف چوہدری جہلم کا جواب)

شمیم احمد.....کراچی
امن ہوتا ہے پیار سے ورنہ
لاکھوں لوگوں کے سر کٹے ہوتے

(فتح علی میانوالی کا جواب)

طٰہٰ یاسین.....لطیف آباد
کچھ تو تھے دوست بھی وفا دشمن
کچھ نری آنکھ میں حیا بھی تھی

(روبی سیالکوٹ کا جواب)

سعید قاسمی.....ڈلوال
نہ ہے دشمنی کسی دن سے اب نہ ہے دوستی کسی رات سے
ہے بچا ہی کیا جو وہ لے گیا مجھے چھین کر مری ذات سے

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

علمی آزمائش
89
30 مارچ 2013ء

میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام ..... ہے۔

نام: .....

پتا: .....

.....

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسپنس ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوایا جائے
کسی ایک پر ☑ کیجیے۔

کوپن کے ہمراہ اپنے جوابات مورخہ 30 مارچ 2013ء تک علمی آزمائش 89 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں۔

مقابلہ
بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ ''بیت بازی'' شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کر سکتے ہیں۔

نام .....

پتا .....

.....

محترم / محترمہ ..... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شامل اشاعت کر لیں

50 (شعر الگ کاغذ پر ہے)

مقابلہ بیت بازی
پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی، 74200

اگر آپ کو

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ،
ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ،
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت،

کے حصول میں دقت پیش آ رہی ہے یا آپ کو اپنے علاقے کے بک اسٹال سے کوئی شکایت ہے اور آپ کے علاقے میں بروقت پرچہ نہیں پہنچ رہا تو

شکایت فیکس کریں

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں
ثمر عباس 0301-2454188
بدرالدین سرکولیشن منیجر 35802552-35386783-35804200
فیکس نمبر 35802551

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

www.pdfbooksfree.pk

علمی آزمائش۔ 89

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کامنفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوایئے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ”یک علمی سرگزشت“ کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 مارچ 2013ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

1928ء میں فیروز پور (مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئیں۔ کینرڈ کالج لاہور سے ریاضی اور معاشیات میں بی اے اور گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے اردو کیا، چلڈرن کمپلیکس لائبریری کی ایگزیکٹو ممبر اور پنجاب یونیورسٹی سنڈیکیٹ کی رکن رہیں۔ ایک بڑے افسانہ نگار کی شریکِ حیات بنیں۔ خود بھی ریڈیو اور ٹی وی کے لیے بے شمار ڈرامے اور سیریز تحریر کیے، سورج مکھی، چہار چمن، اہلِ کرم، ستم گر تیرے لیے، اک تیرے آنے سے پہلے، بزدل، یہ جنوں نہیں تو کیا ہے، منزل بہ منزل، فٹ پاتھ کی گھاس، باٹ بسیرا، تحریریں مشہور ہوئیں۔ حکومت نے تمغۂ امتیاز دیا۔

علمی آزمائش 87 کا جواب

14 اکتوبر **1938**ء کی شب ساڑھے دس بجے پیدا ہونے والی فرح دیبا سلطانہ کے والد سہراب دیبا ایرانی افواج میں افسر تھے۔ اس لڑکی کی ایک دوست تھی شہناز۔ اس نے دوستی کو مستحکم کرنے کے لیے اس کی شادی اپنے باپ سے کرادی تاکہ وہ اس سے بھائی حاصل کرلے۔ اس لڑکی نے اس گھر کے لیے چراغ تو دیا مگر خود اس کی زندگی اندھیرے میں گم ہوگئی۔ اس کی اور اس کے شوہر کی موت ملک سے باہر ہوئی۔

انعام یافتگان

1- مہرین امتیاز، لاہور **-2** زارا اکبر، بہاولپور **-3** نصیر شاہ، جھنگ

4- زاہد انصاری، حیدر آباد **-5** حدیقہ اشرف، کراچی

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے ذوالفقار احمد خان، شمیم احمد، سمیہ عزیز، نغمہ اقبال رضوی، عطیہ نورین، ارہم اقبال رضوی، محمد علی مشاہد، فرزانہ پروین، انصار حسین، لعیق احمد، سرور احسن صدیقی، نیاز خانجی، بختیار شاہ، عارفہ سلطانہ، خالد عثمانی، کہکشاں تبسم، عنایت مسیح، علی احمد، رجب علی مرزا، نجم الدین حیدر، نصرت فاروقی، فہیم احمد، انعام خان، افتخار احسن، وجاہت علی، کاوش اختر، تنویر حسین زیدی، نوازش علی شاہ، ناصر افروز، ممتاز الحسن، وجاہت شاہ، انصار حسین، قائم علی، ابرار احمد، نجم الدین حیدر، حکیم اللہ فہمی، منور علی، ملک سرفراز گل، کاشف حیدر، جاوید علی،

مظفر حسن، پیام فاروقی، ناظم پاشا، کائنات فاطمہ، نذر علی برمانی، خالد خان۔ لاہور سے ایم پی اسلم، ابرار الحسن، قدیر اللہ، ناصر فاروق، کاشان صدیقی، الہ ڈینو آرائیں، گل زیب، پروین ضیاء، نثار اختر، ارشاد علی، احمد علی مشرق، ممتاز الحسن، عقیل سندھو، نعمان اشرف، ارباز خان، اکرم صدیقی، ابرار احمد انعام، تابش عطاری، نیاز احمد ملک، برق ضیائی، الدعلی، احمد بشیر بٹ، فہیم مرزا، حدیقہ اشرف، ملک واحد الحق، ابرار احمد، نازش خان، ہماجبیں، حمیرا خاتون، ممتاز الحسن، زبیر اسلم، نازش حسین، تابش اطہر۔ راولپنڈی سے ڈاکٹر سعادت علی خان، شیراز ملک، ڈاکٹر علم یاسین، ناصر جاہ، تسنیم فاروق آرکلی، صادق حسن، نرجس علی، بخت خان، زبیر شاہ اشرفی، خاقان خان، زویا بخاری، سید محمد تقی، تنویر الحسن، صفدر شیرازی، نسرین اشرف، کائنات بانو، رانا فتح یاب، زاہد عباسی۔ اسلام آباد سے نیلوفر شاہین، ممتاز احمد، کشور جہاں، توصیف احمد، صدیق الرضی، نعمت اللہ خان، خضر حیات عباس، نیاز اللہ، شاہین اشفاق، سعید اختر، روا ممتاز، انور یوسف زئی، شہباز فیضی، محمد متین، بشیر فاروقی، محمد شہزاد، بیدری اکرم۔ ملتان سے محمد بلال اقبالی، محمد سعید چشتی، نورین افشاں، ایاز سومرو، زندان خان، کلیم اللہ چغتائی، ذیشان ملک، فرحت مغیر، قدوس بخش، سعیدہ جلال، فاضلی خان اچکزئی، لبنیٰ ظہیر، رضوانہ اختر، اللہ دتہ، محمد عتیق، فرزانہ ملک، زینب چوہان، قدوس بخش۔ جہلم سے ارباز خان، ملک سرفراز، ندیمہ امتیاز۔ فیصل آباد سے محمد زاہد، ماسٹر عبدالعزیز (سمندری) جھنگ سے عطا مصطفی۔ گوجرانوالے سے الف اے کھوکھر۔ چکوال سے رمضان وٹو، ارشاد حسین۔ واہ کینٹ سے نور افضل خان خٹک۔ منڈی بہاؤ الدین سے خرم جہانزیب۔ میانوالی سے عبدالخالق (کالاباغ) ایم شفیق قدسی (مسلم بازار) کوئٹہ سے حبیب احسن، ناصر چنگیزی، نعمان خان، حسن عسکری، زاہد علی، فرحت بابر، خاقان چنگیزی، راؤ رشید، ارباز خان، فیض اللہ خان، قتیل سید پوری، تقی چنگیزی، نگارث، صالح بشیر، نصرت چنگیزی۔ سرگودھا سے انعام اللہ انعام، اکبر خان، اشرف ممتاز، زاہد حسن، نادر شاہ، حیات خان، فصیح الزماں، عظمی اکملی ٹوانہ، خلیق الزماں، خضر حیات۔ شجاع آباد سے حسن علی زیدی، فہیم اللہ، نصیر جنوئی۔ خانیوال سے طارق شہزاد، سید ابشام اشرف مشہدی۔ حیدر آباد سے احمد انصاری، بابر خان، طہ یاسین، دعا زہرا۔ میر پور خاص سے مجاہد علی ایس بنسی۔ کھاناں سے سلیم کامریڈ۔ پاک پتن سے علی محمد (حسن پورہ) ساہیوال سے سرفراز ملک۔ چھچھ برہ زئی سے ذوالفقار فضل کریم، ملک جاوید محمد خان سرکانی۔ حاصل پور سے نعمان ادریس۔ ڈی جی خان سے موسیٰ خان۔ بہاولپور سے قاضی عدنان احمد، حمیرا کوکب واسطی، آمنہ ملک۔ بہاؤ لنگر سے معظم علی (چشتیاں)۔ اوکاڑہ سے اظہر الدین، سعید احسن محمود، نعمان بشیر، صاحب خان، راجا احسن، ملک صفدر، اظہر الدین۔ سیالکوٹ سے نوید شہزاد خواجہ، آصف ملک، اقرار الحسن، مہ جبیں فلک، نصرت مرزا، محمد رضا، احتشام اسلام الدین، ارباز ملک، لیاقت علی، ضامن رند، ظہیر فرقانی۔ اٹک سے خالد چوہدری، زبیر اللہ خان، فیض اختر، ثنا جبران، خورشید اختر، زبیر اللہ مروت فاطمہ ملک، سرفراز گل، ثناء اللہ، فرحت بابر زمان، سعید بھٹی، نثار فراز، سید اختر، سعید خان، شیخ ثنا، زبیر اللہ مروت، اکرم خان۔ حافظ آباد سے نعمان حسن خان، فرحت جان، خالد جاوید، شیریں فاطمہ، نسرین رانا، محمد عقیل چٹھہ، محمد ابراہیم، محمد صدیق ستری۔ نواب شاہ سے عزیز حسن، ارحم شاہ، عزیز الدین۔ شہر سلطان سے سنجیدہ احمد، بازخ بغاری، ارشد حسن، نوید انصاری، عباس علی، ارباب خان، راجا یونس۔ میر پور آزاد کشمیر سے کاشف حسین، نعمان سلطان، کمال احمد کمال، احسن بھٹ، نصرت خان، یونس ایاز۔ میانوالی سے احمد علی فوقی، ایاز علی رند، ملک سرفراز، خیر الدین کھر، ضامن خان اشرفی، عبدالخالق (کالاباغ) بھکر سے حسن چنگیزی، غازی شاہ، شاہد حسن خان، نیاز احسن، زاہد اسلم چٹھہ، ملک سرفراز منکیرا، زبیر شاہ، تقی بنگش۔ ٹنڈو آدم سے فاطمہ عباسی، نیاز ملکانی، خالد خان چوٹالہ، ناصر بھکیو، نیاز عباس۔ کمالیہ سے محمد کمال، ذیشان مجاہد، ناصر ملک، فہد حسن، ابرار الحق، نثار علی، فہیم عثمانی، فردوس بشیر، ابرار خان اعظم، ظہیر الدین۔ لیہ سے شباب الاسلام، شجاعت خان، راجا ابرار، سردار توفیق، انصار حسین، مالک حسن ملک۔ گولارچی سے ارشد خان، شاہ جمال سے فہد مشتاق۔ نارووال سے انعام احسن کمالی۔ مردان سے ابرار خان۔ تربیلہ ڈیم سے حسن بیگ، فہیم اللہ فاروقی۔ نوشہرہ سے فضل محمد۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے سرفراز احسن، صفدر حسن، خالد خان، ناصر انجم، ابرار حسن زئی۔ ڈیرہ غازی خان سے احمد علی واصف احمد۔ لیہ سے نذیر احمد گجر (چوبارہ) پشاور سے غازی توفیق، مظہر حسین، مانک اسلم، نوید ملک، نسیم نیاز احمد، خالد کنول، وقار احمد، قیصر حسن، توفیق الاسلام، افضل میو، ثنا وقار، منہال زیدی، ابشام رضا خان، نعیم شیرازی، فخر السلام، سردار علی مینگل، فرقان اختر، نسیم اچکزئی، بینش ملک، نسیم فردوس، ارہام خان، جویریہ، گلشن خان، نعیم الحسن، فرقان اختر شاہ نواز اطہر نواز، شمیم فاروقی، ضیاء الحق، اطہر شاہ، ضیاء الحق، جمال شاہ، فراست خان، نوید فہیم، اصغر طوری بنگش، محمود اچکزئی، نزرانہ شاہ، ارباب خان، دردانہ شاہ، نسیم نیازی۔ چشتیاں سے معظم علی۔ مردان سے محمد انور (باڑی چیم)۔ برہ زئی چھچھ سے ذوالفقار فضلگ کریم، ملک جاوید محمد خان سرکانی۔ ممالک غیر سے زاہد بشیر فاروقی (جاپان) احمد انصاری (جرمنی) نصیر خان ناصری (جدہ سعودیہ) حافظ تصدیق بشیر الہندی (سلطنتِ اومان) انعام ملک (جرمنی)۔ فہد فاروق (ٹوکیو جاپان)

www.pdfbooksfree.pk

تلافی

مکرم ومحترم معراج رسول
السلام علیکم
میں نے عورت کو ایک نئے روپ میں بلکہ کئی روپ میں دیکھا ہے جس نے میری زندگی بدل کر رکھ دی ہے۔ کیسے کیسے اثرات مرتب کیے ہیں اسے میں قارئین کے سامنے لارہا ہوں۔

امجد
(راولپنڈی)

بعض اوقات ہم لوگ حالات یا اپنی خواہشوں اور مصلحتوں کے تحت ایسے فیصلے کر لیتے ہیں جن کا اثر ہماری اولادوں پر پڑتا ہے اور کبھی کبھی ان فیصلوں کے ایسے بھیانک نتائج سامنے آتے ہیں کہ زندگی میں پچھتاووں کے سوا کچھ باقی نہیں بچتا۔ میں نے بھی جذبات کی رو میں بہہ کر ایسا ہی ایک فیصلہ کیا تھا جس کا خمیازہ ایک محرومی کی صورت میں بھگت رہا ہوں۔ کسی کا دل دکھانے کی سزا مجھے یوں ملی کہ آج میں اپنے بیٹے کو اپنا نہیں کہہ سکتا اور اس سے دور رہنے پر مجبور ہوں۔

جمیل میرے بچپن کا دوست تھا۔ ہماری دوستی کی ابتدا اسکول کے زمانہ سے ہوئی۔ جب والد صاحب کا تبادلہ کوئٹہ سے کراچی ہوا تو ان کی پوسٹنگ ملیر کینٹ میں ہوئی۔ وہیں ہمیں سرکاری مکان بھی مل گیا اور ہم دونوں بھائیوں کا داخلہ ملیر کینٹ کے سرکاری اسکول میں کرادیا گیا۔ یہ آج سے پچاس سال پہلے کی بات ہے۔ ان دنوں سرکاری اسکولوں کا معیار بہت اچھا ہوا کرتا تھا اور وہاں بڑی مشکل سے داخلہ ملتا تھا۔ کیونکہ والد صاحب سرکاری ملازم تھے اور ہم دونوں بھائیوں کے گزشتہ امتحان میں بہت اچھے نمبر آئے تھے۔ اس لیے ہمیں داخلہ ملنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ میں جب کلاس روم میں پہنچا تو پہلا تعارف جمیل سے ہی ہوا۔ وہ اس طرح کہ کلاس میں دو لڑکے ایک ڈیسک پر بیٹھتے تھے۔ جمیل کے ساتھ والی سیٹ خالی تھی۔ لہٰذا ٹیچر نے مجھے وہاں بٹھادیا۔ جمیل نے پُرجوش مسکراہٹ کے ساتھ میرا خیر مقدم کیا اور مصافحہ کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھادیا۔ میں نے بھی اسی گرم جوشی سے جواب دیا لیکن کلاس شروع ہو چکی تھی۔ اس لیے ہمیں باتیں کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ میں نے اپنے بیگ سے رف کاپی نکالی اور نوٹس لینے لگا۔ اس کے بعد اگلے تین پیریڈز میں بھی پڑھائی ہوتی رہی۔ البتہ بریک کے دوران ہمیں باتیں کرنے کا موقع مل گیا۔ رسمی تعارف کے بعد اس نے کہا ”تم مجھے بہت اچھے لگے ہو۔ آج سے ہماری دوستی پکی۔ اب تم روزانہ میرے ساتھ ہی بیٹھنا۔“

”لیکن یہاں تو کوئی اور بیٹھتا ہوگا۔ اسے اعتراض تو نہ ہوگا؟“

”اس کے اعتراض کرنے سے کیا ہوتا ہے، تم کہہ دینا کہ سر نے یہاں بٹھایا ہے۔ ویسے بھی وہ لڑکا مجھے بالکل پسند نہیں۔ اس کے کپڑوں اور جسم سے اتنی بدبو آتی ہے کہ بتا نہیں سکتا۔ شاید وہ کئی کئی دن تک نہیں نہاتا، خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ آؤ تمہاری کچھ خاطر کروں، آج تم میرے مہمان ہو۔“

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اسکول کی کینٹین میں لے گیا جہاں اس نے دو پلیٹ چھولوں اور جوس کا آرڈر دیا۔ وہ بے حد مخلص دوست ثابت ہوا۔ چند ہی دنوں میں ہماری دوستی اور زیادہ مضبوط ہوگئی۔ البتہ وہ پڑھائی میں کچھ کمزور تھا اور ہوم ورک نہ کرنے پر اسے روزانہ ہی ڈانٹ پڑتی تھی۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھ ہی لیا کہ وہ ہوم ورک کیوں نہیں کرتا۔ کیا اسے ٹیچرز کی ڈانٹ سننے میں مزہ آتا ہے تو اس نے بتایا کہ اسے ہوم ورک کرنے کا وقت ہی نہیں ملتا کیونکہ اسکول سے چھٹی ہونے کے بعد وہ ایک جنرل اسٹور میں شام چار سے رات دس بجے تک ملازمت کرتا ہے۔ اس کے والد ایک معمولی کلرک ہیں اور ان کی تنخواہ سے گھر کا خرچ پورا نہیں ہوتا۔ وہ چھ بہن بھائی تھے اور سب اسکول میں پڑھ رہے تھے۔ لہٰذا والد کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اسے ملازمت کرنا پڑ رہی تھی۔

جمیل کے حالات جان کر مجھے اس سے ہمدردی محسوس ہونے لگی۔ میں نے اسے پیشکش کی کہ اگر صبح کو ہم دونوں آدھ گھنٹا پہلے اسکول آجائیں تو وہ میرے ہوم ورک کو اپنی کاپی میں نقل کرسکتا ہے اور جو کام باقی رہ جائے وہ انٹرول میں پورا کرے۔ وہ یہ سن کر خوش ہوگیا اور اگلے روز سے ہی ہم نے اس پروگرام پر عمل شروع کردیا۔ اس طرح کلاس میں بھی اس کی پوزیشن بہتر ہوگئی اور وہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ پُراعتماد نظر آنے لگا۔ البتہ کلاس میں کچھ لڑکوں کو ہماری دوستی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ مجھ سے تو وہ اس لیے جلتے تھے کہ میں پڑھائی میں بہت تیز تھا اور ہر امتحان میں میری پہلی پوزیشن آتی تھی اور جمیل سے وہ اس لیے خار کھاتے تھے کہ وہ میرا گہرا دوست تھا اور ہر وقت سائے کی طرح ساتھ چمٹا رہتا تھا۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد ہم دونوں نے ایک ہی کالج میں داخلہ لے لیا۔ ہماری دوستی اب بھی پہلے کی طرح مضبوط تھی لیکن تھوڑے دنوں بعد ہی اس پر کالج کا رنگ غالب آگیا۔ وہ اکثر پیریڈ گول کرکے کامن روم میں ٹیبل ٹینس یا کیرم کھیلتا رہتا۔ کچھ آوارہ قسم کے لڑکوں سے اس کی دوستی ہوگئی تھی۔ ان کے ساتھ وہ کلاس چھوڑ کر مارننگ شو دیکھنے جانے لگا۔ اس نے سگریٹ نوشی بھی شروع کردی تھی میں نے اسے ان حرکتوں سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن اس پر میری کسی بات کا اثر نہیں ہوا۔ بلکہ الٹا وہ مجھ سے شکوہ کرنے لگا کہ میں اس کے ساتھ ان سرگرمیوں میں کیوں شریک نہیں ہوتا۔ اس کے بعد میرا کچھ کہنا بے کار تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ ان راستوں پر چل پڑا ہے جہاں سے واپسی بہت مشکل ہوتی ہے۔

ان سرگرمیوں کا نتیجہ میری توقع کے مطابق نکلا۔ وہ فرسٹ ایئر کے پانچ میں سے صرف ایک پرچے میں کامیاب ہوسکا تھا حالانکہ میں نے امتحان سے پہلے اسے تمام مضامین کے نوٹس دے دیے تھے اور مجھے یہ بھی معلوم تھا

www.pdfbooksfree.pk

کہ اس نے ان کے کارتوس بنا کر نقل بھی کی تھی۔ اس کے باوجود وہ چار پرچوں میں فیل ہوگیا۔ اس طرح وہ بات درست ثابت ہوئی کہ نقل کے لیے بھی عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسے سال دوم میں داخلہ نہ مل سکا اور وہ ایک بار پھر فرسٹ ایئر کی کلاس میں بیٹھنے پر مجبور ہوگیا۔

میں نے انٹر سائنس کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کیا اور بی بی اے میں داخلہ لے لیا۔ والد صاحب کی خواہش تھی کہ میں انجینئر بنوں لیکن مجھے بزنس سے دلچسپی تھی۔ میں نے بہت چھوٹی عمر میں یہ بات سمجھ لی تھی کہ خوش حال زندگی گزارنے کے لیے ایک کامیاب بزنس مین ہونا ضروری ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ ایم بی اے کرنے کے بعد کچھ عرصہ کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کروں گا اور اس کے بعد اپنا کاروبار شروع کردوں گا۔

چار پرچوں میں فیل ہونے کے بعد جمیل کو بھی عقل آگئی اور وہ زیادہ سنجیدگی سے پڑھائی کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اس نے جیسے تیسے انٹر پاس کیا اور یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ اب اس نے جنرل اسٹور کی ملازمت چھوڑ دی تھی اور ٹیوشن پر گزارہ کررہا تھا۔ وہ شام کو ایک کوچنگ سینٹر میں بھی جانے لگا تھا جہاں سے اسے معقول آمدنی ہورہی تھی۔ ہمارے راستے الگ ہوچکے تھے لیکن دوستی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ہم اب بھی باقاعدگی سے ملتے اور ایک دوسرے کا حال احوال دریافت کرتے۔

اسے یونیورسٹی جاتے ہوئے چھ ماہ بھی نہ گزرے تھے کہ ایک دن اس نے مجھے بڑے پُرجوش انداز میں بتایا کہ اسے اپنی کلاس کی ایک لڑکی سے محبت ہوگئی ہے اور وہ بھی اسے پسند کرتی ہے۔ اس کی بات سن کر میں نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولا ”چھ پدی اور چھ پدی کا شوربا۔ ابھی کسی قابل ہوئے نہیں اور عشق کا روگ لگالیا۔“

”فی الحال ہمارا شادی کرنے کا کوئی پروگرام نہیں۔“ وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ ”پہلے ہم اپنا ماسٹرز مکمل کریں گے بعد میں کوئی اچھی سی ملازمت اور اس کے بعد شادی کے بارے میں سوچا جائے گا۔“

”تب تک تو وہ لڑکی بوڑھی ہوجائے گی کیونکہ تم دس سال سے پہلے ماسٹرز کرنے والے نہیں اور نوکری کا کیا بھروسا، ملے نہ ملے۔ مجھے تو اس پلان میں خاصے جھول نظر آتے ہیں۔“

”شکل اچھی نہ ہو تو کم از کم آدمی کو بات اچھی کرنی چاہیے۔ میں جانتا ہوں کہ تم جیلس ہورہے ہو کیونکہ تمہیں ابھی تک کسی لڑکی نے گھاس نہیں ڈالی۔“

واقعی وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ مجھے کسی لڑکی نے گھاس نہیں ڈالی تھی بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ میں نے خود ہی کسی لڑکی سے دوستی کرنے کی کوشش نہیں کی، جب دوسرے لڑکوں کو اپنی گرل فرینڈز کے ساتھ گھومتے ہوئے دیکھتا تو میرے دل میں بھی یہ خواہش ابھرتی کہ میں بھی کسی حسین پری کے ساتھ سیر و تفریح کروں، لانگ ڈرائیو پر جاؤں اور قسمیں دیکھوں لیکن ہر بار یہی سوچ کر خاموش ہوجاتا کہ اگر کسی نے دیکھ لیا تو بڑی بدنامی ہوگی۔ لوگ کیسی کیسی باتیں بنائیں گے۔ والدین اور بہن بھائیوں کی نظروں میں میری عزت دو کوڑی کی رہ جائے گی۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے خیالات دل میں جگہ بناتے تو میرا سارا جوش اور ولولہ جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا۔ رفتہ رفتہ میرے ذہن سے صنفِ نازک کا خیال بالکل نکل گیا اور میں نے اپنی پوری توجہ پڑھائی پر مرکوز کردی۔

وقت کا پہیہ تیزی سے آگے بڑھتا رہا۔ ہم اپنی تعلیم مکمل کرکے عملی زندگی میں داخل ہوگئے۔ میں نے ایک بزنس فرم جوائن کرلی اور جمیل کو بھی ایک لیبارٹری میں ملازمت مل گئی۔ اب اس پر سے ذمے داریوں کا بوجھ کافی کم ہوچکا تھا۔ اس کے چھوٹے بھائی بھی پڑھ لکھ کر کام پر لگ گئے تھے اور وہ خود کو خاصا پُرسکون محسوس کررہا تھا۔ پھر ایک دن اس نے مجھے بتایا کہ اس کی شادی اسی لڑکی سے طے ہوگئی ہے جس سے وہ محبت کرتا تھا۔ اتفاق سے انہی دنوں میری شادی کا بھی غلغلہ اٹھا اور نزہت دلہن بن کر میری زندگی میں آگئی۔ وہ رشتے میں میری کزن تھی۔ کسی نے مجھ سے میری مرضی جاننے کی کوشش نہیں کی بس بتادیا گیا کہ میرا رشتہ نزہت سے طے کردیا گیا ہے۔ مجھے ویسے بھی شادی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور میں اسے محض نسلِ انسانی کو آگے بڑھانے کا ایک ذریعہ سمجھتا تھا۔

میرے مقابلے میں جمیل زیادہ خوش قسمت رہا کہ اس نے جس لڑکی کو چاہا... وہ اسے مل گئی۔ افشاں واقعی بہت خوبصورت تھی۔ کم از کم میں نے اپنی زندگی میں اتنی حسین لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ میری اور جمیل کی شادی ایک دو مہینے کے وقفے سے ہوئی۔ شادی کے بعد بھی ہماری دوستی میں فرق نہ آیا اور ہم باقاعدگی سے آپس میں ملتے رہے۔ شروع شروع میں افشاں اور جمیل باقاعدگی سے ہمارے گھر آیا

کرتے تھے لیکن نزہت نے ہمیشہ ان کے ساتھ سرد مہری کا برتاؤ کیا۔ غالباً وہ احساسِ کمتری کا شکار تھی کیونکہ افشاں بے حد حسین تھی جبکہ نزہت کو محض قبول صورت ہی کہا جاسکتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے وہ ان کے یہاں جانے سے بھی کتراتی تھی۔ میرے بے حد اصرار پر وہ دو چار مرتبہ چلی تو گئی لیکن وہاں بھی اس کا رویہ بے حد اکھڑا اکھڑا سا رہا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ افشاں اور جمیل نے بھی ہمارے یہاں آنا جانا کم کردیا۔ البتہ میں بڑی باقاعدگی سے جمیل کے گھر جاتا رہا اور مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی جھجک نہیں ہے کہ اس کی وجہ افشاں تھی۔ وہ خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی زندہ دل، ہنس مکھ اور خوش مزاج واقع ہوئی تھی۔ جمیل کا جگری دوست ہونے کی وجہ سے وہ مجھ سے بڑی بے تکلفی سے پیش آتی اور بعض اوقات مذاق مذاق میں ایسی باتیں کہہ جاتی جنہیں سن کر کوئی بھی مرد شدید قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہوسکتا تھا۔

مجھے بھی افشاں کا ساتھ اچھا لگنے لگا اور میری آمد و رفت پہلے کے مقابلے میں بڑھ گئی۔ میں نے شادی کے بعد ملازمت چھوڑ کر اپنا کاروبار شروع کردیا تھا اور اسے جمانے کے لیے مجھے زیادہ وقت دینا پڑتا تھا۔ اس کے باوجود میں نے جمیل کے یہاں جانا نہیں چھوڑا۔ البتہ نزہت کے لیے میرے پاس بالکل وقت نہیں تھا۔

ہماری شادی کو پانچ سال ہوچکے تھے۔ اس دوران میں دو بچوں کا باپ بن چکا تھا جبکہ جمیل ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم تھا لیکن میں نے کبھی اس بارے میں اسے متفکر یا پریشان نہیں دیکھا البتہ افشاں کے چہرے کے تاثرات سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے اس محرومی کا شدت سے احساس ہے۔ میں یہ بھی محسوس کررہا تھا کہ ان دونوں کے درمیان فاصلے بڑھتے جارہے ہیں اور افشاں میری موجودگی میں بھی بعض اوقات کوئی ایسی بات کہہ دیتی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بچہ نہ ہونے کا ذمے دار جمیل کو سمجھتی ہے۔ مجھے بھی ان کے دکھ کا احساس تھا چنانچہ ایک دن جب افشاں کسی کام سے باہر گئی ہوئی تھی۔ میں نے جمیل سے کہا کہ وہ دونوں اپنا ڈاکٹری معائنہ کیوں نہیں کروالیتے تاکہ اولاد نہ ہونے کی وجہ معلوم ہوسکے۔

جمیل نے مجھے اس طرح گھورا جیسے یہ بات اسے اچھی نہ لگی ہو۔ وہ بے زاری سے بولا ”اس مشورے کا شکریہ۔ ہم یہ کام پہلے ہی کرچکے ہیں۔ سارے ٹیسٹ نارمل

آئس ہاکی

یہ کھیل عام ہاکی سے نکلا ہے اور برفانی گراؤنڈ پر عموماً سرد ممالک میں موسم سرما کے دوران کھیلا جاتا ہے۔ قدرتی برف کے علاوہ مصنوعی برف بھی استعمال ہوتی ہے۔ اس کے گراؤنڈ کو رنک کہتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے بنائے گئے خصوصی ہال یا اِن ڈور رنک میں بھی یہ کھیل کھیلا جاتا ہے اور یہ اہتمام کیا جاتا ہے کہ کھیل کے دوران برف پگھلنے نہ پائے۔ کھلاڑی برف پر پھسلنے والے جوتے پہنے ہوتے ہیں۔ گیند کی جگہ ربڑ کا ایک ٹھوس پک (puck) ہوتا ہے۔ اس کی موٹائی ایک انچ اور قطر تین انچ ہوتا ہے۔ وزن تقریباً ساڑھے پانچ اونس ہونا چاہیے۔ اسٹک کی بلیڈ میں عام ہاکی کی طرح خم نہیں ہوتا۔ دستہ 53 انچ سے بڑا نہیں ہونا چاہیے۔ اسٹک بلیڈ کی انتہائی لمبائی 14.1/2 انچ ہوتی ہے۔ رنک کا طول عموماً 200 فٹ اور عرض 85 فٹ رکھا جاتا ہے۔ کونوں پر ذرا گولائی رکھی جاتی ہے۔ گول چھ فٹ چوڑا اور چار فٹ اونچا (عام ہاکی سے چھوٹا ہوتا ہے)۔ ایک ٹیم چھ افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔ ایک گول مائنڈر، دو ڈیفینڈر اور تین فارورڈ، لیکن اس بات کی اجازت ہوتی ہے کہ تکان یا چوٹ کی وجہ سے کوئی کھلاڑی میدان سے چلا جائے تو اس کی جگہ کوئی اور کھیلنے آجائے۔ ایسے متبادل کھیل کے دوران کسی بھی وقت ہوسکتے ہیں۔ انہیں متبادل (substitute) کہا جاتا ہے۔ ایک میچ ساٹھ منٹ کا ہوتا ہے اور بیس بیس منٹ کے تین حصوں میں کھیلا جاتا ہے۔ نگرانی کے لیے دو ریفری ہوتے ہیں اور ہر گول پوسٹ کے پیچھے ایک گول جج ہوتا ہے۔ کھلاڑیوں کو حفاظتی لباس پہننا پڑتا ہے۔ اس کی داغ بیل 25 دسمبر 1858ء کو کوان انگریز فوجیوں کے ہاتھوں بڑی جھیل آنٹریو کے شمال مغربی کنارے پر واقع کنگسٹن میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ آئس ہاکی کے باقاعدہ مقابلے 1860ء سے شروع ہوئے، اس کھیل کا پہلا ادارہ یا پہلی لیگ کنگسٹن میں 1885ء میں قائم ہوئی۔ 1920ء سے یہ کھیل سرمائی اولمپک کھیلوں کے پروگرام میں شامل کیا گیا۔ اس کی بین الاقوامی تنظیم 1908ء میں قائم ہوئی تھی۔ 1920ء میں اسے اولمپک کھیلوں میں شامل کرلیا گیا۔ اس کا کپ سٹینلے کپ کہلاتا ہے۔

مرسلہ: یاسمین اختیار، سکھر

www.pdfbooksfree.pk

ہیں۔ کہیں کوئی خرابی نہیں۔ بس اوپر والے کی مرضی۔ جب مقدر میں ہوگا، اولاد بھی ہو جائے گی۔"

اس کے بعد میں نے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی .... اسے اولاد نہ ہونے کا کوئی غم نہیں تھا یا وہ اسے ظاہر نہیں کرنا چاہ رہا تھا تو میں اپنے آپ کو اس فکر میں ہلکان کیوں کرتا۔ ویسے بھی مجھے یار کی یاری سے غرض تھی۔ اس لیے میں نے اس کے رویے کا برا نہیں منایا اور معمول کے مطابق اس کے گھر جاتا رہا۔ افشاں کی مہربانیاں اور نوازشیں بڑھتی جا رہی تھیں اور اب وہ میری خاطر مدارات کے لیے خاصا اہتمام کرنے لگی تھی۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا کہ وہ جمیل کی موجودگی کو نظر انداز کر کے مجھ سے ہی باتیں کیے جاتی اور وہ بھی لاتعلق بنا بیٹھا رہتا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ دونوں آپس میں بہت کم باتیں کرتے ہیں اور اگر جمیل کچھ کہے تو افشاں تڑخ کر جواب دیتی ہے جس میں بدتمیزی کا پہلو نمایاں ہوتا تھا۔

ایک دن میں جمیل کے گھر گیا تو وہ موجود نہیں تھا۔ دروازہ افشاں نے ہی کھولا اور اسے دیکھتے ہی میری سانسیں بند ہونے لگیں۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ پُرکشش اور خوب صورت نظر آ رہی تھی۔ اس نے ساڑی اور مختصر سا بلاؤز پہن رکھا تھا جس میں اس کے جسم کے خدوخال پوری طرح نمایاں ہو گئے تھے۔ میں نے اس سے پہلے اسے ساڑی میں نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے اس کا یہ روپ میرے لیے حیران کن تھا۔ وہ شاید نہا کر نکلی تھی۔ اس کے گیلے بالوں سے پانی کے قطرے ٹپک کر بلاؤز کو بھگو رہے تھے۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ جمیل گھر پر نہیں ہے تو معذرت کرتے ہوئے بولا "کوئی بات نہیں میں پھر آ جاؤں گا۔"

اس نے بے تکلفی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی "وہ نہیں ہیں تو کیا ہوا، میں تو ہوں۔ ایسی بھی کیا بے مروتی کہ دروازے سے ہی چل دیے۔"

میں ایک معمول کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ وہ مجھے ڈرائنگ روم کی بجائے ٹی وی لاؤنج تک لے گئی اور ٹی وی آن کرتے ہوئے بولی۔ "آپ کچھ دیر ٹی وی دیکھیں، میں بال خشک کر کے ابھی آتی ہوں۔"

میں بے دلی سے ریموٹ کا بٹن دبا کر چینل تبدیل کرتا رہا لیکن میرا دل افشاں میں اٹکا ہوا تھا۔ اس روپ میں دیکھنے کے بعد میں اس پر سو جان سے فدا ہو گیا تھا۔ مجھے بالکل بھی یاد نہ رہا کہ وہ میرے عزیز ترین دوست کی بیوی ہے اور میں خود بھی ایک وفا شعار بیوی کا شوہر اور دو بچوں کا باپ ہوں۔ سچ پوچھیں تو اس میں سارا قصور افشاں کا تھا۔ اس کی بے تکلفی اور بے باکی نے ہی مجھے اس کے بارے میں سوچنے پر مجبور کیا تھا۔ اگر وہ اپنے شوہر کی وفادار اور اس سے سو فیصد مخلص ہوتی تو کبھی اس کی غیر موجودگی میں مجھے اندر آنے کی دعوت نہ دیتی۔

انتظار کے یہ چند منٹ مجھے صدیوں پر بھاری لگ رہے تھے۔ بالآخر کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے۔ وہ اس شان سے نمودار ہوئی کہ اب اس کے سیاہ چمکیلے بال خشک ہو کر شانوں پر لہرا رہے تھے۔ چہرے پر ہلکا میک اپ کرنے کے بعد اس کی تازگی اور شادابی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ اس نے ہاتھوں میں ایک ٹرے پکڑی ہوئی تھی جس میں دو گلاس اورنج جوس اور ایک پلیٹ بسکٹوں کی رکھی ہوئی تھی۔ وہ ایک ادا سے لہراتی ہوئی میرے پاس آئی اور ٹرے میز پر رکھتے ہوئے بولی۔

"آپ آرام سے بیٹھ جائیں، اتنی جلدی نہیں جانے دوں گی۔ آج تو موقع ملا ہے مجھے دل کی بات کہنے کا۔"

اس نے کتنی آسانی سے وہ بات کہہ دی جو لاشعوری طور پر میں سننا چاہ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے میں نے اپنے آپ کو ملامت کی اور چاہا کہ اسے یہیں روک دوں۔ وہ جو کچھ چاہ رہی تھی وہ ہر لحاظ سے غیر اخلاقی اور غیر شرعی تھا۔ بے شک وہ آسمان سے اتری ہوئی حور تھی لیکن میں اپنے دوست کے گھر میں نقب نہیں لگا سکتا تھا لیکن یہ سب باتیں دماغ سوچ رہا تھا جبکہ دل کا فیصلہ اس کے برعکس تھا۔ میں نے بھی دل کی مانی اور اس کا اگلا جملہ سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہو گیا۔

اس نے بسکٹ کی پلیٹ میری طرف بڑھائی اور بولی "اس دنیا میں آپ واحد شخص ہیں جس سے میں دل کی بات کہہ سکتی ہوں۔ اس لیے میں نے بہت سوچ سمجھ کر اپنا مسئلہ آپ سے شیئر کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ امید ہے کہ آپ مجھے مایوس نہیں کریں گے۔"

میرے رگ و پے میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ مجھ پر اتنا بھروسا کر رہی تھی تو مجھے بھی اس کی حوصلہ افزائی کے لیے کچھ کہنا چاہیے تھا۔ اس لیے میں نے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "آپ بلا تکلف اپنے دل کی بات کہہ سکتی ہو۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔"

وہ اپنی ساڑی کا پلو درست کرتے ہوئے بولی۔ "مجھے آپ سے یہی امید تھی۔ میرا خیال ہے کہ اب مجھے اصل موضوع کی طرف آ جانا چاہیے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں... میری شادی کو پانچ سال ہو گئے ہیں اور میں ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم ہوں۔ شروع کے ایک دو سال تو میں نے کچھ خیال نہیں کیا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ احساس محرومی بڑھتا جا رہا ہے۔ آپ کی شادی بھی جمیل کے ساتھ ہی ہوئی تھی اور آپ ماشاءاللہ دو بچوں کے باپ بن چکے ہیں۔ میں اولاد کی خواہش میں پاگل ہوتی جا رہی ہوں لیکن لگتا ہے کہ یہ خواہش کبھی پوری نہ ہو سکے گی۔"

"مایوسی گناہ ہے۔ خدا کی ذات پر بھروسا رکھیں۔ اس کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ اللہ نے چاہا تو آپ کی خواہش جلد پوری ہو گی۔"

"آپ حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔ خدا کی ذات پر تو بھروسا ہے لیکن جب بندہ خود ہی کچھ کرنے کے قابل نہ ہو تو....."

یہ کہہ کر وہ معنی خیز انداز میں مسکرانے لگی۔ میں اس کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس لیے حیران ہوتے ہوئے بولا۔ "میں کچھ سمجھا نہیں آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں۔"

"امجد صاحب! میں فارسی میں نہیں اردو میں بات کر رہی ہوں۔" وہ چڑ کر بولی۔ "آپ کے دوست جمیل صاحب اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں ہیں۔"

مجھے ایسا لگا جیسے میرے بہت قریب کوئی دھماکا ہوا ہو۔ گویا جمیل نے مجھ سے جھوٹ کہا تھا کہ دونوں میاں بیوی کے ٹیسٹ کی رپورٹ نارمل آئی ہے۔ جب میں نے یہی بات افشاں کے سامنے دہرائی تو وہ بولی "مرد کبھی اپنی کمزوری کا اعتراف نہیں کرتا۔ انہوں نے بھی ان رپورٹس کو جھٹلا دیا اور ایک کے بعد دوسری لیبارٹری سے ٹیسٹ کرواتے رہے لیکن ہر رپورٹ کا نتیجہ ایک ہی تھا۔ اس کے علاوہ گزشتہ چار سال سے اپنا علاج بھی کروا رہے ہیں لیکن کوئی بہتری نظر نہیں آئی۔"

اس کی بات سن کر میں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بولا "پھر تو صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اس دنیا میں ہزاروں لاکھوں لوگ بے اولاد ہوں گے لیکن وہ بھی صبر شکر کے ساتھ زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں۔"

"مجھ میں اتنا صبر نہیں" وہ تڑخ کر بولی "مجھے ہر

آیت الکرسی

قرآن حکیم کی سورۃ البقرہ کی 255 ویں آیت، جو ازروئے حدیث بڑی فضیلت اور عظمت والی ہے۔ اس میں توحید ذات و عظمت، صفاتِ الٰہی بیان فرمائی گئی ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور سب کو قائم رکھنے والا اور ہر عیب و جملہ نقائص سے منزہ ہے۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اسی کا ہے۔ اس کے اِذن کے بغیر کوئی کسی امر کی سفارش نہیں کر سکتا۔ وہی ذرّے ذرّے کا جاننے والا ہے اور جب تک وہ خود نہ چاہے کوئی مخلوق اس کے علم میں سے ایک چیز کو بھی نہیں جان سکتی۔ اس کی کرسی (علم و قدرت) آسمانوں اور زمین کو گھیرے ہوئے ہے۔ ان کی حفاظت سے وہ نہیں تھکتا اور وہی اونچی شان اور عظمت والا ہے۔ مسلمان یہ آیت بالخصوص خوف و خطر کے وقت پڑھتے ہیں۔ اکثریت اسے سوتے وقت بھی پڑھتی ہے۔ ہر نماز کے بعد پڑھنے کی بھی بڑی فضیلت اور تاکید ہے۔

آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس مال یا اولاد پر آیت الکرسی کو پڑھ کر دم کرو گے یا لکھ کر مال میں رکھ دو گے یا بچے کے گلے میں ڈال دو گے شیطان اس مال و اولاد کے قریب بھی نہیں آئے گا۔

آیت الکرسی کے بارے میں حضور ﷺ نے حضرت ابی بن کعبؓ سے فرمایا اے ابو منذر! کیا تمہیں معلوم ہے کہ قرآن کریم کی کون سی آیت عظیم الشان ہے؟ انہوں نے عرض کی: اللہ اور اس کا رسولؐ ہی بہتر جانتے ہیں۔ حضورؐ نے مکرر سوال کیا: تمہیں کچھ خبر ہے کہ قرآن کریم کی کون سی آیت عظیم الشان ہے؟ عرض کیا: اللہ لا الہ الا ھو الحی القیوم۔ یہ سن کر آپؐ نے حضرت ابی بن کعب کے سینے پر ہاتھ مار کر فرمایا: اے ابو منذر! تمہیں یہ دولتِ علم مبارک ہو۔

مرسلہ: شفیق عطاری، حیدرآباد

www.pdfbooksfree.pk

قیمت پر اولاد چاہیے، چاہے اس کے لیے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے؟''

''یہ کیسے ممکن ہے۔ جب آپ کے شوہر اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں تو آپ کی یہ آرزو کس طرح پوری ہوسکتی ہے۔''

''بات صرف اولاد کی ہی نہیں۔ اب میں بے شرم ہوکر آپ کو بتا رہی ہوں کہ وہ ناکارہ ہیں۔ ہر رات تشنگی اور بڑھ جاتی ہے' میں انگاروں پر لوٹتی رہتی ہوں اور وہ مزے کی نیند سوتے ہیں، خدا جانے مجھے کس جرم کی سزا مل رہی ہے۔''

''اس کا ایک ہی حل ہے کہ آپ جمیل سے طلاق لے کر کسی دوسرے شخص سے شادی کرلیں۔''

وہ قہقہہ مار کر ہنسی' اگر یہ اتنا ہی آسان ہوتا تو بہت پہلے طلاق لے چکی ہوتی۔ آپ جانتے ہیں کہ اس معاشرے میں مطلقہ عورت کا کیا مقام ہے۔ آج کل تو کنواری لڑکیاں اچھے رشتوں کے انتظار میں بوڑھی ہوجاتی ہیں تو مجھ طلاق یافتہ کو کون پوچھے گا۔ جمیل کا گھر میرے لیے ایک پناہ گاہ ہے۔ یہاں سے نکلنے کے بعد میرا کوئی ٹھکانا نہیں ہوگا۔ ماں باپ مرچکے ہیں۔ بھائی اپنی دنیا میں مگن ہے اور بھاوج تو شاید ایک دن بھی مجھے ساتھ رکھنا گوارا نہ کرے۔ آپ ہی بتائیں امجد صاحب کہ اگر میں نے جمیل سے طلاق لے لی تو میرا ٹھکانا کہاں ہوگا۔ کون کرے گا مجھ سے شادی؟''

جی میں آیا کہ اپنی خدمات پیش کردوں لیکن مجھ میں اتنی بڑی بات کہنے کی ہمت نہیں تھی۔ اس نے میری یہ مشکل خود ہی آسان کردی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور لہراتی بل کھاتی میرے برابر میں آکر بیٹھ گئی پھر اس نے بڑے ناز سے میری گردن میں اپنی بانہیں ڈال دیں اور سرگوشی کے سے انداز میں بولی ''میں آپ کو کیسی لگتی ہوں؟''

اس کی قربت نے مجھ پر ایسا نشہ طاری کیا کہ اپنی سدھ بدھ بھلا بیٹھا اور سرشاری کے عالم میں بولا۔ ''بہت اچھی۔''

''آپ مجھے پسند کرتے ہیں نا۔'' اس نے دوسرا تیر چلایا۔

''ہاں'' میں حقیقت بیان کیے بغیر نہ رہ سکا۔

''پھر آپ مجھ سے شادی کیوں نہیں کرلیتے؟''

اس کا یہ داؤ اتنا جارحانہ تھا کہ میں ہکا بکا رہ گیا اور مجھ سے فوری طور پر کوئی جواب بن نہ پڑا۔ وہ جذباتی انداز میں بولی۔ ''میں آپ کو اچھی لگتی ہوں۔ آپ مجھے پسند بھی کرتے ہیں پھر مجھ سے شادی کرنے میں کیا امر مانع ہے؟''

میں نے اپنے آپ کو اس سحر سے آزاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیسے ممکن ہے کہ میں اپنے ہی دوست کے گھر میں نقب لگاؤں۔ دوسری بات یہ کہ میں شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ ہوں۔ دوسری شادی کیسے کرسکتا ہوں، دنیا کیا کہے گی۔''

''آپ کو دنیا اور اپنے دوست کا بہت خیال ہے' میں جس آگ میں جل رہی ہوں' اس کا آپ کو کوئی احساس نہیں۔ دوسری شادی کرنا کوئی جرم نہیں۔ مذہب نے بھی اس کی اجازت دے رکھی ہے اور آپ تو ایک نیک مقصد کی خاطر یہ شادی کریں گے۔ آپ کی وجہ سے میری پیاسی زندگی سیراب ہوجائے گی اور میں ماں بننے کا فخر حاصل کرسکوں گی۔''

''لیکن میں جمیل کا سامنا کیسے کرسکوں گا؟'' میں نے تقریباً ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

''جمیل کا خوف دل سے نکال دیں۔ میں طلاق کے بعد عدت گزارنے اپنے بھائی کے گھر چلی جاؤں گی۔ پھر میں اور آپ کسی دوسرے شہر جاکر شادی کرلیں گے' یہ شادی خفیہ ہوگی اور میں اپنے بھائی کو بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔۔۔۔ بہانہ بناؤں گی کہ مجھے اسلام آباد میں ملازمت مل گئی ہے۔ ویسے بھی اسے میری کون سی پروا ہے جو وہ زیادہ سوچ بچار کرے گا۔ کراچی واپس آنے کے بعد آپ مجھے ایک علیحدہ گھر لے کردیں گے۔ آپ کے کاروبار کی نوعیت ایسی ہے کہ ہفتے میں دو تین راتیں گھر سے باہر گزارنا کوئی مسئلہ نہیں۔''

''لیکن زیادہ عرصہ تو اس شادی کو نہیں چھپایا جاسکتا۔''

''کیوں! اگر میں اور آپ چاہیں تو کبھی کوئی اس شادی کے بارے میں نہیں جان پائے گا اور ویسے بھی آپ کو جمیل سے اتنا ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ آپ کے تعلقات ختم ہوجائیں گے، تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ زندگی کے سفر میں لوگ ملتے اور بچھڑ جاتے ہیں لیکن زندگی آگے بڑھتی رہتی ہے۔ اگر وہ کوئی شکوہ شکایت کرے تو کہہ سکتے ہیں کہ آپ نے میری خواہش کے احترام میں مجھ پر یہ احسان کیا تھا۔ آخر مجھے کسی نہ کسی سے تو شادی کرنا ہی تھی۔''

یہ کہہ کر وہ مجھ سے لپٹ گئی اور خمار آلود لہجے میں بولی ''اگر آپ نے انکار کیا تو میں خودکشی کرلوں گی۔ روز مرنے اور روز جینے سے تو بہتر ہے کہ آدمی ایک ہی دفعہ میں اپنی زندگی کا خاتمہ کرلے لیکن یاد رہے کہ میرا خون آپ کی گردن پر ہوگا۔''

اس واضح دھمکی کے بعد میرے پاس اقرار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ پھر سب کچھ ویسے ہی ہوا جیسا کہ اس نے پلان کیا تھا۔ افشاں نے اپنے منصوبے پر عمل کرنے میں بالکل بھی دیر نہیں لگائی اور اگلے روز ہی جمیل سے طلاق کا مطالبہ کردیا جسے سن کر وہ ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے پہلے تو افشاں کو منانے اور سمجھانے کی کوشش کی لیکن جب وہ نہ مانی تو اس نے طلاق دینے سے انکار کردیا۔ اس پر افشاں نے اسے دھمکی دی کہ وہ خلع کے لیے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے گی اور جب اس سے وجہ پوچھی جائے گی تو وہ جمیل کا پول کھول دے گی۔ اس طرح اس کی مردانگی کا بھرم نکل جائے گا اور وہ دنیا میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔ یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی اور جمیل نے خاموشی سے طلاق نامہ پر دستخط کردیے۔

افشاں روتی پیٹتی بھائی کے گھر چلی گئی جہاں بھاوج نے کڑوے کسیلے لہجے میں اس کا استقبال کیا اور یہاں تک کہہ دیا کہ ان لوگوں نے کوئی یتیم خانہ نہیں کھول رکھا ہے۔ افشاں اپنی ساری کشتیاں جلا کر آئی تھی۔ اس لیے ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے بولی۔ ''مجھے صرف عدت کے دوران سر چھپانے کے لیے ٹھکانا چاہیے اس کے بعد اپنا انتظام کرلوں گی۔'' پھر اس نے اپنے پرس سے نوٹوں کی گڈی نکالی اور بھاوج کی طرف پھینکتے ہوئے بولی۔ ''میں خود کسی کا احسان لینا نہیں چاہتی۔ اس لیے کچن کے خرچ میں اپنا حصہ ڈال رہی ہوں، ضرورت پڑے تو اور لے لینا۔''

اس دوران افشاں نے مجھ سے ملنے سے گریز کیا البتہ ٹیلی فون پر بات ہوتی رہی۔ عدت ختم ہونے کے بعد اس نے مجھے یاد دلایا کہ وہ میرے ساتھ دوسرے شہر جانے کے لیے تیار ہے۔ میں اسے پروگرام سے مطلع کردوں کہ کب اور کس وقت ائرپورٹ پہنچنا ہے۔ افشاں کے لیے اس پروگرام پر عمل کرنے میں کوئی دشواری نہ تھی۔ اسے صرف بھائی سے جھوٹ بولنا اور ایک بیگ لے کر ائرپورٹ روانہ ہونا تھا۔ اصل مشکل تو میرے ساتھ تھی۔ دوسری شادی کرنے کے لیے پہلی بیوی سے اجازت لینا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے بغیر قاضی صاحب نکاح نہیں پڑھا سکتے اور میں نزہت سے اچانک اور کسی وجہ کے بغیر یہ مطالبہ نہیں کرسکتا تھا کہ وہ مجھے دوسری شادی کی اجازت دے دے۔ کوئی بھی عورت اپنی خوشی سے ایسا نہیں کرتی۔ لوگ جبر، زبردستی، خوشامد یا دھوکے سے کاغذ پر دستخط کروالیتے ہیں۔ نزہت کا میکا بہت بڑا تھا اور اس کے خاندان میں کئی بااثر لوگ بھی تھے جو میرے لیے مشکلات پیدا کرسکتے تھے۔ ایک ہنگامہ کھڑا ہوجاتا اور مجھے لینے کے دینے پڑ جاتے' چنانچہ میں نے اسے دھوکے میں رکھ کر دوسری شادی کی اجازت لینے کا پروگرام بنایا۔

اسے میری خوش قسمتی سمجھ لیجیے کہ نزہت زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی۔ اس نے میٹرک کرنے کے بعد پڑھنا چھوڑ دیا تھا اور ماں سے امور خانہ داری کی تربیت حاصل کرنے لگی تھی۔ وہ انگریزی بس واجبی سا جانتی تھی۔ چنانچہ میں نے اس کے نام سے ایک پلاٹ خریدنے کے کاغذات تیار کروائے اور اسی کے درمیان اجازت نامہ والا کاغذ بھی رکھ دیا پھر ایک روز صبح کو دفتر جاتے ہوئے وہ فائل نزہت کے سامنے رکھی اور بولا ''تمہارے نام سے ایک پلاٹ خرید رہا ہوں۔ بڑی موقع کی جگہ ہے سال دو سال بعد بیچوں گا تو اچھا خاصا منافع مل جائے گا۔ نہیں تو پڑا رہے، بچوں کے کام آئے گا۔''

نزہت یہ سن کر نہال ہوگئی۔ اس کے لیے یہ احساس ہی بڑا دل خوش کن تھا کہ مجھے گھر اور بیوی بچوں کا کتنا خیال ہے چنانچہ اس نے خوشی خوشی ان کاغذات پر دستخط کردیے اور میں نے ایک اہم مرحلہ سر ہونے پر اطمینان کا سانس لیا۔

دوسرے دن ناشتے کی میز پر میں نے اعلان کیا کہ کاروباری سلسلے میں ایک ماہ کے لیے سنگاپور جارہا ہوں۔ میرے بیوی بچوں کے لیے یہ کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ میرا امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار تھا اور اس سلسلے میں اکثر سنگاپور، ہانگ کانگ اور ملائشیا وغیرہ کا چکر لگاتا رہتا تھا۔ اس لیے انہوں نے اس پر سنجیدگی سے توجہ نہیں دی۔ البتہ نزہت کو دورے کی غیر معمولی طوالت پر تشویش ہوئی اور وہ بولی ''پہلے تو آپ کبھی اتنے دنوں کے لیے باہر نہیں گئے۔ اس مرتبہ ایسا کیا خاص کام آن پڑا؟''

''نزہت بیگم! تم ان باتوں کو نہیں سمجھو گی۔ آم کھاؤ، پیڑ گننے کی کیا ضرورت ہے۔ دراصل یہ ایک بہت بڑا آرڈر ہے اور اس کے لیے وہاں کئی لوگوں سے ملاقاتیں کرنا ہیں۔ ممکن

www.pdfbooksfree.pk

ہے کہ اس سے بھی زیادہ دن لگ جائیں لیکن تم فکر نہ کرو۔ میں جلد از جلد کام نمٹا کر واپس آنے کی کوشش کروں گا۔"

پروگرام کے مطابق میں اور افشاں وقت مقررہ پر ائرپورٹ پہنچ گئے۔ افشاں اس وقت انتہائی ماڈرن لباس میں تھی اور بالکل ایک نوجوان لڑکی نظر آرہی تھی۔ جب جہاز ٹیک آف کرنے لگا تو وہ میرے پہلو میں سمٹتے ہوئے بولی "امجد! تمہیں اپنے فیصلے پر کوئی پچھتاوا تو نہیں ہورہا۔"

"پچھتاوا کیسا میری جان!" میں نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "یہ تو میری خوش قسمتی ہے کہ دنیا کی حسین ترین عورت میری زندگی میں آنے کے لیے بے تاب ہے۔ ایک مرد کو اس سے زیادہ اور کیا چاہیے۔"

"اتنا نہ بناؤ کہ میں اپنے آپے میں نہ رہوں۔" وہ اٹھلاتے ہوئے بولی۔ "اچھا، یہ بتاؤ کہ جب تم نے پہلی بار مجھے دیکھا تو دل میں کیا خیال آیا؟"

"یہی کہ کاش تم جمیل کی بجائے میری بیوی ہوتیں۔"

"پھر تم نے اس کا اظہار کیوں نہیں کیا۔ حالانکہ ہم آپس میں کافی بے تکلف ہو چکے تھے۔"

"کیسے کرتا۔ تم کسی اور کی امانت تھیں اور میں امانت میں خیانت کو جرم سمجھتا ہوں۔"

"اب میں تمہیں ایک راز کی بات بتاتی ہوں اور وہ یہ کہ میری پہلے ہی روز سے تم پر نظر تھی۔ یہ تو طے تھا کہ مجھے جمیل سے ہر صورت میں طلاق لینی ہے کیونکہ اس کے ساتھ رہ کر میں اپنی زندگی کو جہنم نہیں بنا سکتی تھی۔ اسی لیے میں تم سے بے تکلف ہوتی چلی گئی اور میں نے ہر ممکن کوشش کی کہ تمہیں اپنے قریب لاسکوں پھر وہ دن بھی آگیا جب میں نے تمہاری نگاہوں میں اپنے لیے پسندیدگی کی جھلک محسوس کی۔ عورت ان نگاہوں کا مفہوم بہت جلد سمجھ لیتی ہے۔ جب مجھے یقین ہوگیا کہ تمہارے دل میں میری محبت کا دیا روشن ہوگیا ہے تو میں نے تمہیں اپنا محرم راز بنانے کا فیصلہ کرلیا۔ میں نے غلط تو نہیں کیا نا؟"

"بالکل نہیں میری جان۔ تمہیں ایسا کرنے کا حق تھا۔ ہر شخص اپنی بہتری کے لیے سوچتا ہے۔ اگر تم نے ایسا سوچا تو بالکل غلط نہیں کیا۔ میں بھی تمہارے بارے میں بہت کچھ سوچتا تھا لیکن بیوی بچوں کی محبت آڑے آجاتی تھی۔"

"اس لیے کہ تم بنیادی طور پر شریف آدمی ہو۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو میری بے تکلفی دیکھ کر گمراہ ہوسکتا تھا اور عین ممکن ہے کہ وہ اپنی ناجائز خواہشات کی تکمیل کے لیے مجھے بھی غلط راستے پر لگا دیتا۔ میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی کہ تم مجھے جائز طریقے سے اپنا شریکِ زندگی بنا رہے ہو۔"

غرضیکہ اسی طرح کی باتوں میں ہمارا سفر کٹ گیا اور ہم اسلام آباد پہنچ گئے۔ میں نکاح نامہ کے بغیر افشاں کے ساتھ کسی ہوٹل میں ٹھہرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس لیے اپنے ایک دوست کے گھر ٹھہرنے کا پروگرام بنایا۔ میں نے اسے اپنی آمد کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ اس سے میرے کاروباری روابط تھے اور وہ میری ذاتی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ میں نے اس سے کہہ دیا کہ شام تک وہ قاضی اور گواہوں کا بندوبست کرے تاکہ نکاح کی کارروائی اسی روز مکمل ہوجائے۔

تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد میں، افشاں کو لے کر بازار چلا گیا جہاں سے اس نے اپنے لیے عروسی جوڑا، کچھ دیگر ملبوسات، جوتے اور میک اپ کا سامان خریدا، اس نے ضد کی کہ میں بھی اس موقع کے لیے کوئی اچھا سا شلوار قمیص کا سوٹ پسند کرلوں۔ واپس آنے کے بعد اس نے ایک بیوٹی پارلر میں فون کرکے اپنی بکنگ کروائی اور عصر کے بعد وہ میرے دوست کی بیوی کے ساتھ دلہن کا میک اپ کروانے بیوٹی پارلر چلی گئی۔

جب وہ دلہن بن کر واپس آئی تو اس پر نگاہ نہیں ٹھہر رہی تھی۔ یقین جانیے، میں نے اپنی زندگی میں اتنی خوبصورت دلہن نہیں دیکھی تھی۔ میرے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے اور میں اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھ رہا تھا۔ مغرب کے بعد ہمارا نکاح ہوگیا۔ میرے دوست نے اس موقع پر ہلکی پھلکی ضیافت کا اہتمام کیا تھا۔ البتہ میں نے اسے تصویریں کھینچنے اور مووی بنانے سے منع کردیا۔ رات گیارہ بجے کے قریب سب مہمان رخصت ہوگئے تو میں نے بھی حجلۂ عروسی کی راہ لی۔

وہ میری زندگی کی یادگار ترین رات تھی۔ گو کہ میں اس سے پہلے بھی سہاگ رات منا چکا تھا لیکن دونوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہی جو بلیک اینڈ وائٹ اور رنگین فلم میں ہوتا ہے۔ اس رات افشاں نے مجھے زندگی کی حقیقی مسرتوں سے آشنا کیا اور صبح اس کے چہرے کی شادابی دیکھ کر مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ اس کی برسوں کی پیاس بجھ چکی ہے۔

وہ ایک مہینا یوں گزرا کہ ہر روز عید اور ہر رات شب

برات کے مانند تھی۔ اپنے شہر واپس جانے کو جی تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن زیادہ دیر رکنا بھی محال تھا۔ میں نے واپسی سے ایک ہفتہ قبل اپنے منیجر کو فون کرکے ڈیفنس کے علاقے میں ایک اپارٹمنٹ کرانے پر لینے اور اسے ویل فرنشڈ کرنے کے لیے کہہ دیا تھا۔ میں، افشاں کو ائرپورٹ سے براہِ راست اسی اپارٹمنٹ میں لے جانا چاہ رہا تھا۔ افشاں نے وہ اپارٹمنٹ دیکھا تو خوش ہوگئی۔ میں نے اس کے لیے ایک کل وقتی ملازمہ اور اوپر کا کام کرنے کے لیے ایک لڑکے کا بندوبست بھی کردیا۔ افشاں کی خواہش پر اسے ایک نئی گاڑی بھی لے کردی۔ اسے ڈرائیونگ نہیں آتی تھی لہٰذا اس کے لیے علیحدہ سے ڈرائیور رکھنا پڑا۔ اس طرح میرے اخراجات میں کافی اضافہ ہوگیا لیکن افشاں نے جو خوشی مجھے دی تھی اس کے مقابلے میں یہ کچھ بھی نہیں تھے پھر میری مالی حیثیت اتنی مستحکم تھی کہ میں انہیں برداشت کرسکتا تھا۔

کراچی واپس آنے کے بعد پہلی خبر یہ ملی کہ جمیل، افشاں سے جدائی کا صدمہ برداشت نہ کرسکا اور ملک چھوڑ کر چلا گیا۔ اسے شاید دبئی یا قطر میں ملازمت مل گئی تھی۔ اس کے جانے کی خبر سن کر میں نے سکون کا سانس لیا۔ وقتی طور پر اس سے سامنا ہونے کا خطرہ ٹل گیا تھا لیکن اس سے بڑا خطرہ نزہت کی شکل میں باقی تھا۔ اگر اسے میری دوسری شادی کی ذرا سی بھی بھنک مل جاتی تو وہ میرا جینا حرام کردیتی۔ گو کہ اب گھر سے میری دلچسپی برائے نام رہ گئی تھی اور میرا زیادہ وقت افشاں کے پاس ہی گزرتا تھا لیکن اس کے باوجود میں نے نزہت کے ساتھ اپنا رویہ حیرت انگیز طور پر تبدیل کرلیا حالانکہ افشاں سے شادی کرنے کے بعد وہ میرے دل سے بالکل اتر چکی تھی لیکن میں نے اسے مطمئن رکھنے کے لیے اس کی ناز برداری شروع کردی تاکہ اس کے دل میں کسی قسم کا شک نہ آئے۔ میں نے گھر کے معاملات میں بھی دلچسپی لینا شروع کردی۔ ہفتے میں ایک بار نزہت اور بچوں کو باہر کھانے پر لے جانے لگا۔ پورے گھر کا رنگ و روغن، فرنیچر اور سیٹنگ بدل ڈالی۔ نزہت کو نیا ٹی وی اور ڈی وی ڈی لاکر دیا۔ اسے فلمیں دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ بھی میرے اس التفات پر بہت حیران تھی لیکن منہ سے کچھ نہیں بولی۔

افشاں سے میری شادی کو دو ماہ بھی نہ گزرے تھے کہ اس نے مجھے باپ بننے کی خوش خبری سنا دی۔ اصولاً تو مجھے خوش ہونا چاہیے تھا لیکن اس خبر کو سن کر میں کچھ پریشان ہوگیا۔ اگر یہ بچہ نزہت کی کوکھ سے جنم لیتا تو میرے لیے کوئی

آک (Calatrpis)

اس قسم کے پودے عموماً جھاڑیوں اور سخت قسم کی بیلوں پر مشتمل ہیں۔ البتہ بہت سی دوامی بوٹیاں بھی اس قسم میں شامل ہیں۔ ان پودوں کی شاخوں اور پتوں سے دودھ جیسا رس نکلتا ہے۔ یہ تمام پودے زیادہ تر استوائی خطے کی پیداوار ہیں۔ براعظم افریقہ میں سب سے زیادہ پائے جاتے ہیں اور ان کی بہت سی اقسام طبی اہمیت رکھتی ہیں۔ کچھ اقسام رنگ بنانے کے کام آتی ہیں بعض اقسام سے رسّے بنانے کے لیے ریشہ حاصل کیا جاتا ہے۔ ایک قسم کے آک کے رس سے تیروں کو زہر آلود کیا جاتا ہے۔ دوسری قسم کے آک کا زہر مچھلیاں مارنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ پاکستان میں خودرو ہوتا ہے۔

مرسلہ: نازش علی اخوند، کوہاٹ

مسئلہ نہیں تھا لیکن افشاں کی اولاد آگے چل کر میرے لیے مسائل پیدا کرسکتی تھی۔ سب سے بڑا مسئلہ تو وراثت کا پیدا ہوتا۔ ظاہر ہے کہ وہ میری اولاد ہوتی اور میری جائداد اور اثاثوں میں اس کا بھی برابر کا حصہ ہوتا۔ میں ایک خاص مدت تک اس شادی کو خفیہ رکھ سکتا تھا لیکن بچے کے سن بلوغت کو پہنچنے کے بعد یہ ممکن نہ تھا۔ میں دل ہی دل میں دعا مانگنے لگا کہ لڑکی پیدا ہوتا کہ میں اسے پال پوس کر اس کی شادی کرکے چپکے سے رخصت کردوں اور میرے گھر والوں کو اس کا پتا بھی نہ چلے لیکن میری یہ دعا قبول نہیں ہوئی اور افشاں ایک لڑکے کی ماں بن گئی۔

افشاں کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ میری حد درجہ احسان مند تھی اور بار بار یہی کہتی "آپ نے زندگی کی سب سے بڑی خوشی دے کر مجھے خرید لیا ہے۔ میں اس احسان کا بدلہ مر کر بھی نہیں چکا سکتی۔"

"مریں تمہارے دشمن۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا "تم نے جو خوشی مجھے دی ہے اس کے مقابلے میں تو میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔"

"یہ آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ ماں بننا میرا پرانا خواب تھا جس کی تعبیر مجھے آپ سے شادی کرکے ملی۔"

اس نے بڑے چاؤ سے بچے کا نام ارمان رکھا۔ اس کا

www.pdfbooksfree.pk

برسوں کا ارمان جو پورا ہوا تھا۔ اب وہ بچہ ہی اس کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔ میں بڑی مشکل سے اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال کر اس سے ملنے جاتا لیکن وہ مجھ پر کوئی توجہ نہیں دیتی بلکہ میری موجودگی میں بھی بچے میں ہی مگن رہتی۔ یہاں تک کہ اگر وہ سو رہا ہوتا، تب بھی اسی کی باتیں کرتی رہتی۔ مجھے ویسے بھی اس بچے سے کوئی خاص انسیت نہ تھی لیکن اب میں اس سے حسد محسوس کرنے لگا۔ وہ میرے اور افشاں کے درمیان ایک دیوار بنتا جا رہا تھا۔ افشاں کے رویّے سے بھی یہی ظاہر ہوتا تھا کہ جیسے اس کا مقصد پورا ہو گیا ہو اور اب اسے میری ضرورت نہیں رہی۔

میرا گھر سے مسلسل غائب رہنا رنگ لایا اور نزہت کی آنکھوں میں شک کے سائے لہرانے لگے۔ وہ خود تو کچھ نہ بولی لیکن بچوں کو آگے کر دیا۔ میرا بیٹا نعمان خوب باتیں کرنے لگا تھا۔ ایک دن صبح ناشتے کی میز پر بول پڑا ”پاپا، آپ روزانہ رات کو اتنی دیر سے گھر کیوں آتے ہیں۔ بلکہ کبھی کبھی تو رات کو بھی نہیں آتے۔“

اس کی بات سن کر میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ یہ چھوٹا سا بچہ اتنی بڑی بات نہیں کہہ سکتا۔ ضرور کسی نے اس کے منہ میں اپنی زبان ڈال دی ہے۔ میں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”کیا کروں بیٹا، مجبوری ہے۔ کام ہی اتنا زیادہ ہوتا ہے۔“

”لیکن آپ دفتر میں بھی تو نہیں ہوتے۔ مما نے کئی بار فون کر کے پتا کیا ہے۔“

میں نے گھور کر نزہت کی طرف دیکھا۔ گویا وہ میری جاسوسی کر رہی تھی۔ جی چاہا کہ ابھی اس کی طبیعت صاف کر دوں لیکن بچوں کے سامنے کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا البتہ اسے سنانے کی خاطر نعمان سے کہا۔ ”میں ہر وقت دفتر میں نہیں بیٹھا رہتا، دفتر سے باہر بھی بہت سے کام ہوتے ہیں۔ لوگوں سے ملنا، میٹنگوں میں جانا اور کاروباری ڈنر اٹینڈ کرنا۔ تم ابھی بچے ہو، ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔“

نزہت کے چہرے پر ایک سایہ سا آ کر گزر گیا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ اسے میرے جھوٹ پر یقین نہیں آیا۔ مگر مجھے اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ البتہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گھر میں ایک بار پھر تناؤ کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ وہ التفات اور دلچسپی جو افشاں سے شادی کے بعد میں نے مصنوعی طور پر اختیار کی تھی، فضا میں دھوئیں کی طرح تحلیل ہو گئی اور ہم دونوں ایک بار پھر پرانی ڈگر پر واپس آ گئے۔ اُدھر افشاں کے رویّے میں بے اعتنائی غالب آتی جا رہی تھی۔ پہلے وہ مجھے دیکھ کھل اٹھتی تھی لیکن اب یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ محض اپنا فرض نبھا رہی ہو۔ مجھے ہرگز اس سے اس رویّے کی امید نہیں تھی جس کی خاطر میں یہ مشکل جھیل رہا تھا۔ اسی نے مجھ سے نظریں چرانا شروع کر دی تھیں اور سچ تو یہ ہے کہ میں خود بھی دو کشتیوں کی سواری سے تنگ آ چکا تھا۔ آخر کب تک نزہت اور بچوں سے جھوٹ بول کر گھر سے دور رہنے کے بہانے بناتا رہتا۔ نزہت کے انداز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے مجھ پر شک ہو گیا ہے۔ وہ میری ٹوہ لینے کی خاطر دفتر تک پہنچ گئی ہے، ایک دن افشاں کے اپارٹمنٹ تک بھی پہنچ جائے گی۔ اس خطرے سے بچنے کے لیے میرے پاس دو ہی راستے تھے۔ ایک تو یہ کہ افشاں سے شادی کا راز افشا کر دوں۔ بعد میں جو ہوگا دیکھا جائے گا اور دوسرے یہ کہ کسی طرح افشاں سے جان چھڑا لوں لیکن مجھے یہ سب کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی افشاں نے خود ہی میری مشکل آسان کر دی۔

ایک دن میں معمول کے مطابق افشاں سے ملنے گیا تو ڈرائنگ روم میں سائیڈ ٹیبل پر رکھی ایش ٹرے میں سگریٹ کے ٹکڑے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں نے افشاں سے پوچھا ”یہ سگریٹ کے ٹکڑے..... کیا کوئی آیا تھا؟“

”ہاں؟ میں تمہیں بتانے ہی والی تھی۔ میرا کزن امریکا سے آیا ہوا ہے۔ وہی مجھ سے ملنے آیا تھا۔ جلدی میں تھا اس لیے چلا گیا۔ کہہ رہا تھا امجد بھائی سے پھر ملوں گا۔“

”اچھا، لیکن تم نے پہلے کبھی اپنے کسی ایسے کزن کا تذکرہ نہیں کیا جو امریکا میں رہتا ہو؟“

”امجد! تمہیں معلوم ہے کہ جمیل سے طلاق لینے کے بعد میں نے اپنے خاندان والوں سے ملنا چھوڑ دیا ہے۔ اس لیے میں نے کبھی ان کا تذکرہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ نہ جانے ارشد کو میرا پتا کس طرح معلوم ہو گیا۔“

میں بچہ نہیں تھا کہ وہ جھوٹ بول کر مجھے مطمئن کر دیتی۔ میرے منیجر کے علاوہ کسی کو اس اپارٹمنٹ کے بارے میں علم نہیں تھا اور نہ ہی کوئی یہ جانتا تھا کہ افشاں میری بیوی ہے۔ یقیناً وہ پہلے سے ارشد سے رابطے میں تھی۔ تاہم میں نے زیادہ کریدنا مناسب نہ سمجھا جو بھی حقیقت ہوگی سامنے آ جائے گی۔

مجھے زیادہ دن انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اس واقعہ کے پندرہ دن بعد ہی افشاں نے دھماکا کر دیا جب میں اس سے

ملنے پہنچا تو وہ خلاف معمول بڑی لگاوٹ سے پیش آئی۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ بولی ”تم نے مجھ پر اتنے احسان کیے ہیں، اب ایک احسان اور کر دو۔“

”وہ کیا؟“ میں چونکتے ہوئے بولا۔

”مجھے طلاق دے دو۔“ اس نے اتنی آسانی سے کہہ دیا جیسے نئے سوٹ کی فرمائش کر رہی ہو۔

”یہ کیا کہہ رہی ہو۔ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔“

”میں ہوش و حواس میں رہ کر اتنی بڑی بات کہہ رہی ہوں۔“ وہ رسان سے بولی۔ ”تم اتنے اچھے انسان ہو کہ میں تم سے بے ایمانی نہیں کر سکتی۔ ارشد اگر واپس نہ آتا تو بھی یہ مطالبہ نہیں کرتی۔ لیکن اب میں مجبور ہوں۔“

”یہ کیسی مجبوری ہے کہ تم اپنا ہنستا بستا گھر اجاڑ رہی ہو۔“

”میرا خیال ہے کہ تم پوری بات سن لو، اس کے بعد نہیں فیصلہ کرنے میں آسانی رہے گی۔“ وہ میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”ارشد میرا تایا زاد ہے۔ ہم دونوں میں بچپن سے گہری دوستی تھی جو جوان ہونے پر محبت میں بدل گئی۔ ارشد مجھے دیوانہ وار چاہتا تھا اور اس نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میں اسے نہ ملی تو وہ کبھی شادی نہیں کرے گا۔ تایا کی مالی حیثیت بہت کمزور تھی۔ اس لیے مجھے ڈر تھا کہ شاید امی ابو اس رشتے کو قبول نہ کریں کیونکہ وہ مجھے ایک محفوظ مستقبل دینے کے خواہش مند تھے۔ میرا خدشہ درست ثابت ہوا۔ ارشد ایم بی اے کرنے کے بعد دو سال تک ملازمت کی تلاش میں بھٹکتا رہا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ تایا جی کرائے کے مکان میں رہتے تھے اور ارشد پر چار بہنوں کی بھی ذمے داری تھی۔ اس لیے جب تائی نے امی سے ارشد کی بات چھیڑی تو ہماری طرف سے صاف انکار ہو گیا۔ امی کا کہنا تھا کہ افشاں بچپن سے ناز و نعم میں پلی ہے۔ ارشد ابھی اپنا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں، وہ افشاں کو پُرآسائش زندگی کیسے دے سکتا ہے۔

ارشد کا دل ٹوٹ گیا اور اس نے ملک سے باہر جانے کی تیاری شروع کر دی۔ دوستوں سے قرض ادھار لے کر وہ امریکا چلا گیا۔ جانے سے پہلے مجھ سے ملنے آیا تو اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے مجھے کسی اور کی دلہن بنتا نہیں دیکھ سکتا۔ اس لیے ملک چھوڑ کر جا رہا ہے۔ امریکا جانے کے بعد اس نے کچھ عرصہ چھوٹی موٹی نوکریاں کیں پھر اسے معقول ملازمت مل گئی۔ اب وہ گرین کارڈ ہولڈر ہے، چاروں بہنوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ تایا اور تائی اب اس دنیا میں نہیں رہے اور ارشد بھی تنہا زندگی گزار رہا ہے، وہ مسلسل مجھ سے رابطے میں رہا اور میری اس سے ہفتے میں ایک دو مرتبہ بات ہوتی رہتی ہے۔ وہ میری زندگی کے ہر پہلو سے اچھی طرح واقف ہے۔ جمیل سے شادی، طلاق، تم سے شادی اور ارمان کی پیدائش، اسے یہ بھی معلوم ہے کہ تم نے میری خوشی کی خاطر اپنے گھر کا سکون برباد کر دیا ہے۔ یہ اسی کا مشورہ ہے کہ میں تمہیں اس بندھن سے آزاد کر دوں۔ وہ مجھ سے شادی کرنے کے لیے تیار ہے۔“

”لیکن میرا بچہ، اس کا کیا ہوگا۔“

”اس نے میری کوکھ سے جنم لیا ہے۔ اس لیے وہ میرا بچہ ہے۔ ویسے بھی سات سال تک اس پر میرا قانونی حق ہے۔ بہتر ہوگا کہ تم بچے سے دستبردار ہو جاؤ۔ کیونکہ تم اسے سنبھال سکتے ہو، نہ اسے اپنے گھر لے جا سکتے ہو۔ مستقبل میں پیدا ہونے والی پیچیدگیوں سے بچنے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ تم ارمان کو میرے پاس رہنے دو، ارشد اسے اپنا نام دینے کے لیے تیار ہے۔“

اس کی تجویز ہر لحاظ سے معقول تھی اور اس پر عمل کرنے کے بعد میں اپنی پُرسکون دنیا میں واپس لوٹ جاتا اور نہ میرے لیے کئی مسائل پیدا ہو سکتے تھے۔ میں نے اسے طلاق دینے پر آمادگی ظاہر کر دی لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی رکھ دی کہ میں جب چاہوں ارمان سے مل سکتا ہوں اور صرف اس کی وجہ سے وہ میرے ساتھ تاحیات رابطے میں رہے گی۔

افشاں نے مجھے یقین دلایا کہ میں نے اس پر جو احسانات کیے ہیں اس کے مقابلے میں یہ شرط کچھ بھی نہیں اور وہ ہمیشہ اس کی پاسداری کرے گی۔ اس نے فوراً فون کر کے ارشد کو بلا لیا اور جب اسے معلوم ہوا کہ میں افشاں کو طلاق دینے پر آمادہ ہو گیا ہوں تو وہ گرم جوشی سے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔ ”امجد صاحب! پہلے آپ افشاں کے محسن تھے۔ اب میرے بھی بن گئے ہیں۔ آپ نے دو زندگیوں کو تباہ ہونے سے بچا لیا ہے۔ ہم آپ کے اس احسان کی قیمت کبھی نہیں چکا سکیں گے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن ایک سوال ابھی تک میرے ذہن میں کھٹک رہا ہے اور وہ یہ کہ جب آپ دونوں رابطے میں تھے تو جمیل سے طلاق ہونے کے بعد آپ نے افشاں سے شادی کیوں نہیں کی؟“

”اس کی دو تین وجوہات ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ اُس

www.pdfbooksfree.pk

وقت ابا جی حیات تھے اور اپنی بے عزتی نہیں بھولے تھے۔ وہ کبھی بھی افشاں سے شادی کرنے کی اجازت نہ دیتے۔ دوسری بات یہ کہ افشاں مجھ سے رابطے میں ضرور تھی لیکن اسے یہ یقین نہیں تھا کہ میں کبھی اس کی زندگی میں آسکوں گا۔ وہ آپ کو پسند کرنے لگی تھی۔ جب میں نے اس کی چاہت دیکھی تو آپ سے شادی کرنے کا مشورہ دیا کیونکہ اس وقت میں اس کی کوئی مدد نہیں کرسکتا تھا اور افشاں کو فوری طور پر ایک سہارے کی ضرورت تھی۔ اب میں اپنے فیصلے کرنے میں آزاد ہوں اور افشاں کو بخوشی اپنا رہا ہوں۔"

تمام معاملات بخیر وخوبی طے پا گئے۔ افشاں اپنے بھائی سے مکمل طور پر قطع تعلق کر چکی تھی۔ لہٰذا میں نے اسے پیشکش کی کہ وہ اپنی عدت پوری ہونے تک اس اپارٹمنٹ میں رہ سکتی ہے۔ میں اس دوران اس کی ضروریات کا خیال رکھوں گا بلکہ میری خواہش ہے کہ نکاح کی رسم بھی اسی اپارٹمنٹ میں ہو اور میں بھی اس میں شرکت کروں۔"

افشاں اور ارشد نے میری سب باتیں مان لیں اور اس طرح میں افشاں کی زندگی سے نکل آیا۔ عدت کا عرصہ پورا ہونے کے بعد ان دونوں نے نکاح کرلیا اور ارشد نے افشاں کو اپنے ساتھ امریکا لے جانے کی تیاری شروع کردی کیونکہ وہ خود گرین کارڈ ہولڈر تھا۔ اس لیے افشاں کو ویزا ملنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ میں خود انہیں چھوڑنے ائرپورٹ گیا۔ اس روز شاید پہلی بار میرے دل میں شدید خواہش ہوئی کہ ارمان کو گود میں لے کر خوب پیار کروں۔ لیکن میں نے اس خواہش پر قابو پالیا۔ میں عین وقت پر کسی کمزوری کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

افشاں کے جانے کے بعد زندگی اپنی پرانی ڈگر پر لوٹ آئی اور کوئی نہ جان سکا کہ وہ کبھی میری زندگی میں آئی تھی۔ البتہ اس نے وعدے کے مطابق مجھ سے رابطہ رکھا اور ہفتے میں ایک آدھ بار ہماری بات ہوجاتی تھی۔ وہ مجھے ارمان کے بارے میں ایک ایک بات بتاتی اور میں مطمئن تھا کہ میرے بیٹے کی پرورش مناسب انداز میں ہو رہی ہے۔

وقت تیزی سے گزرتا رہا اور میرے بچے جوان ہوگئے۔ اب مجھے ان کی شادیوں کی فکر ستانے لگی تھی۔ نعمان تو لڑکا تھا۔ اس کے لیے ایک سے ایک اچھی لڑکی مل سکتی تھی لیکن افشین کے لیے مناسب برتلاش کرنا ایک مشکل مرحلہ تھا۔ اس سلسلے میں ہم نے کئی جاننے والوں سے کہہ رکھا تھا لیکن ابھی تک کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ رشتے تو کئی آئے لیکن ان میں کوئی بھی ہمارے معیار کا نہیں تھا۔

افشاں سے رابطہ برائے نام رہ گیا تھا۔ میں اپنی مصروفیات میں الجھا رہتا تھا اور وہ بھی باقاعدگی سے اپنا وعدہ نبھانے میں ناکام رہی تھی پھر ایک روز اس نے فون پر مجھے بتایا کہ ارمان کی تعلیم مکمل ہوچکی ہے اور وہ لوگ عنقریب پاکستان مستقل طور پر آرہے ہیں۔ مجھے یہ خبر سن کر کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی۔ نہ جانے میں کیوں یہ چاہتا تھا کہ ارمان ہمیشہ امریکا میں ہی رہے اور کبھی پاکستان واپس نہ آئے۔

انہی دنوں مجھے اپنے کام کے سلسلے میں جکارتہ جانا پڑ گیا۔ ہم اپنی کمپنی کا ایک آفس وہاں بھی کھول رہے تھے۔ اس سلسلے میں مجھے وہاں کم ازکم دو ماہ قیام کرنا تھا۔ میری غیر موجودگی میں وہ لوگ پاکستان آئے لیکن ان کا مجھ سے رابطہ نہ ہوسکا۔ کافی عرصے تک افشاں نے مجھے فون نہیں کیا۔ مجھے بھی اس کی کوئی خاص پروا نہیں تھی۔ بس کبھی کبھار ارمان کو دیکھنے کو دل چاہتا۔ نہ جانے جوان ہو کر اس نے کیسا روپ نکالا ہوگا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ جب بھی افشاں مجھے فون کرے گی تو میں اس سے کہوں گا کہ وہ ارمان کو مجھ سے ملوادے تاکہ میں ایک نظر اپنے بیٹے کو دیکھ سکوں لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اس سے پہلے ہی ایک ایسا واقعہ پیش آگیا جس نے ہم سب کی پُرسکون زندگی میں ہلچل مچادی۔

مجھے جکارتہ سے آئے ہوئے ایک ہفتہ ہی ہوا تھا کہ نزہت نے مجھے اطلاع دی کہ کچھ لوگ افشین کو دیکھنے کے لیے آنا چاہ رہے ہیں۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ ان خاتون نے افشین کی سہیلی ارجمند کی شادی میں اسے دیکھا اور اپنے بیٹے کے لیے پسند کرلیا، پھر انہوں نے ارجمند کی والدہ سے ہمارے گھر کا نمبر لیا اور نزہت سے بات کرکے اپنا مدعا بیان کردیا۔ اب وہ اپنے شوہر اور بیٹے سمیت ہمارے گھر آنا چاہ رہی تھیں تاکہ سب لوگ ایک دوسرے کو اچھی طرح دیکھ لیں اور بات آگے بڑھائی جائے۔ نزہت کو میری مصروفیات کا علم تھا۔ اس لیے وہ مجھ سے پوچھے بغیر انہیں کوئی وقت نہیں دے سکتی تھی۔ اب وہ مجھ سے یہی جاننا چاہ رہی تھی کہ ان لوگوں کو کیا جواب دیا جائے۔ میں افشین کی شادی کے لیے بہت فکر مند تھا اور کوئی موقع ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا چنانچہ میں نے نزہت سے کہہ دیا کہ وہ ان لوگوں کو آنے والے اتوار شام پانچ بجے چائے پر بلالے۔

اگر کوئی خاص مصروفیت نہ ہو تو اتوار کا دن میں بالعموم گھر پر ہی گزارتا تھا۔ یہ میرا ہمیشہ سے اصول چلا آرہا تھا کہ ہفتے میں چھ دن کام اور ایک دن مکمل آرام۔ اس روز تو ویسے بھی خاص مہمان آرہے تھے، اس لیے میں نے گھر پر رہنے کو ترجیح دی۔ نزہت سے میں نے کہہ دیا تھا کہ اپنی اسٹڈی میں ہوں جب مہمان آجائیں تو مجھے بلالیا جائے۔

وہ لوگ وقت کے بڑے پابند تھے۔ ٹھیک پانچ بجے نزہت نے موبائل پر مجھے ان کے آنے کی اطلاع دی۔ میں نے زیر مطالعہ کتاب بند کرکے ایک طرف رکھی اور دیوار پر لگے آئینے میں اپنا جائزہ لے کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے جیسے ہی ڈرائنگ روم میں قدم رکھا حیرت سے میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ سامنے والے صوفے پر افشاں اور ارشد بیٹھے ہوئے تھے جبکہ دائیں ہاتھ والے صوفے پر ایک ارٹ سالڑکا براجمان تھا۔ یقیناً وہ ارمان ہی ہوگا۔

میرے قدم زمین میں گڑ گئے اور میں پتھر کے مجسمہ کی طرح اپنی جگہ پر ساکت ہوگیا۔ افشاں بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ شاید وہ نہیں جانتی تھی کہ جس گھر میں بیٹے کا رشتہ لے کر جارہی ہے وہ میرا ہے اور میں افشین کا باپ ہوں۔

نزہت نے میری جانب دیکھا اور بولی "ارے، آپ دروازے میں ہی کیوں رک گئے۔ اندر آجائیں تاکہ سب لوگوں سے آپ کا تعارف کروادوں" پھر وہ افشاں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی "یہ افشین کے ڈیڈی ہیں، بہت مصروف رہتے ہیں۔ ان کے پاس ہم لوگوں کے لیے بھی وقت نہیں ہوتا۔"

افشاں اچانک ہی صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر ارمان کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی "چلو بیٹا شاید ہم لوگ غلط جگہ پر آگئے ہیں۔"

"ارے، یہ کیا ہوا؟" نزہت چہکتے ہوئے بولی۔ "کہاں تو آپ ہمارے گھر آنے کے لیے اتنی بے تاب ہو رہی تھیں اور اب میرے شوہر کو دیکھتے ہی یوں بھاگ رہی ہیں جیسے یہ کوئی بھوت ہیں۔"

"آپ جو چاہے سمجھ لیں لیکن اب میں یہاں ایک سیکنڈ بھی نہیں رک سکتی۔"

"اب آ ہی گئی ہیں تو کم ازکم اس ڈرامے کا ڈراپ سین ہی دیکھتی جائیں۔" نزہت عجیب سے انداز میں بولی۔

"کیسا ڈراما؟ تم ہوش میں تو ہو، گھر آئے مہمانوں سے اس طرح بات کی جاتی ہے۔" میں نے مداخلت کی۔

آئینی روایات

آئینی روایات قانون کی خشک ہڈیوں پر گوشت کی فراہمی کا کام کرتی ہیں۔ وہ نظریات کے فروغ کے ساتھ ہوتی ہیں۔ ایک آئین خود کوئی کام نہیں کرتا، کوئی شخص اس کا کام کرتا ہے۔ یہ قومی تعاون کا ایک آلہ ہے اور تعاون کا جزو، یہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ آلہ۔ آئینی روایات وہ قوانین ہیں جو تعاون کو متاثر کرنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ آئین کے اثرات بھی قومی زندگی کے حالات کی تبدیلیوں کے ساتھ بدلنے چاہئیں۔ نئی ضروریات کا تقاضا، نئے انداز اور نئی سمتیں ہیں۔ آدمی نئی ضروریات سے مطمئن ہونے کے لیے پرانے قانون سے کام لیتا ہے۔ روایت ہر ایک تنہا نظیر سے بھی وجود میں آسکتی ہے یا ایک بار پھر یہ متعلقہ فریقین کے مابین ایک معاہدے کا نتیجہ بھی ہوسکتی ہے جو انہیں ایک مضبوط جوڑ کے طور پر منظور ہوتی ہے۔

آئینی روایت کو ایک سخت اور موثر قانون کے طور پر استعمال کرنے کی روایت کینیڈا سے ملتی ہے۔ کینیڈا کی حکومت نے 1980ء کے عشرے کے اوائل میں آئین کی ذمہ داری برطانوی حکومت سے کینیڈا کی حکومت کو منتقل کرنا چاہی، تاہم صوبوں کے ساتھ اس کے تصفیے پر معاہدہ نہیں ہوسکا۔ جب حکومت نے اس کے بغیر کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا تو چند صوبوں نے حکومت کی اس کارروائی کی قانونی حیثیت کو چیلنج کردیا۔ سپریم کورٹ نے قرار دیا کہ کسی آئینی ترمیم میں صوبوں کی رضامندی حاصل کرنے کا طے شدہ قانون یا رول نہیں ہے، یہ روایت میں ہے جس سے ایسی رضامندی حاصل کی جاسکتی ہے حکومت نے اس طرح اپنے منصوبوں میں تاخیر کی اور مزید بات چیت کی جس پر دس میں سے نو صوبے وفاقی تجاویز پر نظرثانی پر رضامند ہوگئے جس نے 1983ء کے کینیڈا کے آئین کی بنیاد کو تشکیل دیا۔

مرسلہ: اکبر سبحانی، کراچی

www.pdfbooksfree.pk

''مہمان...!''وہ طنزیہ انداز میں بولی۔''میں ان مہمانوں کی حقیقت سے اچھی طرح واقف ہوں۔ یہ وہی افشاں ہیں نا جنہوں نے میرے حق پر ڈاکا ڈالا تھا۔ آپ سمجھتے ہیں کہ مجھے کچھ خبر نہیں جبکہ میں نے تو آپ کی حرکات و سکنات پر اس وقت سے نظر رکھی ہوئی تھی جب آپ نے افشاں کے گھر ضرورت سے زیادہ آنا جانا شروع کر دیا تھا۔ میں نے آپ ہی کے دفتر کے کچھ لوگوں کو آپ کی جاسوسی پر مامور کر دیا تھا۔ جب آپ کی افشاں سے شادی ہوئی تو میں خوب پھوٹ پھوٹ کر روئی لیکن رونے سے میرا سہاگ تو واپس نہیں مل سکتا تھا لہٰذا میں نے خاموشی اختیار کر لی اور فیصلہ کر لیا کہ جب تک آپ خود مجھے دوسری شادی کے بارے میں نہیں بتائیں گے اُس وقت تک میں بھی اس کا تذکرہ نہیں کروں گی۔ پھر جب میں نے افشاں اور ارشد کی شادی کی خبر اور امریکا جانے کے بارے میں سنا تو میرے دل کو قرار آ گیا اور مجھے یوں لگا جیسے میرے سینے پر سے کوئی بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا ہے۔ قدرت کا یہ کیسا انصاف تھا کہ آپ اپنے بیٹے کو اپنا نہیں کہہ سکتے تھے اور افشاں چکنی چپڑی باتیں کر کے اسے آپ سے دور سات سمندر پار لے گئی، اور آج وہ آپ کے بیٹے کا رشتہ آپ کی بیٹی کے لیے لے کر آئی ہے۔ چاہے انجانے میں ہی سہی۔ جب انہوں نے ہمارے گھر آنے کی خواہش ظاہر کی تو میں نے اپنے ذرائع سے ان کا حدود اربعہ معلوم کرنے کی کوشش کی اور مجھے پتا چل گیا کہ افشاں آپ کی سابقہ بیوی ہیں اور ارمان آپ کا بیٹا ہے۔ میں چاہتی تو یہ حقیقت جان لینے کے بعد افشاں کو یہاں آنے سے منع کر سکتی تھی لیکن میں اس ڈرامے کا ڈراپ سین دیکھنا چاہ رہی تھی۔ اس کے علاوہ میری خواہش تھی کہ حقدار اپنے حق سے محروم نہ رہ جائے۔''

''کیسا حق اور کون حقدار؟''میں نے جھلاتے ہوئے کہا۔

''میں ارمان کی بات کر رہی ہوں۔ آج تک آپ نے ساری دنیا سے یہ بات چھپائے رکھی کہ ارمان آپ کا بیٹا ہے بلکہ آپ نے تو سرکاری کاغذوں مثلاً شناختی کارڈ یا پاسپورٹ اور میٹرک کے سرٹیفکیٹ میں ولدیت کے خانے میں اپنی بجائے ارشد کا نام لکھوا دیا تھا جو شرعی لحاظ سے گناہ اور قانون کی نظر میں جرم ہے۔ اگر اس کے شناختی کارڈ اور دیگر دستاویزات میں ولدیت کے خانے میں ارشد کی بجائے آپ کا نام نہیں درج کیا گیا تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آپ کی دولت اور جائداد میں اپنے حصے سے محروم رہ جائے گا اور میں یہ زیادتی نہیں ہونے دوں گی۔''

''جب تم جان ہی گئی تھیں کہ میں نے افشاں سے شادی کر لی ہے تو کوئی احتجاج کیوں نہ کیا؟ اچھا ہوتا کہ بات اسی وقت کھل جاتی اور میں ارمان کو بانگِ دہل اپنا بیٹا کہہ سکتا۔''

''یہی تو میں نہیں چاہتی تھی۔ جس طرح آپ نے مجھ سے بے وفائی کر کے افشاں سے شادی کی اور مجھے اذیت میں مبتلا کیا اسی طرح میں بھی خاموش رہ کر آپ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اذیت دینا چاہ رہی تھی تاکہ آپ کبھی ارمان کو اپنا بیٹا نہ کہہ سکیں۔ میرا دکھ تو عارضی تھا جو افشاں کے جانے کے بعد ختم ہو گیا لیکن آپ گزشتہ پچیس سالوں سے یہ اذیت سہہ رہے ہیں اور اگر آج یہ لوگ میرے دروازے پر نہ آتے تو شاید آپ ساری عمر بیٹے سے جدائی کا دکھ برداشت کرتے رہتے۔''

''جب تم سب کچھ جاننے کے بعد اتنا عرصہ خاموش رہیں تو پھر آج......''

''یہ سب میں آپ کی بیٹی کے کہنے پر کر رہی ہوں۔'' وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولی۔''جب اسے معلوم ہوا کہ ارمان آپ کا بیٹا اور اس کا بھائی ہے تو اس نے مجھے مجبور کیا کہ میں اس حقیقت کو آپ پر ظاہر کر دوں تاکہ آپ اس خوف سے آزاد ہو سکیں جس نے گزشتہ پچیس برسوں سے آپ کو بیٹے سے دور کر رکھا ہے۔''پھر وہ افشاں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔''آپ لوگ افشین کو دیکھنے آئے تھے۔ میں آپ کو اس سے ضرور ملواؤں گی تاکہ وہ بھی اپنے بھائی سے مل سکے۔ امجد نے آپ پر جو احسان کیا تھا اُس کی قیمت یوں چکا سکتی ہیں کہ ارمان کو اس کے باپ کا نام دے دیں تاکہ وہ اپنے حق اور رشتوں سے محروم نہ رہے۔ بے شک وہ آپ کے ساتھ ہی رہے لیکن اسے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ ارشد کی نہیں بلکہ امجد کی اولاد ہے اور آپ لوگوں نے اپنے مفاد کی خاطر اس سے جو دھوکا کیا ہے اس کی تلافی ہو سکے۔''

افشاں کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ میرے پیروں کی زنجیر کٹ چکی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر ارمان کو گلے لگا لیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ نزہت اتنے اعلیٰ ظرف کی مالک ہوگی۔ اس نے مجھ پر جو احسان کیا، شاید اس کی قیمت کبھی نہ چکا سکوں۔

محترم ومکرم مدیر اعلیٰ سرگزشت

السلام علیکم

ہر انسان اپنے حصے کی ڈیوٹی نبھانے کے لیے ہی اس دنیا میں آتا ہے۔ اس کا ادراک اس ہستی کی قربانی سے ہوا۔ اس نے کتنی بڑی قربانی دی۔ یہی میں آج کہانی کی شکل میں سنانے آیا ہوں۔ یہ میرا خراجِ عقیدت ہے۔ پلیز اسے ضرور شائع کریں۔

عدنان

(سیالکوٹ)

ڈیوٹی

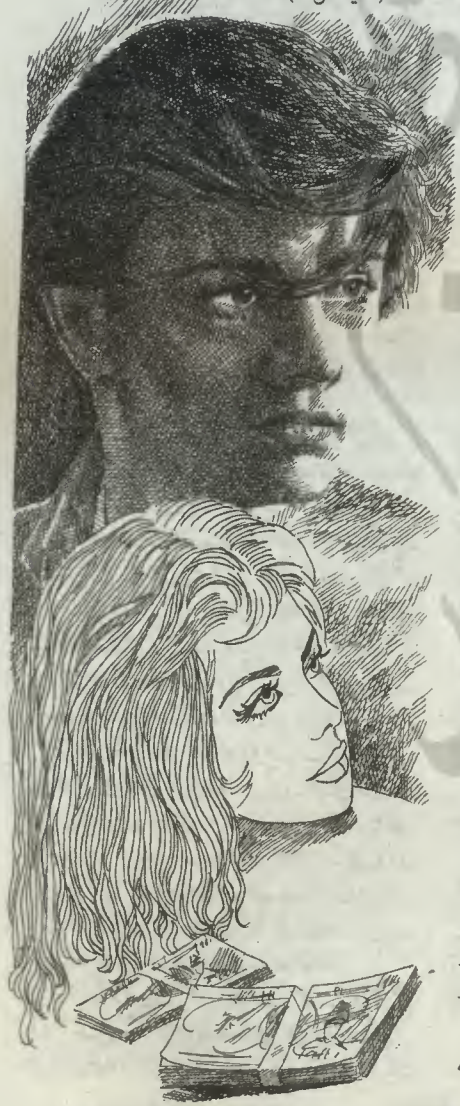

میں نے کتاب کھولی تو اس نے وہ کتاب میرے ہاتھ سے چھین لی۔

میں حیران ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔''یہ آپ کیا کتاب لے کر بیٹھ گئے؟''

''اریبہ، میرا خیال ہے کہ میں تمہارا ٹیوٹر ہوں اور تمہیں ٹیوشن پڑھانے آیا ہوں۔''میں دھیمے لہجے میں بولا۔ ''اور آج یہ میرا پہلا دن ہے۔''

''تو کیا ہوا۔ یہاں کون آپ سے ٹیوشن پڑھنے کے

www.pdfbooksfree.pk

لیے بیٹھا ہے۔"

"تو پھر کس لیے بیٹھی ہو؟"

"آپ سے باتیں کرنے کے لیے۔" اس نے بڑی بے خوفی اور بے باکی سے کہا۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا۔ یہ تم کیسی باتیں کررہی ہو۔"

"ایک سال انتظار کیا ہے آپ کا۔" اس نے بتایا۔

"تب جاکر آج آپ میرے سامنے بیٹھے ہیں۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس گھر میں کتنے ٹیوٹر آئے اور واپس چلے گئے۔"

"ہاں، یہ بات مجھے معلوم ہوچکی ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ لوگ اس لیے نہیں بھاگے کہ انہیں پڑھانا نہیں آتا تھا بلکہ انہیں میں نے بھگایا ہے کیونکہ میں آپ سے پڑھنا چاہتی تھی۔ اسی لیے امی کو بار بار آپ کے گھر بھیجتی تھی۔"

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اس کی امی کئی بار میرے پاس آچکی تھیں کہ میں ان کی بیٹی اریبہ کو پڑھادوں جبکہ میں اس لیے انکار کرتا رہا تھا کہ میرے پاس اور بھی ٹیوشنز تھیں اور اتنا وقت نہیں تھا کہ میں کوئی اور ٹیوشن دیکھ سکوں۔

وہ لوگ میرے ہی محلے میں رہتے تھے یا میں ان کے محلے میں تھا۔ فرق یہ تھا کہ ان کا مکان بہت خوبصورت بنا ہوا تھا جبکہ میرا مکان اپنی اور بجنل حالت میں تھا۔ وہ دراصل کوارٹرز کا سلسلہ تھا۔ سارے کوارٹرز ابتدا میں ایک ہی جیسے تھے لیکن جن کے پاس پیسے آتے گئے انہوں نے پرانی تعمیر توڑ اکر نئے انداز کے گھر بنوالیے۔ چونکہ ہمارے حالات ایسے نہیں تھے اس لیے ہمارا کوارٹر ویسا ہی رہا۔ ہاں اگلے حصے میں تھوڑی بہت تبدیلی ہوگئی تھی لیکن پھر بھی وہ محلے کے دوسروں کوارٹرز کی طرح شاندار نہیں بن پایا تھا۔

والد صاحب کا انتقال ہوچکا تھا۔ اب گھر میں صرف میں تھا، میری چھوٹی بہن تھی اور ماں تھی۔ ہم تین افراد تھے اور میں زندگی کی جدوجہد میں رات دن مصروف رہتا تھا۔ صبح ایک دفتر میں ملازمت اور شام کو ٹیوشنز۔ نہ جانے اس لڑکی نے کب مجھے دیکھا ہوگا اور کب سے اس کے دل میں یہ خواہش ہوگئی کہ وہ اگر پڑھے گی تو مجھ سے ورنہ کسی سے نہیں۔ خدا جانے اس جذبے کا کیا نام ہوسکتا تھا۔

"دیکھو اریبہ۔" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "میں ایک محترم اور باوقار روپ میں تمہارے گھر آیا ہوں یعنی تمہارا استاد بن کر۔ اور یہ بہت مقدس رشتہ ہوتا ہے۔ اس کو ان باتوں سے تباہ نہ کرو۔"

"ارے رہنے دیں۔ آج ایسی باتوں پر کون دھیان دیتا ہے۔ زمانہ بہت بدل گیا ہے سجاد صاحب۔"

"دیکھو، میں تمہارے حوالے سے کسی قسم کی بدنامی نہیں چاہتا۔" میں نے کہا۔ "اگر کسی کو بھی یہ پتا چل گیا میں جہاں پڑھانے جاتا ہوں وہاں کی لڑکیوں سے اس کی باتیں کرتا ہوں تو میری ساکھ خراب ہوجائے گی۔ ٹیوشنز ختم ہوجائیں گی۔ میں ویسے ہی غریب آدمی ہوں۔"

"حد ہوگئی۔ تو یہ باتیں بتانے کون جارہا ہے۔"

"یہ بتاؤ تم مجھ سے چاہتی کیا ہو؟"

"آپ کا پیار۔ آپ کی توجہ۔"

"اریبہ..... تم شاید پاگل ہوگئی ہو۔"

"کچھ بھی سمجھ لیں۔ میں اس سے کم میں سمجھوتا نہیں کرسکتی۔"

"فرض کرو میں نے یہ ٹیوشن چھوڑ دی تو۔"

آپ چھوڑ کر دیکھیں۔ میں ایسا ہنگامہ کھڑا کردوں گی کہ آپ پورے محلے میں تماشا بن جائیں گے۔"

میں نے اندازہ کرلیا کہ اس کے تیور واقعی ایسے ہی ہیں۔ وہ ایسی لڑکی تھی کہ کسی کے ساتھ کچھ بھی کرسکتی تھی اور ایسوں کو بہت حکمتِ عملی کے ساتھ ہینڈل کرنا چاہیے۔ اس لیے میں نے اریبہ سے کہا۔ "ٹھیک ہے اریبہ..... لیکن تم مجھے موقع دوگی کہ میرے بھی دل میں تمہاری محبت پیدا ہوسکے۔ اس کے لیے وقت درکار ہوگا۔ میں تمہیں پڑھانے کے لیے آتا رہوں گا۔ لیکن شرط یہ ہوگی کہ تم مجھ سے پڑھتی بھی رہوگی۔"

"اوکے۔" اس نے میری بات سے اتفاق کرلیا۔ پھر میری طرف دیکھ کر عجیب انداز سے دریافت کیا۔ "ایک بات تو بتائیں۔ آپ مجھے کوئی خراب لڑکی تو نہیں سمجھ رہے۔"

"نہیں تو۔" میں نے جلدی سے گردن ہلادی۔ "تم صرف جذباتی ہو، خراب نہیں ہو۔"

"بالکل یہی بات ہے۔" اس نے کہا۔ "میں ایک پاگل قسم کی لڑکی ہوں۔ میں صرف محبت کرنا جانتی ہوں۔ اس کے علاوہ میرے دل میں اور کوئی بات نہیں اور میں نے آپ سے مذاق نہیں کیا بلکہ محبت کی ہے اور آج سے نہیں برسوں سے۔"

پھر اس نے جو کچھ بتایا اس نے مجھے حیران کردیا تھا۔ وہ جب نویں میں تھی اس وقت سے وہ مجھے پسند کرنے لگی

ہے۔ راستے میں آتے جاتے مجھے دیکھا کرتی۔ ظاہر ہے تھی۔ اس وقت میں نے اس کی طرف دیکھا بھی ہوگا تو دھیان کہاں رہا ہوگا۔ اس محلے میں اور بھی نہ جانے کتنی لڑکیاں ہوں گی۔ بہرحال وہ مجھے دیکھتی رہی اور آہستہ آہستہ میری محبت اس کے دل میں جگہ پاتی گئی۔ وہ یک طرفہ اس محبت میں مبتلا ہوگئی تھی۔ اس کے لیے یہ بہت بڑی بات تھی کہ میں اس کے محلے میں اس کی نگاہوں کے سامنے رہتا تھا۔

وہ کاپیوں پر میرا نام لکھتی رہتی۔ میٹرک کے بعد اس نے کامرس لے لیا تھا۔ یہ سب اس کی پلاننگ کا حصہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ میں بی کام کررہا ہوں اور ٹیوشن پڑھایا کرتا ہوں۔ وہ مجھ سے قریب ہونے کے لیے ٹیوشن کے لیے راستے ڈھونڈنے لگی اور ایک خاص ترکیب سے بالآخر مجھ تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئی یا اس نے اپنی حکمتِ عملی سے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔

میں نے ایسی زبردستی کی محبت کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ اریبہ میں کسی قسم کی کوئی خرابی یا خامی تھی۔ وہ اچھی خاصی خوش شکل لڑکی تھی لیکن اس کا یہ انداز حیرت انگیز تھا۔

سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کس طرح اسے ہینڈل کروں۔ اس نے یہ کہہ دیا تھا کہ میں نے اگر ٹیوشن چھوڑ دی تو وہ میرے لیے مصیبت کھڑی کردے گی اور اس سے کوئی بعید بھی نہیں تھا۔

دوسری طرف یہ خطرہ تھا کہ اگر اس کے گھر والوں کو یا کسی اور کو یہ معلوم ہوگیا تو پھر میرا کیا بنے گا۔ میری کیا پوزیشن ہوگی۔ یہ سب باتیں دل ہولائے دیتی تھیں لیکن اریبہ کو ان باتوں کی پروا ہی نہیں تھی۔ میں جب اس کے پاس ہوتا تو وہ لہک لہک کر مجھ سے باتیں کیا کرتی۔ مجھے دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھتی اور کسی دن میں نہیں جاپاتا تو دوسرے دن باقاعدہ لڑنے لگتی۔

ایک دن اس نے مجھ سے کہا۔ "عدنان، مجھے آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔"

"ہاں کہو۔"

"آپ برا تو نہیں مانیں گے۔" اس نے پوچھا۔

"تم بتاؤ تو سہی کیا بات ہے؟"

"مجھے یہ معلوم ہے کہ آپ کے گھر کے معاشی حالات اچھے نہیں ہیں۔ اس لیے آپ ٹیوشنز پڑھاتے ہیں۔"

"ظاہر ہے لیکن اس سے تمہارا کیا واسطہ؟"

"میں آپ کو کسی چھوٹے موٹے کاروبار کے لیے کچھ رقم دینا چاہتی ہوں۔" اس نے کہا۔

"کیا؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں، میرے پاس پچاس ہزار روپے رکھے ہوئے ہیں وہ آپ لے لیں۔" اس نے کہا۔

یہ بات اب سے دس بارہ سال پہلے کی ہے۔ اس وقت کے پچاس ہزار روپے آج کے حساب سے کم از کم پانچ چھ لاکھ ہوتے تھے۔ "اریبہ اتنے پیسے تمہارے پاس کہاں سے آئے؟"

"کہیں سے بھی آئے ہوں۔ یہ آپ کا دردِ سر نہیں ہے۔" اس نے کہا۔ "ویسے میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ یہ صرف اور صرف میرے پیسے ہیں۔ اس میں کسی اور کا کوئی حق نہیں ہے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تم سے اتنے روپے لے لوں گا۔"

"آپ کو لینے پڑیں گے کیونکہ میں نے قسم کھا رکھی ہے کہ میں یہ پیسے ہر حال میں آپ کو دوں گی۔" اس نے بتایا۔ "اور اگر آپ نے نہیں لیے تو آپ میری ضد سے واقف ہیں۔ میں چھت سے کود کر اپنی جان دے دوں گی۔"

میں پریشان ہوگیا۔ کیا وہ لڑکی میرا امتحان لے رہی تھی یا مجھے بے وقوف بنا رہی تھی۔ خدا جانے اس کے دل میں کیا بات تھی۔ میں نے اس وقت یہ سوچا کہ اس کے والدین کو اس صورتِ حال سے آگاہ کردیا جائے تو بہتر ہوگا لیکن ایسا محسوس ہوا جیسے اریبہ نے میرے خیالات پڑھ لیے ہوں۔ اس لیے وہ چمک کر بولی۔ "دیکھیں عدنان، آپ میرے والدین کو یہ سب نہیں بتائیں گے۔"

"تمہیں کیسے اندازہ ہوا۔"

"آپ کے تاثرات بتا رہے ہیں۔" اس نے کہا۔ "اگر آپ نے ایسا کیا تو شاید آپ کا تو کچھ نہیں بگڑے لیکن میں اپنی جان سے چلی جاؤں گی۔ میرے لیے سوائے موت کے اور کوئی راستہ نہیں ہوگا۔"

"یہ تم ہر وقت موت موت کیوں کرتی رہتی ہو۔"

"اس لیے کہ میں جس راہ پر چل نکلی ہوں اس پر زندگی نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔" اس نے کہا۔ "اس بار اس کے لہجے میں بے پناہ اداسی اور دکھ تھا۔ "میں خوب اچھی طرح جانتی ہوں کہ اس جنونی محبت کا انجام کیا ہونے والا ہے لیکن میں مجبور ہوں۔ میں اپنے آپ کو روک نہیں سکتی اور

www.pdfbooksfree.pk

روکنا بھی نہیں چاہتی۔"

"اریبہ...... میں ایک بار پھر تم سے پوچھ رہا ہوں کہ تم چاہتی کیا ہو؟"

"محبت۔" اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ اس وقت وہ ایک سرشاری کی کیفیت میں تھی۔ "بس مجھے آپ کی محبت کے سوا اور کچھ نہیں چاہئے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے کہ ہم کبھی ایک ہوسکیں گے؟"

"نہ ہوں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" اس نے کہا۔ "محبت کو نفع ونقصان کی پروا نہیں ہوتی۔ اس کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ ہم نہ بھی مل سکے تو بھی محبت تو قائم رہے گی نا۔"

"خدا جانے تم نے ایسی باتیں کہاں سے سیکھ لی ہیں۔"

"خود محبت سے۔" اس نے کہا۔ "یہ محبت سب سے بڑی استاد ہے۔"

"دیکھو، تمہارے اپنے خاندان میں تمہارے اردگرد نہ جانے کتنے نوجوان ہوں گے جو مجھ سے زیادہ خوبصورت اور جن کے حالات مجھ سے کہیں بہتر ہوں گے۔ اس لیے تم......"

اس نے اچانک میری بات کاٹ دی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ وہ بھر کر بولی۔ "کیا خیال ہے آپ کا۔ کیا میں صرف اس لیے اپنی محبت کا گلا گھونٹ دوں کہ آپ کے مالی حالات اچھے نہیں ہیں۔ ایسا کبھی سوچیے گا بھی نہیں۔"

وہ لڑکی مجھے حیران کیے جارہی تھی۔

کئی دنوں کے بعد اس نے پھر پیسوں کی بات چھیڑ دی۔ "آخر آپ مجھ سے پیسے لے کیوں نہیں رہے۔ آپ یقین کریں کہ اگر آپ نے انکار کیا تو یہ سارے نوٹ کسی کنویں میں پھینک دوں گی۔"

میں نے پھر کسی طرح اسے ٹالنے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی بات پر اڑی رہی اور بالآخر میں نے اس سے وعدہ کر ہی لیا "ٹھیک ہے، میں تم سے پیسے لے لوں گا لیکن ایک ہفتہ ٹھہر جاؤ۔"

"وہ کیوں؟"

"میں اپنے طور پر یہ سوچ لوں کہ مجھے ان پیسوں سے کیا کاروبار کرنا چاہئے۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ مطمئن ہوگئی۔ "آپ اچھی طرح دیکھ لیں۔"

اب میں ایک نازک موڑ پر... آکھڑا ہوا تھا۔ میری عزت داؤ پر بھی لگ سکتی تھی۔ میں اس سلسلے میں اپنی ای سے بھی مشورہ نہیں لے سکتا تھا۔ وہ نہ جانے اریبہ کے گھر جا... کیا کہہ دیتیں اور وہ پاگل لڑکی ممکن تھا کہ اپنی جان پر... کھیل جاتی۔ میں نے اتنے دنوں میں یہ اندازہ لگالیا تھا... وہ عام لڑکیوں سے بہت مختلف ہے۔ اس میں ایک پُراسرا... سی کشش تھی۔

کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ وہ مجھ سے... سیریس ہوگئی تھی لیکن وہ بات کیا ہوسکتی تھی وہ میں نہیں جان... سکا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں نعمت اللہ صاحب سے مشو... لینے کا ارادہ کرلیا۔

نعمت اللہ صاحب میرے ابو کے جاننے والے تھے... وہ ایک دانش ور بھی تھے اور ساتھ ہی روحانیت کے مرتبے... بھی فائز تھے۔ ابو کے حوالے سے مجھ سے بہت پیا... کرتے تھے۔ میں کبھی کبھی ان کے پاس جاکر بیٹھ جایا... تھا۔ ان کی محفل میں ادیبوں، شاعروں، دانش وروں اور اہلِ تصوف کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ ادب، فلسفے اور روحانیت سے لے کر ہر موضوع پر باتیں ہوا کرتیں۔

ان سے مشورہ لینے میں کوئی قباحت نہیں تھی۔ مجھے امید تھی کہ وہ ایسا مشورہ دے سکتے ہیں جو میرے لیے سود... مند ہو۔ ان سے کوئی تکلف بھی نہیں تھا۔ میں بہت آزادی سے انہیں اریبہ کے بارے میں بتا سکتا تھا۔

بہر حال جب میں ان سے ملنے پہنچا تو وہ مجھے دیکھ... خوش ہوگئے۔ "صاحب زادے خیریت سے تو ہو۔ اس... طرح کہاں غائب ہوجاتے ہو۔"

"جناب بس مصروفیت کی وجہ سے آنا نہیں ہوا۔" میں نے بتایا۔ "غمِ روزگار آنے جانے کی فرصت نہیں دیتا۔"

"یہ بھی ایک عبادت ہے میاں اور بہت بڑی عبادت۔" انہوں نے کہا۔ "خیر تم بیٹھو، تم سے ابھی باتیں ہوں گی۔"

میں ایک طرف مودب بیٹھ کر ان کی باتیں سننے لگا۔ اس وقت وہ لوگ کسی ادبی واقعے کا ذکر کررہے تھے۔ مشاعرہ ہورہا تھا۔ ایک صاحبزادے تشریف لائے اور ضد کرنے لگے کہ انہوں نے بھی ایک شعر کہا ہے اور وہ اسے سنانا چاہتے ہیں۔ لوگوں نے کہا میاں تم ابھی بچے ہو، تم جاؤ۔ لیکن وہ جب زیادہ ضد کرنے لگے تو انہیں شعر سنانے کی اجازت دے دی گئی۔

اس بچے نے اپنا شعر سنایا اور وہ شعر ایسا تھا کہ جب تک اردو زبان زندہ ہے وہ شعر زندہ رہے گا۔ وہ شعر تھا۔

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

یہ تھا وہ واقعہ جو نعمت اللہ صاحب کے سامنے سنایا گیا ...نعمت اللہ صاحب نے اس پر تبصرہ کیا۔ "آپ لوگ ...تے ہیں کہ اس واقعے نے ہمیں کیا بتایا ہے۔ اس صاحب ...ے کا اسی سال انتقال ہوگیا تھا۔ یعنی اس صاحبزادے کو ...کی طرف سے یہ ڈیوٹی دی گئی تھی کہ وہ دنیا میں جائے۔ ...شعر کہے اور اپنی ذمے داری پوری کرکے واپس ...ئے۔ تو اس نے اپنی یہ ذمے داری نبھادی تھی۔"

اس تبصرے کے بعد اور بھی واقعات بتائے گئے کہ ...طرح فلاں شخص نے فلاں کام کیا اور اس کے بعد مرگیا ...وہ اپنی ڈیوٹی انجام دے چکا تھا۔

ان حضرات کے درمیان بحث ہوتی رہی۔ مجھے چونکہ ...رہی تھی اس لیے میں نے نعمت اللہ صاحب سے ...ت طلب کرلی۔ "بیٹے، تم ایک دو دن بعد میرے پاس ...ور آنا۔" انہوں نے کہا۔

"جی ہاں، ضرور حاضر ہوں گا۔"

"میں گھر واپس آگیا۔ اریبہ والے مسئلے کا اب تک ...کا حل سامنے نہیں آیا تھا۔

میں اب خود بھی آہستہ آہستہ اس کی محبت کو اپنے دل ...میں محسوس کرنے لگا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ حالات نے کبھی ...طرح مجھے سوچنے کی اجازت نہیں دی تھی لیکن میں انسان ...تھا۔ میرے اپنے بھی جذبات ہوسکتے تھے۔

اور ایک لڑکی جب اس طرح والہانہ محبت کررہی ہو تو ...اس کا اثر تو ہونا ہی تھا۔ اریبہ مجھے بے پناہ متاثر کرنے لگی ...تھی۔ میں نے اس دوران میں دیکھ بھی لیا تھا کہ وہ فلرٹ ...کر رہی تھی اور نہ ہی مذاق کررہی تھی۔ وہ واقعی مجھ سے عشق ...کرنے لگی تھی۔

ان سب کے باوجود اس کی وہ تسکین مجھ سے ہضم نہیں ...ہورہی تھی۔ کسی بھی وقت کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ میں مشورے ...کے لیے نعمت اللہ صاحب کے پاس گیا تو تھا لیکن ان سے ...بات کرنے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ ...پھر جاؤں گا ان کے پاس لیکن اس دوران میں ایک اور ...واقعہ ہوگیا۔

اریبہ نے مجھ سے کہا۔ "عدنان صاحب، آج آخری ...دن ہے۔ کل میں اپنے پچاس ہزار کے نوٹوں کو جلارہی ...ہوں۔ اگر آپ نے نہیں لیے تو میں اپنی دُھن کی پکی لڑکی ہوں اور آپ جانتے ہیں کہ میں یہ کرگزروں گی۔"

اس بے وقوف لڑکی کے پیسوں کو بچانے کے لیے میں نے فوراً ہاں کردی۔ "ٹھیک ہے، تم مجھے پیسے دے دینا۔"

اور اس وقت میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر خوشی کا ایسا تاثر آگیا تھا جیسے میں نے اسے دنیا بھر کی دولت دے دی ہو۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ مجھ سے لپٹ جاتی۔ یہ عجیب بات تھی۔ میں اسے دے نہیں رہا تھا، اس سے لے رہا تھا اور اس کا یہ حال تھا کہ وہ خوشی سے نہال ہوئے جارہی تھی۔

وہ اسی وقت دوڑتے ہوئے اندر چلی گئی۔ بہر حال میں نے یہ سوچا تھا کہ وقتی طور پر اس کے پیسے رکھ لوں گا۔ اس کے بعد کسی بہانے اسے واپس کردوں گا یا اس کے والدین کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کردوں گا۔ اسی طرح میں اپنے فرض سے سبکدوش ہوسکتا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ اندر سے ایک پوٹلی لے کر آگئی۔ "یہ لیں۔" اس نے وہ پوٹلی میرے سامنے رکھ دی۔ "اس میں

احمد شاہ پطرس بخاری

اصل نام احمد شاہ اور قلمی نام پطرس بخاری۔ یکم اکتوبر 1898ء کو پشاور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم پشاور ہی میں حاصل کی۔ والد کا نام سید اسد اللہ شاہ تھا۔ پطرس بخاری اعلیٰ درجے کے مزاح نگار تھے۔ انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی میں ایم اے کیا "راوی" میگزین کے ایڈیٹر رہے۔ انگریزی میگزین "سول اینڈ ملٹری گزٹ" میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ عمانویل کالج کیمرج سے انگریزی ادبیات کا امتحان پاس کیا۔ 1937ء میں آل انڈیا ریڈیو سے منسلک ہوئے پھر ترقی کرتے ہوئے کنٹرولر جنرل بن گئے۔ اسی دوران نشر واشاعت اور پبلسٹی کے کئی کام سرانجام دیے۔ 1950ء میں وزیراعظم لیاقت علی خان کے ساتھ امریکا گئے کچھ عرصہ بعد اقوام متحدہ کا نمائندہ مقرر کردیا گیا۔ 1955ء میں اقوام متحدہ کے شعبۂ اطلاعات میں ڈپٹی سیکریٹری جنرل مقرر کردیا گیا۔ اس کے منصب پر فائز ہونے والے پہلے ایشیائی تھے 5 دسمبر 1958ء کو نیویارک میں حرکتِ قلب بند ہونے سے انتقال کرگئے۔

مرسلہ: حبیب الرحمٰن
سینٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور

www.pdfbooksfree.pk

پورے پچاس ہزار ہیں۔ اور ہاں ایک بات بتادوں، آپ اسے واپس کرنے کی مت سوچیے گا اور ایک بار پھر کہہ رہی ہوں کہ اگر آپ نے کسی کو بھی بتایا تو وہ میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔ میں چھت سے کود کر یا زہر کھا کر اپنی جان دے دوں گی۔"

"آخر تم کس قسم کی لڑکی ہو اریبہ۔"

"پاگل اور جنونی ہوں۔ بس ایک محبت کر لی ہے اور اس محبت کو اپنی آخری سانسوں تک نبھانا چاہتی ہوں۔"

میں جان گیا تھا کہ اریبہ اپنے روپے واپس نہیں لے گی۔ اس نے پچاس ہزار میرے حوالے کر دیے ہیں۔ خدا جانے یہ کیسا جذبہ تھا جس کی کوئی توجیہہ پیش نہیں کی جاسکتی تھی۔

کئی دنوں تک سوچنے کے بعد میں نے ان روپوں سے کاروبار کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس زمانے کے پچاس ہزار خاصی بڑی رقم ہوا کرتی تھی اور کوئی باعزت کاروبار کیا جاسکتا تھا۔

لہٰذا میں نے دوسرے محلے میں جا کر کرائے پر ایک دکان لی اور اس میں ایک جنرل اسٹور کھول لیا۔ میں نے اس اسٹور کا نام اریبہ اسٹور رکھا تھا اور اس کی دیکھ بھال اور اسے چلانے کے لیے اعتماد کا ایک آدمی بھی رکھ لیا تھا۔ میں نے جب یہ خبر اریبہ کو سنائی تو وہ خوشی سے نہال ہوگئی تھی۔

"ہاں، یہ آپ نے عقل مندی کی۔ اب آپ کے حالات بدل جائیں گے۔"

"میں نے ایک دوسری عقل مندی بھی کی ہے۔" میں نے بتایا۔

"وہ کیا؟"

"اس اسٹور کا نام اریبہ جنرل اسٹور ہے۔"

"کیا......!" وہ اور خوش ہوگئی تھی۔ "آپ نے ایسا کیوں کیا؟"

"اس لیے کہ وہ اسٹور تمہارا ہے اریبہ۔" میں نے کہا۔ "اس میں جو کچھ بھی ہے وہ تمہاری امانت کے طور پر رکھا ہوا ہے اور جب تم چاہو اپنی امانت مجھ سے واپس لے سکتی ہو۔"

"نہیں، اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔" اس نے جذباتی ہو کر میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔

پتا نہیں ایسی باتوں سے اس کا کیا مطلب تھا۔

بہرحال وہ مجھ سے پوچھتی رہتی تھی کہ اسٹور کیسا چل رہا ہے اور جب میں اسے بتاتا کہ بہت کامیاب جارہا ہے تو وہ خوش ہوجاتی۔

اور یہ سچ بھی تھا۔ اسٹور بہت کامیابی سے چل رہا تھا۔ گاہکوں کا سلسلہ بندھا رہتا تھا۔ مجھے اسٹور میں کام کرنے کے لیے دو لڑکے رکھنے پڑے تھے اور شاید یہ اس کی بے پناہ محبت اور اس کے خلوص کا نتیجہ تھا کہ دو مہینوں بعد میں نے برابر والی دکان بھی حاصل کرلی تھی اور دو دکانوں کو ایک کر دیا گیا تھا۔ اب وہ واقعی ایک بڑی ... بن گئی تھی۔

گھر کے حالات بہت تیزی سے بدلنے لگے تھے۔ یہ سب ایک پاگل اور جنونی لڑکی کی محبت کی وجہ سے ہوا تھا۔ جسے میں صرف ٹیوشن پڑھانے گیا تھا لیکن اس نے ... پر اور میرے دل پر اپنی حکمرانی قائم کرلی تھی۔ اس نے ... ایسا سہارا دیا تھا جس کا میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔

بہرحال میرے دل میں اس لڑکی کی محبت اور زیا... ہوگئی تھی۔

اور ایک دن اچانک زندگی چلتے چلتے رک گئی۔

سب کچھ ٹھیک جارہا تھا۔ اریبہ کی بے پناہ محبت مجھے مکمل طور پر اپنے حصار میں لے لیا تھا کہ اچانک ایک رات مجھے پتا چلا کہ وہ اسپتال میں ایڈمٹ ہوگئی ہے، اس ... حالت ٹھیک نہیں ہے۔

میں پاگلوں کی طرح دوڑتا ہوا اسپتال پہنچ گیا۔ و... اس کے ماں باپ اپنی روتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ مو... تھے۔ "وہ تم ہی کو یاد کررہی ہے۔" اس کی ماں نے بتایا۔

"آخر ہوا کیا ہے۔" میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"اپینڈکس" اس کی ماں نے کہا۔ "اس کا اپینڈ... پھٹ گیا ہے۔ اس پاگل لڑکی نے سب کچھ چھپائے رکھا۔ ... کے درد تو اکثر ہوتا رہتا تھا لیکن اس نے کبھی توجہ نہیں دی۔ ... سمجھ میں نہیں آتا کہ اس نے ایسی بے پروائی کی کیوں۔"

میں اس کمرے میں چلا گیا جہاں وہ لیٹی ہوئی تھی۔ اس وقت وہ ہوش میں تو تھی لیکن جیسے اس کے بدن سے لہو نچوڑ لیا گیا ہو۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ آگئی۔ "اریبہ یہ کیا ہوا۔" میں بے تاب ہو کر اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس وقت مجھے اس کی پروا نہیں تھی کہ اس کے گھر کے لوگ بھی اس کمرے میں موجود تھے۔ "بتاؤ اریبہ، یہ سب تم نے کیوں کیا؟"

"بس ایسا تو ہونا ہی تھا۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"بس آپ سے ایک بات کہنا ہے۔"

"ہاں کہو۔"

www.pdfbooksfree.pk

''آپ پھر وعدہ کریں کہ آپ کسی کو بھی ان روپوں کے بارے میں نہیں بتائیں گے۔''

''ہاں، میں نہیں بتاؤں گا لیکن تم بہت جلد ٹھیک ہوجاؤ گی۔''

اس وقت اس کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ نمودار ہوگئی جیسے وہ دنیا کی بے ثباتی کا مذاق اُڑا رہی ہو۔ میں کچھ دیر تک اس کے پاس بیٹھا رہا پھر آنکھوں میں آنسو لیے اس کے کمرے سے باہر آ گیا۔

ڈاکٹروں نے یہ بتایا تھا کہ اس کی حالت سیریس ہے۔ اپینڈکس کا پھٹ جانا کوئی معمولی بات نہیں ہوتی اور یہ مرض اسے یقیناً بہت دنوں سے ہوگا لیکن نہ جانے کیوں اس نے برداشت کیے رکھا اور کسی کو اپنی تکلیف کی خبر بھی نہیں ہونے دی اور جب درد کی شدت سے بے ہوش ہوگئی تو پھر گھر والے اسے اٹھا کر اسپتال لے آئے تھے لیکن بہت دیر ہوچکی تھی۔

دوسرے دن اس کا انتقال ہوگیا۔

میں سن ہوکر رہ گیا تھا۔ شاید اس کے گھر والوں کو اس کی موت کا اتنا دکھ نہ ہوا ہوگا جتنا مجھے ہوا تھا۔ وہ میری محبت تھی اور محبت بھی ایسی کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔

ہم کبھی ایک دوسرے کے ساتھ باہر نہیں گئے۔ کسی ہوٹل، کسی پارک میں نہیں ملے۔ ایک دوسرے سے محبت بھری باتیں نہیں کیں۔ ان میں سے کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا۔ پھر بھی یہ محبت تھی اور وہ بھی ایسی کہ جس قسم کی محبت کی صرف داستانیں سنی جاتی ہیں۔ وہ لڑکی محبت نہیں بلکہ اپنے عشق کی انتہا پر تھی اور انتہا موت ہی ہوا کرتی ہے سو وہ بھی مرگئی۔

میں کئی مہینوں تک سوگوار رہا۔ پھر میں نے اس کی نشانی میں اپنا دل لگالیا۔ یعنی اریبہ جنرل اسٹور اور وہ ترقی کرتا چلا گیا۔ میں نے اس اسٹور سے پھر ایک ہوٹل بھی کھول لیا تھا۔ جس کا نام بھی اریبہ کافی ہاؤس تھا۔

اب معیارِ زندگی بالکل بدل چکا تھا۔ اس زمانے میں میرے پاس ایک گاڑی آ گئی تھی۔ کافی ہاؤس کے بعد میں نے ہوزری کے کام میں ہاتھ ڈالا اور اس میں بھی کامیابیاں ملنے لگیں۔

پھر ایکسپورٹ امپورٹ اور نہ جانے کیا کیا۔ یہ سب تو بعد میں ہوا تھا لیکن اس کی ابتدا اریبہ جنرل اسٹور ہی سے ہوگئی تھی۔ ایک دن میں پھر موقع نکال کر نعمت اللہ صاحب کے پاس پہنچ گیا تھا اور وہ اس دن اکیلے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرائے۔ ''قبلہ! میں بہت بے چین ہوکر آپ کے آیا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''خدا تمہاری بے چینیاں دور کرے۔'' وہ دھیر سے بولے۔ ''تم بتاؤ کیا بات ہے۔''

میں نے انہیں اریبہ، اس کی محبت، اس کی تر اس کی موت اور اپنے کاروبار کی ترقی کے بارے میں کچھ بتا دیا تھا۔ ''اب فرمائیں جناب، میں کس طرح حاصل کروں، کیا کروں میں۔ آخر اس نے میرے ایسی نیکی کیوں کی۔ اتنی شدید محبت کیوں کی۔ پھر جلدی مرکیوں گئی؟''

''ان تمام سوالوں کے جواب بہت آسان نعمت اللہ صاحب نے کہا۔ ''مجھے بہت اچھی طرح کہ اس بار جب تم یہاں آئے تھے تو ایک ایسے بارے میں گفتگو ہورہی تھی جس نے وہ شعر کہا تھا۔ ''دل پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے۔''

''جی جناب، بہت اچھی طرح یاد ہے۔ پھر اس موت واقع ہوگئی تھی۔''

''جانتے ہو کیوں؟ اس لیے کہ اس نے اپنی ڈیو پوری کردی تھی۔'' نعمت اللہ صاحب نے کہا۔ ''خدا نے صرف اس ڈیوٹی کے لیے زمین پر بھیجا تھا کہ وہ جا پوری دنیا کو اس شعر کا تحفہ دے اور واپس آ جائے۔ یہی کیفیت اس بچی کی تھی۔ خدا اس کی مغفرت فرمائے۔ کی بھی یہی ڈیوٹی تھی کہ وہ پیدا ہو، بڑی ہو۔ تم سے کرے اور تمہاری زندگی سنوار کر واپس چلی جائے۔ نے اپنی ڈیوٹی پوری کردی تھی اس لیے وہ واپس چلی گئی۔''

میری آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ میری میں سب کچھ آ گیا تھا۔ وہ معصوم لڑکی اس ڈیوٹی کے لیے میں آئی تھی۔ صرف میرے لیے اور میری ترقی کے لیے اس نے اپنا کام کر دکھایا تھا اور اب مجھے اس سے وفا نبھا تھی، سو وہ وفا آج تک نبھا رہا ہوں۔ میں نے اس کی محبت کو اپنے سینے سے لگا کر رکھا ہے۔ میرا سارا کاروبار اسی نام پر ہے۔ اریبہ بزنس گروپ ہے میرا۔ میری بیوی یہ پوچھتی ہے کہ اریبہ کون ہے تو میں مسکرا کر خاموش ہوجاتا ہوں۔ ہاں، میں نے اپنی بچی کا نام اریبہ رکھا ہے۔ میں اس سے بے پناہ محبت کرتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ میری محبت کا یہ سفر جاری ہے۔

چور

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم
ایک پرانا واقعہ کہانی کی شکل میں بھیج رہی ہوں۔ امید ہے پسند آئے گا۔ اگر پسند آجائے تو شائع ضرور کریں۔

آصفہ ضیا احمد
(حیدر آباد)

جس طرح پتھر پر کندہ کی ہوئی عبارت کو کوئی نہیں مٹا سکتا اسی طرح زندگی میں کچھ واقعات اس طرح رونما ہوتے ہیں جو ہمیشہ کے لیے ذہنوں پر ثبت ہوکر انمٹ نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔

یہ واقعہ میری عزیز ترین دوست تہنیت سے تعلق رکھتا ہے۔ ہم دونوں کا بچپن ساتھ ہی گزرا اور پھر اسکول اور کالج میں بھی ہم دونوں ہر وقت ساتھ ساتھ ہوتے اس لیے کالج میں کوئل کی جوڑی کے نام سے پکارے جاتے تھے۔

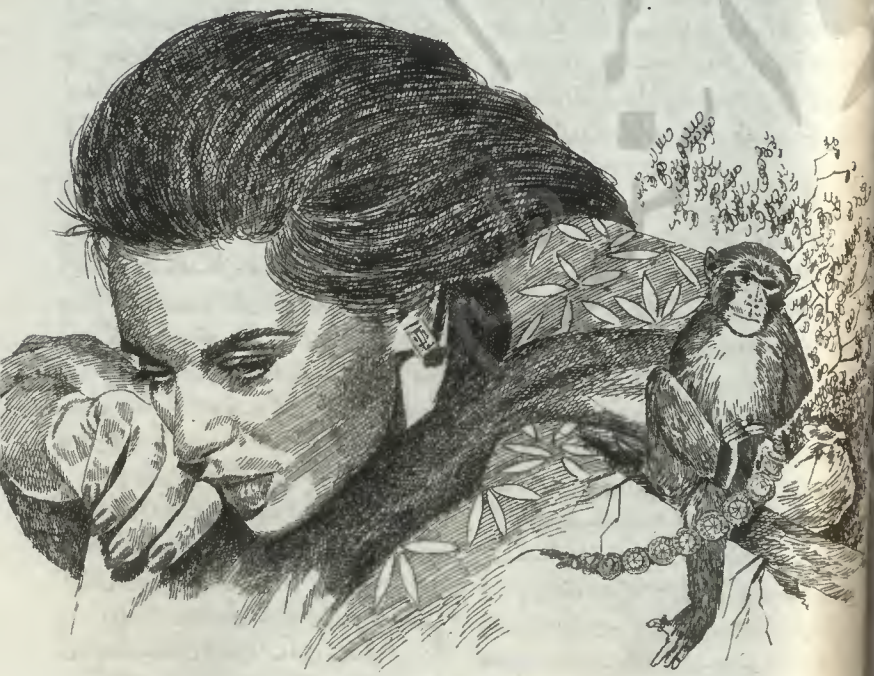

www.pdfbooksfree.pk

میرا تعلق ایک آسودہ حال گھرانے سے تھا جبکہ تہنیت کے والد کسی دفتر میں کلرک تھے۔ ان کا خاندان کل پانچ افراد پر مشتمل تھا۔ تہنیت کے والدین، خود تہنیت اور اس کے دو چھوٹے بھائی سرمد اور سعد، تہنیت کے والد جو کہ جیلانی صاحب کے نام سے پکارے جاتے تھے نہایت نیک اور شریف انسان تھے۔ یہی حال تہنیت کی والدہ کا بھی تھا وہ نہایت سادہ، سلیقہ مند اور کفایت شعار خاتون تھیں۔ خود بھی گھر میں سلائی اور کشیدہ کاری کرکے اتنا پیسا پس انداز کرلیتی تھیں کہ وقتِ ضرورت کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے۔ تہنیت اور اس کے دونوں بھائیوں کا تعلیمی ریکارڈ بہت اچھا تھا اور حالات کے پیشِ نظر تینوں نے محلے کے بچوں کو ٹیوشن پڑھانا شروع کیا اور درس و تدریس کا یہ سلسلہ بڑا کامیاب رہا۔ تینوں بہن بھائی بڑی محنت اور لگن سے بچوں کو پڑھاتے تھے اس لیے روز بروز بچوں کی تعداد بڑھنے لگی اور اس طرح اس کنبے کی معاشی حالت کافی بہتر ہوگئی۔

میں اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی اور خاندان بھر کی لاڈلی تھی کیونکہ ہمارے خاندان میں ماشاءاللہ بیٹے تو سب کے تھے مگر بیٹیوں کی بہت کمی تھی۔ میرے تایا، چچا اور پھوپیوں کے بہت سارے بیٹوں میں اکیلی بہن تھی اس لیے سب ٹوٹ کر چاہتے تھے۔ جیسے ہی میں نے B.SC کیا میرے تایا ابو اور تائی امی بہاولپور سے ہمارے گھر آن دھمکے۔ ویسے تو وہ ہمیشہ آتے جاتے رہتے تھے لیکن اس بار وہ محض ملاقات یا ملنے ملانے کی غرض سے نہیں آئے تھے بلکہ اپنے اکلوتے بیٹے سفیان کا رشتہ لے کر آئے تھے اور مجھے اپنی بہو بنانا چاہتے تھے۔ لیکن میرے والد نے انہیں صاف صاف جواب دے دیا کہ میں اپنے جگری دوست کے بیٹے کے ساتھ اپنی بیٹی کا رشتہ طے کرچکا ہوں۔ مصروفیت کی بنا پر میں آپ لوگوں کو بتا نہیں پایا پھر سوچا کہ وقت آنے پر خود ہی سارے خاندان کو علم ہوجائے گا۔ بہرحال میں معذرت چاہوں گا۔

تایا ابو میرے ابو کے جواب پر سخت برہم ہوئے۔ تائی امی بھی شاکی لہجے میں گویا ہوئیں۔ ”آپ لوگوں نے سگے بھتیجے کے ہوتے ہوئے دوست کے بیٹے کو ترجیح دی۔ یہ امید نہیں تھی آپ لوگوں سے۔“

ابو اور امی نے خاموشی اختیار کی کیونکہ اسی میں دونوں کی عافیت تھی۔ ماحول میں کافی گرما گرمی پیدا ہوگئی تھی۔

ابو دراصل تایا ابو کے مزاج سے خائف رہتے تھے۔ حقیقی بھائی تھے اس لیے انہیں علم تھا کہ تایا ابو کا جب پارا چڑھتا تو پھر انہیں سنبھالنا مشکل ہوجاتا تھا اور اس وقت بھی یہی ہوا، ابو کی زبان سے انکار سن کر وہ ایک دم چراغ پا ہوگئے اور اب وہ مزید قیام کے لیے تیار نہیں تھے۔ حالانکہ میری اور امی کی بہت کوشش تھی کہ وہ لوگ کچھ دن اور ٹھہرتے۔ مگر کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ شوہر کا اشارہ پاکر تائی امی اپنا سامان سمیٹنے لگیں اور ہم لوگ خاموش تماشائی بنے دیکھتے رہے۔ اس روز موسم بڑا خوشگوار ہو رہا تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ لیکن میرے دل کا موسم اس وقت بہت خراب ہو رہا تھا کیونکہ امی اور ابو کے بعد اگر میں کسی کو چاہتی تھی تو وہ تھے تایا ابو اور تائی امی اور سفیان بھائی کو تو میں اپنا حقیقی بھائی سمجھتی تھی۔ اس لیے ابو کے انکار کی وجہ سے میں خوش اور مطمئن تھی۔ اچانک موسم نے رنگ دکھانا شروع کیا اور بادلوں کی رم جھم شروع ہوگئی اور پھر موسم کی پہلی بارش ہوگئی۔ اسی اثنا میں تہنیت پانی میں شرابور اپنے چھوٹے بھائی سعد کے ساتھ داخل ہوئی۔ دونوں دراصل بازار جا رہے تھے کہ بارش نے آلیا۔ پانی میں تربتر حواس باختہ سے جب دونوں میرے گھر میں داخل ہوئے تو سامنے ہی تخت پر تائی امی بیٹھی ہوئی تھیں۔ جیسے ہی ان کی نظر تہنیت پر پڑی تو نگاہیں وہیں جم کر رہ گئیں اور مجھے بے اختیار یہ شعر یاد آگیا۔

تم کو دیکھا تو نظریں یہ کہنے لگیں
ہم کو چہرے سے ہٹنا گوارا نہیں

یہ بات میں آپ کو بتانا ہی بھول گئی کہ تہنیت کافی خوش شکل اور خوبصورت نقوش کی مالک تھی۔ اور پھر سب کچھ اچانک ہوگیا۔ تائی امی نے تایا ابو کو فوراً رام کیا کہ آپ کی بھتیجی نہ سہی اس کی سہیلی کیا بری ہے۔ کیوں نہ ہم اسے اپنی بہو بنالیں لیکن تایا ابو کو جب تہنیت کے معاشی حالات کا علم ہوا تو وہ اس رشتے کے لیے قطعی تیار نہ تھے کیونکہ سب کو اس بات کا علم تھا کہ تایا ابو اپنے سے چھوٹے لوگوں سے ملنا جلنا بھی پسند نہیں کرتے تھے تو پھر بھلا رشتے داری کس طرح قائم کرتے۔ لیکن تائی امی کی ضد کے آگے ان کی ایک نہ چل سکی اور سفیان بھائی کی مرضی معلوم کرنے کے بعد یہ رشتہ آناً فاناً طے پاگیا اور پھر چٹ منگنی پٹ بیاہ کے مصداق تہنیت میری بھابی بن کر تائی اماں کے گھر آگئی۔ یہ سب کچھ تو ہوگیا لیکن

میرے ابو اس رشتے کے سخت خلاف تھے۔ انہوں نے امی سے یہی کہا کہ تہنیت کے والدین کو منع کریں اس رشتے کے لیے۔ لیکن امی چڑھ گئیں اور انہوں نے تیز لہجے میں کہا ”آخر سفیان میں کیا خرابی ہے؟“ ابو نے متانت سے کہا۔

”سفیان تو ہیرا ہے لیکن بھائی کا تمہیں پتا ہے وہ دولت کے دلدادہ ہیں اور اس لحاظ سے تہنیت کا گھرانا ان کے ترازو میں نہ تُلے گا اور یہ سیدھے سادے شریف لوگ ان کا مقابلہ نہ کرپائیں گے۔“ لیکن امی نے ابو کی ایک نہ سنی اور بڑھ چڑھ کر اس کارِ خیر میں حصہ لیا۔

میں بھی بہت خوش تھی۔ تائی امی کے ساتھ مل کر شادی کی ساری شاپنگ میں نے ہی کروائی۔ تایا ابو بھی وقت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے خواتین کے سامنے خاموش ہی رہے۔ اس طرح تہنیت کی شادی ہوئی اور اس کے کچھ عرصے بعد میں بھی پیا دیس سدھاری۔

یادش بخیر میں آپ کو بتا ہی چکی ہوں کہ ہم دونوں بچپن سے ہی ایک جان دو قالب تھے اور اب تو رشتے داری بھی قائم ہوگئی تھی۔ وہ جب بھی سفیان بھائی کے ساتھ میکے آتی تو پہلے میرے والدین سے آکر ملتی اور پھر اپنے والدین اور بھائیوں سے ملنے جاتی۔ فون اور موبائل سے بھی ہم دونوں گھنٹوں باتیں کرتے۔ سسرال سے اسے کوئی شکایت نہیں تھی بس دبے دبے الفاظ میں اس نے مجھے یہ ضرور بتایا کہ تایا ابو کسی امیر کبیر بہو کے خواہش مند تھے اور وقتاً فوقتاً اپنا غصہ کبھی بیوی پر اور کبھی بیٹے پر نکالتے رہتے ہیں اور جب دونوں پر بس نہیں چلتا تو تختۂ مشق بیچاری تہنیت بنتی تھی۔ وہ خسر کا احترام تو بہت کرتی تھی مگر ان کے سائے سے بھی ڈرتی تھی۔

تایا ابو ریٹائرڈ فاریسٹ آفیسر تھے۔ جانور پالنے کا تو انہیں دیوانگی کی حد تک شوق تھا۔ بقول تائی امی، انسانوں سے تو ڈھنگ سے بات کرتے نہیں اور جانوروں کو یوں گلے لگاتے ہیں جیسے وہ ان کے اپنے ہوں۔ تایا ابو کا لان بھانت بھانت کے جانوروں سے بھرا پڑا تھا۔ جب بھی میں تایا ابو کے گھر جاتی تو ان کے رنگ برنگے جانوروں سے مل کر بہت مزہ آتا۔ خاص طور سے ان کا پالی ہوئی ایک بندریا مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔ اس کی خاصیت یہ تھی کہ وہ ہر کسی کی اتنی صحیح نقل اتارتی تھی کہ عقل حیران رہ جاتی تھی۔ بندریا عموماً ایک زنجیر سے بندھی رہتی اور زنجیر کو درخت کے تنے سے باندھ دیا جاتا۔ تایا ابو کے حکم پر کبھی کبھی اسے آزاد

آئزن ہاور، ڈوائٹ ڈیوڈ

1890-1969ء امریکی جنرل اور مدبر، امریکا کے 34ویں صدر۔ ڈینی سن (ٹیکساس) میں پیدا ہوئے۔ 1915ء میں فوج میں بھرتی ہوئے۔ دوسری جنگِ عظیم شروع ہونے پر امریکی چیف آف اسٹاف، جنرل مارشل کے آفس میں بریگیڈیئر جنرل کی حیثیت سے جنگی منصوبہ بندی کے سربراہ مقرر ہوئے۔ جون 1942ء میں یورپ میں امریکی افواج کے کمانڈر بنادیے گئے۔ نومبر 1942ء میں شمالی افریقا پر اتحادی فوجوں کے حملے کی قیادت کی۔ جنوری 1943ء میں مغربی یورپ میں مصروفِ پیکار اتحادی افواج کے سپریم کمانڈر بنائے گئے۔ 1944ء میں جنرل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ 6 جون 1946ء کو فرانس پر حملہ کیا اور پھر مغربی یورپ اور جرمنی پر حملوں کی کمان کی۔ 1945ء تا 1948ء امریکی افواج کے چیف آف اسٹاف رہے۔ بعدازاں ریٹائر ہوکر کولمبیا یونیورسٹی کے صدر بنے۔ 1950ء میں نیٹو کی افواج کے کمانڈر بنائے گئے۔ 1953ء میں مستعفی ہوگئے۔ کیونکہ 1952ء میں، ری پبلیکن پارٹی کے امیدوار کی حیثیت سے، صدارتی انتخاب میں حصہ لیا تھا اور ڈیموکریٹک پارٹی کے امیدوار ایڈلائی اسٹیونسن کو ہرادیا تھا۔ 1956ء میں دوبارہ انتخاب لڑا اور اس مرتبہ بھی ایڈلائی اسٹیونسن کو شکست دی۔ ان کی پہلی مدتِ صدارت کا اہم واقعہ کوریا میں گفت وشنید کے ذریعے جنگ بندی ہے۔ 1960ء میں ایک بلند پرواز امریکی جاسوسی طیارہ یوٹو روس نے مار گرایا اور اس کے پائلٹ فرانسس گیری پاورز کو پکڑ لیا۔ چند دیگر واقعات سے آئزن ہاور کی ساکھ کو سخت دھچکا لگا اور وہ 1961ء میں عملی سیاست سے ریٹائر ہوگئے۔ ویت نام میں ایٹمی اسلحہ استعمال کرنے کے زبردست حامی تھے۔ نہر سوئز کے مسئلے کو حل کرانے میں مصر کی عملی مدد کی اور متحارب گروپوں میں جنگ بندی کرائی۔

مرسلہ: ارشد احمد کاموکی

www.pdfbooksfree.pk

بھی کر دیا جاتا اور پھر بندریا کوٹھی کے لان میں چھلانگیں مارتی ایک جگہ سے دوسری جگہ کودتی پھاندتی رہتی۔ کبھی کبھی کمروں میں بھی آجاتی اور پھر ملازمین اسے پکڑ دھکڑ کر پابہ زنجیر کر دیتے۔ تہنیت اور سفیان بھائی کی شادی کے بعد میں جب بھی تایا ابو کے گھر گئی ان کے جانوروں میں اضافہ ہی نظر آیا۔

تہنیت کا اور میرا ٹیلی فونک رابطہ قائم تھا۔ اچانک ایک دن اس نے خبر سنائی کہ اس کے تمام طلائی اور نقرئی زیورات چوری ہو گئے اور اس چوری سے تہنیت کا جو حشر ہوا سو الگ لیکن تایا ابو نے اس غریب کا ناطقہ ہی بند کر دیا۔ وہ علی الاعلان کہہ رہے تھے کہ اس چوری میں خود تہنیت کا ہی ہاتھ ہے اور اس نے خود اپنا تمام زیور بھائیوں کے ہاتھ سے اپنے ماں باپ کے گھر بھجوا دیا ہے کیونکہ اسی روز تہنیت کے دونوں چھوٹے بھائی اس سے ملنے اس کی سسرال گئے تھے اور کچھ گھنٹے قیام کرنے کے بعد وہاں سے نکل گئے تھے۔ یہ خبر سنتے ہی میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی کیونکہ میں تایا ابو کو اچھی طرح جانتی تھی۔ ان کی نظر میں انسان سے زیادہ قیمتی سونا چاندی تھا۔ میں نے فوراً تہنیت سے ٹیلی فونک رابطہ کیا۔ تہنیت نے آنسوؤں اور سسکیوں کے درمیان سارا واقعہ مجھے کچھ اس طرح سنایا ”میں اور سفیان ایک شادی کی تقریب میں گئے تھے۔ رات گئے واپسی ہوئی۔ کپڑے تبدیل کیے اور تمام جیولری اتار کر جیولری بکس میں رکھ دی جس کی مالیت لاکھوں کی تھی۔ دوسری صبح ہم دونوں میاں بیوی دیر سے جاگے اور اسی اثنا میں سرمد اور سعد مجھ سے ملنے کے لیے آگئے۔ کافی عرصے بعد دونوں کو دیکھا تھا اس لیے سارے کاموں کو پسِ پشت ڈال کر امی ابو کی خیریت دریافت کرنے بیٹھ گئی اور پھر ان کی خاطر تواضع میں لگ گئی۔ وہ دونوں اپنے کسی دوست کی شادی میں آئے تھے اس لیے تھوڑی دیر میرے اور سفیان کے پاس بیٹھ کر دونوں اجازت لے کر اٹھ گئے۔ جب میں سارے کاموں سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں گئی تو ڈریسنگ ٹیبل پر سے جیولری بکس غائب تھا۔ سارا گھر تلاش کر لیا مگر پتا نہیں اس ڈبے کو زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔ کمرے کی تمام کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں جو کہ لان کی طرف کھلتی تھیں اور لان میں تمہیں تو علم ہے کہ تمام جانوروں کے پنجرے ہیں۔ اگر کوئی چور باہر سے آتا تو جانور ضرور شور مچاتے اور چور، گیٹ پر موجود چوکیدار کی تیز نظروں سے بھی نہیں بچ سکتا تھا۔ میرا دماغ کام نہیں کر رہا ہے کہ چور آخر کس راستے سے آیا ہوگا۔ سرمد اور سعد آئے ضرور مگر تم اچھی طرح میرے والدین اور بھائیوں کو جانتی ہو، پتا نہیں ڈیڈی کیوں میرے بھائیوں پر شک کر رہے ہیں۔“ میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”تہنیت خدا کے لیے اپنے آپ کو سنبھالو۔ کیا مجھے علم نہیں کہ تمہارے والدین اور بھائی کیسی عادات و خصائل کے مالک ہیں۔ تایا ابو کے مزاج کا تو تمہیں پتا ہے۔ ابو نے اسی وجہ سے میرا رشتہ اس گھر میں نہیں کیا اور یقین کرو تمہیں بھی وہ مجھ سے کم نہیں سمجھتے اور اسی لیے تمہاری شادی کے وقت وہ امی سے یہی کہتے رہے کہ تہنیت کے والدین کو منع کر دو اس رشتے کے لیے مگر مجھے، امی اور تائی امی کو تم اس قدر پسند تھیں کہ ہماری زبانوں کو تالا لگ گیا تھا پھر ہم لوگوں نے یہ بھی سوچا کہ جس کے سر سہرا بندھ رہا ہے بذاتِ خود وہ تو ایک نیک، شریف، تعلیم یافتہ اور مثالی انسان ہے بس یہی سوچ تمہاری شادی کا محرک بنی۔ میں اور امی تمہاری شادی میں پیش پیش رہے۔ اس طرح تم ہمارے خاندان میں شامل ہو گئیں۔“ بہرحال کافی تسلی دلاسا دے کر میں نے تہنیت کو خاموش کیا۔

دوسرے ہی روز میں ... معظم (میرے شوہر نامدار) کے ساتھ تایا ابو کے گھر جا پہنچی۔ میری امی اور ابو بھی وہیں براجمان تھے۔ وہ لوگ بھی چوری کی خبر سن کر ہی آئے تھے۔ جب ہم دونوں میاں بیوی پہنچے تو سارے گھر پر موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ گھر کے ملازمین کے چہروں سے بھی خوف اور دہشت عیاں تھی کیونکہ اتنی بڑی ڈکیتی کے بعد پولیس کے احاطہ تفتیش میں وہ لوگ بھی شامل تھے۔ سب ایک دوسرے کو شک بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ تو بھلا ہو سفیان بھائی کا جنہوں نے پولیس سے صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا ”ہمارے تمام ملازمین قابلِ اعتبار اور ایماندار ہیں“ سرمد اور سعد کے لیے بھی ان کا بیان شستہ، صاف ستھرا اور شکوک و شبہات سے مبرّا تھا۔ انہوں نے تایا ابو سے بھی سخت الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ وہ ان کی سسرال والوں کی توہین کریں گے تو وہ بیوی کو لے کر فوراً اس گھر سے نکل جائیں گے اور پھر کبھی مڑ کر بھی نہیں دیکھیں گے۔ تایا ابو بیٹے کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھے۔ جو زبان سے کہتا ہے وہ کر کے دکھاتا ہے اس لیے انہوں نے بالکل چپ سادھ لی تھی۔ تائی امی نے بھی بہو کی حالت دیکھ کر تایا ابو کو کھری کھری سنا دی تھی کہ جب سے تہنیت بیاہ کر آئی ہے اس نے

www.pdfbooksfree.pk

بیٹیوں کی طرح ہماری خدمت کی ہے۔ گھر میں اتنے سارے ملازمین کی موجودگی میں ہمارا ہر چھوٹا بڑا کام اپنے ہاتھوں سے انجام دیتی ہے۔ اگر زیور چوری ہوگیا تو اس میں اس کا کیا قصور..... بیٹے، بہو کی زندگی اور خوشیوں سے زیادہ تو نہیں ہے دولت۔ اللہ تعالیٰ میرے بیٹے کے قوتِ بازوؤں میں اضافہ کرے وہ اس سے زیادہ کمالے گا۔ آپ آیندہ میری بہو کو کچھ نہیں کہیں گے ورنہ میں بھی ان دونوں کے ساتھ اس گھر سے ہمیشہ کے لیے نکل جاؤں گی پھر رہیے اپنے ان جانوروں کے ساتھ۔''

تائی امی کی دی ہوئی خوراک نے ایسا کام کیا کہ تایا ابو کے تو جیسے ہونٹ ہی سل گئے اور تہنیت نے سکون کا سانس لیا۔

دو چار دن تایا ابو کے گھر قیام کے بعد ہم لوگوں نے واپسی کا قصد کیا۔ امی ابو کا ارادہ دوسرے دن نکلنے کا تھا۔ ہم دونوں میاں بیوی کو صبح چار بجے کی گاڑی سے نکلنا تھا اس لیے میں نے رات ہی میں اپنا سارا سامان سمیٹ کر پیک کرلیا تھا۔ تھوڑی سی نیند لینے کے بعد تقریباً رات میں تین بجے میں نے بستر چھوڑ دیا۔ کیونکہ معظم کی دفتر کی چھٹی ختم ہورہی تھی اور دوسرے دن انہیں ڈیوٹی اٹینڈ کرنا تھی۔ اس لیے ہم یہ گاڑی مس نہیں کرسکتے تھے۔ سارے گھر پر سناٹا طاری تھا۔ سب گہری نیند کے مزے لوٹ رہے تھے۔ خاموشی، چاندنی رات اور موتیا کے پھولوں کی خوشبو بڑا خوب صورت منظر تھا۔ میں کچی نیند سے اٹھی تھی اس لیے آنکھیں ملتے ہوئے کھڑکی کھول کر لان کا نظارہ کرنے لگی اور پھر اچانک میری نظریں ایک جگہ جاکر منجمد ہوگئیں۔ میری آنکھوں نے جو حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین منظر دیکھا وہ میرے لیے کسی عجوبے سے کم نہ تھا۔ تہنیت کے زیورات و گہنوں کا چور میرے سامنے تھا۔ زیورات کا ڈبا بالکل کھلا پڑا تھا اور تمام زیورات چاند کی روشنی میں اپنی آب و تاب دکھا رہے تھے۔ تایا ابو کی لاڈلی بندریا کے سامنے ایک آئینہ رکھا ہوا تھا اور تہنیت کے سارے زیورات وہ باری باری ڈبے میں سے نکالتی جاتی اور پھر خوش ہوکر اپنی بتیسی چمکاتی اور پہن پہن کر آئینے میں دیکھ کر مزید خوش ہوکر عجیب عجیب سی آوازیں نکال کر اپنے حسن کو نہارتی۔ اور میں، میں تو اپنی پلکیں ہی جھپکانا بھول گئی۔ جب ذرا ہوش آیا تو میں نے فوراً تایا ابو اور تائی امی کے کمرے کی طرف دوڑ لگائی اور چیخ چیخ کر دونوں کو جگا دیا اور کہا ''میں نے چور کا سراغ لگالیا ہے جلدی چلیں۔ آپ کا چور لان میں چوری شدہ مال کی نمائش کررہا ہے۔ اور خود ہی شور مچا مچا کر اپنی چوری کا ڈھنڈورا پیٹ رہا ہے۔

''تائی امی اور تایا ابو اچانک ہی نیند سے بیدار ہوئے تھے اس لیے پہلے تو کچھ سمجھ ہی نہ پائے۔ جب ذرا اوسان بحال ہوئے تو دونوں نے یک زبان ہوکر کہا ''کہاں ہے چور؟''

میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''آپ دونوں میرے ساتھ لان میں تو چلیے۔'' اور ہم لوگوں کی باتوں اور شور وغل کی آواز سے تقریباً گھر کے سب ہی افراد بیدار ہوگئے تھے اور اپنے اپنے کمروں سے نکل کر ٹی وی لاؤنج میں آگئے تھے۔ چور باہر لان میں موجود ہے یہ سن کر سب کی نیند ہوا ہوگئی تھی اور جب میں نے انہیں چور کا دیدار کروایا تو سب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور زبانیں گنگ ہوگئیں اور پھر جو ہنسی اور قہقہوں کا طوفان اٹھا تو سرونٹ کوارٹرز میں سوئے ہوئے ملازمین بھی ہڑبڑا کر اٹھ گئے اور سب ہی اس چور کو دیکھ کر محظوظ ہوئے۔ بندریا نے جب دیکھا کہ اس کے آس پاس ہلچل سی ہورہی ہے تو وہ چوکنا ہوگئی اور تمام زیورات اتار کر بکس میں رکھنے لگی۔ ہم سب خاموش ہوکر اس کا تماشا دیکھنے لگے کہ آخر یہ کرتی کیا ہے۔ زیورات ڈبے میں رکھنے کے بعد اس نے فوراً زمین اپنے پنجوں سے کھودنا شروع کی اور زیورات کا ڈبا و آئینہ گڑھے میں اتار دیا اور پھر اوپر سے مٹی بچھا کر زمین برابر کرنے کے بعد اطمینان سے پیر پھیلا کر بیٹھ گئی۔

ہماری ٹرین کا ٹائم ہورہا تھا اس لیے میں نے تایا ابو کے قریب جاکر کہا ''اچھا تایا ابو ہم دونوں کو تو اب اجازت دیجیے۔ دیکھیے آپ کا چور بھی گرفتار کروادیا۔''

''تایا نادم و شرمسار ایک طرف کھڑے تھے۔ وہ بجائے اس کے کہ میری بات کا جواب دیتے تہنیت کی طرف بڑھے اور بے اختیار تہنیت کو گلے لگالیا اور کہا ''بیٹا مجھے معاف کردو میں نے تمہارا بہت دل دکھایا ہے۔ میں واقعی بہت شرمندہ ہوں۔''

تہنیت پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری تھی۔ وہ تایا ابو کے گلے لگ کر زار و قطار رو رہی تھی، گھر کے سب افراد کی آنکھیں نم ہوگئی تھیں مگر یہ آنسو خوشی اور مسرت کے تھے۔

ڈراما

جناب معراج رسول صاحب

السلام علیکم

کچھ لوگ جھوٹ بول کر، مذاق اڑاکر سمجھتے ہیں کہ ہم نے مقابل سے لطف لیا لیکن یہ نہیں جانتے کہ اس کا اثر دوسرے پر کیا پڑا۔ میرے ساتھ اس شخص نے ایک کھیل کھیلا جو میری نجات کا ضامن بن گیا۔ میری زندگی بدل گئی۔ آپ بھی ملاحظہ کریں۔

ابرار

(کراچی)

میں پارک میں آکر اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھا ہی تھا کہ ایک آدمی میرے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔

وہ ایک مہذب آدمی تھا۔ بہت سلیقے کا لباس اور بہت سلیقے کی کٹنگ۔ اس نے آتے ہی بہت ادب سے سلام کرتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھادیے۔

میں نے کچھ حیران ہوکر اپنے ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیے۔ اس نے بڑے ادب سے میرے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور سینے پر ہاتھ باندھ کر گردن جھکا کر کھڑا ہوگیا۔

میری حیرت بڑھتی جارہی تھی۔ اس کی یہ حرکت میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ کون تھا وہ، اس نے مجھ سے ایسی عقیدت کا اظہار کیوں کیا تھا۔

''حضرت۔'' اس نے میری طرف دیکھا۔ ''آپ

www.pdfbooksfree.pk

میرے لیے دعا کیجیے گا۔"

"دعا! تم کیا کہہ رہے ہو۔ کیسی دعا اور میں تو ایک گناہگار بندہ ہوں بھائی۔ یہ تم کس سے دعا کے لیے کہہ رہے ہو۔"

"آپ ہی سے کہہ رہا ہوں حضرت!" اس نے کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ آپ کا کیا مقام ہے۔ اسی لیے آپ سے درخواست کر رہا ہوں۔"

میں نے اس سے جان چھڑانے کے لیے کہہ دیا۔ "ٹھیک ہے۔ کردوں گا دعا۔"

وہ بہت ادب سے دوبارہ میرے ہاتھوں کو چوم کر ایک طرف چلا گیا۔ اس نے ذرا سی دیر میں مجھے پریشان کر کے رکھ دیا۔ وہ میرے ساتھ کوئی ڈراما بھی نہیں کر رہا تھا۔ کیونکہ بہت ہی معقول انسان دکھائی دیتا تھا۔

بہرحال میں نے اس کے خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔

نسرین کے آنے کا وقت ہوگیا تھا۔ میں نے اسے اس پارک میں بلایا تھا۔ وہ عام طور پر مجھ سے اسی پارک میں ملا کرتی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت نہیں کرتے، اور نہ ہی ہمارے درمیان کوئی سنجیدہ رشتہ تھا۔ ہمارے درمیان صرف جسمانی تقاضوں کے رشتے تھے۔ ہم دونوں ہی اس بات سے واقف تھے۔ نسرین کے لیے نہ تو میں اکلوتا تھا اور نہ ہی میرے لیے نسرین اکلوتی تھی۔

ہم دونوں نے اپنے اپنے طور پر اس معاملے میں ایک دوسرے سے طے کر رکھا تھا۔ اس سلسلے میں ہمارا فلسفہ یہ تھا کہ جو وقت ایک دوسرے کے ساتھ گزر رہا ہو اسے پورے خلوص کے ساتھ گزار لو۔ اس چکر میں نہ پڑو کہ یہ میرے بعد کہاں جاتا ہے، یا کہاں جاتی ہے۔

یہ سب مت سوچو۔ اس نے تم کو اپنے دو گھنٹے تو بھرپور دے دیے نا۔ بس اسی کو سب کچھ جان لو اور خوش رہو، تو ہمارے درمیان اس قسم کے تعلقات تھے۔

نسرین اپنے وقت پر آگئی تھی۔ میں نے جب اسے ہاتھ چومنے والے نوجوان کی کہانی سنائی تو وہ بہت دیر تک ہنستی رہی۔

"ارے واہ، تم تو پیر بابا ہوتے جا رہے ہو۔" اس نے کہا۔

"ختم کرو۔" میں اکتا کر بولا۔ "اس کو غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ اس نے کسی اور کے دھوکے میں مجھ سے بات کرلی ہوگی۔"

ہم وہاں سے اٹھ کر ساحل کی طرف آگئے۔

میرے پاس اپنی گاڑی تھی۔ اس لیے آنے جانے میں دشواری نہیں ہوتی تھی۔ جس کو بھی چاہا گاڑی میں بٹھایا اور کہیں بھی روانہ ہوگئے۔

میرا اپنا ایک کاروبار تھا جو کامیابی سے چل رہا تھا، میں نے کلفٹن جیسے علاقے میں اپنا ایک شاندار اپارٹمنٹ لے رکھا تھا۔

ایسے علاقوں میں رہنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی ڈسٹرب نہیں کرتا۔

آپ کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں، کیا کرتے ہیں، یہ آپ کے یہاں اتنے لوگوں کی آمد و رفت کیوں ہوتی ہے۔ آپ کی اتنی لڑکیوں سے کیوں جان پہچان ہے، وغیرہ وغیرہ۔

لوگوں کو ایک دوسرے سے کوئی مطلب ہی نہیں ہوتا۔ اس لیے آرام سے گزرتی رہتی ہے۔

میں اپنی دوست لڑکیوں کو اپنے اپارٹمنٹ میں ہی لے جاتا تھا۔ میری کچھ دوست لڑکیوں کو پینے کی بھی عادت تھی۔ ان میں سے ایک نسرین بھی تھی۔

وہ کم بخت پی لینے کے بعد بری طرح بہک جایا کرتی۔ اسی لیے اس کی رات اسی اپارٹمنٹ میں گزرتی۔ اور صبح جب اس کے ہوش ٹھکانے آتے تو پھر اپنے گھر کی طرف روانہ ہوجاتی۔

لیکن اس رات وہ زیادہ دیر نہیں رہی تھی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے گلاس اور بوتلیں وغیرہ ایک طرف رکھیں اور اپنے کمرے میں آکر لیٹ گیا۔

عام طور پر میں جلدی سو جایا کرتا ہوں، میرا مطلب ہے کہ جب میرے ساتھ کوئی نہیں ہوتا تو بستر پر گرتے ہی نیند آجاتی ہے۔ لیکن اس رات نیند ہی نہیں آرہی تھی۔ ایک انجانی سی بے چینی تھی۔ نہ جانے کیوں۔

یہ میرا تجربہ ہے کہ جب آپ کے ساتھ اس قسم کی بے چینی اور بے کیفی کی صورت حال ہو تو اس کو تلاش کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ آنکھیں بند کر کے آپ یہ سوچنا شروع کردیں کہ آج آپ نے کیسا دن گزارہ۔ کہاں کہاں گئے۔ کن لوگوں سے ملے۔ دن بھر کیا کرتے رہے۔ پھر اس طرح بھٹکتے ہوئے اچانک وہ وجہ آپ کے سامنے آجاتی ہے جس نے آپ کو بے چین کر رکھا تھا۔

میں نے بھی اپنے آپ کو دہرانا شروع کردیا۔ لیکن ایسی کوئی وجہ سامنے نہیں آسکی جو میری بے چینی کا سبب بن رہی تھی۔ سوائے اس نوجوان کے آنے اور میرا ہاتھ چوم کر چلے جانے کے۔ اور یہ بھی کوئی ایسی بات تو نہیں تھی جو مجھے اس طرح بے چین رکھتی۔

دوسری صبح میں دیر سے دفتر پہنچا تھا۔ میں نے ایک جز وقتی ملازمہ رکھی ہوئی تھی جو صبح آکر ناشتا بنا دیا کرتی اور ضروری کام کر کے چلی جاتی تھی۔

دوپہر اور رات کے کھانے کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ دفتر میں، یا کہیں اور، کسی اور کے ساتھ یا کسی اور کے ساتھ، ہم جیسوں کے لیے ایک ہی بات کہی جاسکتی تھی۔ "یہ اعجاز تھا حسنِ آوارگی کا۔ جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے۔"

دفتر سے اٹھنے ہی والا تھا کہ ایک دوست شاکر کا فون آگیا۔ وہ میرا دوست بھی تھا اور ہم مشرب بھی۔ ہم ایک ساتھ بہت کچھ کیا کرتے تھے۔

وہ مجھے بتا رہا تھا۔ "یار، آج ایک اسپیشل مہمان ہے میرے ساتھ۔"

میری ساری کوفت اس کی بات سن کر دور ہوگئی۔ اسپیشل مہمان وہ کسی خوبصورت لڑکی کو کہا کرتا تھا۔ "تو پھر۔" میں نے پوچھا۔ "کیا کہیں لنچ کا ارادہ ہے۔"

"ہاں۔ ہم کے والٹ پہنچ رہے ہیں۔" اس نے بتایا۔ "تم بھی وہیں پہنچ جاؤ۔"

میں بھی کے والٹ پہنچ گیا۔

یہ ایک ڈھنگ کا ریستوران تھا جہاں ڈھنگ کے لوگ آیا کرتے تھے۔ ڈھنگ کے کھانے ہوتے اور ڈھنگ کی قیمت بھی وصول کی جاتی تھی۔

شاکر کے ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکی کو دیکھ کر دل خوش ہوگیا تھا۔ وہ تیکھے نقوش کی ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ شاکر نے میرا بہت لمبا چوڑا تعارف کراتے ہوئے اس کے بارے میں بتایا۔ "یہ ریما ہیں۔ دوستوں کی دوست۔ ان کی اپنی ایک بوتیک ہے اور نئی لڑکیوں کو ماڈلنگ کے چانس دیا کرتی ہیں۔"

"اوہ، پھر تو ان سے ڈرنا چاہیے۔" میں نے کہا۔

"وہ کیوں؟" ریما نے پوچھا۔

"وہ اس لیے کہ آپ جیسوں کے ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں۔" میں مسکرا کر بولا۔ "بہت تعلقات ہوتے ہیں آپ لوگوں کے۔"

"ہوتے تو ہیں لیکن دوستوں کے لیے۔" وہ بھی

آئن اسٹائن، البرٹ

1879-1955ء امریکی ماہرِ طبیعیات اور سائنسی مفکر۔ جرمنی کے ایک شہر اولم میں پیدا ہوا۔ زیورخ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ 1905ء میں پی ایچ کی ڈگری لی۔ 1905ء میں ہی اس نے نظریۂ اضافیت Theory of Relativity پر اپنا مشہور زمانہ مقالہ شائع کیا، جس سے طبعی کائنات میں نئی راہیں کھلیں۔ اس نے کہا کہ روشنی تمام اطراف میں مساوی رفتار سے سفر کرتی ہے، خواہ دیکھنے والے کی حرکت کچھ بھی ہو نیز کوئی ایک نقطہ حرکت کا صفر نہیں ہوتا، کیونکہ حرکت کا انحصار دیکھنے والے پر ہے۔ اس کے علاوہ زمان بھی اضافی ہے اور اس کا انحصار دیکھنے والے پر ہی ہے۔

آئن اسٹائن نے کچھ عرصہ زیورخ اور پراگ میں درس و تدریس میں گزارہ، پھر 1913ء میں برلن یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر ہوا۔ اس نے طبیعیات میں اور بھی کئی اہم دریافتیں کیں۔ 1921ء میں طبیعیات کا نوبل انعام حاصل کیا۔ 1933ء میں یہودیوں پر نازیوں کے مظالم کے باعث، ریاست ہائے متحدہ امریکا کی شہریت حاصل کرلی اور پرنسٹن یونیورسٹی میں اعلیٰ ریاضیات کا پروفیسر مقرر کیا گیا۔ اسی کی تحریک پر امریکا میں جوہری توانائی پر کام شروع ہوا۔

مرسلہ: شہزاد منظر، کراچی

www.pdfbooksfree.pk

مسکرادی تھی۔

ذرا سی دیر میں ہم بے تکلف ہوگئے۔ یا تو اس کا اپنا انداز ہی ایسا تھا، ذرا سی دیر میں گھل مل جانے والا اور کچھ میرا اپنا ہنر تھا کہ میں بہت جلد بے تکلف کرلیا کرتا۔

کھانے کے بعد شاکر نے مجھ سے کہا۔ ''اچھا یار مجھے تو یہاں سے نکل کر ایک ضروری میٹنگ میں جانا ہوگا۔ تم ایسا کرنا ریما کو ان کے گھر ڈراپ کردینا۔''

''کیوں نہیں، سر آنکھوں پر۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن میری ایک بری عادت ہے۔''

''چلیں، وہ بھی بتادیں۔'' ریما نے پوچھا۔

''وہ عادت یہ ہے کہ جس کو بھی اپنی گاڑی میں لفٹ دیتا ہوں اس کو کچھ دیر کے لیے اپنے اپارٹمنٹ میں مہمان ضرور بناتا ہوں۔''

''ارے یہ کون سی بات ہوئی۔'' شاکر نے کہا۔ ''تم لے جانا ان کو، کیوں ریما۔ تمہیں تو کوئی اعتراض نہیں ہے نا۔'' اس نے ریما سے پوچھا۔

''نہیں تو۔'' ریما مسکرادی۔ ''اس میں کس بات کا اعتراض۔ اچھا ہے اس بہانے ابرار صاحب کا اپارٹمنٹ بھی دیکھ لوں گی۔''

ہم تینوں ہی ایک ساتھ ریستوران سے باہر نکلے تھے۔ ہم پارکنگ کی طرف جارہے تھے کہ اچانک نہ جانے کس طرف سے وہی نوجوان نمودار ہوا جو ایک شام مجھے پارک میں ملا تھا۔

وہ میرے پاس آکر ادب سے جھک کر بولا۔ ''سرکار، امید ہے آپ نے اس خاکسار کے لیے دعا ضرور کردی ہوگی۔''

ہم تینوں ہی پریشان ہوکر رک گئے تھے۔ خاص طور پر میں تو بہت خفت سا محسوس کررہا تھا۔

''حضور، ایک بار پھر آپ سے دعا کی درخواست کرتا ہوں۔''

''ارے بھائی، تم کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔'' میں غصے سے بولا۔ ''جاؤ کسی پیر فقیر سے دعا کرواؤ۔ میری دعا تمہارے کس کام آئے گی۔''

''سرکار، آپ کی دعا سے میری عاقبت سنور جائے گی۔'' اس نے کہا۔ ''یہ تو میں جانتا ہوں کہ سرکار کا کیا مرتبہ ہے۔ اوروں کو آپ کے بارے میں کیا معلوم؟''

''ارے بھائی، میرا کوئی مرتبہ ورتبہ نہیں ہے۔'' میں جھلا کر بولا۔ ''تم اس طرح مجھے پریشان مت کیا کرو۔''

''سرکار، آپ سے صرف دعا کی درخواست ہے۔'' اس نے کہا۔

''اچھا اچھا کردوں گا دعا۔ اب جان چھوڑو۔''

اس نے اچانک میرا ہاتھ تھاما۔ ہتھیلی کی پشت پر بوسہ دیا اور الٹے قدموں چلتا ہوا واپس ہوگیا۔ آس پاس کے لوگ بھی بہت حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

میرا یہ حال تھا کہ میں بہت خفت سی محسوس کررہا تھا۔ اس آدمی نے تو میرا اتنا شاہی بنا کر رکھ دیا تھا۔

''یار، یہ کیا چکر ہے۔'' شاکر نے میرے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے پوچھا۔

''یار، مجھے خود نہیں معلوم۔'' میں نے کہا۔ ''یہ ایک بار پہلے بھی اسی قسم کی حرکت کرچکا ہے۔ اس وقت میں ایک پارک میں بیٹھا تھا اور یہ نہ جانے کہاں سے ٹپک پڑا تھا۔''

''کچھ بھی ہو، اس کے انداز میں بناوٹ نہیں تھی۔'' ریما نے کہا۔ ''اس کے ہر انداز سے آپ کے لیے عقیدت کا اظہار ہورہا تھا اور وہ مجھے کوئی دیوانہ بھی نہیں معلوم ہوتا تھا۔''

''خیر، اب جہنم میں بھیجو اس کو۔'' میں جھلا کر بولا۔ ''چلو، یہاں سے چلتے ہیں۔''

''ابرار صاحب، میں آپ کے ساتھ نہیں جاسکوں گی۔'' ریما نے کہا۔ ''مجھے ایک ضروری کام یاد آگیا ہے۔'' پھر اس نے شاکر کی طرف دیکھا۔ ''شاکر صاحب، سامنے ٹیکسی کھڑی ہے میں اس میں چلی جاتی ہوں۔''

اس سے پہلے کہ شاکر کچھ کہہ سکتا۔ وہ ٹیکسی میں بیٹھ چکی تھی۔

''ابے یہ کیا تماشا ہوگیا۔'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''یہ اچانک کیوں چلی گئی۔''

''اب تو یہ میرے ہاتھ سے بھی گئی۔'' شاکر دانت پیسنے لگا تھا۔ ''اور ولی اللہ بننے کی کوشش کرو۔ اس طرح کوئی تمہارے پاس نہیں آئے گی۔''

''ارے بابا، اس میں میرا کیا قصور ہے۔'' میں غصے سے بولا۔ ''میں تو اس کم بخت کو جانتا بھی نہیں ہوں۔ خواہ مخواہ ڈراما بازی کرتا پھر رہا ہے۔''

''یاد رکھو، پیارے، وہ اس طرح تمہاری ہوا اکھاڑ رہا ہے۔''

''فکر مت کرو، اس بار وہ سامنے آیا نا تو گھونسے مار مار کر بے ہوش کردوں گا۔'' میں نے کہا۔

بہر حال بہت بے کیف ہوکر اپنے اپارٹمنٹ واپس

www.pdfbooksfree.pk

آ گیا تھا۔

اگر اس کم بخت کا یہ ڈراما نہیں ہوتا تو اس وقت ریما میرے ساتھ ہوتی۔ اس کے ساتھ گپ شپ ہو رہی ہوتی۔ بوتل کھل چکی ہوتی لیکن اس نے تو میرا کباڑا ہی کر کے رکھ دیا تھا۔

خدا جانے کیوں میرے پیچھے پڑ گیا تھا۔

مجھ سے کہہ رہا تھا کہ میں اس کے لیے دعا کروں۔ پتا نہیں اس نے مجھ میں کیا دیکھ لیا تھا کہ اس قسم کی بات کر رہا تھا۔ میں تو اس قابل ہی نہیں تھا۔

جس شخص کی راتیں شباب اور شراب میں گزرتی ہوں وہ کسی کے لیے کیا دعا کر سکتا ہے اور اُس کی دعا کس کھاتے میں ہوگی۔

وہ رات بھی بہت بے چینی کی تھی۔ بہت دیر تک سوچتا رہا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ اس نوجوان کو دیکھ کر یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ سیریس ہے یا مجھے بے وقوف بنا رہا ہے۔

اور بے وقوف کیوں بنانے لگا۔ میرا تو اس سے کوئی واسطہ ہی نہیں تھا۔ میں تو اسے جانتا بھی نہیں تھا۔ پھر وہ ایسا کیوں کر رہا تھا۔

اسی ادھیڑ بن میں کئی دن گزر گئے۔

حیرت انگیز طور پر ان دنوں میری کوئی ایکٹیوٹی ہی نہیں رہی۔ دفتر جاتا اور وہاں سے گھر واپس آ جاتا۔ شاکر تک سے ملنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔

ایک دن وہ نوجوان مجھے مارکیٹ میں دکھائی دے گیا۔ اس کی توجہ میری طرف نہیں تھی۔ لیکن میں نے اس کو دیکھ لیا تھا، میں فوراً ہی اس کے پاس پہنچ گیا۔

اس وقت بھی وہ دوسری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے متوجہ کرنے کے لیے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور جیسے اسے کرنٹ سا لگ گیا ہو۔ ”سرکار، حضرت، آپ، آپ یہاں، سرکار آپ نے مجھے اس قابل سمجھا کہ خود میری طرف متوجہ ہو گئے۔“

”ارے بھائی، تم نے یہ کیا تماشا لگا کر رکھا ہے۔“ میں نے غصے سے پوچھا۔ ”میں تو ایک عام سا آدمی ہوں۔ اور تم میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو۔“

”نہیں سرکار، نہیں۔ آپ عام آدمی نہیں ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے۔“

”کیا بکواس ہے یہ؟“

”سرکار، میرے خواب جھوٹے نہیں ہو سکتے۔“ اس نے بتایا۔

”کیسے خواب؟“

”جو میں آپ کے لیے بار بار دیکھتا آیا ہوں۔“

”آؤ میرے ساتھ۔“ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”یہاں نہیں، کہیں اور چل کر بات کرتے ہیں۔“

”میں اسے لے کر ایک طرف چل پڑا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے کسی غلام کے سے انداز میں سر جھکائے چلا آ رہا تھا۔ میں اسے اپنے ساتھ ایک ہوٹل میں لے آیا تھا۔

”چلو بیٹھ جاؤ۔“ میں نے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

”نہیں سرکار! میری اتنی جرأت کہاں کہ میں آپ کے سامنے بیٹھ سکوں۔“

”ڈراما کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بیٹھ جاؤ۔“

وہ اس طرح بیٹھ گیا جیسے کسی بادشاہ نے اسے اپنے سامنے بٹھا لیا ہو۔ ”ہاں اب بتاؤ یہ کیا سلسلہ ہے۔“ میں نے پوچھا۔ ”لیکن سب کچھ ٹھیک ٹھیک بتانا۔“

پھر اس نے جو کچھ بتایا وہ بہت حیرت انگیز تھا۔ اس نے کہا۔ ”سرکار...... میں پچھلے ایک مہینے سے آپ کو خواب میں دیکھتا آ رہا ہوں۔ بار بار کسی نہ کسی طرح، کسی انداز میں آپ کی شکل دکھائی جاتی ہے۔ اور ایک آواز بھی سنائی دیتی ہے کہ ان کا دامن تھام لے۔ ان کا دامن تھام لے۔ جب آپ کی صورت میرے ذہن میں پختہ ہو گئی تو پھر میں نے جان لیا کہ آپ ہی کی دعا میرے کام آ سکتی ہے۔ میں نے آپ کی تلاش شروع کر دی پھر آپ اس شام مجھے پارک میں مل گئے۔ میں نے آپ سے دعا کی درخواست کر دی۔ بس اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں بتا سکتا۔“

”کمال ہے۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”نوجوان، نام کیا ہے تمہارا۔“

”جمال احمد۔“ اس نے بتایا۔

”دیکھو جمال، میں ایک انتہائی گناہگار انسان ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے، تم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہوگا کہ میری صحبت کیسی ہے۔ میں کن لوگوں کے درمیان رہتا ہوں۔“

”سرکار، میں یہ سب نہیں جانتا۔ مجھے تو آپ کی شکل میں ایک روشنی دکھائی جاتی رہی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ آپ میں ایسی کون سی بات ہے لیکن مجھے یہی حکم ملتا رہا ہے۔ اور اس کا ایک ہی مطلب سمجھ میں آتا ہے کہ خدا آپ کی الٹی

سیدھی حرکتوں کے بعد بھی آپ پر بہت مہربان ہے۔“

اس وقت میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نوجوان نے یہ کیا کہہ دیا تھا کہ خدا میرے گناہوں کے باوجود مجھ پر مہربان ہے۔

وہ تو اپنی عادت کے مطابق مجھ سے اجازت لے کر وہاں سے چلا گیا۔ لیکن میں ایک سکتے کے عالم میں وہاں بیٹھا رہ گیا تھا۔ بہت دیر تک۔

مجھے ہوش ہی نہیں رہا تھا کہ میں کہاں بیٹھا ہوں۔۔اور کتنی دیر بیٹھا رہا ہوں۔ کچھ ایسی کیفیت ہو رہی تھی جو بیان ہی نہیں کر سکتا۔

پھر جب بیرے نے آ کر مجھے متوجہ کیا تو میں اس کیفیت سے باہر آ گیا۔ میں نے بیرے کو بل کی رقم دی اور ہوٹل سے باہر آ گیا۔ میرا رخ قریبی مسجد کی طرف تھا۔ نہ جانے کتنے برسوں کے بعد میں مسجد کی طرف جا رہا تھا۔

نہ جانے کتنے برسوں کے بعد میں نے وضو کیا تھا اور کتنی صدیوں کے بعد سجدے میں گرا تھا۔ پورے بدن پر لرزہ طاری تھا اور میں روئے جا رہا تھا، روئے جا رہا تھا۔

مسجد سے باہر آیا تو دل کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ آنسو تھے کہ آنکھوں میں چلے آ رہے تھے۔ میرے خدا! میں جس کے احکام کی نافرمانی کرتا رہا، خلاف ورزی کرتا رہا، اس نے مجھے کس طرح یاد کرایا تھا۔

انہی خیالات میں ڈوبا اپنے اپارٹمنٹ واپس آ گیا۔ یہاں ایک ترغیب میرے انتظار میں تھی۔ شاکر اپنے ساتھ پھر اپنی کسی دوست کو لے کر آیا تھا۔ ”کہاں رہ گئے تھے یار۔“ اس نے پوچھا۔ ”میں تو بہت دیر سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“

”شاکر، اب شاید میں اتنی دور نکل گیا ہوں کہ واپس نہ آ سکوں۔“ میں نے کہا۔ ”اس لیے بہتر یہی ہے کہ تم جس کو لے کر آئے ہو، اس کو لے کر واپس چلے جاؤ۔“

”میرے یار، اس سے مل تو لو۔“ شاکر نے کہا۔ ”اب ایسی بھی کون سی بات ہو گئی ہے۔“

”بہت کچھ ہو گیا ہے شاکر۔“ میں ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ”جو شاید تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔“

وہ بہت دیر تک میرا مذاق اُڑاتا رہا۔ پھر مایوس ہو کر اس لڑکی کو لے کر واپس چلا گیا۔

اس دن کے بعد سے میری کیفیت عجیب ہو گئی تھی۔ زندگی اور دفتر کے معاملات تو اسی طرح چل رہے تھے لیکن

آئفل ٹاور

پیرس (فرانس) کے چوک میں واقع ایک مینار جو ایک فرانسیسی انجینئر آئفل الیگزنڈر گستاف نے بنایا تھا۔ اسی نے نہر پانامہ کا خاکہ تیار کیا تھا۔ یہ دنیا کے اونچے اونچے میناروں میں سے ایک ہے۔ بلندی 984 فٹ ہے۔ مینار کی بنیاد پتھر کی ہیں جو کہ چار جھکے ہوئے ستونوں کے نیچے ہیں جو 187 فٹ کی بلندی پر باہم ملتے ہیں۔ زیریں حصہ اڑھائی مربع ایکڑ رقبے میں پھیلا ہوا ہے اور ابتدائی حصہ 54 ڈگری کے زاویے پر اوپر اٹھتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ بلند ہوتا جاتا ہے۔ پہلی منزل 5860 مربع گز میں پھیلی ہوئی ہے۔ دوسری منزل پر اس کی چوڑائی 3 ہزار مربع گز رہ جاتی ہے۔ آخری منزل تیسری ہے اور اس پر بیک وقت آٹھ سو افراد آ سکتے ہیں۔ آئفل ٹاور کی تعمیر کا کام 28 جنوری 1887ء کو شروع ہوا اور تکمیل 31 مارچ 1889ء کو ہوئی۔ اس کے اوپر سے پورا پیرس نظر آتا ہے۔ اس کی تعمیر میں فولاد اور کنکریٹ استعمال کیا گیا ہے۔ اس پر فرانس کے ٹیلی ویژن سسٹم کا سب سے بڑا ٹرانسمیٹر نصب ہے۔ 1930ء تک یہ دنیا کی بلند ترین عمارت تھی۔

1964ء میں آئفل ٹاور کو فرانس کی وزارت ثقافت نے ایک تاریخی یادگار قرار دیا۔ 1981ء میں صد سالہ تقریب کے لیے مینار کی مرمت اور آرائش کی گئی اور اس پر چار کروڑ 40 لاکھ ڈالر خرچ ہوئے۔ مینار کی حفاظت کو بہتر بنانے کے لیے اس میں آگ بجھانے کے آلات اور ریت چھڑکنے کی بالٹیاں لگائی گئیں۔ دوسرے فرش پر موجود ایک ریستوران کو ہٹا دیا گیا۔ وسط میں ایک ایسی لفٹ لگائی گئی جو کمپیوٹر کے ذریعے چلتی ہے۔ اس مینار کو سو سال کے اندر 10 کروڑ افراد نے دیکھا۔

مرسلہ: ناہید سلطان، شیخوپورہ

www.pdfbooksfree.pk

اب زاویہ ہی بدل چکا تھا۔

میں نے نمازیں شروع کر دی تھیں۔ ہر نماز میرے لیے آنسوؤں کا تحفہ لے کر آتی اور ایسا لگتا جیسے آنسوؤں کے ساتھ ساتھ میرے گناہ اندر سے دھل دھل کر باہر آ رہے ہوں۔

کہتے ہیں کہ کبوتر با کبوتر، باز با باز، جب میں نے اپنے خدا کی طرف دھیان دینا شروع کیا تو پھر اس نے میرے لیے ایسے ایسے دوست، ایسے ایسے لوگ بھیجنے شروع کر دیے جو خدا کے نیک بندے تھے۔

یہ لوگ میرے لیے پیغامات اور ہدایات لے کر آیا کرتے۔ دو ہی مہینوں میں میری تو دنیا ہی بدل گئی تھی۔ میں کچھ اور ہو گیا تھا۔

ایک بالکل مختلف انسان، اور اب وہ نوجوان مجھے دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس نے تو میری دنیا بدل دی تھی۔ جب تک میں گناہوں کے راستے پر چلتا رہا، وہ مجھ سے کئی بار ملا اور جب میں نے واقعی اپنے خدا کا دامن تھام لیا تو وہ غائب ہو چکا تھا۔

نہ جانے اس میں خدا کی کون سی مصلحت تھی۔

شاید وہ خدا کا کوئی فرشتہ تھا جسے میری ہدایت کے لیے بھیجا گیا تھا اور مجھے سیدھے راستے پر لگا کر اور اپنی ڈیوٹی دے کر وہ واپس چلا گیا تھا۔

اس کے باوجود میری نگاہیں اسے تلاش کرتی رہتی تھیں۔ صرف اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے، میں اس کا احسان مند تھا۔ اگر وہ میری زندگی میں نہیں آتا تو نہ جانے اور کتنے شاکر میری زندگی میں آ چکے ہوتے۔

اور بالآخر ایک دن اس سے ملاقات ہو ہی گئی۔ یہ ملاقات ایک ہوٹل میں ہوئی تھی۔ میں اپنے ایک کاروباری دوست کے ساتھ لنچ کے لیے گیا تھا۔ میں یہ بتا چکا ہوں کہ میں نے زندگی کے معمولات ترک نہیں کیے تھے۔ کیونکہ تلاشِ رزقِ حلال بھی خدا کا حکم ہے۔ اس لیے میں اپنا کاروبار بدستور کرتا رہا تھا۔

یہ اور بات ہے کہ خود میری زندگی کے رنگ ڈھنگ بدل چکے تھے۔ اس میں اب خوفِ خدا کا عنصر شامل ہو گیا تھا۔ جب میں نے اس نوجوان کو دیکھا تو اپنے کاروباری دوست کو بٹھا کر اس کے پاس پہنچ گیا۔

وہ نوجوان اس وقت اپنے چند ہم عمر دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

''ارے جناب آپ۔''

میں نے اس کے رویّے میں ایک تبدیلی محسوس کی تھی۔ کہاں تو اس کا وہ انداز ہوتا تھا کہ ادب سے گردن جھکائے کھڑا رہتا۔ اور سرکار اور حضرت کہہ کر مخاطب کر رہا ہوتا اور کہاں یہ حال کہ بے تکلفی سے مخاطب کر رہا تھا۔

''جمال، میں تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لیے بہت دنوں سے تمہیں تلاش کر رہا تھا۔'' میں نے کہا۔

''جناب، آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔ وہ تو صرف ایک مذاق تھا۔''

''مذاق؟'' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیسا مذاق؟''

''دیکھیں، آپ ناراض مت ہوئیے گا۔'' اس نے کہا۔ ''ہم چند دوستوں میں یہ شرط لگ گئی تھی کہ ہمیں کسی کو بے وقوف بنانا ہے۔ اس پارک میں، میں نے آپ کو دیکھا اور اپنا ڈراما آپ کے ساتھ شروع کر دیا۔ اس کے بعد بھی آپ جہاں جہاں دکھائی دیے۔ میں آپ کے ساتھ یہی ڈراما کرتا رہا لیکن اب نہیں، اب بہت ہو گئی۔ اس لیے میں آپ کو صاف صاف بتا رہا ہوں۔ پلیز معاف کر دیجیے گا۔''

''میرے دوست، معافی کیسی۔'' میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''میں تو تمہارا شکر گزار ہوں۔''

''جی۔'' اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

''ہاں بھائی، تمہارے اس ڈرامے کی بدولت مجھے نئی زندگی مل گئی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم نے جس کام کو ڈراما سمجھ کر شروع کیا تھا، میرے خدا نے تمہارے اس ڈرامے کو میرے لیے اطاعت اور فرمانبرداری کا راستہ بنا دیا ہے۔ میں دعویٰ تو نہیں کرتا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ ہو سکتا ہے کہ تم کسی دن واقعی میرے پاس آ جاؤ کہ حضرت میرے لیے دعا کیجیے گا۔ تمہارا بہت بہت شکریہ!''

میں اس نوجوان کو حیرت زدہ چھوڑ کر اپنے کاروباری دوست کے پاس واپس آ گیا۔ وہ نوجوان اپنی جگہ کھڑا ہو کر میری طرف دیکھتا رہا تھا۔

پھر وہ دوستوں سے معذرت کرے ہوٹل سے باہر چلا گیا۔

اس کے بعد وہ مجھے نظر نہیں آیا جبکہ میں آج بھی اس کی تلاش میں ہوں۔ کیونکہ یہ راستہ میں نے اسی کی بدولت پایا ہے۔

خدا آپ سب کی زندگی میں ایسا کوئی نوجوان بھیج دے جو اسی طرح آپ کے ساتھ ڈراما کرے اور آپ اپنے دل میں شرمندہ ہو کر خدا کے سامنے سر جھکا لیں۔

قصور

جناب ایڈیٹر صاحبہ

آداب عرض

ہر انسان کے ساتھ اس کی قسمت ہوتی ہے۔ میرے ساتھ بھی میری قسمت ہے لیکن میری قسمت کتنی کالی ہے اسی کا دکھڑا سنانے کے لیے آج میں حاضر ہوئی ہوں۔ امید ہے آپ اور آپ کے قارئین ضرور سنیں گے۔ عورت قسمت کی کیسی ہیٹی ہوتی ہے اسی کا ذکر کرنے کی کوشش کی ہے۔

زلیخا

(فیصل آباد)

بہت ہی پیاری صورت تھی اُس کی۔

جب وہ صرف تین برس کی تھی تو میں اسے اپنے ساتھ جیل لے کر آئی تھی۔ تین برس کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ کچھ نہ سمجھنے والی۔ اس بے چاری کو کیا معلوم کہ اس کی ماں کو کس جرم کی سزا دی جا رہی ہے۔

اور بہت سوں کو تو یہ بھی نہیں معلوم کہ ان کا مقدر اتنا خراب کیوں ہوتا ہے۔ ان کے لیے سوائے بدنصیبی اور ٹھوکروں کے اور کچھ کیوں نہیں ہوتا۔

میں نے ایک بہت غریب گھرانے میں ہوش سنبھالا تھا۔ نہ جانے کیوں کچھ بدنصیبوں کو خدا بہت پیاری صورت شکل دے دیتا ہے۔ اس نے میرے ساتھ بھی ایسا ہی کیا۔ اس نے مجھے اچھی خاصی شکل دے دی تھی۔

غریب گھر میں لڑکی اگر خوبصورت ہوجائے تو اس کی خوبصورتی اس کے لیے جان کا عذاب ہوجاتی ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔

میرا باپ نہ صرف ایک غریب انسان تھا بلکہ نشے کا عادی بھی تھا۔ اکثر میری ماں سے جھگڑا کیا کرتا۔ ماں کے پاس صرف ایک حربہ تھا۔ اور وہ تھی اس کی زبان، جو قینچی کی طرح چلتی اور باپ کے بخیے ادھیڑ کر ...رکھ دیتی۔

اس وقت باپ کے ہاتھ اپنا کام دکھانے لگتے تھے اور پورے محلے میں ایک شور برپا ہوجاتا۔ اور اس وقت میں ایک کونے میں دبک کر کھڑی ہوجاتی۔

اس ماحول میں میں نے اپنا بچپن گزارہ تھا۔ اگرچہ میں نے زیادہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی، اس کے باوجود مجھے ایک احساس رہتا تھا اور وہ تھا اپنی عزت کا۔

میں اپنی عزت بچانے کی کوشش کیا کرتی۔ میری کوشش یہی ہوتی تھی کہ ہوسناک نگاہوں کی زد سے بچی رہوں۔ اپنے آپ کو بہت لیے دیے رہتی تھی۔

ہوسکتا ہے کہ میرا یہ فعل میرے باپ کو پسند نہ ہو۔ لیکن میری ماں کو بہت خوشی ہوتی تھی۔ وہ مجھ سے کہا کرتی۔ ''دیکھ زلیخا، میں نے جس انداز کی زندگی گزار دی۔ وہ تو میرا مقدر ہے لیکن خدا سے میری دعا ہے کہ تجھے ایک پیار کرنے اور تجھے سمجھنے والا شوہر مل جائے۔ تو اپنی حفاظت کرتی رہنا بیٹی ... کیونکہ تو بہت خوبصورت ہے۔''

''اماں، آخر ابا تمہارے ساتھ ایسا سلوک کیوں کرتا ہے؟'' میں پوچھا کرتی۔

''یہ میری قسمت ہے بیٹی۔ اور میں کیا کہہ سکتی ہوں۔''

کچھ دنوں سے ماں کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی اور مجھے ڈر لگا رہتا تھا کہ ماں کے ساتھ کچھ نہ ہوجائے ورنہ میں کہیں کی نہیں رہوں گی۔ میرے باپ کو تو اپنے نشے ہی سے فرصت نہیں ملتی تھی۔

میں جس قدر خوفزدہ تھی، اس سے کہیں زیادہ ماں خوفزدہ تھی۔ وہ سہمی ہوئی رہتی تھی۔ وہ کہا کرتی۔ ''بیٹا، میں بیمار رہنے لگی ہوں۔ اگر مجھے کچھ ہوگیا تو پھر اپنے آپ کو بچانے کی ذمے داری خود تیری ہوگی۔ کیونکہ تیرے باپ کا کوئی بھروسا نہیں ہے، وہ نہ جانے کیا کر بیٹھے۔''

آخر وہی ہوا، جس کا اندیشہ تھا۔

ماں کا انتقال ہوگیا اور میں اپنے باپ کے رحم و کرم پر رہ گئی۔ بہت دنوں تک وہ سیدھا رہا، وقت پر کام کے لیے جاتا، شام کو جلدی گھر واپس آجاتا اور میری دل جوئی کیا کرتا۔

وہ باپ کا فرض ادا کرنے لگا تھا۔

میں بھی خوش تھی کہ میرے باپ کو عقل آگئی ہے لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہیں چل سکا تھا۔ ایک دو مہینوں کے بعد ہی وہ اپنے راستے پر آگیا۔

اس نے نشے کا استعمال دوبارہ شروع کردیا۔ ہوسکتا ہے کہ اس دوران بھی کرتا رہا ہو لیکن اب باقاعدہ گھر پر ہی کرنے لگا تھا۔ میں نے جب ایک بار اس کو برا بھلا کہا تو اس نے مجھے مارنا شروع کردیا۔

واہ، کیا قسمت تھی میری۔ کیا باپ ملا تھا مجھے، بے رحم اور بے حس، اس رات میں اپنی ماں کو یاد کرکے بہت دیر تک روتی رہی تھی۔

ماں کی موجودگی میں میرے باپ کو نہ تو کبھی مجھ پر ہاتھ اٹھانے کی ہمت ہوئی تھی اور نہ ہی اس نے نشے کا استعمال گھر پر کیا تھا، لیکن اب اسے روکنے والا کون تھا۔

کوئی بھی نہیں۔

اور ایک نوجوان آہی گیا۔ وہ راجو کہلاتا تھا۔ میرے ہی محلے کا تھا، دیکھنے میں بہت بانکا سا، ہمیشہ اچھے کپڑوں میں رہتا۔ محلے میں اس کی بہت عزت تھی۔ اس نے میرے باپ سے دوستی کرلی تھی۔ دونوں اکثر ایک دوسرے کے ساتھ دیکھے جاتے۔

کبھی کبھی میرا باپ اسے اپنے گھر بھی لے آتا تھا۔ راجو کبھی خالی ہاتھ نہیں آتا تھا۔ جب بھی آتا اس کے ہاتھ میں پھل یا مٹھائی کے تھیلے ہوتے۔ میں جب اس کے لیے چائے لے کر جاتی تو وہ باپ کی نگاہوں سے اپنی نگاہیں بچا کر مجھے دیکھتا رہتا۔ میں نے ان نگاہوں کا مفہوم اچھی طرح جان لیا تھا۔

بہت کچھ کہتی ہوئی نگاہیں تھیں۔ عورت ایسی نگاہوں کا مفہوم جان لیتی ہے۔ ایک دن وہ اس وقت آیا جب باپ گھر پر نہیں تھا۔ اس شام بھی وہ اپنے ساتھ دو تھیلوں میں کھانے پینے کی بہت سی چیزیں لے کر آیا تھا۔

میں نے دروازے پر اسے بتایا کہ بابا گھر پر نہیں ہے۔ اس نے وہ دونوں تھیلے میری طرف بڑھا دیے۔ ''یہ

[illegible] وغیرہ ہیں۔''

www.pdfbooksfree.pk

''یہ تم اتنا تکلف کیوں کرتے ہو۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے اچھا نہیں لگتا۔''

''ارے تو کیا فرق پڑتا ہے۔'' وہ مسکرا کر بولا۔ ''یہ تو میری عادت ہے۔ مجھے خالی ہاتھ آنا اچھا نہیں لگتا۔''

میں نے مروتاً اس سے کہہ دیا۔ ''آؤ، اندر آکر کچھ دیر انتظار کرلو، ہوسکتا ہے کہ بابا آہی جائے۔''

اس کو بھی شاید اسی موقع کا انتظار تھا۔ وہ جلدی سے اندر آگیا اور آنگن میں اس جگہ بیٹھ گیا جہاں وہ بیٹھا کرتا تھا۔ یہ پہلی بار تھا کہ وہ میرے باپ کی غیر موجودگی میں آیا تھا۔

میں نے جب اس کے لیے چائے لاکر اس کے سامنے رکھی تو اس نے مجھ سے کہا۔ ''زلیخا، ذرا میری بات سن لو۔''

میں اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

وہ چند لمحوں تک میری طرف دیکھنے کے بعد بولا۔ ''کیا تم یہ جانتی ہو کہ میں یہاں کیوں آیا کرتا ہوں؟''

''ظاہر ہے، بابا کے لیے۔'' میں نے کہا۔

''نہیں، بابا کے لیے نہیں، بلکہ تمہارے لیے۔ تمہارے بابا سے دوستی بھی صرف تمہارے لیے کی ہے۔'' وہ بولتا جا رہا تھا۔ ''آج موقع ملا ہے تو تم سے اپنے دل کی بات کہہ رہا ہوں، ورنہ خاموش ہی رہتا۔''

اس کی بات سن کر عجیب سی کیفیت ہوگئی تھی میری۔ سب کچھ پہلی پہلی بار ہی ہو رہا تھا۔ پہلی بار کسی نے مجھ سے اس قسم کی باتیں کی تھیں۔ پہلی بار کسی نے احساس دلایا تھا کہ میں ایک لڑکی ہوں اور مجھے پسند بھی کیا جاسکتا ہے۔

میری دھڑکنیں تیز ہونے لگی تھیں۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ بہت تیزی سے وہ میرے قریب ہو رہا تھا۔ پر اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ کہہ سکتی دروازے پر بابا کے کھانسنے کی آواز آئی اور ہم الگ ہوکر بیٹھ گئے۔

حیرت یہ تھی کہ بابا نے بھی اس بات پر اعتراض نہیں کیا تھا کہ راجو گھر میں کیوں موجود ہے۔ وہ دونوں بے تکلف دوستوں کی طرح ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگے اور میں وہاں سے ہٹ گئی۔

کچھ دن اسی طرح گزر گئے۔ پھر ایک رات بابا نے مجھ سے کہا۔ ''زلیخا، میں نے تیرے لیے ایک بات سوچی ہے جو کچھ میں کرنے جا رہا ہوں وہ میرا فرض ہے اور میں یہ چاہتا ہوں کہ جلد سے جلد اس فرض سے نمٹ جاؤں۔''

میں سمجھ تو گئی تھی کہ بابا کیا کہنے والا ہے، پھر بھی انجان سی بنی رہی۔

''زلیخا، یہ بتا راجو تجھے کیسا لگتا ہے؟'' بابا نے پوچھا۔

''کیوں بابا۔''

''تو میری بات کا جواب تو دے، یہ بتا کیسا ہے وہ؟''

''ٹھیک ہی ہے۔''

''میں نے اس سے تیرے رشتے کا سوچا ہے۔ تجھے کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔''

میں نے اپنی گردن جھکالی۔ شاید قدرت کو مجھ پر رحم آگیا تھا۔ اس لیے بابا نے مجھ سے میرے دل کی بات کہہ دی تھی۔

''جواب دے بیٹا۔'' بابا نے کہا۔

''اب میں کیا جواب دوں بابا۔ جو تمہاری مرضی۔'' میں نے کہا۔ ''جو تم نے میرے لیے سوچا ہے اچھا ہی سوچا ہوگا۔''

''اس رشتے کی بات خود راجو نے ڈالی تھی۔'' بابا نے بتایا۔ ''اس کی طرف میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا، لیکن یہ خود اس کی خواہش ہے۔''

بابا اس کی تعریفیں کر رہا تھا کہ بہت اچھا ہے۔ اس کا اپنا کاروبار ہے۔ خوب آرام سے رکھے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔''

شادی کی تیاریاں کیا کرنی تھیں۔ بے چاری ماں نے جو کچھ سمیٹ کر رکھا تھا، بابا اس کو جہیز کے لیے مجھے دے دیتا۔ یہ بھی بدقسمتی تھی کہ ہمارا کوئی رشتے دار بھی نہیں تھا۔ ورنہ ایسے موقعوں پر رشتے کی عورتیں آکر سارا کام سنبھال لیتی ہیں۔ شادی کی تیاریوں میں مدد دیتی ہیں لیکن میں کس کو بلاتی؟

خود ہی چھوٹی موٹی چیزیں جمع کرتی رہی۔ بابا نے اس موقع کے لیے صرف بیس ہزار دیے تھے۔ بیس ہزار میں ہوتا ہی کیا ہے لیکن اب کیا ہوسکتا تھا۔

بابا کا یہ کہنا تھا کہ محلے کے دو چار آدمیوں کو گھر ہی میں بلا کر نکاح پڑھوادے گا اور وہی تقریب رخصتی کی بھی ہوگی۔ مہمانوں کے لیے بریانی اور زردے کی دو دیگیں آجائیں گی۔ بس، ہوگئی شادی۔

مجھے بھی اور کیا چاہیے تھا۔

چاہے کسی بھی انداز سے ہو۔ راجو کے ساتھ شادی تو ہو رہی تھی، شاید ایک محفوظ زندگی میرا انتظار کر رہی ہو۔

راجو نے اس دوران اپنی شرافت کا مظاہرہ یوں کیا

www.pdfbooksfree.pk

کہ ایک بار بھی میرے گھر نہیں آیا۔ اور نہ ہی اس نے مجھ سے ملنے کی کوشش کی۔

ایک دفعہ رات میں ملاقات ہوئی تو اس نے اتنا ہی کہا۔ ”اب کس بات کی بے صبری، اب تو شادی کے بعد ہی ہم ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے ملیں گے۔

ان دنوں میری خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ شاید میری زندگی میں میرے لیے خوشیوں کے وہی گنے چنے دن تھے جب میں ہواؤں میں اڑتی پھرتی تھی۔

شادی والے دن گھر میں بہت گہما گہمی تھی۔ اس دن محلے کی کچھ عورتیں آ گئی تھیں جنہوں نے مجھے دلہن بنا دیا۔ میری قسمت ایسی کہاں تھی کہ کوئی مجھے بیوٹی پارلر وغیرہ لے جاتا۔

بس ان عورتوں کے پاس جتنا میک اپ تھا وہ انہوں نے مجھ پر صرف کر دیا تھا۔ اس کے باوجود وہ عورتیں میری تعریف کرتے نہیں تھک رہی تھیں۔

آنگن میں دریاں بچھا کر سفید چاندنی بچھا دی گئی تھی۔ ایک طرف دولہا کے لیے قالین اور گاؤ تکیے تھے۔ گلی میں دیگیں پک کر آ گئی تھیں۔

میں ایک کمرے میں دلہن بنی اماں کو یاد کر کر کے روئے جا رہی تھی۔ محلے کی عورتیں میری قسمت پر افسوس بھی کر رہی تھیں۔ لیکن میرے دل کو بس یہ ڈھارس تھی کہ اب شاید میرے دن بدلنے والے ہیں۔

وقت مقررہ پر راجو برات لے کر آ گیا۔

برات کیا تھی، اس کے دوست تھے۔ وہی محلے کے کچھ لوگ۔ مولوی صاحب آئے، میرا نکاح پڑھایا گیا اور راجو سے میری شادی ہو گئی۔

اس طرح میری زندگی کا ایک دور ختم ہوا اور دوسرا شروع ہوا۔

پہلا دور بہت پریشانیوں کا تھا۔ اماں اور بابا کے جھگڑے، اماں کے آنسو، اور بابا کی گالیاں چیخم دھاڑ، گھر کے آنگن میں ناچتی ہوئی مفلسی، باپ کا نشے کا عادی ہونا، وغیرہ وغیرہ۔

اور دوسرا دور راجو کی بیوی بن کر اس کے ساتھ زندگی گزارنا تھا۔

راجو نے اس محلے سے ہٹ کر ایک دوسرے محلے میں کرائے کا ایک مکان لے لیا تھا، میں کتنی خوش تھی۔ ایک پیار کرنے والا شوہر، ایک چھوٹا سا مکان، کرائے کا سہی، اور ایک ہنستی کھیلتی زندگی۔

ہم ہر ہفتے کہیں نہ کہیں سیر کے لیے چلے جاتے۔ کبھی چڑیا گھر، کبھی سفاری پارک اور کبھی ساحل کی طرف، کبھی کبھی بابا بھی آ جاتا تھا۔

جب بابا آتا تو راجو اور بابا دونوں کہیں چلے جاتے۔ اس رات راجو دیر گئے گھر آیا کرتا تھا لیکن مجھے اس پر اعتراض نہیں تھا۔

وہ کسی اور کے ساتھ تو نہیں جاتا تھا۔ بابا ہی کے ساتھ جاتا تھا۔

ایک دن پتا چلا کہ بابا اپنے گھر میں مردہ پایا گیا ہے، کئی دنوں کے بعد جب گھر سے بدبو اٹھنے لگی اور محلے والے پریشان ہو گئے تو آنگن والا دروازہ توڑ دیا گیا۔

بابا کی دو تین دنوں پرانی لاش صحن میں ہی پڑی ہوئی تھی۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے ظاہر ہوا تھا کہ دیسی شراب بہت زیادہ پی جانے سے اس کی موت ہوئی ہے۔ میرے لیے بہت شرمندگی کی بات تھی۔

میں بابا کی زندگی میں کبھی اتنی ذلیل نہیں ہوئی تھی جتنی ذلت اس کی موت نے دے دی تھی۔ لیکن کیا ہونا تھا، اس کی آخری رسومات ہم دونوں نے ادا کی... اور اس گھر کو تالا لگا کر واپس آ گئے۔

اب وہ گھر قانونی طور پر میری ملکیت تھی کیونکہ میں اکلوتی وارث تھی۔ اس گھر کی قیمت کوئی زیادہ تو نہیں تھی۔ پھر بھی ایک آسرا تھا۔

ہم نے اس گھر کو کرائے پر لگا دیا تھا، تین ہزار کرائے کے طور پر ملنے لگے تھے۔

اس دوران میں ایک بچی کی ماں بن چکی تھی۔ مجھے بچپن میں دیکھنے والوں کا یہ کہنا تھا کہ وہ بچی بالکل میری طرح ہے۔

ویسا ہی سبک چہرہ، خوبصورت نقش و نگار اور چمکتا ہوا رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، غرضیکہ میری عذرا ایک حسین بچی تھی۔ راجو بھی اس کو دیکھ دیکھ کر نہال ہوا جاتا تھا۔

سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا، پھر خرابی اس دن سے شروع ہوئی جب راجو ایک آدمی منیر کو گھر لے آیا، وہ ایک شوباز قسم کا آدمی تھا۔ اس کی قمیص پر سونے کے بٹن لگے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں بہت قیمتی گھڑی تھی۔ جس کے بارے میں راجو نے بتایا کہ پورے تین لاکھ کی ہے۔

وہ شخص پہلے ہی دن سے مجھے بہت برا لگا تھا۔ اس [illegible] ایسا تھا جیسے قصائی بکرے کا جائزہ لے رہا ہو۔ اس نے راجو پر خدا جانے کون سا جادو کر رکھا تھا کہ راجو کو اس کے بغیر چین نہیں آتا تھا۔

وہ ہر ہفتے کی شام ہمارے یہاں کھانے پینے کی ڈھیروں چیزیں لے کر آ جاتا۔ یہ عام طور پر مہنگے مہنگے ہوٹلوں کی چیزیں ہوتی تھیں۔

کسی ہفتے وہ زبردستی ضد کر کے ہمیں اپنے ساتھ آؤٹنگ پر لے جاتا۔ اس کے پاس سفید رنگ کی ایک ٹویوٹا تھی۔ راجو نے اس کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ ایک ٹھیکیدار ہے، اور بہت پیسے والا ہے۔

وہ چاہے جیسا بھی ہو۔ میرے لیے وہ ایک ایسے آکٹوپس کی طرح تھا جو آہستہ آہستہ مجھے اپنی گرفت میں لینے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔

میں نے ایک دو بار راجو کو اس کے رویّے کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے میری بات پر دھیان ہی نہیں دیا۔ یا بات کچھ اور تھی جس کا اندازہ مجھے بعد میں ہوا تھا۔

ایک رات راجو گھر سے باہر تھا کہ منیر گھر آ گیا۔

مجھے اس کا آنا برا لگا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے ساتھ شراب کی بوتل لے کر آیا تھا اور کھانے پینے کی چیزیں بھی۔ میں نے اس کو ٹالنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ زبردستی اندر آ گیا۔

مجھے اس کا رویّہ بہت برا لگا تھا۔ میں اس کو ایک کمرے میں بٹھا کر دوسرے کمرے میں آ کر اپنی بچی کی دیکھ بھال میں لگ گئی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ بھی اسی کمرے میں آ گیا، اس کے پاؤں ڈگمگا رہے تھے۔

”منیر صاحب، پلیز، آپ دوسرے کمرے میں جا کر بیٹھیں۔“ میں نے کہا۔ ”آپ یہاں کیوں چلے آ رہے ہیں۔“

”ارے، تم کس طرح کی بات کر رہی ہو۔“ وہ لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”میں تمہارے لیے کوئی غیر تو نہیں ہوں۔“

”آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں“ میں نے غصے سے کہا۔ ”جائیں چلے جائیں یہاں سے۔“

”کیوں چلا جاؤں، پورے دس ہزار روپے دیے ہیں تمہارے شوہر کو۔“ اس نے بتایا۔

”کیا مطلب“ میں اس کی بات سن کر دنگ رہ گئی تھی۔ یہ آپ کیا بکواس کر رہے ہیں۔“

”بکواس نہیں ہے میری جان! خود سوچو، راجو اچانک کیوں چلا گیا۔ وہ ابھی تک واپس کیوں نہیں آیا۔ اس کو تو آ جانا چاہیے تھا۔ لیکن آج اس کی جیب میں پورے دس ہزار ہیں وہ کہیں اور عیش کر رہا ہوگا۔“

میں نے میز پر رکھی ہوئی ایک بوتل اٹھا لی۔ ”کمینے، تو ابھی اسی وقت کمرے سے نکل جا، ورنہ میں یہ بوتل تیرے سر پر توڑ دوں گی۔“

اس نے ہنستے ہوئے اچانک بستر پر پڑی ہوئی میری بچی عذرا کو گود میں اٹھا لیا۔ ”ٹھیک ہے، تو یہ بوتل میرے سر پر توڑ دے۔ میں اس بچی کو جان سے مار دوں گا۔“

”خدا کے لیے چھوڑ دو میری بچی کو۔“ میں نے اس کے آگے اپنے ہاتھ جوڑ لیے۔ ”چھوڑ دو میری بچی کو۔“

”اب یہ بچی اس طرح تو نہیں چھوٹے گی۔“ بہت مکروہ ہنسی تھی اس کی۔ ”اب تو یہ اسی وقت تمہارے پاس جائے گی جب تم میری بات مانو گی۔“

میرا خیال ہے کہ میری جگہ دنیا کی کوئی بھی عورت ہوتی تو وہ اپنی اولاد کی وجہ سے مجبور ہو جاتی۔ اس ذلیل نے میری ممتا سے کھیلنے کی کوشش کی تھی۔

میں نے اس کی کمینگی کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا۔ وہ مجھے توڑ مروڑ کر چلا گیا۔ راجو کی واپسی رات دیر سے ہوئی تھی۔ میں اس وقت بھی بری طرح روئے جا رہی تھی۔

”ارے کیا بات ہو گئی ہے“ راجو نے پوچھا۔

میں نے اسے منیر کی زیادتیوں کے بارے میں بتا دیا۔ میرا خیال تھا کہ یہ سب سن کر وہ بھڑک اٹھے گا۔ منیر کا خون کر دے گا۔ یا کم از کم اس کو اتنا مارے گا کہ اس کے ہوش ٹھکانے آ جائیں گے۔ اس کے برعکس اس نے مجھے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ ”ارے تو کیا ہو گیا۔ اس میں اتنا رونے دھونے کی کیا ضرورت ہے۔“

”راجو!“ مجھے جیسے سکتہ سا ہو گیا تھا۔ ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ یہ کیسی بے غیرتی کی بات کر رہے ہو۔“

”ارے سب ٹھیک ہے۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔ ”کوئی آسمان نہیں ٹوٹا ہے اور یہ تو دیکھو، اس نے تمہارے لیے بیس ہزار روپے بھی دیے ہیں۔“

اس نے اپنی جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور میں نے میز پر رکھی ہوئی بڑی سی چھری اٹھا کر پوری قوت کے ساتھ اس کے سینے میں اتار دی۔

www.pdfbooksfree.pk

وہ ایک کریہہ چیخ کے ساتھ ایک طرف [illegible]

اس وقت ایک وحشیانہ جنون سا سوار ہوگیا تھا۔ میں نے اس پر وار کرنے شروع کردیے۔ ایک بار دوبار دس بار۔

اس کی کربناک چیخوں نے پورے محلے کو جمع کردیا تھا۔

اس کو مار ڈالنے کے بعد میں نے ..... چھری ایک طرف پھینک دی اور عذرا کو اپنے سینے سے لگا کر زور زور سے رونے لگی۔

اس کے بعد صرف ایک دھندسی باقی رہ گئی تھی۔ کب پولیس آئی، کب مجھے تھانے پہنچادیا گیا، مجھے کوئی ہوش نہیں تھا۔ بس جیسے میں ایک خواب کے عالم میں سفر کررہی تھی۔

اگر ہوش تھا تو صرف اس بات کا کہ مجھے اپنی بچی کو خود سے ایک پل کے لیے بھی جدا نہیں کرنا ہے۔ اس کو سینے سے لگائے رکھنا ہے۔

یہ میری زندگی کی کہانی کا دوسرا باب تھا۔ پہلا باب ماں کی موت، پھر شادی اس کے بعد باپ کی موت تک تھا۔ اور دوسرا باب راجو کے ساتھ اس کے گھر میں زندگی گزارنا تھا، اپنی پیاری سی بچی کے ساتھ۔ پھر منیر کا مجھے تاراج کرنا اور میرے ہاتھوں راجو کی موت تک تھا۔

اس کے بعد میری زندگی کا تیسرا دور شروع ہوا۔ یہ ایک بہت مختلف دور تھا۔ مجھے سات سال کی سزا ہوئی تھی۔ مجھے سات سال جیل میں اپنی بچی کے ساتھ گزارنے تھے۔ جو اس وقت صرف تین برس کی تھی۔

یہ سات سال میرے لیے سات صدیوں کے برابر تھے۔

چونکہ میرا کوئی بھی نہیں تھا۔ اس لیے حکام نے مجھے اجازت دے دی تھی کہ میں اپنی بچی عذرا کو اپنے ساتھ رکھ سکتی ہوں۔

جیل کے شب وروز بہت سخت اور خطرناک تھے۔ وہ ایک زنانہ جیل تھی۔ جس کی وارڈن ہٹلر کہی جاتی تھی۔ انتہائی ظالم اور بے رحم۔

وہ دیکھنے ہی سے خوفناک معلوم ہوتی۔ اس کی آواز بھی بہت کرخت تھی۔ ایک سے ایک گالیاں اسے ازبر تھیں۔ اس کے ہاتھ میں بید کی ایک چھڑی ہوا کرتی تھی، لچکتی ہوئی، ذرا ذرا سی بات پر وہ کسی کو بھی دھنک کر رکھ دیتی تھی۔ کہا جاتا تھا کہ وہ چند اعلیٰ حکام کی منظورِ نظر ہے۔ اس لیے اس کے خلاف کوئی شنوائی نہیں ہوتی تھی۔

وہ منظورِ نظر کیوں تھی۔ اس کا پتا جیل میں آنے کے دو مہینے کے بعد ہوا تھا۔ جب ایک رات اس نے مجھے اپنے [illegible]

اس وقت وہ کسی عفریت کی طرح بید اپنے ہاتھ میں لیے اپنی کرسی پر بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے اپنی چھڑی میز پر مارتے ہوئے کہا۔ ''اوئے بات سن، آج رات تجھے کہیں جانا ہے۔''

''مجھے جانا ہے...'' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''مجھے کہاں جانا ہے؟''

''اپنے باپ کے پاس۔'' وہ غصے سے دہاڑی۔ ''تجھے لیاقت صاحب کے پاس جانا ہے۔ ان کی کوٹھی میں ان کے ساتھ رات گزارنا ہے۔ جانتی ہے، یہ لیاقت صاحب کون ہیں، بہت بڑے آفیسر ہیں۔''

''دیکھیں میڈم، اگر مجھے یہی کرنا ہوتا تو پھر مجھے اپنے شوہر کو مارنے کی ضرورت کیا تھی۔''

''اوہو، تُو تو اس طرح کہہ رہی ہے جیسے بہت ستی ساوتری ہے۔'' وہ غرائی۔ ''یاد رکھ، اگر بات نہیں مانی تو تیرا وہ حشر کروں گی کہ زندگی بھر یاد رکھے گی۔''

اس نے صرف کہنے پر اکتفا نہیں کی۔ بلکہ اپنی چھڑی اٹھا کر مجھے مارنا شروع کردیا۔ میری چیخیں گونج رہی تھیں۔ لیکن کوئی بھی بچانے والا نہیں تھا۔

میں جب مار کھاتے کھاتے نیم بے ہوش ہوگئی تو اس نے دو آدمیوں کو بلا کر حکم دیا۔ ''جاؤ، اس کو اسی حال میں لیاقت صاحب کے پاس لے جاؤ۔''

مجھے گھسیٹتے ہوئے لے جایا گیا۔ پھر وہ لیاقت میرے ٹوٹے ہوئے جسم کو پامال کرتا رہا۔ میں کچھ بھی نہیں کرسکی۔ اس وقت پتا چلا کہ وہ وارڈن اعلیٰ حکام کی منظورِ نظر کیوں ہے۔

وہ اس طرح جوان عورتوں کو رشوت کے طور پر پیش کردیا کرتی تھی۔ جس کے نتیجے میں اس پر انگلیاں اٹھانے والا کوئی نہیں ہوتا تھا۔

اس کے بعد تو یہ سلسلہ شروع ہی ہوگیا۔ صاحب لوگ جیل کے معائنے کے لیے آتے اور مجھے پسند کرکے چلے جاتے اور مجھے ان کے حضور پیش کردیا جاتا۔

میری بچی اسی ماحول میں بڑی ہورہی تھی۔

جب وہ جیل میں آئی تو تین برس کی تھی اور اب نو برس کی ہوچکی تھی۔ خدا نے اس کو بے مثال حسن دیا تھا۔ جس طرح مجھے دیا تھا۔

نہ جانے کیوں جیل کے گھٹے ہوئے ماحول میں رہنے کے باوجود، روکھی سوکھی کھانے کے باوجود دس برس تک

www.pdfbooksfree.pk

آتے آتے وہ بہت گداز بدن کی ہو چکی تھی۔

اس بدنصیب کو تو میرے ساتھ ہی رہنا تھا۔ جب تک میں آزاد نہ ہو جاؤں اس کو آزادی نہیں ملنے والی تھی۔ میں کسی محافظ کی طرح اس کی نگرانی کرتی رہتی۔

اِدھر مت جاؤ۔ اُدھر مت جاؤ، اس عورت سے بات مت کرو۔ وغیرہ۔ اس جیل میں کچھ بدفطرت عورتیں بھی تھیں۔ جن کے ہر انداز سے بدمعاشی ظاہر ہوتی۔

میں اپنی ہر ممکن کوشش کرتی تھی کہ اسے بیرکس میں ہی رکھوں، باہر نہ نکلنے دوں۔ لیکن ایک مجبور قیدی عورت کر بھی کیا سکتی تھی۔

ایک دن وارڈن نے مجھ سے کہا۔ ''تیری بیٹی تو بہت غضب کی نکلی ہے۔''

''ہاں میڈم۔'' میں نے گہری سانس لی۔ ''اس لیے اس کی طرف سے ڈر لگا رہتا ہے۔ خدا جانے اس کے نصیب میں کیا ہے۔''

''بہت اچھا نصیب ہے اس کا۔'' وارڈن مسکرا کر بولی۔ ''دو چار سال اور بڑی ہو جائے تو اس کے چاہنے والے تجھے ایک رات کے ہزاروں دیا کریں گے۔''

میں بھک سی ہو کر رہ گئی۔ جیسے کسی نے مجھے خنجر مار دیا ہو۔ میں تڑپ اٹھی تھی۔ ''میڈم، ایسا نہ کہیں۔''

''اور کیا کہوں۔ جیل سے نکلنے کے بعد بھی تیری بدنامی تو تیرے ساتھ رہے گی۔'' اس نے کہا۔ ''اس معاشرے میں کون قبول کرے گا تیری بیٹی کو۔ کوئی بھی نہیں۔ کیونکہ سب کو معلوم ہو گا کہ تو کون ہے۔ پھر کیا ہو گا، یہی ہو گا نا کہ یہ لوگوں کو خوش کرنے کے کام آئے گی۔''

مجھ سے اب اس کی بکواس برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے قریب رکھی ہوئی بوتل اٹھا کر دیوار پر مار کر اسے توڑا اور اس عورت پر حملہ کر دیا۔

اس نے میرا وار اپنی کلائی پر روکا، اس کی کلائی کٹ گئی تھی۔

پھر میں اس پر دوسرا وار نہیں کر سکی۔

اس نے مجھے قابو کر لیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے محافظوں کو بلا لیا۔ اس کے بعد میری جو گت بنی ہے وہ میں ہی جانتی ہوں۔ سب مل کر مجھے اس بری طرح مار رہے تھے کہ چیختے چیختے میرا گلا بیٹھ گیا تھا۔

مجھے اسی حالت میں اٹھا کر بیرک میں پھینک دیا گیا۔

میری بچی مجھ سے لپٹ کر رونے لگی۔ اس سے میرا یہ حال نہیں دیکھا جا رہا تھا۔

میں کئی دنوں تک کروٹ تک بدلنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ اتنا ظلم ہوا تھا مجھ پر۔۔۔ کس کے لیے، بچی کے لیے۔ میں اس کے لیے کوئی غلط بات تو برداشت کر ہی نہیں سکتی تھی۔

چار دنوں کے بعد وارڈن پھر میرے پاس آئی۔ اس وقت اس نے مجھ سے بہت گھناؤنی بات کی۔ وہ ایک بار پھر عذرا کے بارے میں بات کر رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''میں تیری بیٹی کو اپنے ساتھ لے جا رہی ہوں۔''

''اپنے ساتھ۔'' میں کانپ کر رہ گئی۔ ''کہاں لے جا رہی ہیں؟''

''گھبرانا مت۔ اس کو کسی مرد کے حوالے نہیں کروں گی، اپنے ساتھ رکھوں گی۔'' پھر اس نے کچھ فحش قسم کی باتیں کیں۔

''جس وقت یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ ہم اس وقت بیرک کے باہر کیاریوں کے پاس کھڑے تھے۔ مجھے جھاڑیاں کاٹنی تھیں۔ اس لیے کلہاڑی میرے ہاتھ میں تھی اور میری جان، میری بیٹی بھی میرے پاس ہی تھی۔

اس کی باتیں سن کر میں نے کلہاڑی اٹھائی اور..... اپنی بچی کے بدن میں اتار دی۔ اس کی خوبصورتی کی نگہبانی اس کی موت ہی کر سکتی تھی۔

اس کی موت ہونا ک نگاہوں اور ہاتھوں سے اسے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیتی۔ وہ مر کر محفوظ ہو گئی۔ پھر میں نے اس کلہاڑی سے اپنے آپ کو مارنا چاہا لیکن کلہاڑی مجھ سے چھین لی گئی تھی۔

اس کے بعد پھر مجھے ہوش نہیں رہا کہ میں کون ہوں اور کہاں ہوں۔

کہتے ہیں کہ مجھے سات سال تک پاگل خانے میں رکھا گیا تھا۔ اس کے بعد جانے کی آزادی دے دی گئی۔ لیکن میں کہاں جاتی بے سہارا عورتوں کو سہارا دینے والی ایک این جی او مجھے اپنے ساتھ لے آئی۔ اور اب میں ان ہی کے ساتھ ہوں اور اس این جی او کو اپنی کہانی سنا رہی ہوں جسے ایک لڑکی لکھ رہی ہے۔

لوگ مجھے قاتل اور خونی کہتے ہیں۔ میں نے پہلے اپنے شوہر کو مارا، پھر اپنی بچی کا خون کر دیا، تو کیا میں ایسی ہی ہوں۔ خونی اور قاتل؟

نہ جائے رفتن

مکرمی مدیر اعلیٰ
تسلیم و نیاز

بعض واقعات ایسے مضحکہ خیز ہوتے ہیں جن پر ہنسی آتی ہے لیکن سر پیٹنے کو دل کرتا ہے۔ اب اسی واقعہ کو لے لیں۔ اگر میں اس کا ایک کردار نہ ہوتا تو یقیناً مسکرا کر بھول جاتا لیکن کئی سال پر محیط یہ واقعہ بھلائے نہیں بھولتا۔ امید ہے قارئین کو بھی پسند آئے گا۔

فریدی
(کراچی)

یہ واقعہ چونکہ میرے سامنے پیش آتا رہا ہے۔ اسی لیے آپ مجھے اس کہانی کا ایک کردار سمجھ لیں یا چشم دید گواہ سمجھ لیں۔ صرف چالیس گز کا کوارٹر تھا۔

خود سوچیں چالیس گز ہوتا ہی کیا ہے۔ صرف ایک کوٹھڑی۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا باورچی خانہ اور اس کے ساتھ ہی ٹوائلٹ۔ یعنی چالیس گز ختم۔ نہانے دھونے کے لیے محلے کے نکلے پر جانا پڑتا تھا۔

دونوں باپ بیٹے اس چالیس گز کی کوٹھری میں زندگی کے دن گزار رہے تھے۔ باپ بے چارہ بیمار رہتا تھا۔ رات بھر کھانستا رہتا۔ اس کے کھانسنے کی آوازیں پورے محلے میں

www.pdfbooksfree.pk

گونجتی رہتی تھیں۔

میں ان کے کوارٹر سے کچھ فاصلے پر ایک بڑے کوارٹر میں رہتا تھا۔ میرا کوارٹر بڑا اس طرح ہوگیا تھا کہ والد صاحب نے تین کوارٹر ایک ساتھ خرید لیے تھے۔ اس طرح میرے پاس ایک سو بیس گز زمین تھی جو اچھی خاصی ہوتی ہے۔

والد صاحب نے اس پر نئی تعمیر بھی کروادی تھی۔ اس طرح میرا گھر اس گلی کا سب سے اچھا گھر ہوگیا تھا۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد میں اپنی ایک چھوٹی بہن اور والدہ کے ساتھ رہتا تھا۔

میں ان دونوں کو دیکھ کر بہت افسوس کیا کرتا۔ کوئی مشورہ اس لیے نہیں دے سکتا تھا کہ مشورہ دینے کا فائدہ ہی نہیں تھا۔ ویسے یہ سوچ کر ہی وحشت ہوتی تھی کہ دونوں باپ بیٹے ایک تنگ سی کوٹھری میں زندگی گزار رہے ہیں۔

باپ کا نام شبراتی تھا اور بیٹے کا نام رمضان۔ پتا نہیں ایسے نام کیوں رکھے جاتے ہیں۔ میں نے ایک دن رمضان سے پوچھا۔ ”یار رمضان، یہ تم دونوں باپ بیٹے کے نام ایسے کیوں ہیں۔ اسلامی تہواروں پر۔“

رمضان ہنس پڑا۔ ”فریدی بھائی، تم کو میری بہن کا نام تو معلوم ہی نہیں۔ وہ بے چاری بچپن ہی میں انتقال کرگئی تھی۔“

”اچھا، کیا نام تھا اس کا؟“

”عیدن۔“ اس نے بتایا۔ ”ہم پیار میں اسے عیدو عیدو کہتے تھے۔“

ایک رات میں نے رمضان کی چارپائی باہر گلی میں اس کے دروازے کے پاس دیکھی۔ اس وقت وہ جاگ ہی رہا تھا۔ میں نے اُدھر سے گزرتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا بات ہے رمضان، تم باہر کیوں سو رہے ہو؟“

”کیا بتاؤں فریدی بھائی۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”محلے والوں نے زندگی عذاب کردی ہے۔“

”کیوں، محلے والوں نے کیا کہا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”کم بخت طرح طرح کی باتیں بنا رہے تھے۔“ رمضان نے کہا۔ ”ایک چھوٹی سی کوٹھری میں بیمار باپ کو رکھا ہوا ہے۔ بے چارہ ڈھنگ سے سانس بھی نہیں لے سکتا۔ وہ تو گھٹ کر مر جائے گا اور بھی اسی قسم کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اسی لیے ہم دونوں باپ بیٹے نے یہ فیصلہ کیا کہ آیندہ سے میں باہر ہی سویا کروں گا۔ کچھ تو زبان بند ہوگی کم بختوں کی۔“

”واقعی رمضان تم ایک سعادت مند اولاد ہو۔“ میں نے اسے شاباش دی۔ ”ورنہ آج کل کی اولاد کہاں اتنا خیال رکھتی ہے۔“

رمضان میری حوصلہ افزائی سے بہت خوش ہوا تھا۔

اس کے بعد وہ بے چارہ باہر گلی ہی میں سوتا رہا۔ میں رات کے وقت جب بھی اُدھر سے گزرتا اس سے گپ شپ کرلیا کرتا تھا۔ ایک رات جب وہ اپنے چہرے پر کمبل ڈالے سو رہا تھا میں نے اس کے پاس جاکر آواز دی۔ ”رمضان! رمضان! سو گئے کیا۔“ اس نے چہرے پر سے کمبل ہٹا دیا۔ وہ رمضان نہیں بلکہ شبراتی تھا۔ رمضان کا باپ۔

”ارے چاچا، خیریت تو ہے!“ میں نے حیران ہوکر پوچھا۔ ”تم باہر کیوں سو رہے ہو؟“

”بیٹا، کم بخت محلے والوں کی وجہ سے۔“ شبراتی نے بتایا۔

”کیوں، محلے والے کیا کہہ رہے ہیں؟“

”زندگی عذاب کردی ہے۔ کہہ رہے ہیں کیا بے رحم باپ ہے جو خود تو اندر کمرے میں سوتا ہے اور بیٹے کو باہر گلی میں پھینک دیا ہے۔ بس بیٹا ہم دونوں باپ بیٹے نے یہی فیصلہ کیا کہ اب میں باہر سویا کروں گا۔“

”چاچا، مجھے تم دونوں کی محبت نے بہت متاثر کیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”بس بیٹا، یہی زندگی رہ گئی ہے۔ اب جیسی بھی گزرے، اس کا احسان ہے۔“

بوڑھا شبراتی پھر باہر ہی سوتا رہا۔ رمضان سے ملاقات ہوئی تو وہ کچھ بے چین سا دکھائی دیا۔ ”فریدی بھائی، محلے والوں نے پھر بولنا شروع کردیا ہے۔“

”اب کیا بول رہے ہیں؟“

”یہی کہ کیسا بے رحم بیٹا ہے۔ جس نے اپنے باپ کو گلی میں سونے کے لیے مجبور کردیا ہے۔ بے چارہ بوڑھا سردی کی رات میں رات بھر کھانستا رہتا ہے۔“

”ہاں یہ تو ہے۔ ٹھنڈ تو شروع ہوچکی ہے۔“ میں نے کہا۔

”اب آپ ہی مشورہ دیں، ہم کیا کریں۔“

”میں اب کیا کہہ سکتا ہوں۔“ میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم دونوں خود ہی سوچ کر کوئی راستہ نکالو۔“

اس ہفتے میں نے دیکھا کہ دونوں نے ایک راستہ نکال ...تھا۔

دونوں ہی باہر سونے لگے تھے۔ دونوں کی چارپائیاں گلی ...آ گئی تھیں۔ ”یار... رمضان، یہ کیا حماقت ہے؟“ میں نے ...ن سے پوچھا۔

”یہ حماقت نہیں عقلمندی ہے۔“ رمضان نے کہا۔ ”اب ...ئی الزام نہیں لگا سکتا کہ باپ نے بیٹے کو باہر سلایا ہے ...نے باپ کو کیونکہ اب دونوں ہی باہر ہیں۔“

میں کئی راتوں تک یہ سلسلہ دیکھتا رہا۔ دونوں کی ...پائیاں گلی میں رکھ دی جاتیں۔ بستر بچھائے جاتے اور ...باپ بیٹے اپنی اپنی چارپائی سنبھال لیتے۔

بوڑھے شبراتی کے کچھ دوست بھی تھے۔ اسی کی عمر کے۔ ...ں وہاں آجاتے اور ایک چوپال سی جم جاتی۔ بے چارہ ...ن اپنے باپ اور اس کے دوستوں کے لیے چائے وغیرہ کا ...بست کردیا کرتا۔

وہ محلہ ایسا تھا کہ لوگ وہاں برسوں سے ایک دوسرے ...ساتھ رہ رہے تھے۔ ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ...۔ اسی لیے سب ایک دوسرے پر اعتماد بھی کرتے تھے۔ محلے ...بہو بیٹیاں راستے سے گزرا کرتی تھیں لیکن انہیں کسی قسم کی ...شکایت نہیں ہوتی تھی۔

کچھ دنوں کے بعد ایک رات دونوں چارپائیاں غائب ...ریں۔ یعنی کوارٹر سے باہر کوئی چارپائی نہیں تھی۔ میں نے ...ے دن رمضان سے پوچھا۔ ”کیا ہوا رمضان، خیریت تو ...۔ رات تم دونوں کہیں گئے ہوئے تھے کیا؟“

”نہیں تو۔ ہم دونوں اندر ہی کوٹھری میں سوئے ہوئے ...“

”اندر سوئے تھے۔“

”ہاں فریدی بھائی۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ...روہی محلے والے۔“

”کیوں، اب کیا کہہ رہے ہیں محلے والے؟“

”کہہ رہے ہیں۔ دیکھو دونوں بے وقوفوں کو۔ گھر ...ے ہوئے گلی میں سو رہے ہیں اور ایک رات دونوں سردی ...اکڑے ہوئے ملیں گے۔“

”یہ کیا بات ہوئی۔ یعنی کہانی وہیں پہنچ گئی جہاں سے ...ع ہوئی تھی۔“

”ہاں فریدی بھائی، یہی ہوا ہے۔ اب ہم دونوں پھر

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 7,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 6,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کردیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے
بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔
رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

www.pdfbooksfree.pk

اس کوٹھری میں ہیں۔"

"دیکھو، اگر تم دونوں اسی طرح کرتے رہے تو ایک دن خرچ ہو جاؤ گے۔ محلے والے چاہے اب کچھ بھی بولتے رہیں۔ تم اب کوٹھری سے باہر نہیں نکلنا۔"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

ایک دن رمضان نے میرے سامنے ایک بہت ٹیڑھا مسئلہ رکھ دیا۔ "فریدی بھائی، میں تو بہت چکر میں پھنس گیا ہوں۔ اب تم ہی مشورہ دو کہ میں کیا کروں۔"

"اب کیا مسئلہ ہو گیا تمہارے ساتھ؟" میں نے پوچھا۔

"یہ بہت ہی ٹیڑھا مسئلہ ہے۔" رمضان نے کہا۔ "میرے ابا میری شادی کروانے کے چکر میں ہیں۔ انہوں نے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے کہ میں کسی بھی حال میں شادی کر لوں۔"

"تو اس میں پریشانی کیا ہے، کر لو شادی۔"

"فریدی بھائی، تم تو سارے حالات جانتے ہو۔ شادی کر لی تو ابا کہاں رہے گا۔ اس کو پھر باہر گلی میں سونا پڑے گا۔ اس کے بعد کیا ہو گا۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔ یہ تو واقعی بہت ٹیڑھا مسئلہ ہے۔"

رمضان منہ ہی منہ میں کچھ بولتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔ شاید وہ بے چارہ اپنی قسمت کو برا بھلا کہہ رہا ہو گا۔

کچھ دنوں کے بعد اس کی شادی ہو گئی۔ بہت چھوٹی سی تقریب تھی جس میں گنتی کے کچھ لوگوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ ان میں سے ایک میں بھی تھا۔

اس کا بوڑھا باپ اس وقت بھی کھانس رہا تھا اور میں اسے دیکھ کر افسوس کر رہا تھا کہ اس کھانستے ہوئے بوڑھے کو ایک بار پھر گلی میں اپنا پلنگ بچھانا ہو گا۔ ظاہر ہے کہ وہ بیٹے اور بہو کے ساتھ کمرے میں تو نہیں رہ سکتا۔

لیکن اس کے برعکس ایک اور بات ہو گئی۔

رمضان کا پلنگ پھر باہر آ گیا۔ حالانکہ رمضان اور اس کی بیوی نے کوارٹر کے دروازے کے باہر پلنگ ڈال کر اسے چاروں طرف سے کپڑے سے اس طرح کور کر دیا تھا جیسے کوئی کمرا بنا دیا گیا ہو۔

دو دن تو خیریت سے گزر گئے۔ تیسرے دن رمضان بہت پریشان ہو کر میرے پاس آیا۔ "فریدی بھائی، میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اب میں کیا کروں۔"

"کیوں اب کیا بات ہو گئی۔"

"محلے والے یہ کہہ رہے ہیں کہ میں اس طرح باہر پلنگ ڈال کر پورے محلے کا ماحول کو خراب کر رہا ہوں۔" اس نے کہا۔ "محلے کے لونڈے کم بخت اندھیرے میں گلی میں بیٹھے رہتے ہیں۔"

"یہ بات تو ہے رمضان۔" میں نے کہا۔ "اس بار محلے والوں کا اعتراض بالکل درست ہے۔"

"تو پھر بتاؤ، کیا کروں۔"

"اب میں کیا بتا سکتا ہوں۔ تم لوگ خود ہی کوئی راستہ نکالو۔"

اس بے چارے نے راستہ یہ نکالا کہ تیسرے دن سے اپنے باپ کو گلی میں سلانا شروع کر دیا۔ خیال تھا کہ شاید اب محلے والے اس کا پیچھا چھوڑ دیں لیکن ایسا کیسے ہو سکتا تھا۔

ایک بار پھر وہی اعتراض کہ بے چارہ باپ تو باہر گلی میں سو رہا ہے اور دونوں میاں بیوی کمرے میں عیش کر رہے ہیں۔

تنگ آ کر رمضان نے باپ کو بھی کمرے میں بلا لیا۔ اب وہ تینوں ایک ہی کوٹھری میں تھے۔ اس پر وہ طوفان اٹھا کہ بے چارہ رمضان بلبلا کر رہ گیا۔ اب یہ کہا جا رہا تھا کہ بڈھے باپ کی بے غیرتی دیکھو کہ شادی شدہ بیٹے اور بہو کے ساتھ ایک ہی کمرے میں گھس کر سویا رہتا ہے۔ یہ سب قیامت کی نشانیاں ہیں۔ ایسے لوگوں کی وجہ سے برکتیں ختم ہو گئیں ہیں اور خدا کا عذاب نازل ہونے لگا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

رمضان نے بہت ہی پریشان ہو کر مجھ سے فریاد کی۔ "فریدی بھائی، اب بتائیں، اب میں کیا کروں۔ اب تو کوئی راستہ ہی نہیں رہ گیا ہے۔"

"اب میں تمہارے لیے سوائے دعاؤں کے اور کچھ نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا۔

پھر ایک دن پتا چلا کہ رمضان کا باپ سخت بیمار ہو کر اسپتال پہنچ گیا ہے اور اس بیماری کے عالم میں ایک ہی ہفتے میں اس کا انتقال ہو گیا۔

مجھے اس شخص کی موت کا افسوس بھی تھا۔ لیکن یہ خیال بھی تھا کہ اب بے چارے رمضان کو سکون مل جائے گا کیونکہ بے چارہ باپ ہی نہیں رہا تھا۔ لیکن توبہ کریں۔ باپ کی موت کے بعد پورا محلہ دو واضح گروہوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔

ایک گروہ کا کہنا تھا کہ بے چارہ رمضان اب تباہ ہو گیا ہے۔ باپ کا سہارا ختم ہو گیا ہے۔ اب وہ زندگی بھر دعاؤں کے لیے ترستا رہے گا۔ باپ تھا تو مشورے دیتا رہتا تھا جبکہ

www.pdfbooksfree.pk

سلطان آشفتہ

(1939-1995ء) پنجابی کے ممتاز ادیب اور شاعر۔ وہ پھلانا تک (لوہاری منڈی) لاہور میں پیدا ہوئے۔ تعلیم لاہور ہی میں حاصل کی۔ 1953ء میں بہ سلسلہ ملازمت سعودی عرب چلے گئے اور وہاں عربین آئل کمپنی میں خدمات انجام دینے لگے۔ وہیں انہوں نے عربی سیکھی اور ریاض یونیورسٹی سے ایم اے نفسیات کیا۔ فلسفہ، تاریخ، پُراسرار علوم، الٰہیات، شعر وشاعری، تصوف اور ڈراما نویسی سے دلچسپی تھی۔ بحیثیت شاعر انہوں نے 1961ء میں اردو غزل سے شاعری کی ابتدا کی۔ پنجابی زبان وادب کی ترویج کے لیے بھی کوشاں رہے۔ پنجابی تحقیقاتی مرکز کے صدر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ 1976ء میں پھر سعودی عرب چلے گئے مگر چند برس بعد واپس وطن آئے۔ فلموں کے لیے دو درجن کہانیاں لکھیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں بھی حصہ لیتے رہے۔ لاہور میں انتقال ہوا۔

مرسلہ: افتخار احمد، لاہور

دوسرے گروہ کا کہنا تھا کہ رمضان ہی کی وجہ سے بے چارے شہرانی کا انتقال ہوا ہے۔ اس نے جان بوجھ کر ایسی حرکت کی ہوگی کہ بے چارہ بیمار ہو کر انتقال کر گیا۔

یعنی باپ کی موت کا سارا ملبا بے چارے رمضان پر آ گرا تھا۔

رمضان ایک بار پھر بلبلاتا ہوا میرے پاس آ گیا۔

''فریدی بھائی، اب تو انتہا ہوگئی ہے۔ باپ زندہ رہا تو مصیبت۔ مر گیا تو اور مصیبت۔ اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں۔''

''اب تو صرف ایک ہی طریقہ رہ جاتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ لوگ تمہیں زندہ نہیں رہنے دیں گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم یہ محلہ ہی چھوڑ دو۔ کہیں اور چلے جاؤ۔''

''ہاں، یہ ٹھیک رہے گا۔'' رمضان نے میری تائید کی۔ ''میں خود اب ایسے محلے میں نہیں رہنا چاہتا جہاں لوگوں کو چین ہی نہیں مل رہا ہے۔''

اس کے دس پندرہ دنوں کے بعد رمضان واقعی محلہ چھوڑ کر نہ جانے کہاں چلا گیا۔ اس نے اپنا کوارٹر کسی کو کرائے پر دے دیا تھا۔

میرا خیال تھا کہ اب وہ بے چارہ سکون کی زندگی گزار ہوگا لیکن شاید اس بے چارے کے مقدر میں سکون ہی نہیں تھا۔

ایک دن وہ صدر کے علاقے میں مجھے مل گیا۔ پریشان تھا۔ چہرے پر ہوائیاں اڑتی ہوئی۔ مجھے دیکھتے ہی تیزی سے میرے پاس آ گیا۔ ''فریدی بھائی، اچھا ہوا آپ گئے۔ میں تو خود آپ کے پاس جانے کی سوچ رہا تھا۔''

''تم بتاؤ، تم خیریت سے تو ہو نا؟'' میں نے پوچھا۔

''خیریت کہاں فریدی بھائی۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''ہم جیسوں کے نصیب میں خیریت نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔''

''کیوں، اب کیا مسئلہ ہوگیا۔ تم تو وہ محلہ چھوڑ چکے ہو۔''

''محلہ تو چھوڑ چکا ہوں۔ لیکن اب جس محلے میں گیا ہوں، وہ لوگ اور بھی دو چار ہاتھ آگے کی چیز ہیں۔''

''کیوں، ان کے ساتھ کیا پرابلم ہوگئی۔''

''پرابلم یہ ہے کہ محلے والوں کو یقین ہی نہیں آ رہا کہ میں کوئی شریف آدمی ہوں۔ ان کا کہنا ہے کہ جو شخص راتوں رات اپنا پرانا محلہ چھوڑ کر بھاگ نکلے، اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ وہ سب مجھے اور میری بیوی کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا کرتے ہیں۔ اب آپ بتائیں، میں کیا کروں۔''

''اب تمہارے لیے صرف ایک مشورہ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم نے اپنا کوارٹر کرائے پر دیا ہے نا۔''

''جی ہاں۔''

''بس تم اپنے کوارٹر میں واپس آ جاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''اور دھڑلے سے رہنا شروع کر دو۔ کیونکہ یہ دنیا ایسی ہے کہ تم چاہے کچھ بھی کر لو، وہ تمہارے کام میں نقص نکالتی رہے گی۔ اس لیے اب کسی کی پروا مت کرو۔ لوگ بکواس کرتے ہیں تو کرنے دو۔ ورنہ شاید تمہارے لیے زندہ رہنا دشوار ہو جائے۔''

رمضان نے میرے اس مشورے پر عمل کر لیا۔ اب وہ محلے والوں کی بالکل بھی پروا نہیں کرتا اور انتہائی سکون کی زندگی گزار رہا ہے۔

میرا یہی مشورہ ہر شخص کے لیے ہے۔ لوگ جو کہتے ہیں انہیں کہنے دیں کیونکہ ایک بات یاد رکھیں کہ تنقید کرنے والے ہر حال میں تنقید کریں گے۔ چاہے آپ کچھ بھی کر لیں۔

بیٹی

محترم عذرا رسول
السلام علیکم

میری زندگی ایک عجیب کہانی ہے۔ ایسی کہانی جو ہر ایک کے لیے سبق آموز ہے۔ میں چاہتا ہوں میری کہانی سرگزشت کے قارئین تک پہنچے تاکہ دوسرے لوگ بھی عبرت حاصل کریں۔ میں لکھاری نہیں ہوں اس لیے اپنی کہانی کو عام سے انداز میں لکھ رہا ہوں۔ اسے کسی اچھے رائٹر سے دوبارہ لکھوالیں تو احسانِ عظیم ہوگا۔ لیکن شائع ضرور کریں۔

امجد
(سرگودھا)

''نر کا بچہ ہے، اس لیے اس کے یہاں نر ہی پیدا ہوگا۔'' میرے دوست نے میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''کیا ضروری ہے کہ امجد کے یہاں بیٹا ہی ہو۔'' ایک اور دوست نے تبصرہ کیا۔

''بکواس مت کرو۔'' مجھے اس کی بات پر غصہ آ گیا۔ ''یہ ہمارے یہاں کی روایت ہے۔ پہلی اولاد ہمیشہ بیٹا ہی ہوتی ہے۔ میرے دادا کے یہاں میرا باپ پیدا

www.pdfbooksfree.pk

ہوا تھا۔ میرے باپ کے یہاں میں پیدا ہوا۔ ہمارے یہاں پہلی اولاد کے طور پر بیٹی کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔"

"اور اگر بیٹی ہو گئی تو پھر کیا کرے گا۔"

"گلا دبا کر مار دوں گا، اور کیا کروں گا۔"

"کمال ہے یار۔ تو ابھی تک جہالت کے دور سے واپس نہیں آسکا ہے۔" میرے اس دوست نے کہا جو بیٹی کے حق میں تھا۔

"اب چاہے کچھ بھی سمجھ لے۔ ہمارے یہاں یہی ہوتا ہے۔"

میں کہنے کو یہ سب تو کہہ رہا تھا لیکن میں بھی اندیشوں ہی میں تھا۔ اگر واقعی بیٹی ہی ہوئی تو پھر کیا ہوگا۔ میں کسی بھی صورت پہلی اولاد کے طور پر بیٹی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں یہ برداشت کر ہی نہیں سکتا تھا کہ میرے یہاں بیٹی ہو۔

میں نے اپنی بیوی صغرا سے بھی یہی کہہ دیا تھا۔ "دیکھو صغرا، تم ماں بننے والی ہو۔ یہ بہت خوشی کی بات ہے۔ لیکن یاد رکھو، ہماری پہلی اولاد بیٹی نہیں ہونی چاہیے۔"

"یہ آپ کیسی بات کر رہے ہیں۔" وہ تڑپ گئی تھی۔ "کیا یہ کسی کے بس میں ہے۔ یہ تو خدا کی دین ہے۔ وہ جو بھی دے۔"

"میں یہ سب نہیں جانتا۔ ہمارے خاندان میں یہی چلا آرہا ہے۔ پہلی اولاد ہمیشہ بیٹا ہوا ہے۔ میں خاندان اور برادری میں اپنی ناک نہیں کٹوانا چاہتا، اسی لیے ہر حال میں بیٹا چاہیے۔"

"امجد' خدا کا خوف کریں۔ آپ آج کے زمانے میں بھی ایسی باتیں لے کر بیٹھ گئے۔" صغرا نے کہا۔

"ہاں، مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے آج کے زمانے سے۔" میرا لہجہ انتہائی سخت اور درشت ہوتا جا رہا تھا۔ "یاد رکھو، اگر بیٹا نہیں ہوا تو میں نہیں جانتا کہ پھر کیا ہونے والا ہے۔"

ایسا نہیں تھا کہ مجھے کچھ معلوم نہ ہو، میں سترھویں یا اٹھارھویں صدی کا انسان نہیں تھا۔ اس کے باوجود میں کسی بھی صورت میں بیٹی قبول کر لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

مجھے صغرا سے بھی محبت تھی۔ میں نے اس سے محبت کی شادی کی تھی۔ ہم دونوں کے درمیان مکمل ہم آہنگی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اس کے باوجود میں یہ برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ ہمارے یہاں بیٹی پیدا ہو، خاص طور پر پہلی اولاد۔

صغرا نے ایک ہاسپٹل میں [illegible] ڈاکٹر نے میرے سامنے مشورہ دیا کہ الٹرا ساؤنڈ کروالیا جائے کیونکہ آثار ایسے تھے کہ شاید کوئی پیچیدگی پیدا ہو جائے لیکن میں نے الٹرا ساؤنڈ کروانے سے انکار کر دیا تھا۔

"نہیں ڈاکٹر، اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میری بیوی آپ کے پاس آگئی ہے۔ اب اس کا کیس آپ کے پاس ہے۔"

"وہ تو ہے، لیکن الٹرا ساؤنڈ سے پتا چل جائے گا کہ آنے والی اولاد بیٹا ہے یا بیٹی۔"

"اس کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ بیٹا آرہا ہے۔" میں نے کہا۔

"کمال ہے، آپ کو کیسے معلوم۔"

"اس لیے کہ میرے خاندان کی یہی روایت ہے۔" میں یقین بھرے لہجے میں بولا۔ "برسوں سے یہی چلا آرہا ہے۔"

اس وقت ڈاکٹر نے اس طرح میری طرف دیکھا جیسے اسے میری دماغی صحت پر شبہ ہو رہا ہو۔ لیکن مجھے کسی کی پروا نہیں تھی۔ میں نے تو اپنا ذہن بنا لیا تھا کہ ہمارے یہاں بیٹا ہونے والا ہے۔

مجھے بیٹی کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

میں اس وقت ایسا ہو گیا تھا کہ مجھے صغرا کے احساسات کی بھی پروا نہیں رہی تھی۔ اسے ہر حال میں بیٹے کی ماں بننا تھا۔

میں نے آنے والی اولاد کے لیے خریداری بھی شروع کر دی تھی اور ہر کھلونا ایسا لا رہا تھا جسے لڑکے ہی استعمال کرتے ہیں۔ میں نے صغرا سے کہا۔ "جانتی ہو، میں نے آنے والے کا نام بھی سوچ لیا ہے۔"

"اچھا، وہ کیا۔"

"شہباز، ہے نا مردانہ نام۔"

"ہاں" اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ آگئی، شاید وہ ابھی تک اندیشے میں مبتلا تھی' بے وقوف! پھر وہ دن بھی آگیا، جب مہمان کو دنیا میں آنا تھا۔ صغرا کو لیبر روم میں لے جایا گیا، ڈاکٹر نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ چند وجوہات کی بنا پر کیس پیچیدہ ہو گیا ہے، لیکن وہ اپنی ہی پوری کوشش کریں گی۔ میں بہت بے چین تھا۔ ایک تو یہ فکر تھی کہ پتا نہیں آنے والا کون ہے، پھر صغرا کی طرف سے بھی پریشانی تھی۔ میں نے اس سے محبت کی تھی۔ وہ ایک وفادار اور پیار کرنے والی بیوی رہی تھی۔

بہت دیر بعد ڈاکٹر لیبر روم سے باہر آئی، اس کا چہرہ
...ہوا تھا، اس نے اشارے سے مجھے بلایا، اور جب میں
...کے قریب گیا تو اس نے دھیرے سے کہا، "تمہارے
...دو خبریں ہیں۔"

"جی ڈاکٹر بتائیں"۔ میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ تمہاری بیوی کی حالت نازک ہے،
...بچانے کی کوشش کر رہے ہیں، آگے خدا کی مرضی۔"

"اور...... اور دوسری خبر۔"

"دوسری خبر یہ ہے کہ بیٹی پیدا ہوئی ہے۔"

میرے پورے بدن میں جیسے آگ سی لگ گئی، صغرا
...مجھے کیسا تحفہ دیا تھا۔ جس کو میں کسی طور برداشت کر ہی
...سکتا تھا۔ مجھے بیٹی نہیں چاہیے تھی۔ میں اس وقت یہ
...ہی گیا کہ ڈاکٹر نے صغرا کی حالت نازک ہونے کی
...ع دی تھی۔

میں تو صرف یہ جانتا تھا کہ میں ایک بیٹی کا باپ بن
...ہوں، میری برادری میں ناک کٹ گئی ہے۔

"بھائی، جلدی سے اپنی دم توڑتی ہوئی بیوی کے
...جائیں، وہ آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔"

میرا دل تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن جانا پڑا، صغرا اس
...اپنے ہوش میں تھی۔ اس کی سانسیں چل رہی تھیں۔
...کے برابر میں وہ قابلِ نفرت وجود کلبلا رہا تھا جو میری
...زندگی میں زہر گھولنے آیا تھا۔

صغرا نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ سے میرا ہاتھ تھام لیا،
...آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی۔ "میری بچی، بچی کا خیال رکھنا۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اپنا چہرہ
...دوسری طرف کر لیا تھا۔

بہرحال کچھ دیر بعد ہی اس کا انتقال ہو گیا۔ خدا
...نے وہ اپنے دل پر کیا بوجھ لے کر گئی ہوگی۔ ضروری خانہ
...کے بعد ڈاکٹر نے کہا۔ "اب آپ اپنی بیوی میت
...لے جاسکتے ہیں۔"

"ڈاکٹر صاحبہ، میں میت کو کس کے پاس لے
...وں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ہمارا کوئی ہے ہی نہیں۔" میں نے
...ف جھوٹ بول دیا تھا۔

"یہ کیا بات ہوئی۔ لڑکی کے والدین، عزیز و اقارب،
...وئی تو ہوگا۔"

"نہیں ڈاکٹر' اس غریب کا کوئی بھی نہیں ہے۔" اور یہ حقیقت تھی' جبکہ میرے رشتے دار موجود تھے۔ لیکن میں نے ڈاکٹر کو ان کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔

"پھر تو آپ ایدھی کو فون کر دیں، وہی لاش اٹھا کر لے جائیں گے۔"

میں نے یہی کیا۔ میں نے لاش ایدھی والوں کے حوالے کر دی تھی۔ گرچہ دل پر ایک بوجھ اور دکھ محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن اس کے علاوہ میں اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

اس کے بعد کا مرحلہ بچی کا تھا۔ اس کے ساتھ کیا کیا جائے۔ بہرحال میں اس بچی کو اپنے سینے سے لگائے ہاسپٹل سے باہر آگیا۔ اس نے وہی کپڑے پہن رکھے تھے جو بے چاری صغرا بنا کر اپنے ساتھ ہاسپٹل لائی تھی۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ ایک طرح سے اس کا مر جانا اچھا ہی ہوا۔ ورنہ وہ کبھی اس بچی کو ٹھکانے لگانے کی اجازت نہیں دیتی۔ میں نے اس بچی کو کچرے کے کسی ڈھیر پر ڈال دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ میرے لیے اس کے وجود کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ رہے یا مر جائے، یا اس کا جو بھی حشر ہو۔

میں اسے لے کر ایک ایسی جگہ آگیا جہاں ہر طرف کچرا ہی کچرا تھا۔ وہاں کئی آوارہ کتے بھی تھے۔ یہ اچھی بات تھی۔ ذرا سی دیر میں وہ کتے اس کو چٹ کر جاتے۔

میں کچرے کے ڈھیر کے پاس پہنچا ہی تھا کہ کسی طرف سے ایک پولیس والا نمودار ہو گیا، جو بڑی شک بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ "اوئے، یہ کیا ہے۔" اس نے سینے سے لپٹی ہوئی بچی کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ بچی ہے میری۔" میں نے بتایا۔

"تیری بچی ہے، یا کہیں سے چرا کر لایا ہے۔"

"کیسی بات کر رہے ہو۔ میرے ساتھ ہاسپٹل چلو، خود پتا چل جائے گا۔" میں غصے سے بولا۔

شاید اسے یقین آگیا تھا، اس لیے وہ مجھے گھورتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اب اس کم بخت کو کچرے کے ڈھیر پر پھینکنا مناسب نہیں تھا۔ پھر اسے کہاں لے جاتا۔ میں اپنے ساتھ اسے رکھ نہیں سکتا تھا۔ کسی بھی قیمت پر نہیں۔

پھر مجھے خالہ زینب کا خیال آگیا۔ وہ اکیلی رہتی تھیں۔ میں نے وہ بچی ان کے پلنگ پر رکھ دی۔ "یہ لو خالہ، سنبھالو اس کو۔"

"ارے یہ کون ہے؟"

"ہماری بچی، میرا مطلب ہے صغرا کی بچی، صغرا تو اس

www.pdfbooksfree.pk

کو جنم دیتے ہی مرگئی۔ پتا نہیں یہ کم بخت کیوں زندہ رہ گئی۔''

''ارے ایسا نہیں بولتے بے وقوف۔''

''خالہ' تم بتاؤ، کیا کروں اس کا، کیا اچار ڈالوں؟''

''دیکھو، بچیاں خدا کی نعمت اور رحمت ہوتی ہیں۔'' خالہ نے کہا۔ ''تو تو شروع سے بیٹی کے خلاف تھا۔''

''ہاں خالہ، اور یہ بھی دیکھو کہ پیدا بھی بچی ہوئی۔ مجھے تو صغرا کی موت سے زیادہ اس کے پیدا ہونے کا افسوس ہو رہا ہے۔''

''خدا سے ڈر امجد، ایسی باتیں نہیں کرتے۔''

''اچھا خالہ! میں تو اس کی پرورش نہیں کرسکتا۔ تمہیں ہر مہینے تین ہزار روپے دیے دیا کروں گا، تم ہی اس کی پرورش کرنا۔''

''ہاں، ہاں کیوں نہیں۔ میں تو سینے سے لگا کر رکھوں گی اِس کو۔''

میں نے اپنی جیب سے تین ہزار نکال کر خالہ کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ ''یہ لو خالہ' اس مہینے کے پیسے۔''

''امجد، اگر میرے حالات صحیح ہوتے تو میں اس فرشتے کی پرورش کا ایک پیسا بھی نہیں لیتی۔''

میں اپنا.... بوجھ اتار کر اس گھر سے باہر آ گیا۔ اب وہ پرورش پائے یا نہ پائے۔ خالہ اسے رکھیں یا نہ رکھیں۔ کسی کو دے دیں۔ مجھے اب اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ میرا اس سے کوئی واسطہ ہی کہاں تھا۔ میں تو خواہ مخواہ اس بدبخت کا باپ بن گیا تھا۔

اپنے محلے میں بیٹھا تو محلے والوں اور دوستوں نے گھیر لیا۔ وہ سب صورتِ حال معلوم کرنے کے لیے بے چین ہو رہے تھے۔ میں نے بہت ہی دکھی لہجے میں بتایا۔ ''میری بیوی تو ڈلیوری کے ایک گھنٹے بعد ہی مرگئی تھی اور بچہ تین گھنٹوں بعد اللہ کو پیارا ہو گیا۔''

میں نے اس وقت بھی انہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ میرے یہاں بیٹی پیدا ہوئی تھی۔

بہرحال وہ سب بہت دیر تک افسوس کرتے رہے تھے۔ اس کے بعد زندگی معمول پر آ گئی۔ میں ہر مہینے خالہ زینب کو پیسے بھیجتا رہا تھا۔ خود کبھی نہیں گیا۔ صرف اس لیے کہ ایسا نہ ہو کہ اس کی صورت دیکھنی پڑ جائے۔ اس دوران کئی لوگوں اور محلہ والوں نے مجھ سے کہا بھی کہ میں دوسری شادی کرلوں۔ لیکن میرا دل ہی نہیں مانتا تھا۔ سچ یہ ہے کہ میں دوسری بار بیٹی کی پیدائش کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

دیکھتے دیکھتے پانچ برس گزر گئے۔

پانچ برس کم نہیں ہوتے۔ بہت کچھ تبدیل ہو جاتا ہے۔ بچی پانچ برس کی ہو گئی ہوگی۔ لیکن مجھے تو اس سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔ چاہے وہ کچھ بھی ہو، کیسی بھی ہو۔''

میں تو جیسے اسے بھول ہی گیا تھا۔ یاد ہی نہیں رہا تھا کہ میری کوئی بیٹی بھی ہے۔ ایک دن اچانک خالہ زینب کا پیغام ملا کہ میں ان سے فوراً آ کر ملوں۔

پانچ سال میں یہ پہلا موقع تھا کہ خالہ نے یاد کیا تھا۔ میں وہاں جانا نہیں چاہتا تھا لیکن جانا پڑا۔ خالہ زینب میرے انتظار ہی میں بیٹھی تھیں۔ ''بیٹا امجد، اب تم اپنی امانت کو میرے پاس سے لے جاؤ۔''

''وہ کیوں؟''

''اس لیے کہ ایک تو مجھے اپنی زندگی کا کوئی بھروسا نہیں ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ میں عمرے پر جا رہی ہوں۔ تیرے خالو مرحوم کے بھتیجے کے ساتھ۔''

''خالہ، میں اسے لے جا کر کیا کروں گا۔ تم اسے کسی کے حوالے کردو۔ دے دو کسی کو۔ یتیم خانے میں ڈلوا دو۔''

''خدا جانے کیسا پتھر دل ہے تیرا۔ اتنی پیاری بچی کو اس طرح ٹھکرا رہا ہے۔''

''کچھ بھی ہو خالہ' میں اسے لے جا کر اپنی گردن نہیں جھکا سکتا۔''

اس دوران وہ بچی کمرے سے نکل کر آنگن میں آ گئی تھی۔

''رابعہ بیٹا، یہ تمہارے ابو ہیں۔'' خالہ نے میری طرف اشارہ کر کے بتایا۔ ''ان کو سلام کرو۔''

''سلام ابو۔''

میں نے اپنا چہرہ دوسری طرف کرلیا۔ میں کسی بھی صورت اس کے لیے موم ہونے کو تیار نہیں تھا۔ وہ بچی خاموش رہ گئی تھی۔

خالہ نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''امجد' میرا دل نہیں چاہ رہا کہ میں تجھ جیسے پتھر دل انسان کے حوالے اپنے اس معصوم فرشتہ کو کردوں، لیکن کیا کروں، مجبور ہو کر رہ گئی ہوں۔'' پھر انہوں نے بچی کی طرف دیکھا۔ ''رابعہ بیٹا، اب تم اپنے ابو کے ساتھ ہی رہو گی۔''

''دادی مجھے تو آپ کے ساتھ رہنا ہے۔''

''نہیں بیٹا۔'' خالہ نے اپنا چہرہ دوسری طرف کرلیا۔ شاید ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ ''تم اپنے ابو کے ساتھ جاؤ گی، جاؤ اپنا سامان لے کر آ جاؤ۔''

مجھے اس وقت انتہائی کوفت ہو رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا اس کم بخت کو وہیں چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔ زبردستی کا ڈھول گلے میں لٹکانا پڑ رہا تھا۔ رابعہ اپنا سامان لے کر آ گئی تھی۔ سامان کیا تھا۔ اس کے الٹے سیدھے کپڑوں کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔

میں اسے رات کے سناٹے اور اندھیرے میں اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ صرف اس خیال سے کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ وہ بچی میرے ساتھ آتے ہوئے بہت بری طرح خوفزدہ تھی۔

میں اسے کوٹھری میں لے آیا۔ ''دیکھ، تو اب اسی کمرے میں رہے گی۔ یہاں سے باہر نہیں نکلے گی۔ یہ کمرے کے برابر میں واش روم ہے۔ تو خاموشی سے جائے گی اور واپس آ جائے گی۔ تجھے کسی کو اپنا چہرہ نہیں دکھانا ہے۔''

وہ لرزتی اور کانپتی رہی۔ مجھے اس پر غصہ آنے لگا تھا۔ میرے لیے وہ مصیبت بن کر آ گئی تھی۔ اب اس کے لیے کھانے وغیرہ کا بندوبست بھی کرنا تھا۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میرے دوستوں یا محلے والوں کی نگاہوں میں آئے۔ اس میں میری سبکی تھی اور میں یہ برداشت نہیں کرسکتا تھا۔

پھر یہ میرا معمول بن گیا۔ میں اسے کوٹھری میں بند کر کے اپنی ڈیوٹی پر جایا کرتا۔ وہ کبھی کبھی جب گھبرا کر رونے لگتی تو میں اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اس کی آواز بند کردیتا۔

میں اس کے لیے کھانا اور ناشتا باہر سے لایا کرتا تھا۔ میں نے اس کم بخت کے خوف سے اپنے دوستوں کو گھر میں بلانا چھوڑ دیا تھا۔ منع کر دیا تھا کہ وہ میرے پاس نہ آیا کریں۔

میں رات گئے جب واپس آتا تو اس کی کوٹھری میں اندھیرا ہوتا اور وہ پلنگ پر لیٹی رہتی یا دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی ہوئی ملتی۔

میں اس کے رونے کی آواز بھی سنا کرتا تھا۔ لیکن مجھے اس کے رونے دھونے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بُرے خوف سے وہ صرف سسکیاں لیتی رہتی تھی۔

ایک رات میں گھر واپس آیا تو اس نے مجھ سے کہا۔ ''بابا، مجھے باہر جانے دو۔''

''وہ کیوں؟''

''میں بھی کھیلوں گی۔''

''تو نے کس کو کھیلتے ہوئے دیکھا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت سی بچیوں کو۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ آنگن والے دروازے سے باہر گلی میں کھیل رہی تھیں۔ میں بھی ان کے ساتھ کھیلوں گی۔''

میں غصے سے لرزنے لگا تھا۔ ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ تو دروازے تک گئی تھی۔''

''ہاں بابا۔ لیکن میں باہر نہیں گئی۔ ان کی آوازیں سنتی رہی تھی۔''

''ٹھیک ہے' اب تیرا علاج کرنا پڑے گا۔''

میں نے اس کا علاج یہ کیا کہ اس کے پیروں میں زنجیر باندھ دی۔ اب وہ کوٹھری سے باہر جا ہی نہیں سکتی تھی۔

وہ روتی اور لرزتی رہی۔ لیکن میں نے اس کی پروا نہیں کی، میں کسی بھی حال میں اس کے ساتھ کوئی رعایت کرنے کو تیار نہیں تھا۔ کسی بھی قیمت پر نہیں۔

اس طرح کئی مہینے گزر گئے۔ میں واپس آ کر ذرا سی دیر کے لیے اس کی زنجیر کھول دیتا۔ اسے صرف واش روم تک جانے کی اجازت تھی۔ فارغ ہو کر وہ پھر کوٹھری میں آ جاتی اور میں اس کے پیر میں دوبارہ زنجیر ڈال دیتا۔ میں پوری طرح نفسیاتی بیمار بن گیا تھا۔

جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا۔ اس کے خلاف میری نفرت شدید ہوتی جا رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ

آکٹوپس Octopus

سیپ کی قسم کا ایک سمندری جانور، جس کے سونڈ جیسے آٹھ ہاتھ پاؤں ہوتے ہیں۔ وہ ان سے کیکڑے اور جھینگے پکڑ کر کھاتا ہے، اور انہی کی مدد سے تیرتا ہے۔ آکٹوپس مل جل کر بڑے بڑے پتھروں کے مورچے بنا لیتے ہیں۔ خطرے کے وقت چٹانوں کے نیچے کونوں کھدروں میں چھپ جاتے ہیں یا اپنی تھیلی میں سے کالی سیاہی پانی میں چھوڑ کر اسے دھواں دار بنا دیتے ہیں۔ ماحول اور طبیعت کے مطابق اپنا رنگ بھی بدل سکتے ہیں۔ بحیرہ روم اور بحرِ اوقیانوس میں دس دس فٹ لمبے آکٹوپس ملتے ہیں۔ بحرِ الکاہل کے آکٹوپس کی موٹائی تیس فٹ سے زیادہ ہوتی ہے۔ دنیا کے اکثر ملکوں میں آکٹوپس بطور غذا استعمال ہوتا ہے۔

مرسلہ: اختر ہوشیار پوری، لاہور

www.pdfbooksfree.pk

میں اس کے لیے کیا کروں۔

ایک شام میں گلو کے ہوٹل میں بیٹھا ہوا یہی سب سوچ رہا تھا کہ مجھے دلبر دکھائی دے گیا۔ وہ بہت دنوں کے بعد دکھائی دیا تھا۔

وہ عورتوں اور لڑکیوں کا بیوپاری تھا۔ ان کے سودے کیا کرتا تھا۔ یہ بات مجھے معلوم تھی کہ اس کا دھندا کیا ہے۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس آ گیا۔ ''کیا حال ہے دلبر بادشاہ؟'' میں نے پوچھا۔

مجھے دیکھ کر وہ چونک گیا تھا۔ ''ارے امجد بھائی، بیٹھو، بیٹھ جاؤ۔''

میں اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''ہاں بھائی، کہاں رہے اتنے دنوں تک؟''

''میں دو سال کے لیے دبئی چلا گیا تھا۔''

''دبئی گئے تھے یا اندر ہو گئے تھے۔''

''یار امجد بھائی، اب تم سے کیا چھپانا۔'' وہ ہنس دیا۔ ''ہاں کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔''

''کیوں، کیا غلط ہاتھ پڑ گیا تھا۔''

''ہاں یار، عین وقت پر گڑبڑ ہو گئی تھی۔''

''آج کل کیا کر رہے ہو؟''

''یار، تم تو اس طرح پوچھ رہے ہو جیسے پولیس میں نوکری کر لی ہے۔''

''میں اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ میرے پاس تمہارے لیے ایک سودا ہے۔'' میں دھیرے سے بولا۔

''نہیں بھائی، میں اب خطرے والا کوئی کام نہیں کروں گا۔''

''ارے کوئی خطرہ نہیں۔ صاف ستھرا معاملہ ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''چھ سال کی بچی ہے۔ بہت پیاری، بہت پیسے مل جائیں گے اس کے۔''

''اور اس کے ماں باپ۔''

''کوئی بھی نہیں ہے۔ اس لیے تو اتنے دھڑلے سے سودے کی بات کر رہا ہوں۔''

''کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو گی۔''

''اس کی گارنٹی میں دیتا ہوں۔ کوئی گڑبڑ نہیں ہو گی۔'' میں نے اسے یقین دلایا۔ ''لیکن تم میری بات کرو، مجھے گیا ملے گا۔''

''دیکھو بھائی، آج کل اس دھندے میں بہت خطرے ہیں۔ اس لیے تمہیں دس ہزار سے زیادہ نہیں دے سکتا۔''

''کیا پاگل ہو گئے ہو۔ اتنی پیاری بچی کے صرف دس ہزار، پچاس ہزار لوں گا۔''

بہرحال کافی بحث کے بعد تیس ہزار میں بات طے ہو گئی تھی۔ ''اب تم ایسا کرو، میدان والے درخت کے پاس پہنچو، میں بچی کو لے کر آ رہا ہوں، لیکن رقم تیار رکھنا۔''

''اس کی فکر مت کرو، اتنے پیسے تو ہر وقت جیب میں ہوتے ہیں۔''

''ایک گھنٹے کے بعد پہنچ جانا۔''

میں جب گھر پہنچا تو خاصا اندھیرا ہو چکا تھا۔ اسی اندھیرے میں مجھے اس لڑکی کو نکال کر دلبر کے پاس لے جانا تھا۔

میں نے کوٹھری کا دروازہ کھولا اور اچانک کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ میرا سر پلنگ کے پائے سے ٹکرا کر پھٹ گیا تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے کچھ پتا نہیں چل سکا تھا۔

پھر رابعہ نے کمرے کا بلب جلا دیا۔ وہ میرے چہرے کو خون میں رنگا ہوا دیکھ کر بری طرح رونے لگی۔ اس نے میرا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ وہ روتی جا رہی تھی اور اپنی ہتھیلیوں سے میرا خون صاف کر رہی تھی۔ ''بابا، تمہیں چوٹ لگی ہے، بابا بہت چوٹ لگی ہے نا۔''

اور اس وقت میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔

اس واقعے کو برسوں گزر چکے ہیں، میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ اور ابھی ابھی ایک پیاری سی بچی میرے پاس سے اٹھ کر گئی ہے۔ وہ میری نواسی ہے، یعنی رابعہ کی بیٹی۔

جی ہاں، اس حادثے نے میرے اندر کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ مجھے احساس ہوا کہ بیٹی اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہوتی ہے۔ میری رابعہ کے آنسو میرے دل پر گر رہے تھے۔ ہم دونوں باپ بیٹی ایک دوسرے سے لپٹ کر نہ جانے کتنی دیر تک روتے رہے تھے۔

پھر سب ہی کچھ بدل گیا تھا۔ رابعہ میرے لیے سب کچھ ہو گئی تھی۔ وہ میری جان تھی، میری زندگی تھی، میں اسے لے کر دوسرے محلے میں آ گیا۔ میں نے اسے تعلیم دلوائی، اس کی شادی کرائی۔ اور اب وہ دو بچوں کی ماں ہے۔ وہ ہفتے میں کئی بار میرے پاس آ جاتی ہے اور مجھے اس سے اور اس کے بچوں سے پیار کر کے اور آنسو بہا کر اظہارِ ندامت کا موقع مل جاتا ہے۔

☹

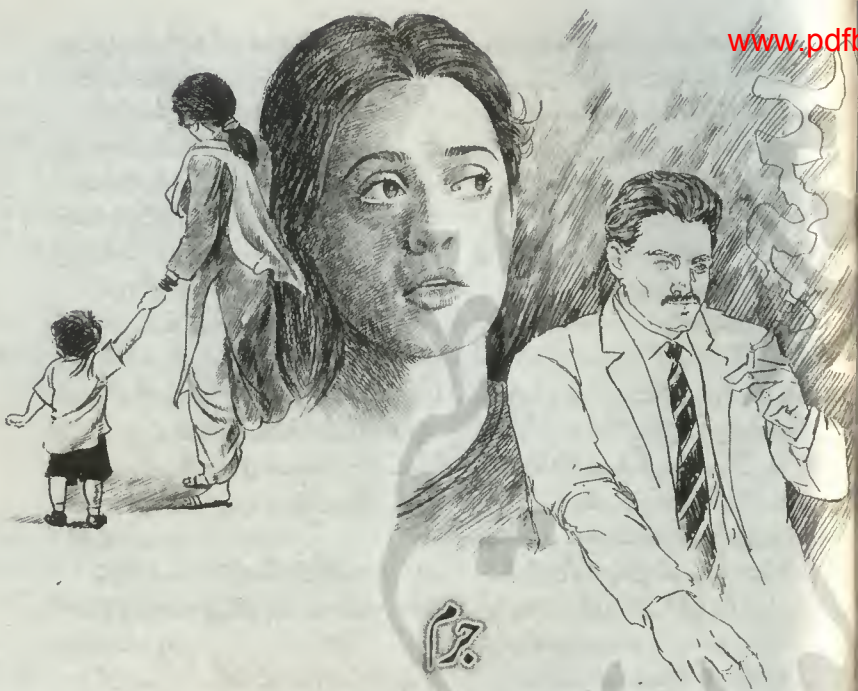

ڈیئر ایڈیٹر!

السلام علیکم

انسان کی زندگی میں ایسے بے شمار واقعات رونما ہوتے ہیں جن پر ایک اچھی فلم بن سکتی ہے ایسا ہی ایک واقعہ میرے ساتھ رونما ہوا، یہ واقعہ ایسا ہے جسے میں جتنا ذہن سے جھٹکتا ہوں وہ اسی قدر چمٹ جاتا ہے۔ رہ رہ کر میرے مظلوم دوست کا چہرہ نظروں کے سامنے آ جاتا ہے۔ آج وہ دوست بہت شدت سے یاد آ رہا ہے اسی لیے اس واقعہ کو قلمبند کر رہا ہوں۔ اگر سرگزشت کے معیار کا ہو تو شاملِ اشاعت کریں۔

خورشید عالم

(گجرات)

میں اُن دنوں لاہور کے گورنمنٹ کالج میں پڑھتا تھا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب تعلیم کو بزنس انڈسٹری کا درجہ حاصل نہیں ہوا تھا اور اسکولوں، کالجوں میں واقعی طلبا کو تعلیم دی جاتی تھی۔

گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لینا تو گویا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ وہاں پنجاب کے دور دراز علاقوں سے طلبہ تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔

میرا تعلق گجرات کے ایک کاروباری گھرانے سے

www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ گجرات میں بھی کالج موجود ہیں لیکن میری خواہش تھی کہ مجھے گورنمنٹ کالج لاہور میں ہی پڑھنے کا موقع ملے۔

میٹرک میں میری فرسٹ ڈویژن آ گئی تو پھر تو وہاں داخلہ نہ ملنے کا کوئی جواز ہی نہ رہا۔ اس دور میں فرسٹ ڈویژن آنا بھی کھیل نہیں تھا۔ ان دنوں تو جس کی سیکنڈ ڈویژن بھی آتی تھی، لوگ اسے بھی رشک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

میں ہوسٹل پہنچا تو مجھے کمرا نمبر ایک سو چودہ میں بھیج دیا گیا۔ اس زمانے میں ہوسٹل کے ہر کمرے میں چار چار طالب علم مقیم ہوتے تھے۔ ہوسٹل کے کمرے خاصے کشادہ تھے۔ طالب علموں کے سنگل بیڈ بلکہ اس دور میں تو بیڈ کی بجائے لوہے کے پلنگ ہوا کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سی میز تھی۔ پھر بڑی سی ایک الماری، ہر لڑکے کے پاس اپنا سامان ہوتا تھا، ہم اپنے جوتے وغیرہ پلنگ کے نیچے رکھتے تھے۔

میں کمرے میں داخل ہوا تو وہاں گٹھے ہوئے جسم اور مضبوط ہاتھ پیروں کا ایک لڑکا پہلے سے موجود تھا۔ وہ اپنا سامان سیٹ کر رہا تھا۔

اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا اور بولا۔ ''السلام علیکم! میرا نام خالد ہے اور میں نے اس کالج میں ایڈمیشن لیا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا مضبوط ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔

''وعلیکم السلام!'' میں نے جواب دیا۔ ''میرا نام خورشید ہے اور میں نے بھی یہاں داخلہ لیا ہے۔''

اس نے مجھ سے کہا۔ ''آپ فکر مت کریں، میرا سامان تو سیٹ ہو ہی چکا ہے، میں آپ کا سامان بھی سیٹ کر لوں گا۔ جب تک آپ ہاتھ منہ دھو کر تازہ دم ہو جائیں، لمبا سفر کر کے آئے ہیں۔''

''او بھائی، میں نے کوئی لمبا سفر نہیں کیا ہے۔ میں گجرات سے آیا ہوں اور مجھے بالکل بھی تھکن نہیں ہے اس لیے آپ زحمت نہ کریں۔''

خالد نے میری ایک نہ سنی اور میرا تمام سامان سیٹ کر دیا۔

وہ جتنا اوپر سے کالا سیاہ تھا، اس کا دل اندر سے اتنا ہی اجلا تھا۔

ابھی ہم فارغ ہو کر بیٹھے ہی تھے کہ ایک ساتھ دو لڑکے داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک کا نام سہیل تھا اور دوسرے کا ریاض! وہ دونوں ہی [illegible] ہم سب نے مل کر ان کا سامان بھی قرینے سے رکھ دیا۔

پھر خالد کی خواہش پر ہم لوگ چائے پینے کے لیے ہوسٹل کے باہر چلے گئے۔

میں لاہور اس سے پہلے بھی کئی دفعہ آ چکا تھا لیکن میرے تینوں ساتھی پہلی دفعہ لاہور آئے تھے اور ہر چیز کو پُرتجسس نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

خالد ملتان کے ایک چھوٹے سے زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ سہیل دیپالپور کے قریب کسی گاؤں کا رہنے والا تھا اور ان کی اچھی خاصی زمین تھی۔ آپ اسے چھوٹا موٹا جاگیردار کہہ سکتے ہیں۔ ریاض بھی خاصے بڑے زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ گویا ان لوگوں میں صرف میں ہی تھا جو کاروباری گھرانے سے تعلق رکھتا تھا ورنہ وہ تینوں زمیندار تھے۔ ان کے انداز بھی زمینداروں والے تھے۔ سہیل کے والد نے تو اس کے ساتھ ایک ملازم رکھنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن کالج انتظامیہ نے اسے مسترد کر دیا اور کہا کہ ملازم رکھنے کا اتنا ہی شوق ہے تو اپنے بیٹے کو لاہور میں ہی مکان دلا دیں۔

وہ لوگ سہیل کو شاید کوئی مکان دلا بھی دیتے لیکن سہیل راضی نہیں ہوا کہ وہاں تو میں بالکل اکیلا ہو جاؤں گا۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔ میں بغیر ملازم کے ہی گزارہ کر لوں گا۔

ایک سال گزرتے گزرتے ہم لوگ آپس میں بہت گہرے دوست بن چکے تھے۔

ہم چاروں ایک دوسرے کی خوبیوں اور خامیوں سے بھی اچھی طرح واقف ہو گئے تھے۔

سہیل کے انداز میں جاگیرداروں والی نخوت تھی۔ وہ ہمارے ساتھ تو کبھی وہ رویہ نہیں اپناتا تھا لیکن اس کے ساتھ باہر جاتے ہوئے مجھے ہمیشہ یہ دھڑکا ہی لگا رہتا تھا کہ کب اس کی جاگیردارانہ ذہنیت جاگ اٹھے اور وہ ہمارے لیے اور خود اپنے لیے کوئی مسئلہ کھڑا کر دے۔ اس نے کسی نہ کسی طرح ضد کر کے اپنے ابا جی کی گاڑی منگوا لی تھی۔ چھٹی والے دن ہم سب اس کی گاڑی میں بیٹھ کر لاہور اور اس کے نواح کی سیر کرتے۔

سہیل کو قیمتی کپڑوں اور جوتوں کا بھی جنون کی حد تک شوق تھا۔ اس کی الماری کپڑوں کے لیے کم پڑ گئی تھی۔ خالد نے رضاکارانہ طور پر اسے اپنی الماری بھی دے دی تھی۔

اس کے [illegible] جوڑے تو میری الماری میں بھی آ گئے تھے۔

ریاض بھی زمیندار تھا لیکن وہ سہیل کی طرح نفاست پسند اور اکڑفوں والا بندہ نہیں تھا۔ وہ دوسروں کے ذاتی معاملات میں بہت کم دخل دیتا تھا۔ سہیل کی طرح وہ بھی کھلے ہاتھ سے خرچ کرنے کا عادی تھا۔

اسی طرح خالد بھی ایک زمیندار گھرانے کا فرد تھا۔ کھلے ہاتھوں سے وہ بھی خرچ کرتا تھا لیکن لباس کے معاملے میں وہ سہیل اور میری طرح نہیں تھا۔

میں چونکہ بچپن سے گجرات میں رہا تھا۔ گجرات بھی اچھا خاصا شہر ہے، پھر اکثر لاہور بھی آتا رہتا تھا اس لیے وہ سب مجھے شہری بابو کہتے تھے۔ اس دور میں کالج کے طلبا بھی تھری پیس سوٹ پہنتے تھے اور آج کل کی طرح سولہ سترہ سال کے نہیں ہوتے تھے بلکہ ان کی عمر بھی خاصی زیادہ ہوتی تھی۔ خاص طور پر ہوسٹل میں رہنے والے تو دور دراز علاقوں سے آتے تھے اور وہ پڑھنا بھی دیر میں شروع کرتے تھے۔

اپنے گروپ میں سب سے کم عمر میں تھا۔

خالد دل کا تو بہت اچھا تھا۔ بس اس کا رنگ کالا سیاہ تھا لیکن اس رنگت کی وجہ سے وہ کسی احساسِ کمتری میں مبتلا نہیں تھا۔ اس میں ایک اور بہت بڑی برائی تھی۔ لڑکیوں کے معاملے میں وہ بہت ندیدہ تھا۔ جہاں کوئی لڑکی دیکھی اور اس کی رال ٹپکی۔ اس نے اپنی کالی رنگت کے باوجود اس ایک سال کے عرصے میں دو عشق بھی کر لیے تھے اور ان لڑکیوں سے راتوں کو ملتا بھی رہتا تھا۔

ہم اسے ٹوکتے تو وہ کہتا ''یار، مجھے کیا ان لڑکیوں سے شادی کرنا ہے۔ میں تو ٹائم پاس کر رہا ہوں۔''

''یہ بہت بری بات ہے خالد!'' سہیل نے کہا۔ ''تم شریف لڑکیوں کو برباد کر رہے ہو۔''

اس کی بات سن کر خالد ہنسا اور بولا۔ ''او یار کہاں کی شرافت! وہ لڑکیاں تو پہلے ہی سے دو دو، تین تین محبوب بھگتا چکی ہیں۔''

ہم لوگ بھی خاموش ہو جاتے۔ یہ اس کا ذاتی فعل تھا۔ ہم اسے جتنا سمجھا سکتے تھے، سمجھا چکے تھے۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ اپنے شوق کی تکمیل کے لیے اس نے بازارِ حسن کا رخ نہیں کیا ورنہ لاہور کی ہیرا منڈی تو پورے برصغیر میں مشہور ہے۔

میں مذاق میں اسے ''اسپ تازی'' کہا کرتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ صنفِ نازک کے معاملے میں وہ کسی گھوڑے ہی کی طرح دیوانہ ہو جاتا تھا۔

پھر اسپ تازی سے اس کا نام ''کالا گھوڑا'' پڑ گیا اور یہ نام ایسا فٹ ہوا کہ نہ صرف ہم بلکہ کلاس کے دوسرے لوگ بھی اسے گھوڑا کہہ کر پکارنے لگے۔ وہ کبھی برا نہیں مانتا تھا۔

ہم لوگ سیکنڈ ایئر میں آئے تو سب سے کم نمبر گھوڑے کے تھے اور سب سے زیادہ نمبر میرے۔ ہم سب نے وعدہ کیا کہ اس سال خوب دل لگا کر پڑھائی کریں گے، پھر واقعی ہم نے پڑھائی شروع کر دی۔

دو تین ماہ ہمیں اسی طرح پڑھتے ہوئے گزرے۔ اب گھوڑے نے بھی اپنی محبوباؤں سے قطع تعلق کر لیا تھا یا پھر اُن کی طرف سے قطع تعلق کر لیا گیا تھا۔ غرض یہ کہ وہ بھی اب راتوں کو غائب نہیں رہتا تھا۔

ایک دن اچانک سہیل کے گھر سے تار آیا کہ فوراً گاؤں پہنچو۔

سہیل سمیت ہم سب پریشان بلکہ حواس باختہ ہو گئے۔ ان دنوں میں ''تار'' کا استعمال بدشگونی بلکہ کسی بری خبر کی آمد سمجھا جاتا تھا۔ پھر سہیل سے فوری طور پر گاؤں پہنچنے کو کہا گیا۔

میں نے اسے پیش کش کی کہ میں اس کے ساتھ چلتا ہوں بلکہ ہم تینوں نے اسے یہ پیشکش کی لیکن سہیل نے انکار کر دیا اور اپنی گاڑی کے ذریعے اکیلا ہی روانہ ہو گیا۔

اگلے چار پانچ دن تک ہم سب پریشان رہے اور گویا سولی پر لٹکے رہے۔

پانچویں دن سہیل کا خط ملا۔

معلوم ہوا کہ سب خیریت ہے بلکہ تم لوگوں کے لیے ایک خوش خبری ہے۔ میری شادی ہو رہی ہے۔ ابا جی نے مجھے اسی لیے گاؤں بلایا ہے۔ ہاں تم تینوں کو بھی ہر قیمت پر شادی میں شریک ہونا ہے ورنہ سمجھ لینا کہ تم میں سے جو بھی شریک نہ ہوا اس سے ہمیشہ کے لیے میرا تعلق ختم ہو جائے گا۔ دو تین دن میں کالج میں سردیوں کی چھٹیاں ہو رہی ہیں۔ تم لوگوں کے پاس اب شریک نہ ہونے کا کوئی بہانہ بھی نہیں ہے۔ میری شادی سے دو چار دن پہلے گاؤں پہنچ جانا تاکہ ہم لوگ ذرا انجوائے کریں، ذرا ہلا گلا کریں، فقط، تمہارا دوست سہیل۔

ہمیں تو یہ بھی حیرت تھی کہ سہیل کی ابھی سے شادی ہو رہی ہے۔ پھر اس پر رشک بھی آ رہا تھا کہ وہ بہت جلد دولہا بن جائے گا۔ اس دور میں شادی کے تصور ہی سے بدن

www.pdfbooksfree.pk

میں گدگدی ہونے لگتی تھی۔

ہم تینوں نے فوری وہاں جانے کا پروگرام بنالیا۔ ریاض اور خالد گھوڑے کے گاؤں تو وہاں سے دور تھے۔ میں انہیں اپنے ساتھ لے کر کچھ دن کے لیے گجرات آ گیا۔ وہاں میں نے اپنے دوستوں کو گجرات گھمایا، خاص طور پر اپنے پنکھوں کے کارخانے دکھائے کہ وہاں کیسے کام ہوتا ہے۔

ریاض مذاق میں بولا۔ ''یار! مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا۔ اب تجھے ہم سب کو ایک ایک پنکھا فری دینا ہوگا۔''

اس وقت میرے ابا جی بھی موجود تھے۔ وہ ہنس کر بولے ''پتر، تم لوگ اپنے گھروں کے پتے لکھوا دو، میں وہاں کے مقامی ایجنٹوں سے کہہ دوں گا کہ وہ پنکھے تمہارے گھروں پر پہنچا دیں گے۔''

ریاض نے کہا ''چاچا جی، میں نے تو مذاق کیا تھا لیکن ابا جی نہ مانے اور انہوں نے ریاض اور خالد کے گھر کے پتے لے ہی لیے۔

ہم سہیل کے گاؤں پہنچے تو اس نے ہمارا یوں استقبال کیا جیسے اس کے گاؤں میں کوئی وزیر یا حکومت کا کوئی اعلیٰ افسر آیا ہو۔

اس کی وسیع و عریض حویلی، نوکروں کی فوج ظفر موج، گاڑیاں اور گھوڑے دیکھ دیکھ کر ہم مزید مرعوب ہو گئے۔ ابھی شادی میں چار دن باقی تھے اور حویلی ابھی سے بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ اس نے ہم سب کے لیے الگ الگ کمروں کا بندوبست کیا تھا لیکن میں نے اور ریاض نے اس پر احتجاج کیا کہ الگ الگ رہ کر ہم کیا انجوائے کریں گے۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ ہم چاروں ہوسٹل کے کمروں کی طرح ایک ساتھ رہ کر لطف اندوز ہوں۔

سہیل کی سمجھ میں بھی یہ بات آ گئی۔ اس نے حویلی کی دوسری منزل پر ایک ہال کمرے میں چار بہترین قسم کی مسہریاں ڈلوا دیں۔ فرش پر دبیز قالین تھا۔ باقی حصے میں اس نے کشن اور گدیاں رکھ کر فرشی نشست بنا دی۔

سردی عروج پر تھی۔ ہم لوگ رات کو دیر تک جاگتے رہتے اور ہنسی مذاق کرتے رہتے۔ اس کے ساتھ ہی ڈرائی فروٹ کے ڈھیر ہمارے سامنے لگے رہتے، ہم پستے، بادام، اخروٹ اور مونگ پھلی سے بھی پورا پورا انصاف کرتے۔

اس کے دو نوکر صرف ہمارے لیے چائے اور کافی بنانے پر مامور تھے۔ اس کے والد نے ہمارے لیے خاص طور پر کافی منگوائی تھی کہ شہری منڈے چائے اور کافی ضرور پیتے ہوں گے البتہ صبح ناشتے میں کسی ضرور پلائی جائی۔

شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ لیکن خالد گھوڑا اکیلا ہی گاؤں کی سیر کو نکل گیا جب وہ کافی دیر تک واپس نہ آیا تو ہمیں فکر ہوئی۔

میں نے سہیل سے کہا۔ ''یار ابھی تک اس گھوڑے کا کچھ پتا نہیں..... نہ جانے وہ کہاں گیا؟''

سہیل مسکرا کر بولا ''فکر مت کرو اس نے یہاں بھی کوئی لڑکی ڈھونڈ لی ہوگی۔ عیش کر رہا ہوگا۔''

''یار، کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔'' ریاض نے کہا ''اگر گھوڑے نے یہاں بھی وہی حرکت کر دی تو کیا ہوگا۔ گاؤں کے لوگ تو اپنی لڑکیوں کی عزت کے معاملے میں بہت حساس ہوتے ہیں۔ ذرا سی بات پر کلہاڑیاں اور ڈنڈے نکل آتے ہیں۔''

(اس دور میں جدید اسلحے کا اتنا رواج نہیں تھا)

سہیل نے منہ بنا کر کہا۔ ''وہ چوہدری نثار احمد خان کا مہمان ہے۔'' سہیل کے والد کا نام نثار احمد تھا۔ ''کسی کی جرأت ہے کہ وہ خالد کو ٹیڑھی نظر سے دیکھے۔ اسے میں نے گاؤں ہی کے ایک آدمی کے ساتھ بھیجا ہے۔ تم فکر مت کرو۔ وہ ابھی تھوڑی دیر میں آ جائے گا۔

اور واقعی خالد گھوڑا تھوڑی دیر بعد واپس آ گیا۔ وہ بہت نڈھال اور تھکا تھکا سا نظر آ رہا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا ہوا گھوڑے، خیریت تو ہے۔ تو گھنٹوں سے کہاں غائب تھا اور کیا وہاں سے پیدل آیا ہے جو آتے ہی یوں پڑ گیا؟''

''یار، سہیل کا گاؤں تو بہت ہرا بھرا ہے، دل چاہ رہا ہے کہ میں ہمیشہ کے لیے یہیں رہ جاؤں، پھر پیار کی بہاریں، توبہ! کیا زبردست لڑکیاں تھیں۔''

''شکر خورے کو ہر جگہ شکر مل جاتی ہے۔'' ریاض نے ہنس کر کہا۔ ''لگتا ہے کہ صبح سے عشق ہی کر رہا تھا، ان نیاروں نے تجھے کچھ کھلایا پلایا بھی ہے یا نہیں؟''

''کھانے پینے کا موقع ہی کہاں ملا؟'' گھوڑے نے بہت مسکین سی شکل بنا کر کہا۔

اس کی بات پر سہیل سمیت ہم سب کے قہقہے نکل گئے۔

سہیل نے فوراً اپنے ایک ملازم سے کہہ کر

گھوڑے کے لیے کھانے کا بندوبست کرا دیا۔ گھوڑا تازہ دم ہونے کے لیے نہانے چلا گیا۔ وہ نہا دھو کر آیا تو کھانے پر ٹوٹ پڑا۔

رات کو جب ہماری محفل جمی تو میں نے باتوں باتوں میں سہیل سے پوچھا۔ ''سہیل ایک بات بتا! اگر کوئی لڑکی اور لڑکا یہاں رنگے ہاتھوں پکڑے جائیں تو گاؤں والے اس کا کیا حشر کرتے ہیں؟''

''دونوں کو وہیں مار دیتے ہیں۔'' سہیل نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اگر لڑکی یا لڑکے میں سے کوئی بچ کر نکل جائے تو اسے تلاش کرتے رہتے ہیں، چاہے اس میں کئی ماہ لگیں یا کئی سال، پھر وہ اسے مار کے ہی دم لیتے ہیں۔''

ہماری باتیں سن کر گھوڑے کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ وہ بہت سکون سے بادام اور پستے چبا رہا تھا، اس کا منہ چلنا ہی بند ہو گیا اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سہیل کو دیکھنے لگا۔

اس کی حالت کو ہم تینوں ہی نے محسوس کر لیا اور ہم بے تحاشا ہنسنے لگے۔

سہیل نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''او گھوڑے تو نے چارا کیوں چھوڑ دیا۔ یہ ان لوگوں کے لیے ہے جو پکڑے جائیں۔ تو پکڑا گیا ہے؟''

اس کی بات سن کر خالد کے چہرے پر رونق آ گئی۔

برات جانے میں ابھی دو دن باقی تھے۔ ہم لوگ سہیل کی جیپ میں شکار کے لیے نکل گئے۔ میرے علاوہ ان سب کا نشانہ بہترین تھا۔ وہ زمیندار گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے اس لیے بچپن سے شکار کھیلتے آئے تھے۔ مجھے کبھی رائفل یا پستول چلانے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ مجھے تو ان لوگوں کی طرح تیرنا تک نہیں آتا تھا۔ سہیل، ریاض اور گھوڑا تو نہر میں خوب مزے سے تیرتے تھے۔

ایک دن جب خالد نے صرف جانگیہ پہن کر نہر میں چھلانگ لگائی تو سب نے پھبتی کسی۔ ''یار پانی پر کیوں ظلم کر رہا ہے، اتنا بہترین اور شفاف پانی ہے، تیرے جسم کی سیاہی سے کالا ہو جائے گا۔''

''تو فکر مت کر۔'' گھوڑے نے کہا۔ ''پانی کالا ہو یا نیلا، مجھے اس سے کیا غرض، ہاں، اگر تو تیرنے کا وعدہ کرے تو میں ابھی باہر آ جاتا ہوں۔''

اس کم بخت کو میری کمزوری کا علم تھا۔

ہاں، میں ان سے ایک بات میں بہت آگے تھا۔ ڈرائیونگ میں کوئی میرا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا! سہیل اور ریاض کی بات تو الگ ہے ان کے ڈرائیور تک میری ڈرائیونگ پر اش اش کرتے تھے۔

ہم نے دو دن گھومنے پھرنے میں گزار دیے۔ گاؤں کی کھلی فضا اور خالص غذائیں، چار دن میں ہی میرا وزن بڑھ گیا تھا۔ ریاض کی رنگت بھی سرخ و سفید ہو گئی تھی۔ بس گھوڑا ہی تھا جس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

سہیل نے برات سے پہلے ہی لڑکی والوں کے گھر پیغام بھجوا دیا تھا کہ میرے ساتھ میرے کچھ خاص دوست بھی ہیں۔ میں ان کے ساتھ رہوں گا اس لیے میرا بندوبست ان ہی لوگوں کے ساتھ ایک ہی کمرے میں کیا جائے۔

جس دن برات روانہ ہوئی اس دن سہیل کی سج دھج دیکھنے کے قابل تھی۔ سہیل کے والد چوہدری نثار احمد کا طرہ پہلے سے زیادہ اونچا اور کلف والا نظر آ رہا تھا۔

سہیل کی دادی نے اس گاڑی کے پہیوں پر سے بھی پیسے صدقہ کر کے خیرات کیے جس میں سہیل کو بیٹھنا تھا۔ پھر اس کے والد نے ہزاروں روپے کے نوٹ اور ریزگاری سہیل پر سے صدقہ کر کے نچھاور کر دی جو گاؤں کے کمی کمینوں نے لوٹ لی۔

لڑکی والوں کا گاؤں یہاں سے چھ، سات گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ ہاں اگر آج کی طرح یہاں پختہ سڑک ہوتی اور نہر پر پل ہوتا تو یہ مسافت دو گھنٹے میں طے ہو جاتی۔

راستے میں سہیل کی گاڑی کا ٹائر پنکچر ہو گیا۔ اس کی دادی نے ٹوکا یہ تو بہت بدشگونی ہو گئی۔ ہم لوگ گاؤں سے باہر آ گئے۔ پیچھے والی گاڑی میں سہیل کے والد کے محافظ سوار تھے۔ وہ سب کلہاڑیوں، گنڈاسوں سے مسلح تھے۔ ایک دو کے ہاتھ میں مجھے تھری ناٹ تھری کی رائفلیں بھی نظر آ رہی تھیں۔

وہ سب ہم سے کچھ فاصلے پر کھڑے ہو گئے۔

اسی وقت ایک خوب صورت سی مقامی لڑکی اپنی بکریاں ہانکتی ہوئی وہاں سے گزری۔

خالد گھوڑے نے آہستہ سے کہا۔ ''کیا آفت جوانی ہے؟''

اس کی بات کو سہیل نے بھی سن لیا۔ وہ آہستہ سے بولا۔ ''تو کہے تو اسے بھی ساتھ لے چلوں؟''

''یہ ہمارے ساتھ کیسے جائے گی؟'' گھوڑے نے حیرت سے کہا۔

www.pdfbooksfree.pk

''ہم ابھی تک اپنی ہی زمینوں پر ہیں۔'' سہیل نے فخر سے گردن اکڑا کر کہا۔ کس کی مجال ہے کہ چوہدری سہیل احمد خان کو انکار کر سکے۔''

''او بس کر یار!'' ریاض نے کہا۔ ''یہ گھوڑا تو اپنے ساتھ ساتھ ہمیں بھی ذلیل کرائے گا۔ لڑکی والوں کے گھر پہنچ کر ان سے کیا کہو گے؟ یہ لڑکی ہم گھوڑے کا دل بہلانے کو لائے ہیں یا اس کی خدمت کرنے کو؟''

''یار تو میں کون سا اسے ساتھ لے کر جا رہا ہوں؟'' گھوڑے نے منہ بنا کر کہا۔

''حقیت یہ ہے کہ ریاض اگر نہ ٹوکتا تو گھوڑا، سہیل سے ضرور فرمائش کرتا کہ اس چرواہی کو بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ ویسے بھی گاؤں کی بہت سی عورتیں برات کے ساتھ تھیں۔ اس چرواہن پر کون دھیان دیتا۔

ڈرائیوروں نے کار کا پہیہ بدل دیا تھا، ہم لوگ گاڑی میں سوار ہو گئے اور گاڑی پھر روانہ ہو گئی۔

ہم لوگوں نے دوپہر کے کھانے کے لیے ایک جگہ قیام کیا، یہاں ہرا بھرا علاقہ تھا۔ گھاس کے فرش پر سہیل کے ملازموں نے قالین بچھا کر دسترخوان لگا دیا اور کھانا چن دیا گیا۔ میں حیران تھا کہ اتنا کھانا یہاں کیسے آیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ایک ٹرک میں کھانے کا سامان اور باورچی بھی ساتھ جا رہے ہیں۔

ہم لوگ کھانا کھا کر فارغ ہوئے اور ٹہلتے ہوئے کچھ دور چلے گئے۔ سہیل کھانے کے بعد سگریٹ پیتا تھا۔ وہ سگریٹ اپنے اباجی اور دوسرے بزرگوں کے سامنے تو نہیں پی سکتا تھا۔

وہاں سے دو لڑکیاں گزریں، ہمیں دیکھ کر دونوں ٹھٹک گئیں۔ میں نے گھوڑے کی آنکھوں میں عجیب سی چمک دیکھی۔

''سنبھل کے گھوڑے!'' ریاض نے جلدی سے کہا۔ ''یہ چوہدری سہیل احمد خان کی زمین نہیں ہے۔''

''ابے تو کیا اپنی آنکھیں بند کر لوں؟'' گھوڑا اچڑ کر بولا۔

ریاض کا جملہ شاید سہیل کی جاگیردارانہ ذہنیت پر کوڑا بن کر لگا۔ اسے لگا جیسے ریاض نے اس پر طنز کیا ہو۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے تو یہی لگ رہا تھا۔

سہیل بھاری آواز میں بولا۔ ''میں جانتا ہوں یہ کس کی زمین ہے۔'' اس نے کچھ توقف کیا اور بولا۔ ''یہ ایک چھوٹا سا زمیندار ہے۔ گھوڑے اگر تجھے ان میں سے کوئی لڑکی پسند ہے تو اشارہ کر۔ میرے آدمی ابھی اسے اٹھا کر گاڑی میں ڈال لیں گے۔''

''تمہارا دماغ خراب ہے؟'' میں نے پہلی دفعہ اتنے غصے میں سہیل کو مخاطب کیا۔ ''کیا تم یہاں کے بادشاہ ہو یا تم پر کوئی قانون لاگو نہیں ہوتا جو تم یوں سرِ عام لڑکیاں اٹھانے کی بات کر رہے ہو۔ مجھے تو لگتا ہے کہ تم نے پڑھ لکھ کر بھی عقل کو ڈبو دیا ہے۔ تمہارے بزرگ ساتھ ہیں اور تم کہہ رہے ہو کہ تمہارے آدمی ابھی ان لڑکیوں کو اٹھا کر گاڑی میں ڈال لیں گے۔ کیا تمہارے والد کو اس پر اعتراض نہیں ہوگا؟''

سہیل کے چہرے پر پہلے تو برہمی کے تاثرات نمودار ہوئے، پھر وہ آہستہ آہستہ نارمل ہو گیا اور بولا۔

''خورشید بات اصل میں یہ ہے کہ ہم لوگ اپنے مہمان کے لیے اپنی جان تک دینے سے گریز نہیں کرتے۔''

''چاہے مہمان کسی کی عزت پر ہاتھ ڈال دے...؟'' ریاض نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم لوگ اب بھی دو سو سال پہلے کے زمانے میں رہ رہے ہو۔ یہ لڑکیاں بھی کسی گھر کی عزت ہوں گی۔ وہ لوگ لاکھ کم زور سہی لیکن اپنی عزت پر جان لے نہیں سکیں گے تو جان دے تو سکتے ہیں۔''

''سہیل! میں ایک بات کہوں؟'' اگر تم برا نہ مانو تو؟''

''کہو یار تم بھی کہو، تم بھی تو آخر مہمان ہو؟''

''فرض کرو گھوڑے کو تمہارے گھرانے کی کوئی لڑکی پسند آ جائے، تو تم کیا کرو گے؟''

''خورشید!'' سہیل غضبناک ہو کر چیخا۔ ''تمہاری جرأت کیسے ہوئی ایسی بات منہ سے نکالنے کی؟''

''بات تلخ ضرور ہے سہیل!'' میں نے کہا ''لیکن میں نے تم سے ایک سوال کیا اور تم آپے سے باہر ہو گئے۔ اگر میں نے سوال کر کے کوئی جرم کیا ہے تو ابھی اپنے آدمیوں سے کہو کہ وہ میرے ٹکڑے کر دیں۔ سچی بات تو کڑوی لگتی ہی ہے۔''

سہیل چند لمحے تک مجھے گھورتا رہا۔

پھر ریاض نے کہا۔ ''چھوڑو یار، کیوں اچھا بھلا ماحول خراب کر رہے ہو۔ ہم سہیل کی شادی میں جا رہے ہیں اور تم...''

''ہم نہیں، تم اور گھوڑا۔'' میں نے منہ بنا کر کہا۔ ''میں واپس جا رہا ہوں، کہاں تو یہ مہمانوں کے لیے اپنی جان دینے کی بات کر رہا تھا اور کہاں یہ مجھ پر یوں چلا رہا ہے جیسے میں اس کا ذاتی ملازم ہوں؟''

''چھوڑ یار، اب غصہ تھوک دے۔'' گھوڑے نے کہا۔

''تم تو بولنا ہی مت۔'' میں نے بپھر کر کہا۔ ''ورنہ میں یہیں تمہاری مرمت کر دوں گا۔ تم سہیل کے مہمان ہو، میرے نہیں ہو۔''

میرا غضب ناک لہجہ سن کر گھوڑا خاموش ہو گیا۔

''تو واپس جائے گا کیسے؟'' ریاض نے پوچھا۔

''یار، مجھے یہاں سے کوئی نہ کوئی سواری تو مل ہی جائے گی، کوئی بس، کوئی بیل گاڑی، کوئی ٹریکٹر، اگر وہ بھی نہ ملا تو میرے پیر تو ہیں۔ واپس جانا کون سا مسئلہ ہے؟''

''خورشید!'' سہیل نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''تو نے میری بات کا اتنا برا منایا ہے؟''

''میں نے نہیں بلکہ تو نے میری بات کا برا مانا ہے۔'' یہ کہہ کر میں مڑا، اور واپس جانے کے ارادے سے قدم بڑھائے۔

سہیل نے بھاگ کر مجھے پکڑ لیا اور بولا۔ ''خورشید! میں تجھ سے معافی مانگتا ہوں۔ مجھے اچانک غصہ آ گیا تھا۔ مجھے معاف کر دے یار!''

''میرا سوال اب بھی اپنی جگہ موجود ہے۔'' مجھے بھی کچھ ضد سی ہو گئی تھی۔ جو شخص دوسروں کی بہو بیٹیوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح اٹھانے کی بات کر رہا تھا، وہ اپنے گھر کی لڑکیوں کے بارے میں کیا خیالات رکھتا ہے۔

''تو میرا جواب سننا ہی چاہتا ہے تو سن۔'' سہیل نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اگر ہمیں شبہ بھی ہو جائے تو ہم اس آدمی اور اپنے خاندان کی لڑکی کے ٹوٹے کر دیتے ہیں۔''

میں نے نرمی سے کہا۔ ''میں بھی تجھ سے یہی سننا چاہتا تھا۔ اسی طرح دوسروں کے جذبات بھی ہوں گے۔ غیرت تو دوسروں کی بھی ہوتی ہے۔''

''چل، اب غصہ تھوک دے۔'' سہیل نے کہا۔ ''اگر تو کہے تو میں تیرے پاؤں پکڑ لوں۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

میں نے اسے سینے سے لگا لیا اور کہا۔ ''سہیل! پڑھ لکھ کر تو انسان میں شعور آتا ہے۔ مجھ سے وعدہ کر کہ آئندہ اس قسم کی جاہلوں والی کوئی بات نہیں کرے گا۔''

''اچھا یار، میں وعدہ کرتا ہوں، مردوں والا وعدہ۔'' اس نے میرے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

ہم ریاض اور گھوڑے سے کچھ دور تھے۔ ہمیں ہنستا دیکھ کر وہ دونوں بھی ہنسنے لگے۔

سہیل ہنس کر بولا۔ ''یار، اب اس گھوڑے سے بھی کچھ

آلو: Potato

انسانی غذا کا ایک اہم جزو۔ زمین کے اندر ہوتا ہے۔ پودا چھوٹا، پتے چوڑے اور پھول سفید ہوتے ہیں۔ اس کی کاشت، سب سے پہلے میکسیکو اور پیرو میں ہوئی۔ وہاں سے ہسپانوی ملاح اسے یورپ لے گئے اور اب یہ تقریباً تمام دنیا میں کاشت کیا جاتا ہے۔

پیرو کے لوگ اسے بتاتا کہتے تھے۔ ہسپانویوں نے اسے بپاتا کہا، جو انگریزی میں بگڑ کر پوٹیٹو ہو گیا لیکن ممبئی میں اسے بٹاٹا کہتے ہیں جو ہسپانوی سے ملتا جلتا نام ہے۔ اہلِ ہند نے اسے آلو کا نام دیا، کیونکہ اس کی شکل آلوچے اور آلو بخارے سے ملتی جلتی تھی۔

آلو ایک قوت بخش غذا ہے، اس میں 81 فیصد پانی، 16 فیصد نشاستہ اور باقی شکر، چکنائی، ایسڈ، حیاتین اور نمک ہوتے ہیں۔ گاجر اور مولی کی طرح یہ جڑیلی سبزی نہیں ہے۔ یہ دراصل زمین کے اندر، پودے کی شاخ کا پھولا ہوا سرا ہوتا ہے، جسے بصلہ یا گنٹھا کہتے ہیں۔ سوائے بادی کے مریضوں کے، ہر عمر کے لوگوں کے لیے بہترین غذا ہے۔ جتنا کاربوہائیڈریٹ، لوہا اور حیاتین سی اس میں ہوتا ہے، سنگتروں کے سوا اور کسی پھل یا سبزی میں نہیں ہوتا۔

برصغیر پاک و ہند میں آلو کی کاشت سترھویں صدی عیسوی میں شروع ہوئی۔ پاکستان میں صوبہ سرحد، صوبہ سندھ اور پنجاب میں اچھے قسم کے آلوؤں کی کاشت ہوتی ہے۔ دنیا بھر میں آلو کی کوئی سات سو اقسام پائی جاتی ہیں۔ پاکستان میں التمش، ایجکسن، ایف بی 3, 9003 ایف 13-9369 ڈایامنٹ، پٹرونس، ملٹا، سپینٹا، کارڈینل، ولجایا جوز نامی قسموں کے آلو کاشت کیے جاتے ہیں۔

مرسلہ: فہمیدہ نسرین ملتان

www.pdfbooksfree.pk

مت کہنا۔ وہ بے چارہ تو تیری ڈانٹ سے پہلے ہی سہم گیا ہے۔ اسے بھی معاف کردے۔ وہ اپنی عادت سے مجبور ہے۔''

اس نے یہ بات اتنے سنجیدہ انداز میں کہی کہ مجھے ہنسی آگئی۔

ہم لوگ دوبارہ روانہ ہوئے تو چراغ جلے دلہن کی حویلی پہنچے۔

دلہن والوں نے سہیل کی ہدایت کے مطابق ہمارے لیے حویلی کی دوسری منزل پر ایک خاص کمرے کا انتظام کیا تھا۔ کمرے میں بہترین مسہریاں تھیں۔ ایک طرف فرشی نشست پر گاؤ تکیے رکھے تھے، درمیان میں کوئلوں کی انگیٹھی دہک رہی تھی۔ اس دن سردی اچانک بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ کمرے میں نئے اور نرم ملائم کمبل اور ریشمی رضائیاں بھی تھیں۔ ڈرائی فروٹ کے تھال بھرے رکھے تھے، چائے اور کافی کی ہدایت شاید سہیل کے والد نے دی تھی۔

ہم لوگ گرما گرم پانی سے نہا کر تر و تازہ ہوگئے، پھر گرم گرم بھاپ اڑاتی چائے اور شامی کبابوں نے لطف دوبالا کردیا۔

دوسرے دن نکاح تھا، اس سے پہلے سہیل کے خاندان میں بہت رسمیں رائج تھیں اس لیے سہیل ہم سے اجازت لے کر زنان خانے میں چلا گیا۔ وقت گزاری کے لیے ہم نے تاش کی گڈی نکال لی اور تاش کھیلنے لگے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم خشک میوے بھی ٹونگ رہے تھے۔ وقفے وقفے سے ہم لوگ چائے اور کافی بھی پی رہے تھے۔

جب ہم کھیل کھیل کر اکتا گئے تو اٹھ کر اپنے بستروں پر لیٹ گئے۔ دلہن والوں کے ملازم وقفے وقفے سے انگیٹھی میں کوئلے ڈال دیتے تھے۔ کمرا خوب گرم ہو رہا تھا، نرم و ملائم بستر پر لیٹتے ہی مجھے نیند کے جھونکے آنے لگے، حالانکہ اس سے پہلے میں نے کم سے کم دو تین کپ چائے اور اتنی کافی پی لی تھی۔ سہیل ابھی تک غائب تھا، آخر وہ دولھا تھا۔ وہ بے چارہ خواتین کے درمیان مختلف رسوم میں پھنسا ہوا تھا۔ آج کا دور ہوتا تو ہم بھی اس کے ساتھ ہوتے۔ ایسے میں گھوڑے کی تو گویا عید ہوجاتی۔

میں یہی سب کچھ سوچتے سوچتے نہ جانے کب سوگیا۔

اچانک سرد ہوا کا جھونکا آیا تو میری آنکھ کھل گئی۔

کمرے میں گھپ اندھیرا تھا اور ٹھنڈی ہوا مسلسل آرہی تھی۔ کمرے کے وسط میں رکھی ہوئی انگیٹھی کے کوئلے سرد پڑ چکے تھے۔ مجھے شدید پیشاب بھی آرہا تھا لیکن میں نے سہیل سے یہ پوچھا ہی نہیں تھا کہ بیت الخلا کس طرف ہے؟ اس دور میں آج کی طرح اٹیچ باتھ تو ہوتے نہیں تھے۔

میں نے ریاض کو آواز دی۔ ''ریاض!'' میں نے چند لمحے تک اس کے جواب کا انتظار کیا لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ وہ شاید بہت گہری نیند میں تھا۔ پھر میں نے گھوڑے کو آواز دی۔ ''گھوڑے... خالد...'' لیکن جواب ندارد!

وہ دونوں یا تو بہت گہری نیند میں تھے یا پھر اپنے بستروں میں تھے ہی نہیں۔ میں سگریٹ بھی نہیں پیتا تھا کہ ماچس ہی جلا کر کمرے کا جائزہ لے لیتا۔ سرد ہواہڈیوں میں گھسی جارہی تھی۔

دلہن والوں کے ملازمین کا خیال آیا۔ وہ لوگ یقیناً برآمدے میں بستر لگائے سو رہے ہوں گے۔ میں نے زور سے آواز دی۔ ''کوئی ہے؟ باہر کوئی ہے؟'' میں نے اس مرتبہ قدرے بلند آواز میں پکارا لیکن میری آواز کا کسی نے جواب نہیں دیا۔

میں جھنجلا کر خود ہی بستر سے اٹھا اور ٹٹولتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ میرا اندازہ تھا کہ دروازہ میری مسہری سے کچھ فاصلے پر دائیں جانب ہے۔

میں اندازے سے آگے بڑھا تو فرش پر پڑی ہوئی ایک رضائی میں الجھ کر گرتے گرتے بچا۔ اب میری نظریں اندھیرے سے کچھ کچھ مانوس ہوگئی تھیں لیکن اتنا گھپ اندھیرا کیوں تھا؟ کیا لائٹ چلی گئی تھی یا فیوز اڑ گیا تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ دروازے کی طرف جانے کی بجائے ریاض یا گھوڑے کو اٹھاؤں۔ میں پھر پلٹا۔ ریاض کی مسہری میری مسہری کے نزدیک ہی تھی۔

میں نے آگے بڑھ کر اس کی مسہری کو ٹٹولا تو وہاں صرف لحاف تھا۔ بستر پر ریاض نہیں تھا۔

میں اندازے سے گھوڑے کی مسہری کی طرف بڑھا۔ اس کی مسہری بھی خالی تھی۔ وہ دونوں نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔

مجھے ایک خیال یہ بھی آیا کہ ممکن ہے دلہن والوں کے گھر میں کوئی ایسی رسم ہو جس میں مرد بھی شرکت کرتے ہوں۔ شاید ریاض اور گھوڑا وہیں گئے تھے لیکن یہ اندھیرا کیوں تھا؟

میں نے اپنی ریڈیم ڈائل والی گھڑی پر نظر ڈالی تو اس میں سوا تین بج رہے تھے۔

رات کے اس پہر یہ لوگ کہاں چلے گئے تھے۔ سہیل

تو خیر پہلے ہی غائب تھا۔

میں پھر اندازے سے دروازے کی طرف بڑھا اور باہر نکلنے کی کوشش کی تو دیوار سے ٹکرا گیا۔ میں جھنجلا کر رہ گیا۔ پھر میں دیوار کو ٹٹولتا ہوا اس کے سہارے آگے بڑھا اور بالآخر دروازے تک پہنچ گیا۔ دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ میں باہر نکلا تو باہر بھی کوئی ملازم نہیں تھا۔

مجھے یاد آیا کہ دن میں جس غسل خانے میں غسل کیا تھا، اس کے برابر میں ہی بیت الخلا تھا۔ میں اندازے سے غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔

میں نے بیت الخلا کے دروازے پر ہتھ رکھ دیا۔ اب نہ جانے وہ غسل خانہ تھا یا بیت الخلا۔

اچانک پیچھے سے ایک انتہائی کڑک اور مکروہ آواز آئی۔ ''کہاں جارہا ہے؟''

میں بھڑک کر پلٹا تو خوف و دہشت سے میرا خون خشک ہوگیا۔

وہ انسان نہیں کوئی عجیب مخلوق تھی۔ مجھے اندھیرے میں صرف اس کا ہیولا نظر آرہا تھا۔ اس کا قد بلاشبہ آٹھ، ساڑھے آٹھ فٹ لمبا تو ہوگا کیونکہ مجھ جیسا دراز قد آدمی بھی اسے سر اٹھا کر دیکھنے پر مجبور تھا۔ وہ سیاہ مائل گہرے رنگ کے لباس میں تھا۔ مجھے صرف اس کے بال نظر آرہے تھے جو اس کے سر سے نیچے شانوں تک بکھرے ہوئے تھے۔

اس نے میرے مڑنے پر ایک بھیانک قہقہہ لگایا اور بولا۔ ہاہاہا... آج تو قبضے میں آیا ہے۔ مجھے کتنے عرصے سے کسی صحت مند نوجوان کے خون کی ضرورت تھی۔ آج اگر میں نے تیرا خون نہ پیا تو صبح تک میں مرجاؤں گا۔''

میں بزدل نہیں ہوں لیکن گھپ اندھیرے اور اس پُراسرار ماحول میں مجھے عجیب سا خوف محسوس ہو رہا تھا۔ پھر اس سے پہلے ہم لوگ اس قسم کے پُراسرار واقعات پر گفتگو بھی کرتے رہے تھے۔

تبھی مجھے دادی اماں کی بات یاد آئی کہ پتر کوئی بھوت پریت یا آسیب ٹکرا جائے تو آیت الکرسی پڑھ لیا کر، وہ فوراً اس کے جلال سے یا تو ڈر کر بھاگ جائے گا یا بھسم ہوجائے گا۔

میں نے ہمت کرکے کہا۔ ''آخر تو کون ہے اور چاہتا کیا ہے؟''

میں رام چندر کی بھگتی ہوئی آتما ہوں۔'' اس نے عجیب سے کھردرے لہجے میں کہا۔ ''گھر میں جب بھی کوئی

آگرہ

بھارت کے صوبہ اتر پردیش (سابق صوبہ جات متحدہ آگرہ و اودھ) کا مشہور تاریخی شہر۔ دریائے جمنا کے کنارے دہلی سے بجانب مشرق سو میل کے فاصلے پر آباد ہے۔ آبادی 2001ء میں 11,00,000 تھی۔ سلطنتِ مغلیہ کے بانی شہنشاہ بابر نے اسے اپنا دارالحکومت بنایا تھا۔ اس کے پوتے اکبر نے سلیم چشتی سرخ قلعے کی مرمت و توسیع کی۔ اس کا شاندار مقبرہ سکندرہ کے مقام پر ہے۔ شاہجہان نے 50-1632ء کے دوران یہاں اپنی ملکہ ممتاز محل کا شہرۂ آفاق مقبرہ تاج محل تعمیر کرایا۔ آگرے کی اہمیت 1659ء سے کم ہونی شروع ہوئی جب شہنشاہ عالمگیر نے پایہ تخت دہلی منتقل کرلیا۔ سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے دوران میں حکمران جلد جلد بدلتے رہے۔ بالآخر 1803ء میں لارڈ لیک Lake نے اسے مرہٹوں سے فتح کرکے انگریزی سلطنت میں شامل کرلیا۔ 1835ء سے 1858ء تک آگرہ شمال مغربی صوبہ جات کا دارالحکومت رہا۔ اہم ریلوے جنکشن اور خاصا بڑا تجارتی مرکز ہے۔ جوتے، شیشے کے سامان، دستکاریوں، قالین اور بالخصوص مغلیہ طرز کی عمارات کی وجہ سے مشہور ہے۔

تاج محل کے علاوہ شاہجہان کی تعمیر کردہ موتی مسجد، شیش محل Mirror Palace اور یونیورسٹی (قیام 1927ء) کی عمارات بھی بڑی دیدہ زیب ہیں۔ یہاں ہوائی اڈا، ریلوے اسٹیشن بھی ہیں۔

مرسلہ: زاہد سلیم، کراچی

www.pdfbooksfree.pk

شادی ہوتی ہے یا کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو مجھے خون کی ضرورت پڑتی ہے۔ آج میں تیرا خون پیوں گا۔''

میں نے آیت الکرسی پڑھنے کی کوشش کی لیکن مجھے آیت الکرسی یاد ہی نہیں آرہی تھی۔ میں نے پھر ذہن پر زور دیا تو مجھے آیت الکرسی کی بجائے الحمد شریف یاد آگئی، میں نے اس کا ورد کرتے ہوئے اچھل کر اس بھوت کے پیٹ میں زوردار ٹکر ماری۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں اپنی زندگی سے مایوس ہوگیا تھا۔ سوچا کہ جب مرنا ہی ہے تو اس کا مقابلہ کرکے کیوں نہ مروں گا۔ میری ٹکر اتنی شدید تھی کہ وہ دھڑام سے فرش پر گر پڑا اور کراہ کر بولا۔ ''اوئی مرگیا!''

اس وقت اچانک لائٹ روشن ہوگئی۔ میرے سامنے فرش پر کوئی اجنبی پڑا تھا۔ ٹکر لگنے سے اس کے بالوں کی وگ دور جا گری تھی۔ وہ دراصل لمبے لمبے بانسوں پر چل رہا تھا۔ میری ٹکر سے وہ توازن برقرار نہ رکھ سکا اور فرش پر گر گیا۔

اسی وقت سہیل، ریاض اور گھوڑا ہنستے ہوئے ایک طرف سے نمودار ہوئے۔ دلہن کے بھائی اور کزن بھی ساتھ تھے۔

دلہن کے بھائی نے آگے بڑھ کر مجھ سے معافی مانگی اور بولا۔ ''معافی چاہتا ہوں، دراصل یہ پلان آپ کے دوست ہی کا تھا کہ آپ لوگوں کو خوفزدہ کیا جائے۔ یہ ان ہی کی ایکٹونیٹی تھی۔

میں سہیل سے مخاطب ہوا۔ ''تم سے تو میں بعد میں نمٹوں گا پہلے اس بے چارے جن بابا کو دیکھو۔ میری ٹکر کچھ زیادہ ہی زور سے لگ گئی ہے۔

دلہن کے بھائی کے اشارے پر دو تین ملازمین اس کی طرف بڑھے۔ اسے اچھی خاصی چوٹ آئی تھی لیکن آدمی جان دار تھا اس لیے ملازموں کی مدد سے فوراً اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ملازموں نے اس کے پیروں میں بندھے ہوئے بانس کھول دیے تھے۔

''صاحب جی!'' اس نے لجاجت بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں تو حکم کا غلام ہوں۔ مجھے تو سلطان صاحب نے کہا تھا۔''

''تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔'' میں نے اس سے کہا۔ ''تمہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی۔''

''نہیں صاحب جی! ہم لوگ تو ایسی چوٹیں کھانے کے عادی ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

وہ بھی دلہن والوں کا ملازم تھا، لحیم شحیم آدمی تھا اس لیے اس کا انتخاب کیا گیا تھا۔

بعد میں سہیل نے ہنستے ہوئے مجھے بتایا کہ میرا پلان تو یہ تھا کہ تم تینوں کو خوف زدہ کیا جائے لیکن جب میں یہاں پہنچا تو ریاض اور خالد جاگ رہے تھے۔ انہوں نے ہماری باتیں سن لیں۔ میں نے سوچا کہ اب تو سارا پلان ہی چوپٹ ہوجائے گا۔ اب پلان بنا ہی لیا ہے تو کم سے کم خورشید ہی کو ڈرا دیا جائے۔ مجھے معاف کردینا یار، یہ صرف مذاق تھا۔''

میں نے تو سہیل سے کہا بھی تھا کہ خورشید نہیں ڈرے گا۔'' ریاض نے کہا۔ ''ہاں، میں یا گھوڑا ہوتا تو ہم دونوں خوف زدہ ہوجاتے۔ میں تو شاید اس ''جن'' کو دیکھ کر ہی بے ہوش ہوجاتا لیکن تم نے تو باقاعدہ اس جن سے بات چیت شروع کردی۔''

سہیل نے کمرے کی تمام کھڑکیاں بند کیں تو مجھے خیال آیا کہ سرد ہوائیں ان ہی کھڑکیوں سے آرہی تھیں۔ اس نے ملازمین کو انگیٹھی دہکانے کا حکم دیا اور مجھ سے بولا۔ ''یار تم لیٹ جاؤ اب تمہارے لیے گرما گرم چائے بنواتا ہوں۔''

او بھائی، میں پیشاب کرنے گیا تھا۔ اندھیرے میں کچھ نظر ہی نہیں آرہا تھا۔ پہلے میں فارغ ہولوں، پھر تم سے بات کرتا ہوں۔ ہاں تمہارا یہ مذاق ادھار رہا۔ اس کے بدلے میں تم سے ایسا مذاق کروں گا کہ زندگی بھر یاد رکھو گے۔'' یہ کہہ کر میں بیت الخلا کی طرف بڑھ گیا۔

دوسرے دن سہیل کا نکاح تھا۔ نکاح کے لیے سہیل نے.... اپنی طرف سے تینوں دوستوں کے لیے بہت قیمتی سوٹ بنوا کر دیے تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ اس سے دلہن والوں پر رعب پڑے گا۔''

''رعب پڑے گا۔'' ریاض نے کہا۔ ''نظر سے بچنے کے لیے ہمارے ساتھ کالا ٹیکا بھی ہے۔''

''بیٹا! کل تمہیں اس کالے ٹیکے ہی نے بچالیا۔''

''اچھا اب بک بک بند کرو اور نیچے چلنے کی تیاری کرو۔'' سہیل نے کہا۔ ''میں نیچے جارہا ہوں، قاضی صاحب آچکے ہیں۔ تم لوگ بھی نیچے پہنچو۔ نظام الدین!'' اس نے ایک ملازم سے کہا۔ ''ان لوگوں کو نیچے بڑے کمرے میں لے آنا۔''

سہیل کا نکاح بہت شاندار طریقے سے ہوا۔ دلہن والے اگر سہیل کے گھرانے سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں تھے۔ باہر سیکڑوں دیگیں دم ہورہی تھیں۔ ان لوگوں نے

درجنوں بکروں کی قربانی کی تھی اور درجنوں بکرے صدقے کے طور پر ذبح کرکے پورے گاؤں میں تقسیم کردیے تھے۔

ہم لوگ تو یوں بھی دی آئی پی تھے کہ دولھا کے مہمان تھے۔ اس موقع پر مجھے دلہن کی بہنوں اور دوسری خواتین کو دیکھنے کا موقع بھی ملا۔ میں انہیں دیکھنے کی بجائے گھوڑے کی طرف دیکھ رہا تھا کہ وہ کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کردے اور رنگ میں بھنگ پڑ جائے۔ ریاض تو باقاعدہ اس کے ساتھ بیٹھا تھا اور اس کا ایک ہاتھ گھوڑے کے ہاتھ میں تھا۔ گویا اس نے گھوڑے کی لگام تھام رکھی تھی۔

پُرتکلف کھانے کے بعد وہاں دلہن والوں کی طرف سے فنکشن کا انتظام بھی تھا۔ دور دور سے بھانڈ مراثی آئے تھے۔ دلہن والوں نے لاہور سے ناچنے والیاں بھی بلائی تھیں۔ یہ محفل رات گئے تک جاری رہی، پھر ہم لوگ اپنے کمرے میں آگئے۔

میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سہیل بھی ہمارے ساتھ تھا۔

''تم یہاں ہو؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''تمہیں تو دلہن کے پاس ہونا چاہیے۔''

سہیل نے ایک طویل اور ٹھنڈا سانس لیا اور بولا۔ ''یار خورشید تمہیں حیرت ہوگی۔ یہ ہماری فیملی کی ایک عجیب وغریب رسم ہے بلکہ میں تو اسے المیہ کہوں گا۔''

''یار، صاف صاف بات کرو۔'' میں نے الجھ کر کہا۔

''ہمارے خاندان میں رسم ہے کہ نکاح کے بعد کم سے کم دو مہینے اور زیادہ سے زیادہ چار مہینے تک دلہن اور دولھا آپس میں نہیں مل سکتے۔''

''یہ کیسی رسم ہے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا، پھر اتنی لمبی چوڑی تقریب کی ضرورت کیا ہے۔ سیدھا سیدھا نکاح کرکے تجھے دور بھیج دیتے اور رخصتی کے وقت بلا لیتے۔ ہم بھابی کو ساتھ لے کر جاتے تو اس کا مزہ ہی اور تھا۔ یار تو نے موڈ خراب کردیا۔''

''موڈ تو میرا خراب ہے یار!'' سہیل نے کہا۔ ''آج میری سہاگ رات ہے بلکہ ہونا چاہیے تھی۔ مجھے آرسی مصحف کے موقع پر صرف دلہن کا چہرہ دکھایا گیا ہے۔ اس سے میری آتشِ شوق مزید بھڑک اٹھی ہے۔''

''کیا بات ہے یار؟'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''تو جھنجلاہٹ میں بہت ثقیل اردو بول رہا ہے۔ ''آتشِ شوق!''

''یار، مجھے مذاق سوجھ رہا ہے اور میں...''

''چھوڑ میرے دوست!'' میں نے کہا۔ ''اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

''یہ باتیں ریاض اور گھوڑا بھی سن رہے تھے۔ انہوں نے بھی اپنے اپنے طور پر سہیل کو تسلی دی۔ گھوڑے نے تو دو چار پھڑکتے ہوئے لطیفے بھی سنائے اور سہیل ہنسنے پر مجبور ہوگیا۔

ہاں، میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ دلہن والوں نے ہمارا کمرا تیار کردیا تھا۔ اب ہم نچلی منزل کے ایک بڑے کمرے میں تھے۔ وہاں شاید ان لوگوں نے دلہن کا جہیز وغیرہ رکھا تھا جو سہیل کے گھر والوں کے ساتھ جاتا۔ ہمیں ابھی مزید ایک دن وہاں قیام کرنا تھا۔

ریاض نے کہا ''یار، مجھے تو ابھی نیند نہیں آرہی ہے۔ سہیل کو بھی نیند نہیں آرہی ہوگی۔ کیوں نہ ہم تاش ہی کھیل لیں۔

گھوڑے نے تاش کی گڈی نکالی اور پتے بانٹنے لگا۔

سہیل نے اسے روک دیا اور بولا ''یار کوٹ پیس کی بجائے فلیش کھیلیں گے۔ یا تو آج میں تم لوگوں کی جیبیں خالی کراؤں گا یا اپنی جیب خالی کردوں گا۔''

ہم نے ... سوچا، اگر سہیل کی یہ ... خوشی ہے تو یہ ہی سہی۔ ہم تو اسے کسی نہ کسی طرح بہلانا چاہتے تھے تاکہ وہ پھر سے نارمل ہوجائے۔

''ایک روپے کا بیٹ ہوگا۔'' سہیل نے کہا۔ ایک روپیا اس دور میں خاصی قدر رکھتا تھا۔ عام طور پر لوگ چار آنے رکھتے تھے۔

''منظور ہے۔'' میں نے کہا۔ ''چل بھئی گھوڑے، پیسے نکال۔''

ریاض اور گھوڑے نے پیسے نکالے اور فرش پر ڈال دیے۔ میں نے بھی پیسے نکال کر ڈال دیے اور ہم لوگ فلیش کھیلنے لگے۔

اس دن گھوڑا ہر بازی جیت رہا تھا اور ہم جھنجلا کر مزید پیسے لگا رہے تھے۔ ہم جب سے سہیل کے گاؤں آئے تھے ہماری جیب سے ایک پیسا بھی خرچ نہیں ہوا تھا۔ صرف پانچ پانچ سو روپے ہم نے نکاح کے بعد سہیل پر سے صدقہ کرکے اس کے ملازمین کو دیے تھے۔ میرے خیال میں تو یہ رقم بہت زیادہ تھی لیکن سہیل کی عزت کا بھی خیال رکھنا تھا۔

کھیلتے کھیلتے جب ایک بازی ختم ہوئی تو گھوڑا بولا۔ ''یار، میں ذرا پیشاب کرکے آتا ہوں۔ اس وقت تک ایک بازی تم تینوں کھیل لو۔''

وہ اٹھ کر چلا گیا۔

www.pdfbooksfree.pk

ہم تینوں ہی کھیلتے رہے۔ اس مرتبہ دو تین بازی میں جیتا، پھر سہیل نے جیتنا شروع کر دیا۔ ریاض بری طرح ہار رہا تھا۔

اچانک اس نے کہا۔ ''یار، یہ گھوڑا کہاں جا کر مر گیا۔ کیا یہ کہیں پڑ کر سو تو نہیں گیا کہ اسے جیتی ہوئی رقم دوبارہ نہ ہارنا پڑ جائے۔''

گھوڑا اس وقت تک ہم سے تقریباً دس ہزار روپے جیت چکا تھا۔ اس دور میں دس ہزار میں اچھا خاصا ایک مکان مل جاتا تھا۔

ہم نے اس کے انتظار میں دو تین بازیاں مزید کھیلیں، پھر اسے ڈھونڈنے کے لیے اٹھنے ہی والے تھے کہ گھوڑا واپس آ گیا۔

''کہاں مر گئے تھے یار؟'' ریاض نے اپنے مخصوص لہجے میں پوچھا۔

''یار میں پیشاب کرنے گیا تو مجھے کسی ملازم کا کمرا نظر آیا۔ وہاں بستر پر بیٹھا تو بستر اتنا نرم اور گرم تھا کہ مجھے اونگھ آ گئی۔''

''اچھا، یار بات مت بنا۔ چل پتے بانٹ!'' ریاض نے کہا۔ ''تو کیا سمجھتا ہے کہ ہم تیری جیب سے مال نکالے بغیر تجھے چھوڑ دیں گے؟''

''یار، تم لوگوں کو مزید ہارنے کا شوق ہے تو چلو میں کھیلنے کو تیار ہوں۔'' گھوڑے نے کہا اور پتے بانٹنے لگا۔

اس مرتبہ میں بہت غور سے اس کے ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے پتے بانٹتے وقت عجیب سی حرکت کی تھی۔

بازی شروع ہونے سے پہلے ہی میں نے کہا۔ ''ایک منٹ۔''

سب میری طرف دیکھنے لگے۔

''اس وقت ہمارے سامنے بارہ پتے پڑے ہیں۔ گڈی میں جوکر سمیت اکتالیس پتے ہونے چاہئیں۔''

''ہاں، تو پھر؟'' سہیل نے پوچھا۔

''ریاض!'' میں نے کہا۔ ''ذرا گڈی کے پتے گنو۔''

ریاض نے پتے گنے تو وہ اکتالیس تھے۔ ان میں جوکر بھی موجود تھا۔

''باقی دو پتے کہاں ہیں؟'' میں نے سخت لہجے میں گھوڑے سے پوچھا۔

''یار، یہیں ہوں گے۔'' گھوڑے نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ''کہاں جائیں گے؟''

''ایک منٹ!'' ریاض گھوڑے کی آستینوں کی تلاشی لینے لگا۔ ان میں سے اینٹ کا ایک غلام اور حکم کا بادشاہ نکل کر باہر گر پڑے۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔ ''تم ہم لوگوں سے نوسر بازی کرتے رہے ہو، تم کیا سمجھتے ہو، تم بہت بڑے شار پر ہو۔ چلو ساری رقم نکالو۔''

اس نے میرے اور ریاض کے تیور دیکھے تو جیب سے رقم نکال کر سامنے ڈال دی۔ ریاض نے اس کی تلاشی لی اور سزا کے طور پر اس کی جیب سے تمام رقم ضبط کر لی۔ پھر ہم نے اس رقم کو تین حصوں میں تقسیم کیا اور اپنی اپنی جیب میں رکھ لی۔

سہیل نے ہنس کر کہا۔ ''یار! گھوڑا میرا مہمان ہے۔ اس کی جیب میں اتنی رقم تو چھوڑ دو کہ یہ گھر پہنچ سکے۔ پھر اس نے اپنے حصے کی رقم گھوڑے کو دے دی۔

ہم لوگوں نے کھیل بند کر دیا اور آپس میں گپ شپ کرنے لگے۔ پھر نہ جانے کب ہم لوگوں کو نیند کے جھونکے آنے لگے اور ہم سب اٹھ کر اپنے اپنے بستروں میں چلے گئے۔

دوسرے دن ہم وہاں سے روانہ ہوئے تو گھوڑا خلافِ معمول خاموش تھا اور کسی سوچ میں گم تھا۔ ہم پھر وہی تھکا دینے والا سفر کر کے سہیل کے گاؤں پہنچے۔

ہم تو اسی رات وہاں سے روانہ ہونا چاہتے تھے لیکن سہیل کے والد نے روک لیا۔ ''پتر! تم لوگ ابھی اتنا لمبا سفر کر کے آئے ہو۔ آج رات آرام کرو۔ صبح میں اپنی گاڑی میں تمہیں لاہور بھجوا دوں گا۔''

اس دن ہم واقعی تھک گئے تھے۔ کھانا کھانے کے بعد ہی کچھ دیر میں سو گئے۔

دوسرے دن ہم لوگ لاہور روانہ ہو گئے۔ سہیل ہمارے ساتھ نہیں تھا۔ اس نے ایک ہفتے بعد آنے کا وعدہ کیا تھا۔

وہاں سے نکلنے کے بعد ریاض نے ڈرائیور سے کہا۔ ''مجھے لاری اڈے پر چھوڑ دینا، میں اپنے گھر جاؤں گا۔''

ابھی کالج کی چھٹیاں باقی تھیں۔ میں نے بھی گجرات جانے کا فیصلہ کر لیا۔ گھوڑے نے مجھ سے کہا کہ میرا گاؤں یہاں سے کافی دور ہے۔ میں تمہارے ساتھ گجرات چلتا ہوں۔ وہیں سے لاہور چلا جاؤں گا۔

گجرات پہنچ کر بھی گھوڑا کچھ خاموش خاموش سا تھا۔

میں نے اس سے کہا۔ ''یار گھوڑے! میں محسوس کر رہا ہوں کہ تو جب سے سہیل کی شادی سے واپس آیا ہے، تب

سے خاموش خاموش ہے آخر بات کیا ہے؟''

''یار! بات بہت خطرناک ہے۔'' گھوڑے نے کہا۔

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''کیا مطلب؟ صاف صاف بات کر۔''

''تجھے یاد ہو گا کہ اس دن جب ہم لوگ تاش کھیل رہے تھے تو میں کچھ دیر کے لیے وہاں سے چلا گیا تھا۔''

''ہاں، تو نے بتایا تھا کہ تجھے اونگھ آ گئی تھی۔'' میں نے کہا۔

''مجھے اونگھ نہیں آئی تھی۔'' گھوڑے نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں کمرے سے باہر نکلا تو مجھے علم نہیں تھا کہ نیچے کی منزل میں بیت الخلا کس طرف ہے۔ سامنے کوئی ملازم بھی نہیں تھا کہ میں اس سے پوچھتا۔ باہر صحن کے کونے پر مجھے ایک کمرا نظر آیا۔ میں سمجھا کہ اس میں ضرور کوئی ملازم ہو گا۔ میں اس کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہاں گھپ اندھیرا تھا لیکن چوڑیوں کی جھنکار سے معلوم ہوا کہ وہاں کوئی عورت موجود ہے۔''

''تو نے کیا کیا ہے گھوڑے؟'' میں نے وحشت زدہ ہو کر پوچھا۔

''میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ میں گھبرا کر واپس پلٹا تو اس عورت نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور سرگوشی میں بولی۔ ''مجھے یہاں بلا کر اب خود کہاں جا رہے ہو؟''

پھر... پھر...'' میں نے جھلا کر پوچھا۔

''پھر اس لڑکی نے مجھے مجبور کر دیا اور...''

''بکواس مت کر۔ کون لڑکی تجھے مجبور کرے گی؟ تو نے خود ہی دست درازی کی ہو گی؟''

''میری بات کا یقین کر خورشید۔'' گھوڑے نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں اپنی مری ہوئی ماں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس لڑکی نے مجھے مجبور کیا تھا۔ وہ تو مجھے آنے ہی نہیں دے رہی تھی کہ کچھ دیر اور رک جائیں، نہ جانے پھر موقع ملے یا نہ ملے۔''

''یہ تو نے اچھا نہیں کیا گھوڑے؟'' میں نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔ ''اگر وہ سہیل کے خاندان کی کوئی لڑکی ہوئی تو اس سے ہم سب کے تعلقات تو خراب ہوں گے ہی، تیری جان کے لالے بھی پڑ جائیں گے۔ تو اچھی طرح جانتا ہے کہ اس معاملے میں سہیل کیا کہہ رہا تھا؟'' پھر میں کچھ توقف کے بعد بولا۔ ''اور اگر وہ سہیل کی سسرالی ہوئی تو تو دوہری مصیبت میں پڑ جائے گا۔ سہیل تو تیرا دشمن ہو گا ہی، اس کی سسرال والے بھی تیری جان کے دشمن ہو جائیں گے۔''

''تو پھر میں کیا کروں؟'' گھوڑے نے بے بسی سے پوچھا۔ ''کیا کہیں بھاگ جاؤں؟''

''بھاگ کر تو کہاں جائے گا؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''یہ لوگ تو برسوں اپنی عزت کے دشمنوں کا پیچھا کرتے ہیں اور جب بھی موقع ملے، اس کا کام تمام کر دیتے ہیں۔ اب تو بھی دعا کر اس لڑکی نے کسی کو کچھ نہ بتایا ہو۔''

''یار! اس نے مجھے اندھیرے میں پہچانا کب ہو گا؟'' گھوڑے نے کہا۔

اس کی اس بات پر میں کانپ کر رہ گیا۔ اگر اس لڑکی نے اسے نہیں پہچانا ہو گا تو پھر ان لوگوں کا شبہ ہم تینوں پر جائے گا۔ اب ہمارے لیے بھی اتنا ہی خطرہ تھا جتنا گھوڑے کے لیے تھا۔

میں اس انتظار میں رہا کہ کب سہیل یا اس کے آدمی ہمارے گھر پہنچتے ہیں لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔

کالج کھل گئے اور ہم دوبارہ لاہور آ گئے۔ سہیل بھی واپس آ گیا۔ وہ بالکل نارمل تھا اور پہلے کی طرح ہنس بول رہا تھا۔ کسی طرح سے احساس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ اسے کوئی مسئلہ ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس لڑکی نے کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔

میرا خیال اب تک یہ تھا کہ گھوڑے نے اس لڑکی کے ساتھ زیادتی کی ہو گی لیکن اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ گھوڑا جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ اس لڑکی نے خود ہی اسے مجبور کیا ہو گا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ سہیل یا اس کی سسرالی نہیں بلکہ کوئی ملازمہ ہو گی ورنہ بڑے گھرانوں کی لڑکیاں یوں خود کو کسی کے سامنے تھالی میں رکھ کر پیش نہیں کرتیں، وہ بھی یہ دیکھے بغیر کہ وہ ہے کون؟ بات آئی گئی ہو گئی۔

ہم سب پھر پڑھائی میں لگ گئے۔

دو مہینے بعد سہیل کے گھر سے بلاوا آیا کہ گاؤں پہنچو، دلہن کو رخصت کر کے گھر لانا ہے۔ تمہارا کوئی دوست آنا چاہے تو تم اسے بھی لا سکتے ہو۔

ریاض نے تو معذرت کر لی۔ اس کی طبیعت یوں بھی ٹھیک نہیں تھی۔ وہ اپنے گھر جا رہا تھا۔ گھوڑے کے دل میں چور تھا اس لیے وہ بھی بہانہ بنا کر رہ گیا۔

سہیل میرے پیچھے پڑ گیا کہ یار! اس موقع پر تو ہی میرے ساتھ چل، اس کے شدید اصرار پر مجھے اس کے ساتھ جانا پڑا۔

دلہن کے گاؤں میں پھر ہمارا اسی انداز میں استقبال ہوا۔ پھر بکرے ذبح ہوئے، دیگیں چڑھیں، صدقے دیے

www.pdfbooksfree.pk

گئے اور سہیل دلہن کو لے کر روانہ ہوا۔

میں آیا تو سہیل کی گاڑی میں تھا لیکن اب اخلاقاً اس کے ساتھ بیٹھنا اچھا نہیں لگا۔ اس نے تو ڈرائیور کو بھی ساتھ نہیں لیا تھا اور اپنی گاڑی خود ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔

میں جانتا تھا کہ وہ دونوں اس وقت اپنی اپنی بے تابی اور بے چینی کی روداد سنائیں گے، ایک دوسرے سے محبت کے بول بولیں گے۔

جب ہم واپس سہیل کے گاؤں پہنچے تو سہیل خوش ہونے کی بجائے انتہائی اداس اور غم زدہ لگ رہا تھا۔ اس کا چہرہ پتھر کی طرح سخت ہو رہا تھا۔

میں ہول کر رہ گیا کہ کہیں دلہن نے اسے گھوڑے کی ''واردات'' کے بارے میں تو نہیں بتا دیا۔

رات کے کھانے کے بعد وہ دلہن کے کمرے میں جانے کی بجائے میرے کمرے میں آ گیا اور بے چینی سے ٹہلنے لگا۔

میں نے تشویش سے پوچھا۔ ''خیریت تو ہے سہیل! تو اتنا پریشان کیوں ہے؟''

میرا اتنا کہنا تھا کہ سہیل مجھ سے لپٹ کر بچوں کی طرح رونے لگا۔ میں گھبرا گیا کہ ایسی کیا بات ہو گئی۔

وہ روتے ہوئے بولا۔ ''میں لٹ گیا خورشید! میری عزت کا جنازہ نکل گیا... میں... میں برباد ہو گیا، تو بتا اب میں کیا کروں؟''

میں نے گھبرا کر پوچھا۔ ''کیا ہوا سہیل! کچھ بتا تو سہی۔''

''یار! جس دن میرا نکاح تھا، اس دن میں نے اپنی بہن کے ذریعے یہ بندوبست کرایا تھا کہ وہ دلہن کو کسی طرح مجھ سے ملوا دے۔ پھر تو ہماری ملاقات دو مہینے بعد ہونے والی تھی۔ مجھ سے اتنا صبر نہیں ہو رہا تھا۔ میری بہن نے مجھ سے وعدہ کر لیا کہ وہ موقع دیکھ کر مریم کو صحن کے آخری کونے والے کمرے میں بھیج دے گی۔ اس طرف یوں بھی کوئی نہیں جاتا ہے تاش کی بازی ختم ہونے کے بعد میں اس کمرے میں پہنچا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں کافی دیر وہاں مریم کا انتظار کرتا رہا لیکن وہ نہیں آئی۔ میں سمجھا کہ اس بے چاری کو آنے کا موقع ہی نہیں ملا اس لیے میں مایوس ہو کر واپس آ گیا۔''

''پھر... پھر... کیا ہوا؟'' میرے ذہن میں گھوڑے کی کہانی گونجنے لگی۔

''آج جب میں دلہن کو لے کر آ رہا تھا تو اس نے کہا۔ ''اچھا ہوا، آپ نے وہ کڑا اتار دیا جو اس رات آپ نے پہن رکھا تھا۔ مجھے مردوں کے ہاتھ میں کڑے اچھے نہیں لگتے ہیں۔''

''کون سا کڑا؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''آپ اتنے بھولے نہ بنیں، اس رات تو آپ نے وہ کڑا پہن رکھا تھا اور جناب مجھے بلا کر خود واپس جا رہے تھے۔ میں اگر آپ کا ہاتھ پکڑ کر نہ روکتی تو آپ نکل جاتے۔ شاید آپ کو خوف ہو کہ کوئی آ نہ جائے۔''

میں سناٹے میں رہ گیا لیکن یار...''

''میں جانتا ہوں خورشید! وہ خالد تھا۔ کڑا وہی پہنتا ہے اور تجھے یاد ہے وہ تاش کی بازی چھوڑ کر اٹھ گیا تھا اور کافی دیر بعد واپس آیا تھا۔''

''ہاں مجھے یاد ہے۔'' میں نے کہا۔ پھر میں نے سہیل کو سب کچھ سچ سچ بتا دیا کہ اصل واقعہ کیا ہے اور اس سے کہا۔ ''سہیل! جو کچھ بھی ہوا غلط فہمی میں ہوا۔ گھوڑا قسمیں کھا رہا تھا کہ میں تو واپس آ رہا تھا لیکن اس لڑکی نے زبردستی میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے روک لیا۔ اس میں قصور تو کسی کا بھی نہیں ہے۔''

''ہاں، اس میں قصور کسی کا نہیں ہے، قصور تو میرا ہے، اب میں زندگی بھر اس بے غیرتی کے ساتھ زندگی گزاروں گا کہ میری بیوی مجھ سے پہلے کسی اور کی ہو چکی ہے۔''

میں اسے دیر تک سمجھاتا رہا، پھر وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

رات کا شاید آخری پہر تھا جب میں نے دھماکے کی آواز سنی، آواز سہیل کے کمرے کی طرف سے آئی تھی۔

سب لوگ اس کے کمرے کی طرف دوڑ پڑے۔ میں بھی ساری احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر دوڑا۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ سہیل کے والد نے زور زور سے دروازہ پیٹا تو دروازہ کھل گیا اور مجھے مریم کا سہما ہوا چہرہ نظر آیا۔ وہ بری طرح لرز رہی تھی اور سکتے کی حالت میں تھی۔ بیڈ پر خون میں لت پت سہیل کی لاش پڑی تھی۔ اس نے اپنے... ریوالور سے اپنی عزت پر جان قربان کر دی تھی۔

میں بوجھل قدموں سے واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔

مجھے آج بھی سہیل یاد آتا ہے تو آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ گھوڑا، اس کے بعد ملک ہی چھوڑ گیا۔

*

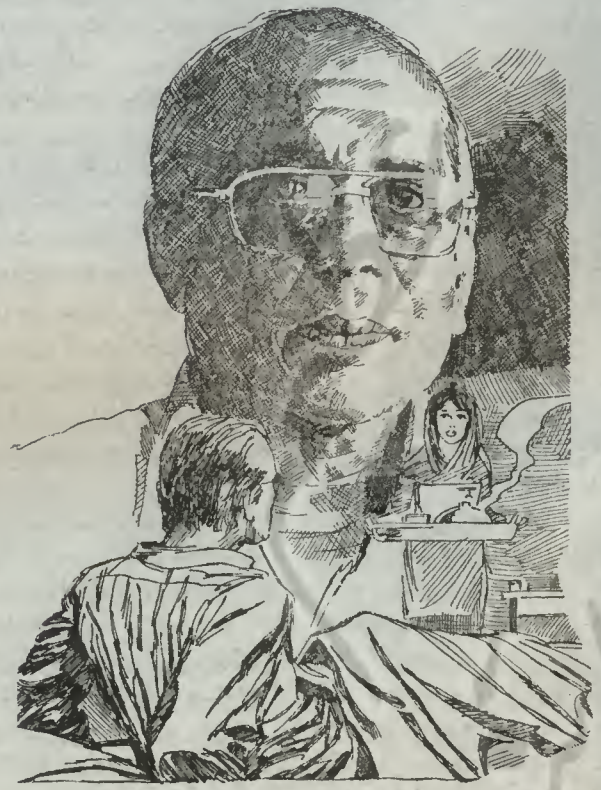

قسمت

محترم ایڈیٹر
سلامِ تہنیت

یہ روداد میری نہیں، میرے ایک واقف کار کی ہے لیکن ایسی دلچسپ ہے کہ اسے سرگزشت کے قارئین سے شیئر کرنے پر مجبور ہو گئی ہوں، امید ہے آپ کو بھی پسند آئے گی۔

ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری
(بھکر)

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں نئی نئی شادی ہو کر کوٹ ادو سے بھکر آئی تھی۔ یہاں مجھ سے پہلے یہ خبر پہنچ گئی تھی کہ میں ڈائجسٹوں میں کہانیاں لکھتی ہوں۔ اس دن میں اپنے کمرے میں بیٹھی تھی کہ مجھ سے ملنے ایک عورت آ گئی۔ اسے دیکھ کر میں نے یہی سمجھا کہ میں نئی دلہن ہوں اس لیے وہ ملنے آئی ہے لیکن کچھ ہی دیر میں مغالطہ دور ہو گیا اس نے اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد کہا ''بھابی سنا ہے آپ کہانیاں شہانیاں بھی لکھتی ہو۔''

www.pdfbooksfree.pk

''جی ہاں آپ نے صحیح سنا ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور اسے بغور دیکھنے لگی۔ اس لیے کہ وہ مجھ سے عمر میں کافی بڑی لگ رہی تھی۔

''باجی میں چاہتی ہوں آپ میرے بھائی کی کہانی بھی لکھیں۔''

''لوگ اپنی کہانی لکھنے کی فرمائش کرتے ہیں اور تم اپنے بھائی کی کہانی لکھنے کی بات کر رہی ہو میں سمجھی نہیں، ان کی ایسی کون سی بات ہے جسے کہانی کا روپ دیا جا سکے؟''

''بھابی وہ موت سے پنجہ لڑا کر آیا ہے۔ اس کی زندگی بہت بڑی کہانی ہے۔ یہاں کے بہت سے لوگ اس بارے میں جانتے ہیں۔ آپ پتا کرلیں۔ زندگی نے اس کے ساتھ ایسا عجیب کھیل کھیلا ہے کہ میں بتا نہیں سکتی اسی لیے کہہ رہی ہوں کہ آپ اس کی کہانی لکھیں بلکہ میں نفیس بھائیا سے کہہ کر آپ کی بات بھائی سے کرا دیتی ہوں نفیس بھائیا بھی انکار نہیں کریں گے۔''

وہ اتنا کہہ کر چلی گئی۔ میں نے بھی اس کی بات کو اہمیت نہیں دی لیکن تیسرے دن خود نفیس نے مجھ سے کہا کہ ایسا کرو کہ کسی دن شہباز کی کہانی سن کر اسے لکھ ڈالو... وہ دو دن سے میرے پاس آرہا ہے۔''

نفیس کا کہا میں کیسے ٹالتی اس لیے ایک دن میں نے سکینہ کو بلوا لیا کہ وہ اپنے بھائی کو لے کر آجائے۔ میرا حکم سنتے ہی وہ اپنے بھائی شہباز کو لے کر آگئی۔

شہباز 28، 30 سال کا پورا مرد تھا۔ اس کے سامنے بیٹھ کر اس کی روداد سننے میں مجھے شرم آرہی تھی پھر بھی میں بیٹھنے پر مجبور تھی۔ آصف نے کہنا شروع کیا کہ باجی میں آپ کو شروع سے سناتا ہوں۔ یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب میں کراچی میں رہتا تھا۔

☆☆☆

اس دن میں مرکز کے خصوصی بلاوے پر مرکز آیا تھا کہ مریض کا فون پھر آگیا۔ فون مریض کے گھر والوں نے کیا تھا۔ مریض کو قصبہ کالونی کے قریب ایک بستی سے لینا تھا اور سندھ گورنمنٹ اسپتال پہنچانا تھا۔ میں ایمبولنس لے کر نکل پڑا۔ جب میں قصبہ کالونی سے آگے بڑھا تو مجھے راستے کے کنارے کھڑے کچھ لوگ نظر آئے۔ ان کے نزدیک ایک چارپائی تھی جس پہ ان لوگوں نے مریض کو لٹا رکھا ہے۔ ایمبولنس دیکھ کر ان لوگوں نے ہاتھ سے رکنے کا اشارہ دیا۔ میں نے رک کر پوچھا تو وہ بولے کہ انہوں نے ہی فون کیا تھا۔ میں نے ایمبولنس سے اسٹریچر نکالا اور اس پر مریض کو لٹا کر اندر کرلیا۔ مریض کے ساتھ تین آدمی تھے۔ ان تینوں نے اندر آنا چاہا تو میں نے کہا کہ اتنے آدمیوں کو ساتھ بٹھانے کا حکم نہیں ہے۔ صرف دو آدمی آسکتے ہیں وہ لوگ میری منت سماجت کرنے لگے تو میں مان گیا اور دو کو پیچھے مریض کے پاس اور ایک کو برابر میں بٹھا لیا اور ہوٹر بجاتا ہوا چل پڑا۔ ابھی میں کچھ ہی دور گیا ہوں گا کہ مجھے اپنی کمر میں کسی چیز کے چبھنے کا احساس ہوا۔ میں نے اُدھر دیکھنے کی کوشش کی تو روح فنا ہوگئی۔ میرے برابر میں بیٹھے شخص نے میری کمر سے پستول لگا دیا تھا۔ پھر اس نے غراتی ہوئی آواز میں کہا ''ایمبولنس روک دے۔''

''مگر کیوں؟'' میں نے سوال کیا۔

''اگر نہیں روکے گا تو تیری قبر یہیں بن جائے گی۔''

میں سمجھ گیا تھا کہ یہ لوگ میری ایمبولنس چھیننا چاہتے ہیں اور اس کے ذریعے دہشتگردی کی کارروائی کریں گے۔ ایسی کئی خبریں میرے علم میں تھیں کہ ایمبولنس چھین کر دہشت گردی کی گئی۔ میں رضا کار ہوں اس طرح تو بہت کچھ ہو جائے گا۔ میرا کام زندگی بچانا ہے زندگی لینے کا سبب میں کیسے بن جاتا اس لیے میں نے ایمبولنس روکنے سے صاف انکار کردیا۔ میرے انکار پر وہ جھنجلا گیا اور اس نے پوری قوت سے میرے پیروں پر پیر مارا۔ بریک پر دباؤ پڑنے سے ایمبولنس جھٹکا کھا کر رک گئی۔ دوسرے شخص نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھولا اور مجھے نیچے دھکیل دیا۔ میں باہر گرا ضرور مگر فوراً اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے زور آزمائی کرتے دیکھ پستول والے نے ہاتھ باہر نکالا اور میرے پیر پر تین فائر کردیے۔ زخم کی تکلیف سے میں الٹ کر گرا تھا۔ اتنی دیر میں وہ ایمبولنس لے کر بھاگ گئے۔ میں درد سے بے حال ہوگیا تھا۔ میرے پیر سے خون بہہ رہا تھا۔ چلنا تو دور کی بات ہے مجھ سے کھڑا ہونا بھی دشوار ہوگیا تھا کیونکہ ایک گولی کمر کے قریب بھی لگی تھی۔ ایسے میں عافیت اسی میں تھی کہ میں وہیں پڑا رہوں اور کسی امداد کا منتظر رہوں۔ سڑک پر ٹریفک کم ہی مگر چلتی تو ہے۔ کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ آ ہی جاتا اسی امید پر کافی دیر تک وہیں درد سہتا، بے دم سا پڑا رہا میں نے خون روکنے کے لیے شرٹ پھاڑ کر پیر باندھ لیا تھا۔ مگر جب کافی دیر ہوگئی تو یہ سوچ کر اٹھ گیا کہ مجھے حوصلہ دکھانا ہوگا ورنہ میں اسی جگہ مر جاؤں گا۔ اس لیے کہ درد بڑھتا جا رہا تھا۔

ایسے وقت میں جب موت بہت قریب محسوس ہو۔ اس کی آہٹ صاف سنائی دینے لگے تو انسان کو اپنا ماضی کسی چلتی پھرتی فلم کی طرح آنکھوں کے سامنے نظر آنے لگتا ہے۔ مجھے بھی بیتے ہوئے پل یاد آرہے تھے۔ مجھے بھائی بھابی کی شادی یاد آرہی تھی۔ ان کی باتیں یاد آرہی تھیں، اماں موقع پاتے ہی بھائی کو گھیر لیتی تھیں۔

''ایاز پتر، تو اب شادی کرلے.... مجھ سے اب اور رہا نہیں جاتا۔''

''ماں تُو تو جھلی ہوگئی ہے۔ یہ کون سا وقت ہے ایسی باتیں کرنے کا۔'' ایاز بھائی منہ بنا کر بولتے۔

''بیٹا سکینہ کے بعد میں بہت اکیلی ہوگئی ہوں پھر میرا کیا بھروسا۔ جسم میں جان تک نہیں ہے خود کو گھسیٹ رہی ہوں۔''

''ہاں بھائی جان۔ اب آپ شادی کر ہی لیں۔'' میں بھی اماں کا ساتھ دینے لگتا۔

''ارے واہ اب تو تُو مجھ سے بھی بڑا ہوگیا ہے۔ مجھے مشورہ دینے لگا ہے۔'' ایاز بھائی میری پیٹھ پر ہاتھ مار کر کہتے۔

''ایسا غلط کیا کہا ہے اس نے۔ یہ میری حالت دیکھ ہی رہا ہے۔'' اماں اپنی کمزوری کو آڑ بنانے لگتی تھیں۔

''ماں ابھی مجھے بہت کچھ کرنا ہے۔ شہباز کو اعلیٰ تعلیم دلوانا ہے۔ پھر میں اپنے بارے میں سوچوں گا۔''

''اور تب تک تُو بوڑھا ہو چکے گا۔'' اماں کہتیں۔

''تو کیا ہوا ابا سے کیا وعدہ تو پورا ہو جائے گا۔''

''تمہارے ابا نے یہ کب کہا تھا کہ تم اپنی زندگی خاک کرلو..... تمہاری شادی کے بعد بھی شہباز کی پڑھائی جاری رہے گی رک تو نہیں جائے گی۔''

''اور کیا... بھابی کے آجانے سے میرا دل بھی لگ جائے گا۔ اس لیے کہ پہلے بھابی آئے گی پھر بھتیجا آئے گا ہاہاہا۔'' میں بول کر اٹھ جاتا کہ بھائی کہیں زوردار ہاتھ نہ جڑ دیں۔

''تم لوگ سمجھ نہیں رہے ہو۔ شادی سے اخراجات بڑھتے ہیں۔ اتنی چھوٹی سی تو تنخواہ ہے۔''

''آنے والی اپنا رزق خود لے کر آئے گی۔ پھر اب مجھ سے اکیلے گھر سنبھالا بھی نہیں جاتا۔'' اماں اپنی بات پر اڑی رہتیں۔

''اماں آپ مجھے بلیک میل تو نہ کریں۔ وقت آئے گا تو میں خود شادی کے لیے کہہ دوں گا۔''

''ہاں بھائی میں نے خود دیکھا ہے۔ اماں کس طرح گھر کا کام نمٹاتی ہیں۔ صرف جھاڑو دینے کے لیے گھنٹا بھر لگا دیتی ہیں۔''

''گویا تم لوگ ایک ماسی کے لیے پریشان ہو.... رکھ لو کسی کو میں اسے تنخواہ دے دیا کروں گا۔'' بھائی ہنس کر کہتے۔

''مجھے ماسی کا بیٹا نہیں اپنی بھابی کا بیٹا چاہیے۔ میں سب سے چھوٹا ہوں مگر اب مجھ سے بھی ایک چھوٹا ہونا چاہیے۔''

''میرے بڑھاپے پر رحم کرو۔ حقیقت کو سمجھو۔ میری ہڈیوں میں اب جان نہیں رہی۔''

''پلیز بھائی جان گھر کی رونق کے بارے میں سوچیں۔ کب سے ہم نے کوئی خوشی نہیں دیکھی ہے۔ اس بہانے خوش ہولیں گے۔''

''ٹھیک ہے آپ لڑکی دیکھیں۔ مگر ایک شرط ہے کہ لڑکی کو وعدہ کرنا ہوگا کہ وہ میرے شہباز کو بیٹے کی طرح رکھے گی۔'' بالآخر بھائی نے ہتھیار ڈال دیے۔

''ہُرّے...... بس میں آج ہی اپنے تمام دوستوں سے کہتا ہوں، باجی سکینہ کو خبر دیتا ہوں کہ بھر میں جونک لگ گئی... سب مل کر لڑکی ڈھونڈنا شروع کردیں...... اماں آپ بھی فوراً لڑکی کی تلاش میں لگ جائیں۔''

''لڑکی تلاش کیا کرنا ہے۔ دیکھی بھالی ہے۔ شیدے کی بیٹی رعنا ہے نا۔ کتنی سیدھی سادی۔ اللہ میاں کی گائے ہے گائے۔ میں آج ہی شیدے سے بات کرتی ہوں۔''

اماں نے اسی دن شیدے چاچا کو بلانے کے لیے گاؤں کے ملک کے گھر فون کردیا۔ شیدے چاچا آئے اور چٹ پٹ شادی ہوگئی۔ بھابی گھر آگئی۔ وقت تیزی سے گزرنے لگا اور صرف ڈیڑھ سال میں ہمارے یہاں ایک نیا مہمان بھی آگیا۔ اس دن تو میں بہت خوش تھا۔ بچے کو گود میں لیے اِدھر سے اُدھر بھاگ رہا تھا اور اماں چیخ رہی تھیں۔ اور میں اپنی رو میں بولے جا رہا تھا ''بھابی میں آپ سے بہت خوش ہوں...... میری برسوں کی تمنا آپ نے پوری کی ہے۔'' بھابی رعنا مسکرا رہی تھی اور میں بچے کو جھلاتے ہوئے بول رہا تھا ''اب تک اس گھر میں سب سے چھوٹا میں تھا مگر اب مجھ سے بھی چھوٹا آگیا۔ میں بتا نہیں سکتا میں کتنا خوش ہوں۔ اس وقت میرا دل گانے کو کر رہا ہے ''تھری چیئرز فار بھابی ہپ ہپ ہرّے۔''

''نومولود ہے... تیرے جنگلی پن سے وہ ڈر رہا ہے.... دے دے ماں کو... بھوکا ہو رہا ہے۔'' اماں بولیں۔

''نہیں اسے اپنی گود سے نہیں اتاروں گا۔'' میں نے

www.pdfbooksfree.pk

ضد کی۔

''ارے بے وقوف دودھ پی لینے دے پھر لے لینا۔'' اماں نے جھڑکا۔

''بھابی اسے میری گود میں رہنے دیں۔ اسی طرح دودھ پلا دیں۔'' میں نے ضد کی۔

''جوتے کھائے گا۔ کم عقلا کہیں کا۔ تیری گود میں وہ کیسے دودھ پلائے گی۔''

''ارے چھوڑیں پرانی باتیں۔ میں سکندر کا نپل لے آتا ہوں اسے بوتل سے دودھ پلائیں گے۔''

''سیدھی طرح سے بچہ اسے دے دے ورنہ ابھی جوتی اتار لوں گی۔''

''میں کن کر سو جوتی کھانے کو تیار ہوں مگر بچہ نہیں دوں گا۔ ایک تو بھابی نے اتنی دیر لگا دی۔ ہم سب کے تڑپنے کا لطف لیتی رہیں۔ اب میں ان کو تڑپاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ بچہ تمہارے پاس ہی رہے گا۔ ابھی تو دے دو۔ ابھی تمہارے بھائی جان بھی آتے ہوں گے۔'' بھابی نے کہا۔

''چلو جب آپ بھائی جان کا خوف دلا رہی ہیں تو دے دیتا ہوں مگر ابھی مجھے کمرے میں لا کر دے جائیں گی۔''

''تم سب اسی میں الجھے ہوئے ہو۔ اس کا نام کیا ہوگا یہ بھی سوچا ہے؟'' اماں نے ٹوکا۔

''اس کا نام ارباز ہوگا ارباز ملک۔'' میں نے فوراً کہا۔

''بہت خوب اچھا نام ہے.... شہباز... ایاز... ارباز... واہ۔'' اماں نے تعریف کی۔

''اور کیا میرا دیا ہوا نام تو لوگ اپنے بچوں کو فخریہ دیتے ہیں۔ بھابی آپ کو یقین نہیں آئے گا.... کل میں آپ کو پانچ سال پرانا اخبار دکھا دوں گا۔ امریکا کے صدر نے اپنے بیٹے کا نام مجھ سے پوچھ کر رکھا تھا۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''چل ہٹ.... امریکی صدر کا بیٹا تیری عمر سے بڑا ہے۔''

''ارے بھابی جس طرح غالب میرے خواب میں آ کر میرا شعر چرا لے جاتے ہیں اسی طرح امریکی صدر بھی اس وقت آ کر نام لے گیا تھا۔'' کہتے ہوئے میں نے قہقہہ لگایا۔

بچے کو ہلاتے ہوئے۔ بھابی نے کہا ''غالب نے کون سا شعر لیا ہے؟''

''بازیچۂ اطفال ہے دنیا میرے آگے..... ہوتا ہے شب و روز تماشا میرے آگے۔ یہ میرا شعر تھا انکل غالب نے مانگ لیا.... اتنے بزرگ آدمی.... مجھ سے انکار کیا نہ گیا اور میں نے شعر دے دیا۔''

''تم مجھے پینڈو سمجھ رہے ہو نا؟ یہ شعر سو سال پرانا ہے اور غالب کا ہی ہے۔''

''قسم لے لیجیے جو میں آپ کو پینڈو سمجھ رہا ہوں، آپ تو پینڈو ہیں ہی۔''

''مار بیٹھوں گی۔ میں انٹر پاس ہوں انٹر پاس۔ سمجھے۔''

''انٹر کے معنی اندر' ہر لڑکی گھر کے اندر رہتی ہی ہے۔ آپ نے کون سا عجوبہ کام کر لیا۔ انٹر کر لیا تو کیا کیا۔''

''بکواس بند کرو اور باہر جاؤ میں اسے فیڈ کراؤں گی۔''

''اچھا اچھا... جا رہا ہوں اگر مدد کی ضرورت ہو تو بتا دیں....'' ہنس کر کہا اور باہر بھاگ آیا۔

☆☆☆

اس وقت روڈ پر خود کو گھسیٹتے ہوئے میں پرانے وقت کو یاد کر رہا تھا۔ میں سو سے زائد زخمیوں کو اسپتال پہنچا چکا تھا۔ جانتا تھا کہ درد کو کم کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اسے محسوس نہ کیا جائے اور اسے محسوس نہ ہونے دینے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ذہن کو بٹا دینا۔ اسی لیے میں پرانی باتوں کو یاد کر رہا تھا۔ مجھے ایک ایک بات یاد آ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے سامنے فلم سی چل رہی ہو۔ مجھے بھائی کا وہ منظر شدت سے یاد آ رہا تھا جب ان کی ایک غلط بیانی پکڑی گئی تھی۔ اس دن ہم سب گھر میں بیٹھے تھے۔

بھائی اندر داخل ہوئے اور تھکے ہوئے انداز میں صوفے پر گر گئے۔ ان کی حالت دیکھ کر بھابی نے پوچھا ''کیا بات ہے آج کل آپ کافی دیر سے آ رہے ہیں۔''

''بس دوستوں نے تنگ کر رکھا ہے۔ ہر روز کوئی نہ کوئی دوست گھیر لیتا ہے۔ اپنا اور میرا ٹائم خراب کرتا ہے۔''

''دوستوں میں بیٹھ کر آپ اپنے بیٹے کو بھی بھول جاتے ہیں۔'' بھابی نے طعنہ دیا۔

''شہباز ہے نا۔ وہ کسی اور کو گود میں لینے کب دیتا ہے۔'' کہہ کر انہوں نے قہقہہ لگایا۔

''بھابی میں حقیقت بتاؤں؟'' میرے لہجے پر بھائی میری طرف حیرت سے دیکھنے لگے تھے۔

''بولو... ایسی کیا بات ہے جو اتنے پُراسرار انداز میں بتانا چاہتے ہو؟'' بھابی نے پوچھا۔

''دراصل یہ خبر مجھے آج ہی ملی ہے۔''

بھائی نے چونک کر پوچھا ''کون سی خبر؟''

''آپ نے غلط بیانی کی ہے۔ آپ کا کوئی دوست آپ

کو نہیں روکتا اور نہ آپ کسی ہوٹل میں بیٹھنے کے عادی ہیں۔''

''کیوں میں دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر چائے نہیں پی سکتا۔ باتیں نہیں کر سکتا؟'' بھائی نے جواب دیا۔

''گپ لگانے والے اور لوگ ہوتے ہیں۔ آپ اس قبیل کے ہیں ہی نہیں۔'' میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیوں بھائی کیوں ... میں گپ کیوں نہیں لگا سکتا... ذہن ہلکا کرنے کے لیے دوستوں کے ساتھ بیٹھنا بھی ضروری ہے۔''

''مگر آپ نے کبھی ایسا کیا ہی نہیں۔ آپ کو تو بس کام اور کام اسی سے دوستی ہے۔ اس وقت بھی آپ کام پر سے آ رہے ہیں۔'' پھر میں نے بھابی کی طرف مڑ کر کہا ''جانتی ہیں بھابی... پتا نہیں کیسے ان کو یقین آ گیا ہے کہ ان کی تنخواہ سے گھر نہیں چلے گا اس لیے آج کل انہوں نے پارٹ ٹائم کرنا شروع کر دیا ہے۔''

''پتا نہیں کس ہیرو نچی نے یہ خبر اڑائی ہے... تم نے بھی یقین کر لیا۔'' بھائی نے آنکھیں چراتے ہوئے کہا۔

''بھائی جان میں بھی آپ ہی کا بھائی ہوں اگر کوئی کچھ کہتا ہے تو میں نہ تک جاتا ہوں آپ گلشن میں ایک بلڈر کے آفس میں اکاؤنٹ دیکھ رہے ہیں۔''

''اب ارباز بھی ہو گیا... خرچ بڑھنا تو ہے... آمدنی بھی بڑھانا پڑے گی نا ... وہی کر رہا ہوں۔'' بھائی نے جھوٹ کھل جانے پر کہا۔

''اس طرح تو آپ اپنی جان ہلکان... کر رہے ہیں... اپنی صحت بھی دیکھیں... اتنا کام کریں گے تو کیا ہوگا یہ سوچا ہے۔''

''اسی لیے تو میں نے سوچا ہے کہ کسی طرح ایک بار دبئی چلا جاؤں وہاں تنخواہ اچھی ہے۔ ایک سال میں سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔''

''کیا مفت میں کوئی لے جائے گا... وہاں جانے کے لیے بھی لاکھ روپے چاہئیں۔'' میں نے ٹوکا۔

''میرا ایک دوست مجھے خرچ دے رہا ہے.... میں وہاں پہنچ کر اس کے پیسے لوٹا دوں گا۔''

''کہیں دھوکا نہ ہو جائے۔ آج کل ایسا بہت ہو رہا ہے۔'' میں پُرسوچ انداز میں بولا۔

''نہیں... کمپنی بڑی ہے اور وہ شخص بھی جانا پہچانا ہے۔''

''مگر بھابی کا کیا ہوگا... وہ اکیلے کیسے رہیں گی؟''

''دو سال کی تو بات ہے... وقت گزرتے دیر کتنی لگتی

آگ بجھانے کا آلہ

Fire Extinguisher

کاربن ڈائی آکسائیڈ خود نہیں جلتی، جلتی ہوئی چیزوں کو بجھا دیتی ہے۔ کاربن ڈائی آکسائیڈ کی اس خاصیت کے پیش نظر آگ بجھانے کا آلہ بنایا گیا۔ یہ آلہ تکونی شکل کا ہوتا ہے اور سرکاری اور غیر سرکاری عمارتوں اور اسپتالوں وغیرہ میں دیواروں کے ساتھ لٹکا ہوتا ہے۔ بسوں اور لاریوں کے اندر بھی آویزاں ہوتا ہے۔ اس کا بیرونی خول دھات کا بنا ہوتا ہے، جس کے نوکدار سرے پر ایک باریک سوراخ ہوتا ہے اور پیندے پر سوراخ نما کیل ہوتی ہے۔ کیل کے باہر کا سرا چوڑا ہوتا ہے۔ خول کے پیندے پر دھات کی کیل کے نوک دار سرے سے کچھ اوپر ایک شیشے کی نلی رکھی ہوتی ہے۔ شیشے کی یہ نلی ہلکے گندھک کے تیزاب (سلفیورک ایسڈ) سے بھری ہوتی ہے۔ نلی کے اردگرد سوڈیم بائی کاربونیٹ (دھوبی سوڈا) کا محلول بھرا ہوتا ہے۔ جب آگ بجھانے کے لیے اس آلے کو استعمال کرنے کی ضرورت ہو تو بیرونی چوڑے سرے کو زور سے زمین پر مارا جاتا ہے، جس سے شیشے کی اندرونی نلی پھٹ جاتی ہے اور اس کے اندر کا گندھک کا تیزاب باہر نکل آتا ہے۔ جب یہ تیزاب سوڈیم بائی کاربونیٹ سے ملتا ہے تو فوری طور پر تیز کیمیائی عمل پیدا ہوتا ہے اور کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس خارج ہونے لگتی ہے اور آگ بجھانے کے لیے استعمال کی جا سکتی ہے۔

مرسلہ فرحت ذاکر، لاہور

www.pdfbooksfree.pk

ہے؟'' تبھی دروازے پر دستک ہوئی ہے۔ میں اٹھ کر دروازے پر گیا تو اصغر بھائی کھڑے تھے انہوں نے ایک لفافہ دیتے ہوئے کہا کہ یہ بھائی کو دے دینا۔

میں نے لفافہ لاکر بھائی کو دیا۔ بھائی نے لے کر کھولا پھر اندر کے کاغذات دیکھ کر بولے ''لو ویزے کے لیے پاسپورٹ جمع بھی ہوگیا۔ جلد ویزا مل جائے گا۔''

ایک ماہ بعد بھائی چلے گئے۔ اور زندگی پیچ وخم سے روشناس کراتی چلی گئی... ایک سال میں کتنے سارے واقعات زندگی کا حصہ بنے .... کتنی بڑی بڑی تبدیلیاں آئیں... زندگی کے کیسے کیسے رنگ سامنے آئے مگر مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ میں تو ایک کھلنڈرا لڑکا تھا۔ مزاجاً ویسا ہی رہا۔ ہنسنا ہنسانا ہی کو زندگی سمجھ رہا تھا۔ زندگی کبھی تلخ بھی بن جائے گی اس کا سوچا بھی نہیں تھا۔ کیونکہ بھابی کے آجانے سے زندگی مزید خوبصورت بن گئی تھی۔ وہ خود بھی ہنس مکھ تھیں اس لیے زندگی کا صحیح لطف آرہا تھا۔ زندگی میں حسین رنگ بھرنے کے لیے ارباز بھی آگیا تھا۔ اس کی قلقاریوں سے ڈھیروں خون بڑھ جاتا۔ کالج سے آتے ہی میں اس کو گود میں لیے اِدھر سے اُدھر ٹہلتا رہتا تھا۔ وہ ننھا سا وجود میرا عادی ہوگیا تھا۔ بھابی لاکھ کہتیں کہ اس طرح اس کی عادت بگڑ رہی ہے مگر میں نہیں سنتا۔ ان ہی کا مذاق اڑاتا کہ بھائی جان کو آنے دیں، میں کہوں گا کہ میرے بھتیجے کو گود میں لینے سے یہ جلتی ہیں۔ آپ بھی کبھی کبھی ان کو...... بس میرا اتنا کہنا ہی کافی ہوتا کہ وہ مصنوعی غصے میں منہ بنا لیتیں۔ بھائی جان کا خط پابندی سے آرہا تھا۔ ہر ماہ ایک لاکھ روپے کا ڈرافٹ بھی آجاتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک سال گزر گیا۔ اب ہم سب ان کی واپسی کے منتظر تھے کہ ان کا خط آگیا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ یہاں ایک نئی کمپنی سے معاہدہ کیا ہے۔ وہ لوگ ہر ماہ ڈیڑھ لاکھ روپے پاکستانی ادا کریں گے۔ اس لیے میں ابھی نہیں آؤں گا۔ چھ مہینے بعد چھٹی ملے گی تب آؤں گا۔ اس خبر سے اماں بھی اداس ہوگئی تھیں اور میں بھی، بھابی کا تو پوچھنا ہی کیا۔ وہ تو بہت زیادہ دکھی تھیں مگر میں اپنے آپ کو خوش دکھانے کے لیے، بھابی کے دکھ کو کم کرنے کے لیے ہمہ وقت ہنسی ٹھٹھول کرتا رہتا۔ اس دن بھی بھابی میرا نشانہ بن رہی تھیں۔

''بھابی میرا کہا مانیں۔ آپ ایک چکر دبئی کا لگا آئیں۔''

''کیوں... کیا مجھے وہاں جاتے ہی نوکری مل جائے گی۔''

''بالکل نوکری ملے گی... جانتی ہیں کیوں.... کیونکہ اس وقت ایک نہایت حسین لڑکی بھائی جان کی خدمت کا ٹھیکا لیے ہوئے ہے...... آپ کو تو وہ صرف پچاس ہزار سکہ رائج الوقت بطور حق مہر ادا کر کے لائے ہیں جب کہ وہ ہر ماہ دس ہزار لے رہی ہے۔''

''نہیں جناب میرے شوہر ایسے نہیں ہیں۔۔ فلرٹ کرنا تمہارا کام ہے... وہ تو کسی کو نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔''

''جی ہاں وہ نظر اٹھا کر اسے نہیں دیکھتے۔ تمام مراحل جھکی جھکی نظروں سے طے ہوتے ہیں۔''

''اماں اسے سمجھا دیں... میں مار بیٹھوں گی۔''

''تو کیا ابھی کھڑی ہیں؟ ابھی بھی تو بیٹھی ہیں۔''

''اللہ کرے تمہاری بیوی دن رات تم پر شک کرتی رہے۔''

''ارے بھابی میں اسے فرصت ہی نہیں دوں گا پھر شک کرنے کا وقت کیسے نکالے گی۔''

''جس طرح تم میرے شوہر کو بدنام کر رہے ہو میں بھی اس کے سامنے تمہیں بدنام کردوں گی۔''

''بدنام جو ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا... آپ کو کھلی اجازت ہوگی... دل بھر کر بدنام کر دینا... پوائنٹ بھی مجھ سے لے لینا۔ میں خود بتا دوں گا کہ اس کے کان میں کس کس قسم کا زہر انڈیل سکتی ہیں۔''

''بچُو میرا نام رعنا ہے۔ میں اسے ایسا بھڑکاؤں گی کہ وہ ایک ہاتھ میں بیلن دوسرے میں سونٹا لے کر کھڑی رہے گی۔ اِدھر تم اندر آئے اور اُدھر اس نے......''

''اللہ بھابی آپ کو قسم ہے جلدی سے کسی لڑکی کو ڈھونڈ لیں... زندگی میں بہار آجائے گی میرا بھتیجا بھی مفت کا تماشا دیکھا کرے گا۔ واہ واہ کیا سین ہوگا۔''

''بس رک جاؤ اِدھر تمہارے بھائی آئے اُدھر میں نے لڑکی ڈھونڈی۔''

''خدا قسم بھابی... اب اور ظلم نہ کریں... جلدی سے لڑکی ڈھونڈنا شروع کردیں.....''

اِدھر میں مزاقاً بھابی سے کہہ رہا تھا کہ لڑکی ڈھونڈیں اور اُدھر ایک بھیانک بات مجھے ڈھونڈ رہی تھی۔ گویا میرا پیچھا کر رہی تھی۔ مجھ تک پہنچنے کی سعی میں مصروف تھی۔ وہی باتیں تو مجھے اس رات زخمی حالت میں اندھیری سڑک پر کچھ زیادہ ہی یاد آرہی تھیں۔ میں سینے کے بل رینگتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اور ان باتوں کو یاد کر رہا تھا۔ بڑبڑاتا جا رہا تھا۔

کوئی نہیں آئے گا... میں اسی ویرانے میں مر جاؤں گا..... لوگ مجھے لاوارث سمجھ کر دفن کر دیں گے..... آہ میں کیا کروں... اے میرے اللہ.... تُو نے سب کی مدد کی ہے.... میری بھی مدد کر دے... کسی کو بھیج دے۔'' پھر زور سے آواز لگائی ''کوئی ہے... ارے میں مر رہا ہوں... کوئی مجھے بچالے۔'' تبھی میں نے دیکھا کہ ایک عورت تیز تیز قدموں سے آگے بڑھتی جا رہی ہے۔ میں نے آواز دی۔ ''اے عورت ...... اے بی بی بات سنو... میری مدد کرو۔ یہاں آؤ.... مجھ پر رحم کھاؤ.... کون ہو تم... نزدیک آؤ۔ کسی کو بلا لاؤ... یا صرف مجھے سہارا دو.... میں مرنا نہیں چاہتا... پیر میں گولی لگی ہے ... اسی زخمی ٹانگ سے تمہاری بستی تک پہنچ جاؤں گا... بس مجھے سہارا دو۔'' عورت مڑ کر دیکھتی ہے۔ اس پر نظر پڑتے ہی میں زور سے چیخا ''ارے یہ تم ہو ... رعنا یہ تم ہو.... یہاں آؤ.... مجھے سہارا دو'' مگر وہ عورت فوراً غائب ہوگئی۔ اور میں بلکنے لگا ''اف میرے مولیٰ... یہ کیسا امتحان ہے... کیوں میرے ذہن کو بھٹکا رہے ہیں۔ بار بار آنکھوں میں کیوں میرے اپنوں کی شبیہہ ابھر رہی ہے..... یقیناً میں مرنے والا ہوں .... تبھی تو سب اس طرح یاد آرہے ہیں ..... میری موت ایسی ہوگی... بے یار و مددگار ہوگی.... نہیں میں ایسی لاوارثی کی موت مرنا نہیں چاہتا، اپنوں سے دور میں مرنا نہیں چاہتا۔ اے میرے اللہ ... مجھے بھائی جان جیسی موت نہ دے۔'' اس دن جب یہ خبر آئی تو میں کتنا رویا تھا۔ اسی کے بعد ہی تو میری زندگی کا رخ بدلا تھا۔ میں کچھ سے کچھ ہوگیا تھا۔ وہ منظر آج بھی یاد ہے۔ جیسے آنکھوں میں منجمد ہوگیا ہے۔

پوسٹ مین خط دے کر گیا تھا۔ وہ خط لہراتے ہوئے میں نے رعنا کو چھیڑا تھا ''اوئے ہوئے دبئی سے خط آیا ہے۔''

رعنا خوش ہوکر بولی ''تمہارے بھائی جان کا خط ہے نا۔''

''دبئی کا ڈاک ٹکٹ لگا ہے تو وہیں سے آیا ہے اور وہاں بھائی جان کے علاوہ کون ہے جو خط لکھے گا۔''

''دو مجھے دو۔'' رعنا نے ہاتھ بڑھایا۔

''کیوں دوں... میں نہیں دیتا۔''

''کیوں نہیں دو گے۔''

''بس میری مرضی۔''

''واہ رے مرضی... شرافت سے دے دو۔''

''نہیں دیتا کیونکہ یہ میرے بھائی کا خط ہے۔''

''یہ میرے ارباز کے ابو کا خط ہے۔''

آواز Sound

اشیاء کی حرکت سے پیدا ہونے والی توانائی۔ آواز کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کی خدمت ہوا انجام دیتی ہے۔ ٹھوس اشیاء یا سیال مادّوں میں ارتعاش سے پیدا ہونے والی بڑی اور چھوٹی موجیں جب کان کے پردوں سے ٹکراتی ہیں تو ہم آواز سنتے ہیں۔ آواز دھاتوں، پانی، لکڑی اور دوسرے ٹھوس اجسام میں سے گزر سکتی ہے۔ سرد ہوا میں اس کی رفتار کم اور گرم ہوا میں زیادہ ہوگی۔ لوہے اور فولاد میں 16 ہزار فٹ فی سیکنڈ، تانبے میں 11666 فٹ، سیسے میں 4030 فٹ اور چاندی میں 8553 فٹ فی سیکنڈ کے حساب سے سفر کرتی ہے۔ تازہ پانی میں جس کا درجہ حرارت 59 فارن ہائیٹ ہو، اس کی رفتار 4714 فٹ فی سیکنڈ ہوتی ہے۔ ہوا کا درجہ حرارت صفر درجے سینٹی گریڈ ہو تو اس کی رفتار 1880ء فی سیکنڈ یا 742 میل فی گھنٹا ہوتی ہے۔

انسانی کان صرف اس لرزتے ہوئے جسم کی آواز سن سکتا ہے جس کی فریکوئنسی کی قیمت 20 سے زیادہ اور 20 ہزار سے کم ہو۔ آواز پیدا کرنے کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں: ایک مرتعش جسم اور دوسرا مادّی واسطہ، material medium مثلاً ہوا وغیرہ کیونکہ آواز کی لہریں خالی فضا یا خلا vacuum میں سے نہیں گزر سکتیں۔ جب آبی بخارات کی مقدار ہوا میں بڑھ جاتی ہے تو ہوا کی کثافت کم ہوجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مرطوب ہوا میں آواز کی رفتار بڑھ جاتی ہے۔ اسی طرح ٹمپریچر بھی آواز کی رفتار پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر ہوا کے ٹمپریچر میں ایک درجہ سینٹی گریڈ کا اضافہ کیا جائے تو اس میں آواز کی رفتار کی قیمت تقریباً 2 فٹ فی سیکنڈ ہے۔ دیگر واسطوں میں آواز کی رفتار مقابلتاً زیادہ ہے۔

مرسلہ: شاہنواز بھٹیو، لاڑکانہ

www.pdfbooksfree.pk

''تو ارباز کو دوں گا آپ کو کیوں دوں۔''
''اللہ ستاؤ نہیں دے دونا۔''
''پہلے بتائیں خط لے کر کیا کریں گی؟''
''پڑھوں گی....اور کیا کروں گی۔''
''کیسے پڑھیں گی.....میں بتاؤں؟....پہلے آنکھوں سے لگائیں گی پھر چوم کر کہیں گی ''جانِ تمنا خط ہے تمہارا.. پیار بھرا افسانہ... دل لے لو نذرانہ'' ہے نا... یا کوئی اور گانا گائیں گی....یہ والا ''میرے پیا گئے رنگون وہاں سے کیا ہے ٹیلی فون...تمہاری یاد ستاتی ہے۔''
''دیکھو اب زیادہ مت ستاؤ.....شرافت سے خط میرے حوالے کر دو۔''
''خط ... ہاتھ سے پکڑیں گی نا۔''
''تو کیا پیر سے پکڑوں گی۔''
''جس ہاتھ میں خط ہوگا پہلے میں اس ہاتھ کو چوموں گا۔''
''اسی ہاتھ کا ایسا تھپڑ پڑے گا کہ اولاد بھی منہ ٹیڑھی پیدا ہوگی....سمجھے......''
''نہیں بھابی مجھے منہ ٹیڑھی اولاد نہیں چاہیے ورنہ لوگ شک کریں گے کہ میری بیوی بھی منہ ٹیڑھی ہے...اس لیے لیجیے مگر پہلے بتائیں دبئی میں آپ کا کون رہتا ہے۔''
''میرے شوہر رہتے ہیں اور کون رہے گا۔
میں نے اپنی ٹھوڑی پر انگلی رکھ کر، شرمانے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔''میرے شوہر۔لیجیے'' اور دونوں ہتھیلیوں پر رکھ کر خط پیش کر دیا''آپ ہی پہلے پڑھ لیجیے پھر میں پڑھوں گا اگر میرا ذکر ہوا تب۔''
رعنا جلدی جلدی خط کھولتی ہے۔خط پڑھتے پڑھتے اس کے چہرے کی رنگت بدلنے لگتی ہے پھر وہ تیورا کر نیچے گر جاتی ہے۔رعنا کی حالت دیکھ کر میں نے اماں کو پکارا''اماں... جلدی آئیں۔''
اماں نے داخل ہوتے ہی پوچھا''کیا ہوا؟''
''بھابی کو سنبھالیں'' پھر میں خط کے متن پر نظریں دوڑانے لگا۔لکھا تھا''میں ایاز کے ساتھ کام کرتا ہوں۔وہ میرا بہترین دوست تھا۔گزشتہ ہفتے کمپنی کے ایک ورکر کی غلطی سے وہ بوائلر میں گر گئے۔یہ خبر باہر جاتی تو کمپنی کی بدنامی ہوتی اس لیے اس کو طبعی موت کا سرٹیفکیٹ دے کر جلدی جلدی یہیں دفن کر دیا گیا۔کمپنی نے بطور ہرجانہ پانچ لاکھ روپیا دیا ہے جو میں نے آپ کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دیا ہے۔آپ چیک کر لیں۔''

الٹ پلٹ کر خط دیکھا مگر اس پر کسی کا نام پتا نہیں تھا۔
پورے گھر میں سوگواری چھا گئی۔
وقت گزرنے لگا۔گزرتے وقت کے ساتھ غم میں کمی آ گئی۔ایک دن جب اماں میرے ساتھ بیٹھی تھیں میں نے کہا''اماں اب کیا ہوگا؟''
''میرا تو دماغ ہی ماؤف ہو گیا ہے۔تم ہی بتاؤ۔''
''بھابی کا غم دیکھا نہیں جاتا...بے چاری نے خوشیاں دیکھی ہی کہاں....بچپن تنگی ترشی میں گزرا...اب جب راج کرنے کا وقت آیا تو بھائی جان نہ رہے۔''
''مجھے تو ایک اور ڈر ستانے لگا ہے۔''
''کون سا ڈر؟''
''اب ایاز تو رہا نہیں۔رعنا کا رشتہ ایاز سے تھا۔جب وہ ہی نہ رہا تو اس کا اس گھر سے کیا رشتہ؟....اس کے گھر والے آ کر لے جائیں گے.....وہ جائے گی تو ارباز کو بھی ساتھ لے جائے گی۔''
''ہاں یہ تو ہو سکتا ہے۔''
''ابھی رعنا جوان ہے۔شیدے اس کی دوسری شادی ضرور کرائے گا۔ارباز کی تو زندگی ہی بگڑ جائے گی۔''
''ہم ایسا ہونے نہیں دیں گے۔''
جس بات کو میں نے منع تھا۔انکار کیا تھا کہ میں ایسا ہونے نہیں دوں گا مگر ایسا ہی ہونے جا رہا تھا۔اماں کا ڈر صحیح نکلا۔عدت کے ایام ختم ہوتے ہی شیدے چاچا آ گئے تھے۔
''شیدے بھائی رعنا کو ابھی کچھ دن اور رہنے دیں۔ابھی زخم نیا ہے۔یہاں رہے گی تو ہم لوگوں کی خاطر وہ زیادہ غم نہیں منائے گی۔ہماری خاطر وہ اپنے دکھ کو چھپائے رہے گی۔''
''اگر یہ رعنا کی خواہش ہے تو میں دخل نہیں دوں گا۔بتائیں میں کب آؤں۔''شیدے چاچا بولے۔
''فصل کی کٹائی کے کچھ دن بعد آ جائیں۔''اماں نے کہا۔
''آپ جیسا کہیں' میں آج ہی لوٹ جاتا ہوں۔''
اس دن شیدے چاچا چلے گئے۔ہم نے اطمینان کی سانس لی لیکن وقت کبھی رکا ہے۔بڑی تیزی سے گزرا۔دیکھتے ہی دیکھتے چھ ماہ گزر گئے اور چاچا پھر آ گئے۔
''باجی آپ کے حکم پر میں اتنے دنوں تک رکا رہا مگر اب اور اسے یہاں نہیں چھوڑ سکتا ہوں۔''شیدے چاچا نے آتے ہی کہا۔
''یہاں برائی کیا ہے۔بھابی یہاں رہیں یا وہاں

ت تو ایک ہی ہے۔''میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ تو گویا ٹھان کر آئے تھے کہ رعنا کو لے کر ہی جانا ہے۔
''نہیں بیٹا اب ایسا ممکن نہیں کیونکہ اب وہ رشتہ ہی نہیں رہا جس رشتے کی ڈور سے وہ بندھی تھی۔....اگر اب میں نے اسے یہاں چھوڑا تو لوگ جینا دوبھر کر دیں گے۔ابھی سے لوگ باتیں بنا رہے ہیں۔مجھے طعنے دے رہے ہیں کہ بیٹی کو کھلا نہیں سکتا.....میں غریب ضرور ہوں مگر ت دار ہوں۔''شیدے چاچا نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔
''ارباز یہاں سے جائے گا تو بکھر جائے گا۔اسے چچا کی گود کی عادت ہے۔''اماں نے آخری حربہ آزمایا۔
''ہاں یہ صحیح ہے۔میں ایک غریب آدمی ہوں۔اس غربت میں بھی تینوں بیٹوں کو پڑھا رہا ہوں۔اسے جس قسم کی سہولت چاہیے وہ میں نہیں دے سکوں گا۔''
''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ بھابی کو یہیں رہنے دیں۔''
''کیسے رہنے دوں بھائی....لوگ طعنے دے دے کر رے دے رہے ہیں....اسے یہاں سے لے جائے بغیر چارہ بھی نہیں ہے۔''شیدے چاچا بولے۔
''بھابی کو یہاں سے لے جا کر کیا کریں گے؟ ان سے اسکول میں ٹیچری کرائیں گے؟''میں نے جل کر کہا۔
''میں ایک غریب آدمی ہوں۔بیاہی بیٹی بہت بڑا بوجھ ہوتی ہے۔اسے گھر میں بٹھا بھی نہیں سکتا۔اس لیے اس کی دوسری شادی کرا دوں گا۔'' سانس لے کر وہ بولے''رہا سوال ارباز کا تو رزق کا مالک اللہ ہے۔وہ کوئی نہ کوئی راستہ نکال ہی دے گا....ہو سکتا ہے جہاں اس کی شادی کراؤں وہ لڑکا خود ہی کہہ دے' میں اس بچے کو ساتھ رکھوں گا۔''
''یہ ناممکن ہے کہ ہم ارباز کو جانیں دیں' یہ اس معصوم پر ظلم ہوگا۔''میں نے حتمی لہجے میں کہا۔
''ایک اور راستہ ہے۔''شیدے چاچا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''کون سا راستہ؟''اماں نے جلدی سے کہا۔
''آپ بھلے ہی کراچی میں رہتی ہیں مگر برادری کے رسم و رواج سے تو واقف ہیں نا۔''
''ہاں بولیں۔''اماں نے کہا۔
''برادری میں صدیوں سے رسم چلی آ رہی ہے کہ بھائی کے بعد بھابی پر دیور کا حق ہوتا ہے۔شہباز اس سے شادی کر لے۔''
''نہیں میں ایسا نہیں کر سکتا یہ دقیانوسی باتیں ہیں۔''

میں گویا چیخ پڑا۔
''یہ جاہلانا باتیں نہیں ہیں۔تم کسی بھی عالم دین سے مشورہ کر لو۔شوہر اگر پردیس میں جا کر مفقود الخبر ہو جائے تو طلاق ہو جاتی ہے۔یہاں تو مرنے کا ثبوت بھی ہے، ایاز کے دوست کا خط موجود ہے۔''
''گویا رعنا کا دوبارہ نکاح ہو سکتا ہے نا، شہباز سے نکاح؟''اماں نے چونک کر کہا۔
''مگر میں بھابی کو بہت عزت دیتا ہوں۔''
''اگر عزت دیتے ہو تو یہ کیسے قبول کرو گے کہ کوئی اور اس عزت کا مالک بن جائے؟ ذرا سوچو....ارباز کی طرف دیکھو...کیا اسے سوتیلے باپ کے حوالے کر دو گے؟ بولو، ہے کوئی جواب؟''شیدے چاچا نے گویا میری دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی تھی۔
''پہلے میں بھابی سے بات کروں گا۔''میں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔
''میں بات کر آئی ہوں وہ تیار ہے۔''اماں نے کمرے میں آ کر کہا اور میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

☆☆☆

اس ویرانے میں زخمی حالت میں سینے کے بل رینگتے ہوئے بھی میں یہی کچھ سوچ رہا تھا۔بھائی کو یاد کر رہا تھا۔اللہ سے معافی مانگ رہا تھا۔''اے میرے اللہ اس اذیت سے نجات دے....اف' کیسی شدید اذیت ہے۔درد مارے ڈال رہا ہے اب برداشت نہیں ہو رہا ہے...آہ...اے خدا میرے اللہ میری اذیت کو کم کر دے.....مجھے حوصلہ دے....برداشت کرنے کی قوت دے۔کسی کو آتے نہ دیکھ کر میں سر کو زمین پر رکھ کر رونے لگا''میری کوئی مدد نہیں کرتا۔میں کیا کروں میں مرنا نہیں چاہتا...... میں زندہ رہنا چاہتا ہوں...میں...میں کیا کروں...میرا بچہ تو ابھی دنیا میں آیا بھی نہیں ہے.....میں ایک نظر اسے دیکھنا چاہتا ہوں....اب اور سہا نہیں جاتا...بہت درد ہو رہا ہے....بہت اذیت ہو رہی ہے....اب میں نہیں بچوں گا....آسمان پر سپیدی سحر نمودار ہونے لگی تھی' میں پھر آگے بڑھنے لگا۔ذہن بٹانے کے لیے بڑبڑاتا جا رہا تھا۔''مجھے معاف کر دیں بھائی...میرا کوئی قصور نہیں ہے....میں نے تو انکار کیا تھا.....کتنا منع کیا تھا..مگر میری کوئی نہیں سن رہا تھا.....سب ایک ہو گئے تھے....خود بھابی کی خواہش تھی۔ارباز کی خاطر میں نے ہاں کی تھی' وہ بھی ارباز کے

www.pdfbooksfree.pk

مستقبل کی خاطر راضی ہوئی تھی....اس رات میں کتنا رویا تھا۔۔میرے ذہن میں سہاگ رات کا منظر تازہ ہو گیا تھا۔۔رعنا دلہن بنی بیٹھی تھی۔اسی بیڈ پر دوری بنائے میں بھی بیٹھ گیا تھا۔

''ہر مرد کی زندگی میں یہ رات خوشیاں لاتی ہے....مگر میرے لیے یہ رات غمناک ہے...یہ گلے میں پھولوں کا ہار نہیں ... پھنکارتے ہوئے ناگ ہیں...جو مجھے مسلسل ڈس رہے ہیں۔کیا کروں سمجھ میں نہیں آتا۔''میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

''یہی زندگی ہے۔تم تو پڑھے لکھے ہو...تم نے ہی مجھے مطالعے کا شوق دلایا..کہتے تھے مطالعہ ذہن کو وسعت دیتا ہے....وہ کہانی بھی تمہی نے پڑھائی تھی جس میں ایک لڑکی اپنے حق کی خاطر دنیا سے ٹکرا جاتی ہے۔دوسروں کی خاطر اپنی خوشیوں کا گلا گھونٹ لیتی ہے۔میں نے بھی قربانی دی ہے تم بھی غور کرو...میں ابا کے ساتھ چلی جاتی تو کیا ہوتا۔''

''مجھے تو سزا نہ ملتی...یہ بہت بڑی سزا ہے۔''

''نہیں یہ سزا نہیں انعام ہے.....سوچو ابا نے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ میرا بوجھ نہیں اٹھا سکتے...گھر لے جا کر میری دوسری شادی کرا دیتے۔اس کے بعد کیا ہوتا میرا ارباز سوتیلے باپ کے رحم و کرم پر رہتا..اس کی زندگی برباد ہو کر رہ جاتی...یہاں تم ہو...اماں ہیں...اس کی زندگی پر غم کا سایہ بھی نہیں پڑے گا۔اس کی زندگی بنانے کے لیے ہم اور تم دونوں نے قربانی دی ہے۔''

''مگر کیا کروں آپ کا تقدس دل میں موجزن ہے...آپ کو ہاتھ لگاتے ہوئے بھی دل ڈرے گا۔''

''آپ نہیں تم...اب میں آپ کی بیوی ہوں۔ارباز کی خاطر سب کچھ بھول جائیں،اس کی خاطر مجھے اپنی زندگی میں شامل کرلیں۔'' کہتے ہوئے اس نے لائٹ بجھادی تھی۔

☆☆☆

پھر اندھیرا چھٹ گیا۔دور ایک بستی کا ہیولا نظر آنے لگا۔میں اُدھر بڑھتا جا رہا تھا۔بڑبڑاتا جا رہا تھا ہے۔''اے میرے اللہ...بس اتنی ہمت دے دے کہ میں کسی طرح اس بستی تک پہنچ جاؤں۔۔اف...کاش اس دن میں گھر سے نہ نکلتا...کاش میں پروگرام کینسل کر دیتا۔اس دن کا منظر نظروں میں آنے لگا۔

مرکز سے بار بار کال آرہی تھی۔میں نے چھٹی لے رکھی تھی مگر نوکری ایسی تھی کہ ایمرجنسی میں مجھے بلایا جا رہا تھا۔ایسے وقت انکار نہیں کیا جا سکتا تھا اسی لیے میں جانے کے لیے تیار ہو گیا۔جب باہر نکلنے لگا تو رعنا نے کہا''آپ کب تک واپس آئیں گے؟''

''دو چار گھنٹے تو لگ ہی جائیں گے۔''

''اگر اس درمیان اسپتال جانا پڑا تو؟''

''اماں ہیں نا...ان کو لے کر چلی جانا۔سہراب گوٹھ سینٹر فون کر دینا۔اختر کسی کو بھیج دے گا۔''

''پھر بھی آپ کا ہونا ضروری ہے۔''

''ارے بھائی سارے مراحل ڈاکٹرنیوں کو طے کرانا ہے مجھے نہیں۔''

''آپ تو ہر بات کو مذاق میں اُڑا دیتے ہیں۔''

''اور سنو اس بار ارباز کے لیے بہن لانا ہے سمجھیں۔''

''گویا یہ سب میرے اختیار میں ہے۔''

''اے لو جب مجھ پر اختیار حاصل کر سکتی ہو تو پھر....''

''سنجیدہ ہو جائیں.....جلدی واپس آنے کی کوشش کریں گے۔''

''اچھا بابا مریض کو اتار کر فوراً آ جاؤں گا۔'' کہہ کر میں گھر سے باہر آ گیا۔مرکز پہنچتے ہی مجھے ایمبولنس کی چابی دی گئی اور آرڈر بک۔میں سائرن بجاتا ہوا قصبہ کالونی کی طرف دوڑ چلا پھر میرے ساتھ جو کچھ ہوا وہ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔میں زخمی حالت میں کراہتا ہوا خود کو گھسیٹتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔آسمان پر سفیدی چھا گئی تھی،آبادی اب صاف نظر آ رہی تھی اسی لیے میں زور زور سے آواز لگانے لگا''ارے بھائی کوئی ہے...کوئی میری مدد کر دے''تبھی دور سے کسی کی آواز سنائی دی''کون...کون ہے؟''

''میں یہاں ہوں...اِدھر جھاڑیوں کے پیچھے...میں زخمی ہوں میری مدد کرو۔''میں نے چیخ کر کہا۔

ایک شخص سامنے آیا۔معائنہ کے بعد بولا''ٹھہرو میں رکشا لے کر آتا ہوں۔''

''اسی اللہ کے بندے نے مجھے اسپتال پہنچایا......

ڈاکٹر بھی میری سرگزشت سن کر حیران رہ گئے۔ان کے بقول میں نے پورے تین کلو میٹر کا فاصلہ رینگتے ہوئے طے کرلیا تھا،وہ میری سخت جانی پر محوِ حیرت تھے۔اس اسپتال میں ٹریٹمنٹ دے کر اگلے دن رخصت کر دیا گیا میں ایمبولنس میں سوار ہو کر گھر پہنچا۔ایمبولنس جب میرے دروازے پر رکی تو گھر بند پڑا تھا۔برابر والے نے آکر چابی دی اور بتایا اماں،رعنا کو اسپتال لے کر گئی ہیں۔اسی کی مدد لے کر ایمبولنس والے نے مجھے بیڈ روم تک پہنچایا۔بیڈ پر لیٹا ہوا میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ اپنے گھر تک پہنچ گیا۔اتنی بڑی مصیبت سے بچ کر آ گیا۔تبھی دروازہ کھلا اور میں حیرت سے اچھل پڑا۔اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ ایسا کچھ دیکھوں گا مگر حقیقت نظروں کے سامنے تھی اسے جھٹلا بھی تو نہیں سکتا تھا۔

''بھائی آپ...آپ؟''

''ہاں یہ میں ہی ہوں۔''

''مگر وہ خط وہ اطلاع؟''

''وہ خط میں نے ہی بھجوایا تھا۔''

''مگر کیوں...یہ بھی سوچا تھا کہ اس کا ردِ عمل کتنا خوفناک ہوگا۔''

''اس وقت وہی ایک راستہ تھا۔بڑی لمبی کہانی ہے بتاؤں گا....اماں کہاں ہیں....رعنا نظر نہیں آ رہی؟ارباز کتنا بڑا ہوا؟کیسا ہے وہ؟''

''وہ...وہ..اماں اور رعنا کہیں گئی ہیں۔''میری آواز میں گھبراہٹ تھی۔

''ادب قاعدہ سب گھول کر پی گئے....بھابی نہ کہہ کر نام لے رہے ہو.....میری عدم موجودگی میں اس کا وقار تک بھول گئے؟''بھائی کی تیوری چڑھ گئی تھی۔

''وہ....وہ آپ نے رعنا کہا تو...تو میرے منہ سے بھی نکل گیا...گھبراہٹ میں...''

میرے دماغ میں شور ہو رہا تھا کہ اب کیا ہوگا....بھائی اتنی بڑی خبر سن کر پاگل ہو اٹھیں گے....کہ اب ان کی بیوی میری بیوی ہے....میرے بچے کی ماں بننے اسپتال گئی ہے....یہ گھر تو اب تباہ ہو جائے گا....اماں بھی ٹوٹ کر رہ جائیں گی۔

''رعنا ارباز کو ساتھ لے کر گئی ہے۔''

''جی...جی ہاں۔''

''کب تک آئیں گی''

''بس آتی ہوں گی...آپ بیٹھیں تو...''

''تمہاری یہ حالت کیسے ہوئی...رعنا کی الجھن میں اتنی بڑی بات پوچھنا بھول گیا۔''

''بس سے پھسل کر گر گیا تھا۔''

''اچھا اچھا...رعنا کیا دور گئی ہے۔''

''پتا نہیں...جہاں بھی گئی ہیں اماں کے ساتھ گئی ہیں۔''

''ارباز بھی ساتھ ہے نا؟وہ اسکول جاتا ہے نا۔''

''جی ہاں......آپ بیٹھیں تو اور یہ بتائیں ایسا کیوں کیا تھا۔''

''دولت بہت بری چیز ہے۔زیادہ سے زیادہ کمانے کے چکر میں،میں غلط لوگوں میں پھنس گیا تھا۔ان لوگوں کے ساتھ کام کر کے دو بار میں ہی چار لاکھ روپے جمع کر لیے تھے کہ ان کا ایک بندہ پکڑا گیا۔وہ میرے گھر بھی آتا تھا اس لیے مجھے بھی گرفتار کرلیا گیا۔وہاں کا قانون ہے کہ ڈرگ سپلائی کرنے والے کو موت کی سزا دے دی جاتی ہے.......میں نے یہی سمجھا کہ مجھے بھی یہی سزا ملے گی..بے عزتی الگ ہوگی۔یہ خبر پاکستان پہنچتی تو تم لوگ بھی شرمسار ہوتے ...لوگ تمہیں طعنے دیتے...ارباز کی زندگی برباد ہو جاتی...لوگ اسے اسمگلر کا بیٹا کہتے....اسی لیے میں

آفتاب ظفر

پاکستان کے ممتاز مصور۔ وہ گورداسپور میں پیدا ہوئے۔ 1943ء میں جب ان کی عمر صرف چھ برس کی تھی تو انہوں نے تحریکِ پاکستان سے متعلق کئی ایک تصاویر بنائیں۔ 1948ء میں ان کے والد نے تمام تصاویر حضرت قائداعظم کی خدمت میں پیش کیں تو قائداعظم نے جواب دیا کہ مجھے امید ہے کہ آگے چل کر یہ بچہ میری قوم کا بڑا فنکار بنے گا۔ گیارہ سال کی عمر میں نیشنل کالج آف آرٹس جو اس وقت میو اسکول آف آرٹس کہلاتا تھا میں داخلہ لیا جہاں انہوں نے تین سال کا کورس مکمل کیا۔ 13 سال کی عمر میں اپنے اسکول کے وائس پرنسپل اور مشہور مصور شیخ احمد کے ساتھ کراچی چلے گئے اور اپنے استاد کے ساتھ مل کر امریکا کے مشہور ناشر سلور برڈٹ کی تاریخ پاکستان اور جغرافیہ کی کتابوں کے لیے تصاویر بنائیں۔ 1966ء میں انہوں نے پاکستان آرٹ انسٹیٹیوٹ کراچی کی بنیاد رکھی۔ اس دوران میں 1965ء میں کراچی آرٹس کونسل میں ان کی بنی ہوئی تصویر ''گھریلو خاتون'' پر انہیں پہلا انعام دیا گیا۔ 1967ء میں لڈی ڈانس کو دوسرا انعام دیا گیا۔ 1970ء میں انہیں پاکستان کے قومی عجائب گھر واقع کراچی میں گندھارا گیلری کو سجانے کا موقع دیا گیا۔ حکومت پاکستان نے مرزا غالب پر ایک دستاویزی فلم کے لیے غالب کی زندگی کے مختلف مناظر ان سے بنوائے۔

مرسلہ: زاہد تسلیم، کراچی

www.pdfbooksfree.pk

نے.....وہ جھوٹی اطلاع بھجوادی۔مگر بعد میں شک کی بنیاد پر صرف دس سال کی سزا ہوئی۔خیر جو ہونا تھا ہو گیا۔مجھے بھوک لگ رہی ہے میں کچن میں دیکھتا ہوں شاید کچھ مل جائے۔'' بھائی جان کمرے سے باہر نکل گئے۔

بھائی جان باہر نکل گئے تھے مگر میرے اندر ایک طوفان سا اٹھ رہا تھا۔اس وقت میری بس ایک ہی دعا تھی کہ اے اللہ کسی طرح آنے والے طوفان کا رخ موڑ دے۔ بھائی کو حقیقت معلوم ہو گی تو قیامت آجائے گی.....رعنا ان کی بیوی ہے وہ اسپتال سے لوٹے گی تو اس کی گود میں میرا بچہ ہوگا...یہ بہت بڑی بات ہے قیامت ہی تو آجائے گی.....اب کیا ہوگا....بھائی کا ردِعمل کیا ہوگا...اماں کیا کہیں گی.....خود رعنا کا ردِعمل کیا ہوگا۔بھائی سارا قصور میرا ٹھہرائیں گے.....یہ گھر تباہ ہو جائے گا....بسی بسائی گرہستی اجڑ جائے گی...میں بستر پر لیٹا یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ بھائی واپس آئے۔ان کا چہرہ سپاٹ تھا...ان کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔اسے انہوں نے میرے سرہانے رکھا اور باہر جاتے ہوئے بولے''میں ایک ضروری کام سے جارہا ہوں'' اور باہر نکل گئے۔وقت گزرتا رہا میرے اندر جنگ جاری رہی...بیزار وقت میں نے سوچ میں گزار دیا شام ہونے کو آگئی تھی۔میں نے بیڈ سوئچ دبا کر بلب جلایا تھا کہ میری نظر کتاب پر پڑی اور میں نے وقت گزاری کے لیے اسے اٹھالیا تبھی اس میں سے نکل کر ایک خط نیچے گرا۔میں نے اسے کھولا تو ایک ایک سطر قیامت تھی۔بھائی نے لکھا تھا''میرے بھائی شہباز! میں نے سب کچھ جان لیا ہے۔تمہارے کمرے میں رعنا کی دلہن بنی تصویر دیکھ کر مجھے تمہارے گھبرا اٹھنے کی وجہ سمجھ میں آگئی ہے۔اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔حالات کچھ بھی کرا سکتے ہیں اس لیے میں ہمیشہ کے لیے جارہا ہوں، مجھے ڈھونڈنے کی کوشش مت کرنا اور نہ کسی کو کچھ بتانا۔سب مجھے مردہ تصور کررہے ہیں تو کرنے دو۔حقیقت بتا کر رعنا اور اماں کی زندگی کو تلاطم میں نہ ڈالنا۔قسمت میں جو لکھا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔فقط تمہارا بدقسمت بھائی ایاز'' میں دوبارہ موت کے منہ سے بچا ہوں ایک بار تب جب گولی لگی اور دوسری بار تب جب بھائی آئے۔وہ غصے میں کچھ بھی کر سکتے تھے۔ان کی بیوی اب میری جو ہے اس لیے وہ مجھے گولی بھی مار سکتے تھے۔کوئی بھی بڑا حادثہ ہو سکتا تھا مگر میں زندہ رہ گیا۔بھائی کی عظمت کو یاد کرنے کے لیے زندہ رہ گیا مگر نہیں یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔اس لیے کہ اصل قیامت تو تب آئی جب رعنا تین دن بعد اسپتال سے میرے بیٹے کو گود میں اٹھائے گھر آئی۔

جب وہ گھر آئی تھی تو میں نارمل ہو چکا تھا مگر میری ایک چھوٹی سی غلطی نے سب کچھ الٹ پلٹ دیا۔میں سو کر اٹھا تو بچہ بری طرح رو رہا تھا۔میں نے رعنا کو بیدار کرنے کے لیے اسے کندھے سے ہلایا تو وہ لڑھک گئی۔تب میں نے دیکھا کہ اس کی مٹھی میں کاغذ دبا ہوا ہے اور منہ سے جھاگ سا گر رہا ہے۔میں نے جلدی سے مٹھی کھولی تو اس کاغذ پر لکھا تھا''تمہارا بچہ تمہارے حوالے۔تم سے مجھے کوئی شکایت نہیں ہے۔میری قسمت ہی ایسی ہے۔تم نے بات چھپالی کہ تمہارے بھائی آئے تھے مگر میں نے تمہارے بستر کے نیچے پڑا خط پڑھ لیا ہے، میرا شوہر زندہ تھا اور میں نے دوسری شادی کر لی۔میرا ضمیر مجھے جینے نہیں دے گا اس لیے میں نے نیند کی گولیاں کھالیں۔میری خودکشی پر پردہ ڈال دینا ورنہ خوامخواہ پولیس تھانے کا مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔میرے دونوں بیٹوں کا خیال رکھنا۔فقط بدنصیب رعنا۔'' میں نے خط چھپالیا۔سب نے یہی سمجھا کہ پیدائش کے وقت کوئی پیچیدگی ہو گئی ہے اسی لیے رعنا زندہ نہ رہ سکی۔اماں نے بچے کو سنبھال لیا لیکن وہ بھی زیادہ دن ساتھ نہ دے سکیں۔ان کے بعد میں بچوں کو لے کر بہن کے پاس آگیا ہوں۔اگر آپ کو میری کہانی ایسی لگے کہ اسے چھپوایا جا سکتا ہے تو ضرور چھپوا دیں۔

شمارہ فروری 2013ء کی منتخب سچ بیانیاں

ہماری پیش کش.....آپ کا انتخاب

☆اول: کیسا اپنا پن.....ارسلان احمد (کراچی)

☆دوم: انگارا.....عمران (لاہور)

☆سوم: دوہرا معیار.....ڈاکٹر مہرین مہرو (فیصل آباد)

پہلے دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ بھی منتخب کیجیے
ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے